اردو شعرا کے تذکرے

اور

تذکرہ نگاری

از

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

☆

مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

اردو شعرا کے تذکرے

اور

تذکرہ نگاری

از

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

☆

مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

طبع اول : نومبر ۱۹۷۲ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : پروفیسر حمید احمد خاں
ناظم مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱- ریلوے روڈ لاہور

طابع : محمد زرین خاں

قیمت : ۲۸ روپے

انتساب

ڈاکٹر ہلتروده خاں اور شباہت علی خاں کے نام

فہرست مضامین

پیش لفظ

اُردو میں مغرب کے طرز پر تحقیقی کام ابھی چند برسوں سے شروع ہوا ہے - اگر اس مدت کو بہت بڑھائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تحقیق کے سلسلے کا آغاز صحیح معنوں میں بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی سے ہوتا ہے - چونکہ اس کام میں مستند ماخذوں اور اہم حوالوں کے طور پر عموماً اُردو شعرا کے تذکروں سے مدد لی گئی ہے ، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُردو میں ادبی تنقید و سوانح اور تاریخ نگاری کے سلسلے کا تحقیقی کام دراصل تذکروں کے سہارے آگے بڑھا ہے - اگر یہ تذکرے یکے بعد دیگرے سامنے نہ آجاتے تو ہم اُردو زبان و ادب کے قدیم ورثے ، اس کی نوعیت ، اس کے اسالیب اور اسالیب کی ارتقائی کڑیوں سے ناواقف ہوتے - ہمیں یہ بھی پتا نہ چلتا کہ ہمارے شعر و ادب کی تاریخ کتنی پرانی ہے اور اس میں ہمارے اسلاف نے کتنی قیمتی چیزیں یادگار چھوڑی ہیں -

تذکروں کی اس اہمیت کو ہمارے ہاں جن لوگوں نے سب سے پہلے محسوس کیا اور جن کی دلچسپیوں کے نتیجے میں ابتداءً اُردو تذکروں پر کچھ کام ہوا ، ان میں حافظ محمود شیرانی ، مولوی عبدالحق ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، حبیب الرحمٰن خاں شروانی ، سید محمد ایم - اے ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور قاضی عبدالودود کے نام آتے ہیں - ان بزرگوں کا کام تقسیم ہندوستان سے پہلے کا ہے - تقسیم کے بعد پاکستان اور ہندوستان دونوں میں ۱۹۶۴ع تک سالنامہ نگار (تذکروں کا تذکرہ نمبر) مرتّبہ راقم الحروف کے سوا کوئی قابل ذکر کام نظر نہیں آتا - ہاں پچھلے چند برسوں سے اس طرف خاصی توجہ دی جا رہی ہے - لکھنے والوں کے علاوہ پڑھنے والے بھی تذکروں سے دلچسپی لے رہے ہیں اور اسی دلچسپی کا ایک معمولی نشان میری زیر نظر کتاب ہے -

اُردو شعرا کے تذکروں سے میری دلچسپی نہ نئی ہے ، نہ بہت پرانی - ہاں فارسی شعرا کے بعض تذکرے ۱۹۵۱ع-۱۹۵۲ع سے میرے مطالعے میں رہے ہیں -

اس کی بھی خاص وجہ تھی - میرے عزیز دوست شباہت علی خاں اور ان کی بیگم ڈاکٹر ہلتروده خاں ، جن کے ناموں سے اس کتاب کا انتساب ہے ، کئی سال بسلسلۂ ملازمت اور تعلیم و تدریس ایران میں رہے - دونوں کا علمی و ادبی مذاق نہایت پاکیزہ اور قابلِ رشک ہے - ڈاکٹر ہلتروده جرمن نژاد ہیں - مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں پر مہارت رکھتی ہیں - شباہت علی خاں میرے عزیز ہیں ، ہم وطن ہیں ، ہم مدرسہ ہیں ، ہم عمر ہیں ، ہم ذوق ہیں ، ہم خیال ہیں اور لڑکپن کے ساتھی ہیں - ان کا لطفِ خاص مجھ پر یہ رہا کہ ایران میں جو کلاسیکی کتابیں شائع ہوتی رہیں وہ بغیر میری طلب کے مجھے بھیجتے رہے - ان میں علم عروض و معنی سے متعلق بھی کتابیں تھیں ، دواوین بھی تھے اور تذکرے بھی - تذکرے میرے لیے بالکل نئے تھے اس لیے خصوصاً میرے مطالعے میں رہے اور اس مطالعے کے نتیجے میں مجھے اس موضوع سے یک گونہ دلچسپی پیدا ہو گئی -

چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اُردو شعرا کے تذکروں پر بھی ایک نظر ڈالوں اور دیکھوں کہ ان میں کیا کچھ ہے - لہٰذا تلاش کر کے تھوڑے ہی دنوں میں مولوی عبدالحق کے مرتّبہ اور انجمن ترقیِ اُردو کے مطبوعہ چند تذکرے میں نے پڑھ ڈالے - لیکن اُردو شعرا کے تذکروں میں چونکہ اکثر غیر مطبوعہ اور کمیاب تھے اس لیے ان تک بہ آسانی میری رسائی نہ ہو سکی اور تذکروں کے مطالعے کا جو شوق پیدا ہوا تھا وہ کچھ دنوں بعد ماند پڑ گیا - ۱۹۵۹-۱۹۶۰ع کی بات ہے ، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو کراچی یونیورسٹی کی نگرانی میں ایک فرانسیسی خاتون سکستان لیلیان نذرو پی ایچ - ڈی کے لیے گارسیں دتاسی کی ''تاریخِ ادبِ ہندوی و ہندوستانی'' کا اُردو میں ترجمہ اور اس پر حواشی و مقدمہ لکھ رہی تھیں - ڈاکٹر صاحب موصوف دو سال کے لیے پاکستانیات کے پروفیسر ہو کر کولمبیا چلے گئے اور مجھے لیلیان سکستان کے کام کی نگرانی اور حسب ضرورت اس کی مدد کرنے کا حکم دے گئے - گارسیں دتاسی کی تاریخ میں اُردو کے علاوہ ہندی اور فارسی کی سیکڑوں کتابوں کے حوالے بھی اکثر جگہ آئے ہیں - خصوصاً اُردو شعرا کے جتنے تذکروں کا سراغ دتاسی نے دیا ہے ، قدیم کتابوں میں اور کہیں نظر نہیں آتا - لیکن اُردو شعرا کے اکثر تذکرے فارسی میں تھے اور فرانسیسی خاتون فارسی سے ناواقف تھیں ، اس لیے ان کی رہنمائی کی خاطر مجھے اُردو فارسی کے اکثر مطبوعہ و غیرمطبوعہ دستیاب تذکرے دیکھنے پڑے جس

کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں فارسی شعرا کے تذکروں کی طرح اُردو شعرا کے تذکروں کی اہمیت و افادیت کا بھی قائل ہو گیا - چنانچہ مطالعے کے دوران میں جہاں میں نے مذکورہ خاتون کی ضرورت کی چیزیں انھیں تلاش کر کے دیں ، وہاں اپنی دلچسپی اور اپنے کام کی باتیں بھی نوٹ کرتا گیا - اس طرح میرے پاس اُردو اور فارسی شعرا کے تذکروں کے بارے میں خام صورت میں بہت سا مسالہ جمع ہوگیا -

۱۹۶۲ع میں مولانا نیاز فتح پوری مرحوم کراچی آ گئے اور 'نگار' بھی لکھنؤ سے کراچی منتقل ہوگیا - یہاں میں بھی مولانا کے ساتھ اس کی ادارت میں شریک ہوگیا - ۱۹۶۴ع کے سالنامے کے لیے نیاز صاحب سے موضوع کا ذکر آیا تو چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے : ''نکال سکتے ہیں تو تذکروں کا تذکرہ نمبر نکالیے -'' موضوع کی حد تک تو ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' لیکن جب نیاز صاحب نے یہ فرمایا کہ ''وقت کم ہے ، پورا سالنامہ آپ ہی کو لکھنا ہوگا'' تو میں ایک طرح کی ذہنی الجھن میں پڑ گیا - موضوع کی وسعت و پیچیدگی ، عدیم الفرصتی ، وسائل کی کمی اور اپنی کم علمی اس بات کی متقاضی تھی کہ سردست اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا جائے لیکن ادبی ذوق و شوق اور نیاز صاحب کی خواہش کا یہ تقاضا تھا کہ ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' ضرور شائع کیا جائے - کئی دن تذبذب میں گزرے ، آخرکار غالب کے اس شعر :

بی تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روی دریا آتش است

نے سہارا دیا اور میں نے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر کام شروع کر دیا - تذکروں پر از سر نو نظر ڈالی ، یاد داشتیں ڈھونڈ کر جمع کیں اور جیسے تیسے کرکے تقریباً چار سو صفحات کا سالنامہ بنام ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' مئی - جون ۱۹۶۴ع میں منظر عام پر لے آیا - نیاز صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ''حرفِ اول'' کے نام سے اس کے تعارف میں لکھا :

''نگار کی زندگی کا یہ بالکل پہلا واقعہ ہے کہ اس کا 'سالنامہ' پریس کو جا رہا ہے ، اس حال میں کہ اس کی جمع و ترتیب میں سوا ان چند تمہیدی سطور کے ایک لفظ بھی میرے قلم کا نہیں ہے - ہاں اگر 'القائل علی الخیر کفاعلہ' کوئی معقول و صحیح بات ہے تو یہ فخر مجھے ضرور حاصل ہے کہ سالنامے کے موجودہ موضوع کی طرف میں نے ہی

فرمان صاحب کو متوجہ کیا اور انھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اس بات کو مان لیا ۔ کیونکہ وہ خود اس موضوع پر عرصے سے غور کر رہے تھے اور کافی مواد ان کے پاس جمع تھا ، یقیناً یہ بالکل خدا ساز بات تھی اور حسنِ اتفاق سے :

جو ان کی خو تھی وہ ہی مرا مدّعا ہوا

اس خاص موضوع پر سالنامے کی جمع و ترتیب کا خیال اول اول جنوری ۱۹۳۵ع کا سالنامہ 'اُردو شاعری نمبر' نکالنے کے بعد ہی میرے ذہن میں آیا تھا ۔ لیکن چونکہ میں سمجھتا تھا یہ کام صرف ایک شخص کے کرنے کا نہیں ہے اس لیے میں خاموش رہا کیونکہ وہ 'ایک شخص' میں نہیں ہو سکتا تھا ۔ میرے پاس نہ وقت اتنا تھا کہ 'نگار' اور اپنی زندگی کی تمام ذمہ داریوں سے اعراض کر کے صرف اس کام میں لگ جاتا اور نہ اتنی ہمت و توانائی کہ تمام تذکروں کو فراہم کرتا اور ان کا مطالعہ کرکے خود کوئی تذکرہ ان تذکروں کا مرتّب کر سکتا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خیال میں نے ترک کر دیا ۔"[۱]

یہ سالنامہ جس میں شعرا کے تذکروں کو موضوع بنایا گیا تھا اور جس میں اُردو شعرا کے دستیاب قلمی و مطبوعہ تذکروں کے تعارف و فہرستِ شعرا کے ساتھ ساتھ فارسی شعرا کے تذکروں اور ماخذوں کی بھی ایک طویل فہرست مع مؤلفین و سنینِ تالیف شائع کی گئی تھی ، اُردو فارسی دونوں زبانوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا کام تھا ۔ لیکن مجھے اس وقت بھی اعتراف تھا اور آج بھی ہے کہ یہ کام چند مہینوں میں جیسے تیسے کیا گیا تھا اور بہت سرسری تھا ! بہت سی واقعاتی اور تاریخی غلطیاں تھیں ، کئی تذکروں کا تعارف شامل ہونے سے رہ گیا تھا ، کئی تذکرے ایسے تھے جن کی تفصیلات اور فہرستِ شعرا دستیاب نہ ہو سکی تھی ، جس کے سبب اس میں کل ۴۵ تذکروں کے تعارفات شامل تھے ۔ ان میں بھی کئی نامکمل اور حد درجہ تشنہ تھے ۔ بعض تذکروں پر صرف نصف صفحہ ، بعض پر چند سطریں اور بعض پر زیادہ سے زیادہ ایک یا دو صفحے لکھے

۱- نگار پاکستان ، کراچی ، سالنامہ ۱۹۶۴ع ، ص ۵ ، مؤلفہ و مرتّبہ راقم الحروف ۔

گئے - تاہم ان خامیوں کے باوجود چونکہ اس انداز کا کام اُردو فارسی میں اس سے پہلے نہ ہوا تھا اس لیے ہر طبقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا - رسائل و اخبارات میں حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے ، علم دوست احباب اور بزرگوں نے ہمت افزا خطوط لکھے ، طلبہ اور زبان و ادب کے اساتذہ نے اس کا خیر مقدم کیا ، کئی یونیورسٹیوں نے اسے نصاب کی کتبِ امدادی میں شامل کر لیا اور بعض نامور محققین نے پچھلے چند برسوں کے تحقیقی کام کی فہرست میں اسے نمایاں جگہ دی -

مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ جس مقصد سے یہ سالنامہ مرتّب کیا گیا تھا ، وہ پورا ہوا یعنی ہماری ادبیات قدیم کا جو بیش قیمت ذخیرہ تذکروں کی صورت میں کتب خانوں میں پڑا ہوا تھا ، لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے - پہلے صرف مخصوص افراد اس ذخیرے سے واقف تھے ، اب عام و خاص سب مطلع ہو گئے کہ ہمارے شعرا کے تذکرے تعداد میں کتنے ہیں ، کب لکھے گئے ہیں ، کہاں کہاں ہیں اور ان کی کیا نوعیت ہے - نتیجۃً بہت سے اہل علم و اہل نظر بطور خاص اس طرف متوجہ ہوئے - جن تذکروں کے تعارف نامے شامل ہونے سے رہ گئے تھے، لوگوں نے ان کی نشان دہی کی اور مضامین لکھے - ان کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و طباعت کی طرف بھی توجہ کی گئی - چنانچہ ۱۹۶۴ع کے بعد اب تک کئی قلمی تذکرے مفید حواشی و مقدمات کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں - بعض مطبوعہ تذکرے ، جو نایاب ہو چکے تھے ، ضروری مقدمات اور نئی ترتیب و تدوین کے ساتھ منظر عام پر آئے ہیں - کئی تذکروں کے ترجمے اور خلاصے شائع کیے گئے ہیں - بعض تذکرے زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں اور بعض پر پی ایچ - ڈی - کے لیے تحقیقی کام ہو رہا ہے - ان کاموں کی تفصیل مناسب جگہوں پر کتاب کے اندر ملے گی - میرے لیے جو بات حوصلہ افزا تھی وہ یہ ہے کہ اس عرصے میں جو بھی کام تذکروں کے سلسلے میں ہوا ہے ، اس میں میرے ادنیٰ کام کا حوالہ ضرور دیا گیا ہے - بعض نے یہ کیا ہے کہ اپنے مضامین و کتب میں سارا مواد نگار کے سالنامے ہی سے لیا ہے لیکن حوالہ دینا پسند نہیں کیا - بعض نے صرف اس کی کمزوریاں گنوائی ہیں اور خوبیوں کو لے کر اپنے نام سے اس طرح منسوب کر لیا ہے گویا یہ خاص انھی کی تحقیق اور مطالعے کا نتیجہ ہیں - بعض نے راہِ اعتدال اختیار کی ہے اور ادبی دیانت کے ساتھ اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو سامنے

رکھ کر اس کے حوالے دیے ہیں ۔ میں ان تمام اہل علم کا شکر گزار ہوں کہ اُن کے اِن تبصروں نے مجھے اپنے کام کی اہمیت اور خاص طور پر اس کی خامیوں کا شدید احساس دلایا ۔ ایسا احساس جس نے مجھے اس کے بعد بھی تذکروں کی طرف متوجہ رکھا اور جس کے نتیجے میں یہ تالیف وجود میں آ سکی جو کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے ۔

ہر چند کہ اس کتاب میں تقریباً وہ سارا مواد شامل ہے جو ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' میں پیش کیا گیا تھا ، لیکن کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے یہ کتاب اس سے بالکل مختلف چیز ہو گئی ہے ۔ اس کا مواد تذکرہ نمبر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے ۔ پہلے ہر تذکرے پر چند سطری یا صفحے دو صفحے کے نوٹ تھے ، نہ تذکرے کے مؤلف کا اس میں حال شامل تھا ، نہ دستیاب قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی نشان دہی کی گئی تھی ، نہ عہد تصنیف و تالیف پر مفصل بحث تھی ، نہ سنینِ تصنیف و طباعت کا تعیّن تھا اور نہ ہر تذکرے کی سوانحی و تنقیدی اہمیت پر خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی تھی ۔ تراجم کے نمونے تو سرے سے نہیں تھے ۔ دیباچہ اور ترقیمہ کے ضروری اندراجات بھی اس میں سے حذف ہو گئے تھے ۔ کئی مطبوعہ اور قلمی تذکروں کا اس میں ذکر ہی نہیں تھا ۔ بعض کے صرف نام دے دیے گئے تھے اور بعض کی تفصیلات نہ ہونے کے برابر تھیں ۔ اب یہ صورت نہیں ہے ، کتاب کی نوعیت اس سے بہت مختلف ہے ۔ اس میں تذکرہ نگاری ، اس کے آغاز و ارتقا اور تاریخی و ادبی اہمیت کا ، آج تک کی تحقیق و تنقید کی روشنی میں ، جائزہ لیا گیا ہے ۔ ہر تذکرے پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اس تبصرے میں مؤلف کے حالات زندگی ، سالِ تصنیف و طباعت ، اس کے قلمی اور مطبوعہ نسخے ، نیز اس کے اوصاف و نقائص سبھی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں ۔ ہر تذکرے کے متعدد تراجم — خصوصاً شروع اور آخر کے — بطور نمونہ نقل کر دیے گئے ہیں ۔ حسبِ ضرورت دوسرے تذکروں سے مقابلہ و موازنہ کے ذریعے ہر تذکرے کی خصوصیت اور اس کے مآخذ اور اس سے مستفید تذکروں کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ تذکروں کے تذکرہ نمبر میں ''تذکرۂ دلکشا'' مؤلفہ جنم جی متر ارمان ، ارمغانِ گوکل پرشاد ، تذکرۂ بشیر ، تذکرۂ آزردہ ، نگارستانِ بشیر ، منتخب التذکرہ ، قطعہٴ منتخب ، مخزن نکات (اُردو ترجمہ) اور تذکرۂ حیدری وغیرہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں تھا ۔ اس کتاب میں ان سب پر مفصل تبصرے ہیں ۔ تذکرۂ بے جگر مؤلفہ خیراتی لعل بے جگر ، تذکرۂ ابن طوفان ،

مسرت افزا مؤلفہ ابوالحسن ، مجمع الانتخاب مؤلفہ کمال اور بہارِ بےخزاں مؤلفہ احمد حسین سحر کا ذکر پہلے برائے نام ثانوی حوالوں کی مدد سے کیا گیا تھا ، اب ان سب پر براہ راست مطالعے کے ذریعے روشنی ڈالی گئی ہے ۔ علاوہ ازیں پچھلے چند برسوں میں اُردو شعرا کے تذکروں پر جو کام ہوا ہے ، حتی‌الوسع اس کو نظر میں رکھ کر تذکرہ نگاری کی تاریخ اور ہر تذکرے کی خامی اور خوبی پر گفتگو کی گئی ہے ۔ یہ گفتگو اجمال کے باوصف اپنے اندر ساری ضروری تفصیلات رکھتی ہے ۔ اس لحاظ سے یہ کتاب تذکروں کا سرسری تذکرہ نہیں بلکہ شعرا کے اُردو تذکروں کی ایک منضبط تاریخ بن گئی ہے ۔

نگار کے سالنامے میں ہر تذکرے کی فہرستِ شعرا بھی شامل تھی جس کے سبب سے اس کی حیثیت 'فرہنگِ سخنوران' کی سی ہو گئی تھی ، یعنی ایک شخص اس نمبر کو دیکھ کر بہ آسانی یہ معلوم کر سکتا تھا کہ کسی خاص شاعر کا ذکر کن کن تذکروں میں آیا ہے ۔ شعرا کی یہ فہرستیں اس کتاب میں شامل نہیں کی گئیں ۔ اول اس لیے کہ یہ کام ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' کی صورت میں موجود ہے اور فرہنگ کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ تذکروں میں مذکورہ شعرا کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے ۔ اس میں ادنیٰ ، اعلیٰ اور شاعر و متشاعر سبھی شامل ہیں ۔ اگر ان سب کی فہرست اس میں شامل کی جاتی تو یہ کتاب بےسبب بہت ضخیم ہو جاتی ۔ چنانچہ کتاب میں فہرستِ شعرا کی کمی کو اس طرح پورا کیا گیا ہے کہ تقریباً ساڑھے تین سو نمایندہ شعرا ، جن کے ذکر کے بغیر اُردو شاعری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی اور جن پر کسی وقت تنقیدی کام کیے جانے کا امکان ہو سکتا ہے ، منتخب کر لیے گئے ہیں اور کتاب کے آخر میں ''فرہنگِ سخنورانِ نامور'' کے نام سے بلحاظ حروف تہجی ان کے بارے میں یہ نشان دہی کر دی گئی ہے کہ کسی خاص شاعر کا ذکر نکات الشعرا سے لےکر آب حیات تک کن کن تذکروں میں آیا ہے ۔ اس طرح یہ کتاب جو ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ع سے لےکر ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ع کے تذکروں پر محیط ہے ، تذکروں کے سرسری تعارف سے آگے بڑھ کر شعرائے اُردو کے تذکروں کی تاریخ اور نامور شعرائے اُردو کی فرہنگ بن گئی ہے ۔ فرہنگ شعرا میں ہر شاعر کے تخلص اور نام کے سامنے تذکروں کے نام کی جگہ اُن کے وہ نمبر شمار درج کیے گئے ہیں جو فہرست مضامین میں نکات الشعرا سے آب حیات تک سرسٹھ تذکروں کے مقابل

دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب کیسی ہے؟ اس کی کوئی افادیت ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں رائے مجھے نہیں قارئین کو دینا ہے اور میں اس رائے کے لیے بے چینی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔ ہاں! اس کام کے سلسلے میں جن بزرگوں اور دوستوں نے میری ہمت بڑھائی ہے اور ہر طرح میری معاونت کی ہے ان کے بارے میں شکر و احسان کے چند الفاظ ضروری ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں میرے اولیں محسن ڈاکٹر ہلتروده اور شباہت علی خاں ہیں۔ دوسرے وہ اہلِ قلم ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً مجھے کام کی اہمیت کا احساس دلایا اور اپنے مشفقانہ مشوروں کے ذریعے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ اس موضوع کو کتابی صورت میں لایا جائے۔ ان بزرگوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام استاذی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض تذکروں پر اُنھی کے کام کو دیکھ کر اور اُنھی کے توجہ دلانے کے سبب مجھ میں تذکروں پر کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس کتاب کی تالیف میں آغازِ کار سے لے کر انجام تک مجھے اُنھوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے اور اگر میں ان کے لطف و کرم کا شکریہ ادا بھی کرنا چاہوں تو حق ادا نہ ہوگا۔ اُستاذی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مالک رام، ڈاکٹر گیان چند اور رشید حسن خاں نے تذکروں سے متعلق میری تحریروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے، اکثر میری ہمت بڑھائی ہے اور مجھ میں کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ میں ان سب کا شکرگزار ہوں۔ افراد کی طرح بعض کتب خانے بھی اس کام میں میرے معاون رہے ہیں۔ ان میں پہلا نام ''کتب خانۂ خاص'' انجمن ترقی اُردو کراچی کا ہے۔ مجھے زیادہ مواد اسی کتب خانے سے ملا ہے۔ لیاقت نیشنل لائبریری، ترقی اُردو بورڈ اور جامعہ کراچی کے کتب خانوں سے بھی میں نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، خواجہ مشفق، قیصر ابن حسن اور ضمیر نیازی کے ذاتی کتب خانوں سے میں نے جب چاہا اور جس طرح چاہا استفادہ کیا۔ بعض اہم ماخذ تک میری رسائی انھی حضرات کی معرفت ہوئی ہے۔ خصوصاً خواجہ مشفق نے جس کھلے دل سے اس سلسلے میں میری مدد کی ہے اس کے لیے الفاظ نہیں کہ میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔

اُنھوں نے بعض نادر مخطوطے ، ان کی قلمی نقلیں ، فوٹو اسٹیٹ ، بعض نایاب رسائل اور تذکرے مہینوں کے لیے میرے حوالے کردیے اور بعض اہم مضامین کی نشان دہی بھی کی ۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یہ کام اتنی جلد تکمیل کو نہ پہنچتا ۔ قیصر ابن حسن صاحب کا التفات بھی اسی قسم کا ہے ؛ ان کے پاس مطبوعہ تذکروں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے ۔ مجھے اُنھوں نے اس ذخیرے سے فائدہ اُٹھانے کا موقع اس طرح دیا کہ عملاً بہت دنوں تک ان کا کتب خانہ میری تحویل میں رہا ۔ زیر نظر تالیف کے سلسلے میں ان کا احسان یہ بھی ہے کہ اس میں فرہنگ سخنوراں کے نام سے شعرا کا جو اشاریہ شامل ہے وہ اُنھی کی محنت کا نتیجہ ہے ۔ میرا حصہ اس میں صرف اتنا ہے کہ میں نے منتخب شعرا کی فہرست مرتّب کر کے ان سے فرہنگ تیار کرنے کی گزارش کی تھی ۔ اُنھوں نے میری گزارش پر جس خندہ پیشانی کے ساتھ توجہ فرمائی ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کا شکریہ کس طرح ادا کروں ۔ ضمیر نیازی کے کتب خانے سے بھی میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور ان کے لطفِ خاص کا ممنون ہوں ۔ پروفیسر سید معین الرحمٰن ، اقبال حسین شوق ، زاہد علی ، شباہت علی خاں ، محمد عمر اور برادرم ذاکر علی یوں شکریے کے مستحق ہیں کہ میرا لکھنا پڑھنا بڑی حد تک اُنھی کی رفاقت اور اعانت کے دم سے ہے ۔ آخر میں مجھے اُردو کے جاں باز سپاہی اور ممتاز ادیب پروفیسر حمید احمد خاں ناظم مجلس ترقی ادب لاہور کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی توجہ سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی ۔ پاکستان میں مجلس ترقی ادب واحد ادارہ ہے جس نے شعرائے اُردو کے تذکروں کی طرف خصوصی توجہ کی ہے ۔ اس توجہ کے نتیجے میں کئی تذکرے مفید حواشی اور مقدمات کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور بعض زیر اشاعت ہیں ۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تذکروں سے متعلق یہ کتاب بھی مجلس ہی کے اہتمام سے منظر عام پر آ رہی ہے ۔

فرمان فتح پوری

کراچی ، جمعہ ۲۷ ۔ نومبر ۱۹۷۰ء
مطابق ۲۶ ۔ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

تذکرہ نگاری اور اس کا ارتقاء

تذکرہ نگاری کا مفہوم :

جن لوگوں کی نظر سے اردو فارسی شعرا کے دو چار تذکرے بھی گذرے ہیں ، ان سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ تذکرے عام طور پر بیاضِ اشعار کے ڈھب پر مرتّب کیے گئے ہیں - ہم نے اگلے صفحات میں کسی جگہ تذکرہ نگاری کے محرّکات پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تذکروں کی تالیف میں بیاض اور بیاض نگاری کے شوق نے خاص کردار ادا کیا ہے - اگر تذکروں کی عام روش کو نظر میں رکھ کر ''تذکرہ نگاری'' کے مفہوم یا اس کی تعریف کا تعین کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ''بیاض'' کی ترقی یافتہ صورت کا نام تذکرہ ہے - بیاض میں صرف اشعار کا انتخاب ہوتا تھا ، جب اس میں انتخابِ اشعار کے ساتھ صاحبانِ اشعار کے نام اور تخلص کا اضافہ کر دیا گیا تو اس کا نام تذکرہ ہوگیا - بعد ازاں شعرا کے نام اور تخلص میں خاص ترتیب پیدا کی گئی - کہیں ابجدی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ، کہیں ہجی ترتیب کو ترجیح دی گئی - اس کے ساتھ مختصر حالات زندگی اور کلام پر مختصر تبصرے کا اضافہ ہوا اور ''تذکرہ'' بیاض سے آگے بڑھ کر نیم تاریخی ، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی فضا میں داخل ہوگیا - وقت اور ماحول کے تقاضوں کے تحت تذکروں پر ادبی تاریخ ، تنقید اور سوانح نگاری کا رنگ گہرا ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ تین رنگوں کا یہی آمیزہ جسے حقیقی معنوں میں نہ ادبی تاریخ کا نام دے سکتے ہیں ، نہ تنقید کہہ سکتے ہیں اور نہ سوانح نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں ، تذکرے کا فن قرار پایا ، اور شعرا کے مختصر حالات ، کلام پر سرسری تبصرہ اور انتخاب اشعار کو اس فن کے عناصرِ ترکیبی میں شمار کیا گیا -

لغات اردو فارسی میں بھی ''تذکرہ'' کے دوسرے متعدد معانی کے ساتھ ساتھ ایک معنی یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ ''ایسی کتاب جس میں شعرا کا حال لکھاجائے''

گویا ، لغت کی رو سے اصطلاح شعر و ادب میں اشعار اور احوال شعرا سے متعلق کتاب کو تذکرہ کہتے ہیں[۱] ، لیکن جب شعر و ادب کے سیاق و سباق سے ہٹ کر اسے استعمال کیا جائے گا تو اس سے مراد صرف شعرا کا تذکرہ نہیں بلکہ علما ، فضلا ، صوفیا ، اطبا ، اولیا اور حکما کا تذکرہ بھی ہو سکتا ہے - اردو فارسی میں ان معنوں میں لفظ ''تذکرہ'' کے استعمال کی مثالیں ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں ، اور آج سے نہیں مدت سے ہیں - لیکن خالص تذکرۃ الشعرا کے معنی میں اس لفظ کا اولیں استعمال تذکرۂ دولت شاہ مؤلفہ ۸۹۶ھ میں نظر آتا ہے[۲] ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''تذکرۂ دولت شاہ'' کی ترکیب خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ''تذکرہ'' کے اصطلاحی معنی تذکرۃ الشعرا کے بھی ہیں - اس کے بعد یہ لفظ ان معنوں میں عموماً استعمال ہوا ہے - چنانچہ جب ہم تذکرۂ میر حسن ، تذکرۂ شورش ، تذکرۂ عشقی اور تذکرۂ ابن طوفان کہتے ہیں تو ''تذکرہ'' سے ہماری مراد تذکرۃ الشعرا ہی ہوتی ہے -

اب رہ گیا ''تذکرہ'' اور تذکرہ نگاری کی معنوی وسعت و حدود کے تعین کا سوال ، تو اس سلسلے میں اردو اور فارسی کے سارے تذکرہ نگار خاموش ہیں - ہر تذکرہ نگار نے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں سے فائدہ بھی اٹھایا ہے اور ان کے تذکروں میں کیڑے بھی نکالے ہیں - لیکن کسی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا ہے کہ تذکرہ در اصل ہے کیا اور اسے کیا ہونا چاہیے ؟ حتیٰ کہ گارسیں دتاسی ، عبد الحی صفا بدایونی اور محمد حسین آزاد جنھوں نے اپنے تذکروں میں پچھلے تذکروں کی خامیوں پر وضاحت سے قلم اٹھایا ہے ، یہ کہیں نہیں بتایا کہ

۱- معنی کی تفصیل کے لیے دیکھیے :
(الف) بیان اللسان ، مطبوعہ ادارۂ علمیہ ، میرٹھ ۱۹۵۱ع -
(ب) فرہنگ آنند راج ، جلد اول ، ص ۶۵۷ ، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۹ع -
(ج) فرہنگ نظام ، جلد دوم ، ص ۲۲۵ ، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۵۱ھ -
(د) فرہنگ آصفیہ ، جلد اول ، ص ۴۷۴ ، مطبوعہ رفاہ عام لاہور ۱۹۰۸ع -
(س) نور اللغات ، جلد دوم ، ص ۱۸۶ ، مطبوعہ نیر پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ع -
۲- مقدمۂ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ، از ڈاکٹر علی رضا نقوی ، چاپ تہران ۱۹۶۴ع -

تذکرہ نگاری کی معنوی حدود کیا ہونی چاہییں - قدیم تذکرہ نگاروں میں صرف کریم الدین نے اس طرف توجہ کی ہے اور تاریخ و تذکرہ کا فرق اس طور پر واضح کیا ہے کہ :

''کتب تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں تاریخ کی ہیں اس لیے اکثر اہل علم و فضل نے بہ لحاظ تکمیل فن تواریخ کے اس فن کی کتابیں . . . تصنیف کی ہیں . . . مگر افسوس کہ کسی نے اس کو شاخِ تاریخ نہ کہا - واضح ہو کہ تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں واقعات یا حالاتِ زمانہ اس طور پر لکھے جائیں کہ اس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں زمانے میں یہ حادثہ یا واقعہ گزرا ، بخلاف تذکرہ کے کہ اس میں ایک خاص قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے - مثلاً تذکرۃ الشعرا یا تذکرۂ انبیا یا تذکرۂ اولیا وغیرہ - اس سے معلوم ہوا کہ تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام کہ وہ تذکروں کو بھی مشتمل ہوتی ہے -

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرہ ایک قسم کی تاریخ ہے بشرطیکہ اس میں ہر ایک شخص کے زمانے کا بھی حوالہ ہو اور اگر صرف حال ہو اور تاریخ کسی کی دریافت نہ ہو سکتی ہو اور نہ مصنف کے بیان سے واضح ہو کہ کس زمانے کا یہ حال بیان کرتا ہے تو اس صورت میں داخل تاریخ نہ ہوگا ، بلکہ ایک قسم علیٰحدہ مقابل تاریخ کے ہوگی - اس صورت میں نسبت تضاد کی ہو گی - غرض کہ تاریخ میں بحث واقعاتِ زمانہ سے ہوتی ہے اور تذکرے میں اشخاص کا بیان ہوتا ہے -''[1]

''تذکرہ اور تذکرہ نگاری'' کی تعریف اس سے زیادہ کسی اور تذکرے میں نظر نہیں آتی -

فارسی تذکروں کی قدامت :

اُردو میں تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا اور آخر آخر اس کے فکر و فن نے کیا صورت اختیار کی ؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے

۱- مقدمہ طبقات الشعرائے ہند ، مؤلفہ کریم الدین ، مطبوعہ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ع ، مملوکہ انجمن ترقی اُردو کراچی -

سے پہلے فارسی تذکرہ نگاری کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے ، اس لیے کہ شعر و ادب کی بعض دوسری اصطلاحات و اصناف کی طرح تذکرہ نگاری کا رواج بھی اُردو میں فارسی کے زیر اثر ہوا ہے ۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ محمد حسین آزاد کی آب حیات مصنفہ ۱۸۸۰ع سے قبل تک اُردو شعرا کے جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر فارسی زبان میں ہیں اور فارسی تذکرہ نگاری کی قدیم روش پر مرتّب کیے گئے ہیں ۔

فارسی میں تذکرہ نگاری کا آغاز فی الواقع کس زمانے سے ہوا ، اس کے متعلق وثوق سے کوئی حکم لگانا مشکل ہے ۔ پھر بھی فارسی کے قدیم ترین مآخذوں اور تذکروں کی چھان بین سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل فارسی میں تذکرہ نگاری کا رواج نہ ہوا تھا بلکہ ایک ایرانی محقق کے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے :

''پس از اسلام نیز تا آغاز سدہ ششم کتابے درین زمینہ" کہ ترجمہ شاعران فارسی زبان را ، بہ زبان فارسی و بہ استقلال در برداشتہ باشد نمی شناسیم ، اما بہ زبان عربی کتابہائے در ترجمہ مردان بزرگ علم و ادب و شعر فراہم می آمدہ مانند کتاب یتیمۃ الدہر ثعالبی کہ ابوالقاسم علی پسر باخرزی متوفی بسال ۴۶۷ھ دیلی بنام دمیۃ القصر و عصرۃ اہل العصر ، بر آن نوشت بہ ترجمہ شاعران حجاز و شام و دیار بکر و آذربائیجان و عراق و رے و اصفہان و فارس و کرمان و جرجان و دہستان و استرآباد و قومس و خوارزم و خراسان و بست و سیستان و غزنہ اختصاص دارد ۔[۱]

اسی طرح فارسی کا پہلا تذکرہ نگار محمد عوفی ، لباب‌الالباب مؤلفہ ۶۱۸ھ کے دیباچے میں لکھتا ہے :

''شک نیست کہ درین شیوہ در طبقات شعرائے عرب چند تالیف ساختہ اند و چند تصنیف پرداختہ چون طبقات ابن سلام و طبقات ابن قتیبہ و طبقات ابن المعتز ویتیمۃ الدہر کہ ابو منصور ثعالبی ساختہ است و دمیۃ القصر کہ تاج الرؤسا علی بن الحسن الباخرزی پرداختہ و زینۃ الزمان کہ

۱۔ مقدمہ مجمع الفصحا ، مرتبہ مظاہر مصفّا ، مطبوعہ تہران ۔

شمس الدین محمود اند حودی تالیف کرد ولٰکن در طبقات شعرائے عجم ہیچ تالیف مشاہدہ نیافتادہ است و ہیچ مجموعہ در نظر نیامدہ ۔''[1]

ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی میں تذکرہ نگاری کا آغاز دخلِ اسلام سے بھی کئی سو سال بعد چھٹی صدی ہجری سے ہوتا ہے ۔ صاحبِ راحت الصدور و آیۃ السرور کے بیان کے مطابق چھٹی صدی ہجری کے وسط میں طغرل بن ارسلان کی خواہش پر معروف شعرا کے منتخب اشعار جمع کرنے اور شعرا کی تصویروں کے ساتھ ایک مصوّر تذکرہ ترتیب دینے کا کام شروع ہوا تھا[2] لیکن افسوس کہ اس تذکرے کے تکملہ یا وجود کا کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے ۔ اس لیے فارسی کے قدیم ترین دستیاب تذکرے کی حیثیت سے جس تذکرے کا نام لیا جا سکتا ہے ، وہ نور الدین محمد عوفی کا لباب الالباب ہے جو سر زمین پاک ہی میں بعہد ناصر الدین قباچہ والی اُوچ لکھا گیا ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ لباب الالباب سے پہلے بھی بعض ایسی کتابوں کے نام ملتے ہیں جن میں فارسی شاعری اور بعض فارسی شعرا زیر بحث آئے ہیں ۔ ان میں حسب ذیل کتابیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں :

۱۔ مناقب الشعرا ۔

۲۔ مجمع النوادر یا چہار مقالہ ۔

۳۔ راحت الصدور و آیۃ السرور ۔

اول الذکر کا نام صرف دولت شاہ سمرقندی کے تذکرۃ الشعرا مؤلفہ ۸۹۲ھ میں ایک جگہ آیا ہے جسے ابو طاہر خاتونی کی تالیف بتایا گیا ہے ۔ ابو طاہر خاتونی پانچویں صدی ہجری کے اواخر اور چھٹی صدی ہجری کے اوائل سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا شمار عہد سلجوقی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا تھا اور اس حیثیت سے اس کا تذکرہ ، اکثر قدیم کتابوں میں آیا ہے ۔ چنانچہ عماد الدین اصفہانی نے تاریخ سلجوقیہ میں ، قزوینی نے آثار البلاد میں ، شمس قیس بن رازی نے

۱۔ دیباچہ لباب الالباب ، ص ۱۰ ، مرتبہ سعید نفیسی چاپ تہران ۔

۲۔ مقدمہ راحت الصدور و آیۃ السرور ، بحوالہ مقدمہ لباب الالباب ، مرتبہ سعید نفیسی ۔

المعجم فی معاییر الاشعار العجم میں ، ابی بکر محمد بن علی راوندی نے راحۃ الصدور و آیۃ السرور میں اور ہدایت قلی نے مجمع الفصحا میں ابو طاہر خاتونی کا ذکر کیا ہے اور اس کے اشعار بھی نقل کیے ہیں ۔ لیکن ''مناقب الشعرا'' صرف یہی نہیں کہ اب تک نایاب ہے بلکہ محققین کے نزدیک اس کا وجود ہی مشتبہ ہے ۔ علامہ عبدالوہاب قزوینی جنھوں نے اس سلسلے میں تفحص و تحقیق سے کام لیا ہے لکھتے ہیں کہ :

''فقط دلیلے کہ مابدست داریم برائے صحت وجود چنین کتابے از تالیف ابو طاہر خاتونی منحصر است باین کہ یک مرتبہ ذکر او در تذکرۂ دولت شاہ شدہ است و گمان نمی کنم کہ این دلیل کافی باشد برائے یقین بہ صحت نسبت و عدم تعلق ، و قلتِ تحقیق و مسامحہ در نقل دولت شاہ زیادہ ازان است کہ محتاج بیان باشد ۔''[1]

اس کے بعد یہ کہنا کہ یہ کتاب فی الواقع فارسی شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے ، بہت مشکل ہے ۔ بلکہ بعض قرائن سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ مناقب الشعرا کا موضوع تذکرۂ شعر و شاعری نہیں بلکہ کچھ اور ہے ۔ اس خیال کو یوں تقویت پہنچتی ہے کہ دولت شاہ سمرقندی ایک طرف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کا تذکرہ فارسی کا پہلا تذکرہ ہے ، دوسری طرف وہ مناقب الشعرا کا حوالہ بھی دیتا ہے ۔ اگر مناقب الشعرا واقعی شاعروں کا تذکرہ ہوتا تو کم از کم سمرقندی پہلا تذکرہ نگار ہونے کا مدعی نہ بنتا اور اگر دانستہ ایسا کرتا تو پھر مناقب الشعرا کا حوالہ نہ دیتا ۔ غرض کہ اس کتاب کا تذکرۃ الشعرا ہونا یقینی نہیں اور اگر ہو بھی تو چونکہ یہ اب تک ناپید ہے اس لیے تذکرے کی حیثیت سے اسے زیر بحث لانا مناسب نہیں ۔

مجمع النوادر مؤلفہ ٥٥١ھ بھی تذکرۃ الشعرا نہیں بلکہ جیسا کہ اس کے مشہور و معروف نام ''چہار مقالہ'' سے ظاہر ہے ، نظامی عروضی سمرقندی کے چار مختلف مقالات کا مجموعہ ہے ۔ اس میں مصنف نے شاہانِ وقت کے چار مصاحبینِ خاص یعنی دبیر ، شاعر ، منجّم اور طبیب کے دستور العمل سے بحث کی ہے ۔ مقالہ دوم میں شعر و سخن کی حقیقت اور بعض شعرا کا ذکر آیا ہے ۔ لیکن

---

١ ۔ مقدمہ لباب الالباب ، مرتّبہ سعید نفیسی ، چاپ تہران ۔

تذکرہ نگاری سے براہ راست اس کا کوئی تعلق نہیں ہے - ہاں اسے فارسی شعر و ادب کا ایک قدیم ماخذ ضرور کہہ سکتے ہیں -

جہاں تک ''راحت الصدور و آیۃ السرور'' مصنفہ ابوبکر نجم الدین محمد بن علی راوندی کا تعلق ہے ، یہ کتاب بھی تذکرۃ الشعرا کے زمرے میں نہیں آتی - ''راحت الصدور'' در اصل آلِ سلجوق کی تاریخ ہے جو ۵۹۹ھ میں لکھی گئی ہے - اس کا ایک باب ''ذکر شاعرانِ مداح آلِ سلجوق و شعرہائے آنان'' سے البتہ تعلق رکھتا ہے - اس لیے راحت الصدور کو بھی چہار مقالہ کی طرح فارسی کے بعض شعرا کے قدیم ماخذ میں شمار کر سکتے ہیں ، لیکن تذکرہ نہیں کہہ سکتے -

فارسی شعرا کا پہلا تذکرہ :

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں مناقب الشعرا ، مجمع النوادر اور راحت الصدور و آیۃ السرور تینوں کتابیں تذکرہ نگاری کی تاریخ سے خارج ہو جاتی ہیں اور آج تک کی تحقیق کے مطابق یہی کہنا پڑتا ہے کہ فارسی کا پہلا دستیاب تذکرہ لباب الالباب اور پہلا تذکرہ نگار محمد عوفی ہے - اڈورڈ براؤن نے بہت صحیح لکھا ہے کہ :

''عزت این کتاب لباب الالباب در این است کہ در این فن تقریباً یادگار وحید است - اگرچہ قبل ازیں چند تذکرہ ہائے دیگر در احوال مآثر شعرائے فرس نوشتہ شدہ ولے اکثر آنہا دستخوش حوادث و پایمال مرور زمان گشتہ - الا چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی . . . در آن کتاب ہم اگرچہ ضمناً از گروہے از مشاہیر شعرائے متقدمین ذکر رفتہ ولے مقصود اصلی مؤلف غیر ازان بودہ است ، بخلاف این کتاب لباب الالباب کہ اصل مرام مؤلف ہمین بودہ است کہ حتی المقدور از عامۂ شعرائے مشہور ذکرے و از افکار ابکار و منتخب اشعار ایشان برسبیل نمونہ یادگار در صحائف کتاب خود گذارد -''[۱]

فارسی کا پہلا تذکرہ لباب الالباب ۶۱۷ اور ۶۱۸ھ کے درمیان تکمیل کو

۱- مقدمہ ''لباب الالباب'' از براؤن ، چاپ تہران -

پہنچا ہے اور اس کی دو جلدیں حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہیں۔

اول : در فضیلت شعر و شاعری۔
دوم : در معنی شعر از طریق لغت۔
سوم : در معنی آنکہ اول شعر کہ گفت۔
چہارم : در معنی آنکہ اوّل کسے کہ شعر پارسی گفت۔
پنجم : در لطائفِ اشعار وزرائے عالی مرتبت و صدور سامی منزلت۔
ششم : در لطایف اشعار ملوک کبار و سلاطین نامدار۔
ہفتم : در ذکر صدور و علما و فضلا۔
ہشتم : در ذکر لطایف اشعار شعرائے کہ در عہد آلِ لیث و آلِ طاہر و آلِ سامان بودند۔
نہم : در ذکر شعرائے آلِ ناصر۔
دہم : در ذکر لطایف شعرائے آلِ سلجوق۔
یازدہم : در ذکر لطایف شعرائے کہ درین قرن بودہ اند بعد از عہد دوست معزی و سنجری۔
دوازدہم : در ذکر لطایف اشعار صدورِ فاضل کہ بدین حضرت مخصوص اند و برین دولت موسوم۔

بعد کے فارسی تذکرہ نگاروں نے عموماً لباب الالباب ہی کو سامنے رکھ کر اپنے تذکرے مرتّب کیے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض نے اس کا حوالہ دیا ہے اور بعض نے نہیں دیا۔ غلام علی آزاد بلگرامی کا یہ خیال بہت درست ہے کہ ''جمیع تذکرہ نویسان متاخر در تحریر احوال شعراء اقدم القدما عیالِ اُویند۔''[۱] چنانچہ لباب الالباب کی اشاعت سے قبل فارسی کے جن تذکرہ نگاروں نے اس کتاب سے براہ راست مدد لی ہے اور جنھوں نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے ان میں پانچ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ تقی الدین اوحدی جنھوں نے ''فردوس خیال'' کے نام سے ۹۹۱ھ میں فارسی شعرا کا تذکرہ لکھنا شروع کیا اور ۱۰۲۲ھ میں

۱۔ خزانۂ عامرہ مرقومہ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ع، مطبوعہ کانپور ۱۸۷۱ع، ص ۶۔

''عرفات العاشقین'' کے نام سے مکمل کیا اور ۱۰۳۶ھ میں ''کعبۂ عرفان'' کے نام سے اس کا خلاصہ مرتّب کیا ۔

۲- سید علی بن محمود حسینی جنھوں نے ۱۰۰۰ھ میں ''بزم آرا'' کے نام سے فارسی شعرا کا تذکرہ مکمل کیا ۔

۳- امین احمد رازی جنھوں نے ۱۰۰۲ھ میں ہفت اقلیم کے نام سے شعر و ادب کے متعلق ایک معلوماتی کتاب مرتّب کی اور اس میں بعض فارسی شعرا کے حالات بھی درج کیے ۔

۴- حسن بن لطف اللہ رازی طہرانی جنھوں نے ۱۰۴۰ھ میں ''میخانہ'' کے نام سے رودکی سے لے کر معاصرین تک کا تذکرہ مکمل کیا ۔

۵- علی قلی خاں داغستانی جنھوں نے ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ع میں فارسی شعرا کا ایک تذکرہ لکھا اور ''ریاض الشعرا'' نام رکھا ۔

اس سے قبل دولت شاہ سمرقندی نے ''تذکرۃ الشعرا'' مؤلفہ ۸۹۲ھ میں اور سام مرزا نے تحفۂ سامی مؤلفہ ۹۵۷ھ میں بھی لباب الالباب سے پورا فائدہ اٹھایا ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اس کا حوالہ نہیں دیا ۔ بعض تذکرہ نگار اور مؤرخ ایسے بھی ہیں جو لباب الالباب سے براہ راست استفادے کا دعوی تو کرتے ہیں اور جگہ جگہ لباب الالباب کا حوالہ بھی دیتے ہیں ، لیکن قرائن سے پتا چلتا ہے کہ لباب الالباب ان کی نظر سے نہیں گزرا ۔ مثلاً خزانۂ عامرہ کے مؤلف غلام علی آزاد بلگرامی اور شعر العجم کے مصنف مولانا شبلی دونوں لباب الالباب کو اپنا ماخذ بتاتے ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے ثانوی ذرائع سے لباب الالباب کے بعض تراجم نقل کیے ہیں اور اس سے براہِ راست استفادے کا موقع انھیں نہیں ملا ۔[۱]

فارسی تذکرے اردو تذکرہ نگاری سے قبل :

لباب الالباب کے زیر اثر ۶۱۸ھ سے لے کر اردو شعرا کے اولین تذکرہ نکات الشعرا مؤلفہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ع تک فارسی شعرا کے کتنے تذکرے موجود

۱- ''تنقید شعر العجم'' از حافظ محمود شیرانی ، ص ۴ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۲ع طبع اول ۔

تھے اور ان کی نوعیت کیا تھی - اس کا بھی اجمالی ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ ریختہ گو شعراء کے تذکرے عموماً فارسی تذکروں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں — یوں تو ایسی کتابیں اور بھی ہیں لیکن ۶۱۸ھ سے لے کر ۱۱۶۵ھ تک فارسی شعراء کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں اُن میں مندرجہ ذیل خاص اہمیت رکھتے ہیں :

۱- ''تذکرۃ الشعراء'' مؤلفہ دولت شاہ سمرقندی ، مرقومہٗ ۸۹۲ھ -

۲- ''مجالس النفائس'' مؤلفہ میر علی شیر نوائی ، مرقومہٗ ۸۹۶ھ -

۳- ''لطائف نامہ'' مؤلفہ سلطان محمد سنجری ابن امیری ہروی ، مرقومہٗ ۹۲۷ھ -

۴- ''روضۃ السلاطین'' مؤلفہ سلطان محمد فخری ، مرقومہٗ ۹۳۵ - ۹۶۱ھ -

۵- ''مذکر الاحباب'' مؤلفہ نثار بخاری ، مرقومہٗ ۹۷۴ھ کے قریب -

۶- ''جواہر العجائب'' یا ''تذکرۃ النسا'' مؤلفہ فخری ، مرقومہٗ ۹۶۳ھ -

۷- ''تحفہٗ سامی'' مؤلفہ سام مرزا ، مرقومہٗ ۹۵۷ھ -

۸- ''نفائس المآثر'' مؤلفہ علاء الدولہ قزوینی ، مرقومہٗ ۹۷۳ تا ۹۷۹ھ -

۹- ''خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار'' مؤلفہ تقی کاشی ، مرقومہٗ ۹۸۵ - ۱۰۱۶ھ -

۱۰- ''بزم آرا'' مؤلفہ سید علی بن محمود حسینی ، مرقومہٗ ۱۰۰۰ھ -

۱۱- ''بت خانہ'' (خلاصۃالشعراء) مؤلفہٗ محمد صوفی و عبداللطیف ، مرقومہٗ ۱۰۱۰-۱۰۲۱ھ -

۱۲- ''خزینہٗ گنج الٰہی'' مؤلفہ عماد الدین محمود حسینی الٰہی ، مرقومہٗ ۱۰۳۲ - ۱۰۵۲ھ -

۱۳- ''خیر البیان'' مؤلفہ حسین بن غیاث الدین محمود ، مرقومہٗ ۱۰۱۷ - ۱۰۲۶ھ -

۱۴- ''عرفات العاشقین'' مؤلفہ تقی الدین محمد تقی اوحدی ، مرقومہٗ ۱۰۲۲ - ۱۰۲۴ھ -

۱۵- ''عالم آرا'' مؤلفہ اسکندر منشی ، مرقومہٗ ۱۰۲۵ھ -

۱۶- ''میخانہ'' مؤلفہ عبدالنبی خان فخر الزمانی قزوینی ، مرقومہٗ ۱۰۲۸ھ -

۱۷- ''مجمع الشعراء جہانگیر شاہی'' مؤلفہ قاطعی ، مرقومہٗ ۱۰۳۷ھ -

۱۸- ''رسالہ'' مؤلفہٗ چندربھان برہمن ، مرقومہٗ قبل ۱۰۷۳ھ -

۱۹- ''تذکرۂ نصر آبادی''، مؤلفہ طاہر نصر آبادی، مرقومہ ۱۰۸۰ تا ۱۰۹۶ھ-

۲۰- ''کلمات الشعراء'' مؤلفہ محمد افضل سرخوش، مرقومہ ۱۰۹۳ھ-

۲۱- ''تذکرۃ الشعراء'' مؤلفہ محمد بقا سہارنپوری، مرقومہ قبل ۱۰۹۴ھ-

۲۲- ''مرآۃ الخیال'' مؤلفہ شیر خاں لودی، مرقومہ ۱۱۰۲ھ-

۲۳- ''ہمیشہ بہار'' مؤلفہ کشن چند اخلاص، مرقومہ ۱۱۳۶ھ-

۲۴- ''سفینہ خوشگو'' مؤلفہ بندرا بن خوشگو، مرقومہ ۱۱۳۱ تا ۱۱۶۱ھ-

۲۵- ''سفینہ بے خبر'' مؤلفہ عظمت اللہ بے خبر، مرقومہ ۱۱۴۱ھ-

۲۶- ''مقالات الشعراء'' مؤلفہ قیام الدین حیرت، مرقومہ ۱۱۴۴ھ-

۲۷- ''ید بیضا'' مؤلفہ غلام علی آزاد بلگرامی، مرقومہ ۱۱۴۸ھ-

۲۸- ''تذکرۂ ندرت'' مؤلفہ علی فطرت ندرت، مرقومہ ۱۱۴۹ھ-

۲۹- ''گلدستہ'' مؤلفہ عبدالوہاب، مرقومہ ۱۱۵۵ھ-

۳۰- ''ریاض الشعراء'' مؤلفہ علی قلی خان والہ داغستانی، مرقومہ ۱۱۶۱ھ-

۳۱- ''منتخب الاشعار'' مؤلفہ مردان علی خان مبتلا، مرقومہ ۱۱۶۱ھ-

۳۲- ''تذکرۂ حسینی'' مؤلفہ میر حسین دوست سنبھلی، مرقومہ ۱۱۶۳ھ-

۳۳- ''مجمع النفائس'' مؤلفہ سراج الدین علی خان آرزو، مرقومہ ۱۱۶۴ھ-

۳۴- ''تذکرۃ المعاصرین'' مؤلفہ شیخ علی حزیں، مرقومہ ۱۱۶۵ھ-

ان میں سے اکثر تذکرے سر زمینِ پاک و ہند میں لکھے گئے ہیں-

فارسی تذکروں کی نوعیت و اہمیت :

ان تذکروں کی کیا نوعیت ہے؟ اس کے جواب میں ان پر الگ الگ بحث کرنے کی گنجائش اس جگہ نہیں ہے- مجموعی حیثیت سے البتہ ان پر کچھ کہا جا سکتا ہے- جہاں تک ان کی ظاہری صورت کا تعلق ہے، بقول ڈاکٹر عبدالستار

صدیقی[1] ہم انھیں دو خاص گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

(الف) عام تذکرے : یعنی ایسے تذکرے جن میں فارسی شاعری کے آغاز سے لے کر معاصرین تک کا ذکر کیا گیا ہے ۔ مثلاً تذکرۃ الشعراء ، خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار ، خزینۂ گنج الٰہی ، بت خانہ ، مرآۃ الخیال ، سفینۂ خوشگو ، ریاض الشعراء ، ید بیضا ، مجمع النفائس اور عرفات العاشقین وغیرہ ۔

(ب) خاص تذکرے : یعنی وہ تذکرے جن میں کسی خاص عہد یا دور یا صرف معاصر شعراء کا ذکر آیا ہے ، مثلاً مجالس النفائس ، نفائس المآثر ، میخانہ ، کلمات الشعراء ، تذکرۂ نصر آبادی ، ہمیشہ بہار اور تذکرۃ المعاصرین وغیرہ ۔

اب رہ گئی ان تذکروں کی معنوی نوعیت ، سو اس سلسلے میں سب سے پہلے لباب الالباب کے بارے میں علامہ عبد الوہاب قزوینی کی رائے سن لیجیے ۔ اس لیے کہ یہی تذکرہ ، فارسی تذکرہ نگاری کا سنگ بنیاد ہے اور اسی کی تقلید میں دوسرے تذکرے لکھے گئے ہیں ۔ قزوینی نے لباب الالباب کی تاریخی ، سوانحی اور تنقیدی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"لباب الالباب اگرچہ در ترجمۂ احوالِ شعراء غالباً معلوماتے مفید بدست نمی دہد و مخصوصاً سنِ وفات را کہ اہم مواضع تراجم رجال است ، در اکثر اوقات جہلاً او غفلۃً ذکر نمی کند و ہم واحد او استعمال استعارات سمج و تشبیہات بارد و تسجیعات متکلف ثقیل و جناسات متصنع مستکرہ است کہ از وراء آنہا ہیچ معنی بچنگ خوانندہ نمی آید ۔ و نیز منتخباتے کہ از اشعار شعرا می دہد بسیارے از اوقات اشعار متوسط بلکہ اشعار ردی ایشان است بطورے کہ از روئے ایں منتخبات نمی توان بہ سبک و اسلوب شاعر مبحوث عنہ پے برد ۔"[2]

کم و بیش یہی حال دوسرے تذکروں کا ہے ۔ چنانچہ مجمع الفصحا کے مرتّب

۱۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور ، بابت فروری ۱۹۲۷ع ۔

۲۔ مقدمۂ لباب الالباب ، از عبدالوہاب قزوینی ، مرتّبہ سعید نفیسی مطبوعہ تہران ۔

و مقدمہ نگار فارسی تذکرہ نگاری کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''بر محققان پوشیدہ نیست کہ در بیشتر تذکرہ ہائے فارسی اشتباہے بزرگ تاریخی و ادبی از قبیل نسبت شعر شاعرے بشاعر دیگر یا انتساب یک پارہ شعر بدو یا چند شاعر اشتباہ در تعین زمان زندگی و سن تولید و مرگ و مولد و غیر آن کم نیست — روش تذکرہ نویسان در نوشتن ترجمہ حال و شیوۂ بیان شاعران نیز بیشتر یک نواخت بہ نظر می رسد و باندک تامل آشکار می شود کہ بیشتر آنان گرفتار تقلید از یک دیگر بودہ اند و ہیچیک شیوۂ تازہ ای بکار نہ بردہ است و اگر تازگی و دگرگونی درکار آنان باشد بیشتر از جہت تقسیم بندی ظاہری ست و در معنی و اصل کار ایشان تازگی و ابتکار کمتر دیدہ شدہ است چنانکہ در ضمن ذکر بعضے از تذکرہ ہائے معروف این تقلید را از نظر خوانندہ می گذرانیم ۔''

از جہت تعین شیوۂ شاعران در بیان اگر حمل بر مبالغہ و اغراق نہ شود باید گفت کہ بتقریب ہیچیک از تذکرہ نویسان قلمے در روشن کردن سبک برنامہ نہ نہادہ و از جہت انتقاد نیز قدمے بر نہ داشتہ است ۔

نویسندگان کتابہائے تذکرہ برائے نشان دادن اہمیت شاعر و سبک و سلیقۂ او در شعر بہ کلمہ بازی و لفظ پرداختہ اند و اگرچہ برائے بعضے از آنان کہ شعر شناس بودہ اند و سخن درست و استوار از نادرست و سست، باز می شناختہ اند تحلیل و تجزیہ سبک و تحلیل شیوۂ بیان و بیان جہت ہائے امتیاز شعر شاعرے از شاعر دیگر میسر بودہ است ۔ پائے بند ہائے ظاہر و صنعت سازی و تکلف آنانرا آسودہ و آنگذاشتہ چنانکہ امروز اگر بدقت کتابہائے تذکرہ مورد نظر قرار گیرد این مدعا بخوبی اثبات می گردد کہ سر نوشت تعین سبک شاعران و اہمیت ایشان در شعر در دست تذکرہ نویسان بستگی بصورت ظاہر نام وکنیت و تخلص ایشان و آمادگی آن کلمہ ہائے برائے تجنیس سازی و ایہام و قلب و تصنیف داشتہ است و شاہد این معنی ترجمۂ حال بیشتر شاعراست در تمام تذکرہ ہا از لباب الالباب گرفتہ تا مجمع الفصحا و گاہے کار این تکلف بہ مسخرہ

و خندہ و دیوانگی و پرداختن درو نامہائے بزرگ کشیدہ است ۔''

تذکرہ نگاری کی کمزوریوں کے باب میں تذکروں کا سخت سے سخت نقاد جو کچھ کہہ سکتا ہے تقریباً وہ سب کچھ مندرجہ بالا دو اقتباسات میں آ گیا ہے لیکن ان کمزوریوں کے باوجود فارسی تذکروں کی اہمیت کم نہیں ہوتی ۔ ان ناقدین نے جہاں تذکروں کی خامیاں گنوائی ہیں وہاں اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ:

''این کتاب از حیث نظر تاریخی و ادبی اہمیتے دارد . . . و در حقیقت اگر لباب الالباب بدست ما نہ رسیدہ بود تراجم جماعتے کثیر بل اکثر از شعرائے متقدمین بکلی از میان رفتہ بود والآن ابداً اسمے و رسمے از ایشان باقی نماندہ بود ۔'' (مقدمہ مجمع الفصحا)

یہ ہے فارسی تذکرہ نگاری کی نوعیت و روش جسے پس منظر کے طور پر اُردو تذکرہ نگاری کے مطالعے کے وقت ذہن میں رکھنا ضروری ہے ۔ اس لیے کہ اُردو شعرا کے تذکرے عموماً اسی کی تقلید اور اسی کے زیر اثر وجود میں آئے ۔

اُردو شعرا کے تذکروں کا آغاز :

برصغیر میں اُردو زبان و شعر کو عملاً قبول عام اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل سے نصیب ہوتا ہے ۔ ہوا یہ کہ ۱۷۰۷ع میں اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد جب مغلیہ سلطنت کو سنبھالنے والا کوئی نہ رہا تو مسلمانوں کا سیاسی اقتدار رفتہ رفتہ دیسی راجہ نوابوں اور بعد ازاں انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا ۔ اس سیاسی تبدیلی نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا وہاں زبان و ادب پر بھی گہرا اثر پڑا ۔ فارسی جسے کئی صدی سے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی ، حکومت کی سرپرستی اور خواص کی قدردانی سے محروم ہو گئی ۔ ان حالات میں اُردو کو سامنے آنے کا موقع ملا اور چند دن میں اس نے فارسی کی ساری ظاہری و معنوی خصوصیات کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کر لیں کہ فارسی کو اُردو کے لیے ہر شعبۂ زندگی میں جگہ خالی کرنی پڑی ۔

۱۔ مقدمہ مجمع الفصحا ، مرتبہ مظہر مصفا ، مطبوعہ تہران ۔

جو لوگ اب تک اُردو کو کم مرتبہ اور لچر خیال کرتے تھے وہی اس کی طرف لپکے اور اس طرح کہ اُردو انھیں کی ہو کر رہ گئی ۔ اُردو نثر کی طرف البتہ ذرا دیر میں توجہ کی گئی اور انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے قبل تصنیفی و تالیفی کاموں کا مؤثر ذریعہ نہ بن سکی ۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک اُردو شعرا کے جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں بہ استثنائے ''گلشن ہند'' مؤلفہ مرزا علی لطف اور ''گلدستہ حیدری'' مؤلفہ حیدر بخش حیدری سارے کے سارے فارسی زبان میں ہیں اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور پر ۱۷۵۰ع سے لے کر اُردو شعرا کے آخری تذکرہ "آب حیات" کے سن تالیف ۱۸۸۰ع تک برابر قائم رہتا ہے ۔

اُردو شعرا کے قدیم ترین تذکرے :

اب رہا یہ سوال کہ اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ کب لکھا گیا اور کس نے لکھا ؟ ان سوالوں کا حتمی جواب ذرا مشکل ہے ۔ قدیم تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو میں تذکرہ نگاری کا رواج میر و درد کے عہد ہی سے ہو گیا تھا اور بعض معاصرین مثلاً محمد یار خاں خاکسار ، محمد رفیع سودا ، سراج الدین علی خان آرزو اور سید امام الدین وغیرہ نے شاید اُردو شعرا کے تذکرے بھی مرتّب کیے تھے لیکن چونکہ یہ تذکرے آج تک نایاب ہیں ، بلکہ اُن میں سے بعض کا وجود بھی مشتبہ ہے ، اس لیے ان کے آغاز و انجام یا نوعیت و کیفیت کے متعلق کوئی گفتگو لاحاصل ہے ۔ ہاں قدیم ترین دستیاب تذکروں کو سامنے رکھ کر ان کی تقدیم و تاخیر کا تعین کیا جا سکتا ہے ۔

اُردو کے قدیم ترین تذکروں میں مندرجہ ذیل کے نام لیے جاتے ہیں :

۱۔ نکات الشعرا ، از میر تقی ، مؤلفہ ۱۱۶۵ھ ۔

۲۔ گلشن گفتار ، از حمید اورنگ آبادی ، مؤلفہ ۱۱۶۵ھ ۔

۳۔ تحفۃ الشعرا ، از افضل بیگ قاقشال ، مؤلفہ ۱۱۶۵ھ ۔

۴۔ ریختہ گویاں ، از فتح علی حسینی گردیزی ، مؤلفہ ۱۱۶۶ھ ۔

۵۔ مخزن نکات ، از قیام الدین قائم ، مؤلفہ ۱۱۶۸ھ ۔

اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ :

ان تذکروں کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب لکھتے ہیں ''دو تذکرے (تحفۃ الشعرا اور گلشن گفتار) دکن سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مخزن نکات اپنے دعوے کے باوجود بعد کی تصنیف ہے اور ۱۱۶۸ھ میں لکھا جاتا ہے ۔ باقی رہا تذکرۂ گردیزی سو داخلی شہادتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ گردیزی نے میر کے تذکرۂ نکات الشعرا کو ضرور دیکھا ہوگا ۔ پس ان حالات میں تذکرۂ میر کو اُردو شعرا کا پہلا موجود تذکرہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔''[۱]

اس سے قبل قدیم تذکروں پر بعض دوسرے کام کرنے والے حضرات مثلاً مولوی عبدالحق مرحوم ، محی الدین قادری زور ، حبیب الرحمان خاں شروانی ، گارسیں دتاسی ، حافظ محمود شیرانی ، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ، سید محمد ایم ۔ اے ، حکیم شمس اللہ قادری اور قاضی سید عبدالودود وغیرہ نے بھی کم و بیش اس قسم کا اظہار خیال کیا ہے اور اسی لیے آج عموماً نکات الشعرا ہی کو اردو شعرا کے دوسرے تذکروں سے مقدم کیا جاتا ہے اور ہم نے بھی اس کتاب میں اسی خیال کے تحت نکات الشعرا کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے ۔

لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے نکات الشعرا کی تقدیم کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ نکات الشعرا ، گلشن گفتار اور تحفۃ الشعرا تینوں ۱۱۶۵ع میں مکمل ہوئے ہیں اس لیے نکات الشعرا کو باقی دو سے مقدم کیونکر خیال کیا جاتا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ یہ تذکرے دکن میں لکھے جاتے ہیں لیکن ان کی روش اُردو شعرا کے عام تذکروں سے مختلف نہیں ہے ۔ ان میں دکنی شعرا کے ساتھ شمالی ہند کے متعدد شعرا کا ذکر آیا ہے اور تذکرۃ الشعرا کی حیثیت سے انھیں وہی اہمیت حاصل ہے جو نکات الشعرا کو ۔ اس لیے انھیں تذکرہ نگاری کی توقیت یا تاریخی ترتیب سے خارج کرنے اور انھیں نکات الشعرا سے مؤخر خیال کرنے کا جواز سمجھ میں نہیں آتا ۔

بعض حضرات کی تحریروں سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ میر کے تذکرے کو فتح علی حسینی اور قائم کے تذکروں سے مقدم خیال کرنا بھی ہنوز تشنۂ تحقیق

۱۔ ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' مطبوعہ رسالہ اُردو بابت جولائی ۱۹۴۲ع ۔

ہے - جہاں تک نکات الشعرا کا تعلق ہے، میر نے خود اس کا کوئی سالِ تصنیف درج نہیں کیا - مخلص کی وفات کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مولوی عبدالحق مرحوم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا ہے - گردیزی نے البتہ اپنے تذکرے کے تکملہ کا سال ۵ محرم ۱۱۶۶ھ ظاہر کر دیا ہے - قائم کے تذکرے کا تاریخی نام ''مخزن نکات'' ہے اور اس سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں - ان تاریخوں سے بظاہر نکات الشعرا کو باقی دونوں سے مقدم خیال کرنا پڑتا ہے - لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ تینوں معاصرین اپنے تذکروں میں ایک دوسرے کے تذکرے کا کوئی سراغ نہیں دیتے - گردیزی نے تو خیر اس قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن قائم اور میر دونوں اُردو کے اولیں تذکرہ نگار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں - قائم کا بیان ہے کہ :

''مخفی و محتجب نہ ماند کہ الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نہ گردیدہ و تا این زمان ہیچ انسانے از ماجرائے شوق افزائے سخنوران این فن سطرے تالیف نہ رسانیدہ - بنا بر این فقیر مؤلف محمد قیام الدین قائم بعد کوشش تام و سعی تمام دواوین این اعزہ فراہم آوردہ پارۂ ابیات از ہر کدام بر سبیل یادگار در ذیل این بیاض کہ بہ مخزن نکات موسوم است بہ قید قلم در آوردہ -''

(دیباچہ مخزن نکات، ص ۱)

اسی طرح میر تقی میر کا دعویٰ ہے کہ :

''در فن ریختہ کہ شعرے است بطور شعر فارسی بہ زبان اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد دہلی کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوال شاعران این فن بہ صفحۂ روزگار بہ ماند -'' (دیباچہ نکات الشعرا، ص ۱ طبع اول)

لیکن اسی کے ساتھ میر تقی میر نے محمد یار خاکسار عرف گلو کے ذکر میں خود یہ بھی لکھ دیا ہے کہ :

''تذکرۂ نوشتہ است بنام معشوقِ چہل سالہ خود احوالِ خود را اولِ از ہمہ نگاشتہ'' -

نثار احمد فاروقی نے اس بیان سے یہ سوال اٹھایا ہے کہ :

''اگر میر کا تذکرہ سب سے پہلا ہے تو خاکسار نے اپنے 'معشوق چہل سالہ'

کے نام سے جو تذکرہ لکھا تھا اس کا حوالہ اس میں کیسے آ گیا۔ ظاہر ہے کہ ترجمۂ خاکسار بعد میں لکھا گیا۔ یہ عبارت بڑھائی گئی"[1] لیکن تحقیق مزید کے بعد نثار احمد فاروقی نے میر کے مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"میر کی مراد یہ ہے کہ خاکسار نے ایک تذکرہ لکھا اور اسے اپنے معشوق چہل سالہ سے منسوب کر دیا۔ یہ تذکرہ معشوق چہل سالہ موجود ہے۔ اس معشوق چہل سالہ کا نام محمد قائم اور اس کے تذکرے کا نام مخزن نکات ہے۔"[2]

ہر چند کہ نثار احمد فاروقی کی اس رائے سے اختلاف اور اس پر اعتراض کی خاصی گنجائش نکلتی ہے اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے اس پہلو پر اپنے ایک مقالے میں مفصل بحث بھی کی ہے[3] لیکن نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر انصار اللہ نظر دونوں کے مقالات سے اتنی بات تو بہر طور واضح ہو جاتی ہے کہ خود میر کے قول کے مطابق "نکات الشعرا"[4] سے پہلے اُردو شعرا کا تذکرہ موجود تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب تک یہ دستیاب نہیں ہوا۔ اسی طرح دکن کے دو تذکروں — گلشن گفتار مؤلفہ حمید اورنگ آبادی اور تحفة الشعرا مؤلفۂ قاقشال — کے متعلق بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نکات الشعرا یا مخزن نکات کے بعد کے ہیں۔ تحسین سروری نے اپنے ایک مضمون میں گلشن گفتار کے سالِ تصنیف کے سلسلے میں مدلل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حاصلِ کلام یہ ہے گلشن گفتار کا آغاز ۱۱۶۵ھ سے بہت پہلے ہوا ہوگا۔"[5]

۱- دلی یونیورسٹی میگزین، میر نمبر، ص ۳۹۵، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مطبوعہ دلی ۱۹۶۲ع۔

۲- رسالہ اُردو ادب، ص ۴۳، علی گڑھ، شمارہ نمبر (۱) ۱۹۶۷ع۔

۳- اُردو ادب، علی گڑھ، شمارہ نمبر (۳) ۱۹۶۷ع۔

۴- میر نے یہ کہا ہے کہ نکات الشعرا کے خلاف خاکسار نے تذکرہ لکھا ہے۔ یہ عبارت قابل غور ہے۔ "علی الرغم این تذکرہ، تذکرہ نوشتہ است" ص ۱۲۲ نکات الشعرا [ادارہ]۔

۵- صحیفہ لاہور، شمارہ نمبر ۴۵، بابت اکتوبر ۱۹۶۸ع۔

جہاں تک نکات الشعرا ، تذکرۂ ریختہ گویاں اور مخزن نکات کی تقدیم و تاخیر کا سوال ہے اس کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں[1] :

(الف) ''میر صاحب نے تقریباً ۱۱۶۱ھ میں یا اس کے کچھ بعد اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا ۔ اس وقت تک اس موضوع پر کسی کتاب کا لکھا جانا میر صاحب کے علم میں نہ تھا ۔ ۱۱۶۴ھ میں وہ اس کام میں مشغول تھے ۔ مخلص کی وفات کے ایک برس بعد تک بھی یہ کام ختم نہیں ہوا تھا اور آرزو کے متعلق انھوں نے جو عمدہ تعریفی کلمات استعمال کیے ہیں وہ شعبان ۱۱۶۵ھ کے قبل کے لکھے ہوئے ہیں جب کہ وہ آرزو کے یہاں یا اس کے پڑوس میں رہا کرتے تھے ۔'' (مقدمہ دستور الفصاحت ، ص ۴۶)

(ب) ''گردیزی نے اس کا آغاز ۱۱۵۶ھ کے قریب کیا ہے — ۱۱۵۶ھ میں اس کی عمر ۲۵ سال ہو گی ۔ یہ عمر اس قسم کا کام انجام دینے کے لیے بالکل موزوں تھی ۔ خود میر صاحب کی عمر تذکرہ ختم کرتے وقت تیس برس کی تھی ۔''

(مقدمہ دستور الفصاحت ، ص ۴۸ ، ۴۹)

(س) ''قائم نے پہلے اپنا تذکرہ بیاض کی صورت میں مرتّب کیا تھا ۔ اس بیاض کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلی تاریخ ۱۱۵۷ھ/ ۱۷۴۴ع ملتی ہے ۔ اس وقت تک اُردوگو شعرا کا کوئی تذکرہ مرتّب نہ ہوا تھا ۔ ۱۱۶۷ھ میں . . . بیاض نے تذکرے کی شکل اختیار کر لی اور مصنف نے اس کا تاریخی نام ''مخزن نکات'' رکھا جس سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں ۔''

(دستور ، ص ۵۹)

ان بیانات کی روشنی میں یہ کہنا کہ میر کا تذکرہ گردیزی اور قائم یا حمید اور قاقشال کے تذکروں سے مقدم ہے ، مشکل ہے ۔ بلکہ واقعات تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گردیزی ، قائم اور حمید نے میر سے بہت پہلے اپنے تذکروں کی بنا ڈال

۱۔ مقدمہ دستور الفصاحت ، مرتّبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

دی تھی - اس لیے بعض اہل قلم کا یہ لکھنا کہ :

''میر کو تذکرہ لکھنے میں اوّلیت حاصل ہے . . . گردیزی اور قائم دونوں نے ان کی محنت سے کسی نہ کسی رنگ میں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور اٹھایا ہے -''[1]

درست نہیں معلوم ہوتا - بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ :

''میر ، گردیزی اور قائم تینوں نے ایک دوسرے کی معلومات سے کم و بیش استفادہ کیا ہے - لیکن معاصرانہ چشمک یا اخلاق جرأت کی کمی کی وجہ سے کسی ایک نے بھی دوسرے کے تذکرے کا نام تک نہیں لیا -[2]

جہاں تک نکات الشعرا اور مخزن نکات کے بعض تراجم میں مماثلت و مشابہت کا سوال ہے اس کا سبب یہی نہیں ہے کہ قائم نے میر سے ہر موقع پر استفادہ کیا ہے ، بلکہ وجہ یہ ہے کہ دونوں نے بیاض عزلت اور بیاض طالب سے فائدہ اٹھایا ہے اور مواد فراہم کرنے کے وسائل قرب زمانی و مکانی کے سبب دونوں کے پاس تقریباً ایک سے رہے ہیں -

ان تفصیلات سے کم از کم یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر کا یہ دعویٰ کہ وہ اُردو شعرا کے پہلے تذکرہ نگار ہیں درست نہیں ہے - گردیزی اور قائم دونوں نے میر سے بہت پہلے اپنے تذکروں کی ترتیب و تسوید کا کام شروع کر دیا تھا - نثار احمد فاروقی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ محمد تقی میر دہلی میں ان کے (قائم کے) ہمسائے تھے - میر کو تذکرۂ مخزن نکات کی تالیف کا علم ہوگا لیکن انھوں نے عمداً اس سے چشم پوشی کی ہے اور تقدم کا شرف خود حاصل کرنا چاہا - میری ناچیز رائے میں سر دست میر سے تذکرہ نگاری کی اولیت کا شرف چھیننا ان کے ساتھ زیادتی ہے - یہ مانا کہ عرشی صاحب کی تحقیقات کے مطابق گردیزی کے ''ریختہ گویان'' کا آغاز ۱۱۵۶ھ میں ، قائم کے مخزن نکات کا ۱۱۵۷ھ میں اور میر کے نکات الشعرا کا ۱۱۶۱ھ میں ہوتا ہے اور اگر ہم سال آغاز کے

۱- مقدمہ مخزن نکات ، ص ۳۳ ، مرتبہ اقتدا حسن ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول ۱۹۶۶ع -

۲- مقدمہ مخزن نکات ، ص ۳۳ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ع -

لحاظ سے ان کی تاریخی ترتیب قائم کریں تو موجودہ تذکروں میں پہلا تذکرہ "ریختہ گویاں"، دوسرا "مخزن نکات" اور تیسرا "نکات الشعرا" قرار پاتا ہے۔ لیکن سال تصنیف کے سلسلے میں سال آغاز نہیں بلکہ ہمیشہ کسی کتاب کا سال اختتام شمار کیا جاتا ہے۔ چونکہ خود عرشی صاحب کی تحقیقات یہ بتاتی ہیں کہ نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں ریختہ گویاں ۱۱۶۶ھ اور مخزن نکات ۱۱۶۸ھ میں مکمل ہوا ہے اور آخری دو تذکروں میں بالترتیب ۱۱۶۸ھ اور ۱۱۷۶ھ تک اضافے ہوتے رہے ہیں، اس لیے سال تکمیل کے اعتبار سے نکات الشعرا یقیناً گردیزی اور قائم کے تذکروں سے مقدّم ہو جاتا ہے اور بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی آج بھی یہی کہنا پڑتا ہے کہ دستیاب تذکروں میں تکمیلی حیثیت سے جو تذکرے سب سے پہلے سامنے آئے ہیں ان میں نکات الشعرا، گلشن گفتار اور تحفۃ الشعرا کے نام شامل ہیں[1]۔ اس کے بعد اس فن کو وہ قبول عام حاصل ہوا کہ اٹھارھویں صدی کے اختتام تک درجنوں تذکرے وجود میں آ گئے۔

تذکرہ نگاری کے محرّکات:

فارسی کی طرح اردو میں بھی تذکرہ نگاری کے آغاز و فروغ کے متعدد محرکات رہے ہیں اور اگر ہم نکات الشعرا سے لے کر آب حیات تک کے زمانے کو ذہن میں رکھ کر ان کی نشان دہی کرنا چاہیں تو اس سلسلے میں امور ذیل کو محرکات کا نام دے سکتے ہیں:

۱۔ **اپنی یادگار چھوڑنے کا فطری جذبہ:** اس فن کا اولیں محرک بھی انسان کا وہی فطری جذبہ ہے جو اپنے بعد اپنی ایسی یادگار چھوڑ جانا چاہتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نام تا قیامت دعاؤں کے ساتھ لیا جائے اور وہ زندۂ جاوید ہو جائے۔ بقول میر:

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

چنانچہ فارسی کا پہلا تذکرہ نگار عوفی لباب الالباب کے سبب تالیف کے

۱۔ علی گڑھ میگزین ستمبر ۱۹۳۸ع و سال نامہ سہیل ۱۹۳۶ع ممکولہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

ذیل میں لکھتا ہے کہ :

"محمد عوفی روئے از ہمہ جہان گردانیدہ و بہمہ جہان آوردہ است . . . خواست کہ حضرت عالیہ (نصیر الدین قباچہ) را ہمہ از شیوۂ صناعت و سرمایۂ بضاعت خود خدمتے کند و تحفۂ آرد تا دامن قیامت دست بلا بدامن آن نرسد و تا آخر دورِ روزگار "از دست تعرض شب روان زوال مامون باشد ۔"

اسی طرح فارسی کا دوسرا اہم تذکرہ نگار دولت شاہ سمرقندی "تذکرۃ الشعرا" مؤلفہ ۸۹۲ھ کے دیباچہ میں بطور سبب تالیف رقم طراز ہے کہ :

"من بندہ در روزگار شباب و ایام فضل و اکتساب را در جہالت و بطالت بسر بردم و دو سہ روزہ زندگانی کہ سرمایۂ سعادت جاودانی است بما لایعنی تلف کردم ۔ چون از روئے محاسبت و مراقبت بروزنامۂ حیات نظر کردم دیدم کہ کاروان عمر گرانمایہ در بیشۂ گمراہی پنجاہ مرحلہ قطع نمودہ بود . . . با خود اندیشہ کردم کہ از دفتر دین و دانش کہ فہرست مجموعۂ کمالات است حرفے نخواندۂ و از جاہ و مراتب آبا و اجداد بے بہرہ ماندہ این چنین عمرِ تلف شدہ را چہ عوض و این سودائے بےسود راچہ غرض ؟ بعد ما کہ زخم شمشیر تشویر خوردم و ساعتے بندامت سر فرو بردم — آخر مصلحت آن دانستم کہ پیش ازانکہ پائے مرکب حیات در سنگلاخ اجل مجروح شود : ع

دست بکارے زنم کہ غصہ سر آید

. . . آخر از حسرت و پشیمانی و اندوہ و پریشانی بہ زاویۂ ادبار مجاور گشتم و بگوشۂ تنہائی معتکف نشستم و از بطالت ملالت بر خاطرم مستولی شد کہ ناگاہ : ع

ہاتف غیب این ندا در داد

غافل منشین ورقے می خراش   گر نہ نویسی قلمے می تراش

چون کنوز معانی ظہور نمودہ دانستم کہ قلم اژدہائے آن گنج بود با قلمِ دو زبان یکدل شدہ گفتم اے مفتاح کنوزِ دانش بہ تو مشورت می کنم کہ بہ سعی بنانِ من بدندان تو کدام رقم است ۔ قلم بصدائے صریر بامن تقریر کرد :

کہ ہر چیز کان گفتنی گفتہ اند   بر و یومِ دانش ہمہ رفتہ اند

علمائے دین دادِ آثا و اخبار دادہ اند و ابواب قصص انبیا بر رخ خلق کشادہ اند ۔ شیخ عطار کہ مرقد او از ریاحین انوار معطر باد در تذکرۃ الاولیا ید بیضا نمودہ و مؤرخان دانا در تواریخ و مقامات سلاطین توانا مجلدہا پرداختہ اند و کتاب ہا ساختہ اند و ہم چنین در معرفت بلاد و مصلحت عباد آنچہ بائیستنی است فضلا در آن کار جہد نمودہ اند و یادگارے گذاشتہ اند :

آنچہ مجہول ماندہ در عالم ذکر تاریخ و قصۂ شعراست [۱]

چنانچہ دولت شاہ نے اپنی یادگار چھوڑنے کی آرزو میں فارسی شعرا کا تذکرہ مرتب کر دیا ۔ اپنی یادگار چھوڑنے اور زندہ جاوید ہو جانے کا یہی شوق عموماً تذکرہ نگاری کا محرک بنا ہے اور جیسا کہ اُردو فارسی کے تذکرہ نگاروں نے سبب تالیف کے باب میں واضح کر دیا ہے ، یہی فطری جذبہ اکثر تذکروں کو وجود میں لایا ہے ۔

۲۔ بیاض نگاری اور انتخاب اشعار کا شوق : ”تذکرہ نگاری کا دوسرا بڑا محرک انتخاب اشعار یا بیاض نگاری کا شوق بھی رہا ہے ، انتخاب اشعار کی رسم اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود شعر گوئی کی ۔ انتخاب اشعار در اصل تخلیقی جذبے اور عمل ہی کا ایک جزو ہے جسے شعری تنقید کا نقطۂ آغاز کہنا چاہیے ۔ یہ نقطۂ آغاز ذاتی پسند و ناپسند کا پابند رہ کر بھی مذاق سخن اور معیار فن سے یکسر بیگانہ نہیں ہوتا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی شعر کی تنقید میں انتخاب اشعار سے مفر نہیں ہے اور یہ انتخاب نقاد کو رسوا یا نیک نام کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے ۔ یہ مانا کہ انتخابِ اشعار ، تنقید کا کوئی بنیادی اُصول نہیں ہے لیکن ادبی تنقید سے اس کی اہمیت کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتے ۔ اس کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اس سے آمد و آورد ، توارد و تسامح اور خیال کی جدت و قدامت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ شاید اسی لیے

۱۔ تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی ، بہ تحقیق و تصحیح محمد عباسی ، صفحات ۱۴ تا ۱۷ ۔ از انتشارات کتاب فروشی بارانی تہران ۔

علامہ ابن رشیق نے یہ حکم لگایا تھا کہ :

شاعر کو اعلیٰ طبقے کے شعرا کا کلام یاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے شعر کی بنیاد اسی منوال پر رکھے ۔ جو شخص اساتذہ کے کلام سے خالی الذہن ہوگا اگر وہ محض طبیعت کی اپج سے کچھ لکھ بھی لے گا تو اس کو شعر نہیں بلکہ نظم ساقط از اعتبار یا ٹکسال باہر کہیں گے ۔ پس جب اس کا حافظہ ، بلغا کے کلام سے پُر ہو جائے اور ان کی روش ذہن کی لوح پر نقش ہو جائے تب فکرِ شعر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے ۔ اب جس قدر مشق زیادہ ہوگی اسی قدر ملکۂ شاعری مستحکم ہوگا ۔''[1]

یہ ایک ایسے نقاد کا قول ہے جس کے اثرات مغربی روشنی آنے سے قبل تک عربی ، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر صاف نظر آتے ہیں ۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ فارسی اور اُردو شعرا کے تذکروں میں زبان و بیان کی جن خوبیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی ملتی ہے وہ عموماً ابن رشیق ہی کے دبستانِ تنقید سے تعلق رکھتی ہے ۔ چنانچہ اگر ہم تذکروں کے سوانحی اختصار پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اکثر تذکرہ نگاروں کا مقصود اول اول اشعار کا انتخاب تھا ۔ آخر آخر اس انتخاب میں شاعر کا نام ، تخلص ، ولدیت اور سکونت کے متعلق چند فقرے شامل ہو گئے اور اشعار کے مجموعے نے آسانی سے تذکرے کی صورت اختیار کر لی ۔ اس خیال کی تائید فارسی زبان کے قدیم ترین ماخذ مثلاً ابی بکر نجم الدین محمد پسر علی کی تصنیف راحت الصدور و آیۃ السرور مؤلفہ ۵۹۹ھ اور محمد پسر بدر جاجری کی تالیف مونس الاحرار مؤلفہ ۷۴۱ھ سے بھی ہوتی ہے ۔

انتخاب اشعار کے بڑھتے ہوئے شوق نے بیاض نگاری کی بنا ڈالی اور بیاض نگاری نے آگے چل کر تذکرۃ الشعرا کی صورت اختیار کر لی ۔ بات یہ ہے کہ مختلف مضامین کی ضروری یادداشت رکھنے کے سلسلے میں پاک و ہند میں بیاض کا رواج عام تھا اور آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے ۔

۱۔ بحوالہ مقدمہ شعر و شاعری ، ص ۱۴۶ - ۱۴۷ ، مصنفہ مولانا حالی مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۵۳ء ۔

مولوی عبدالحئی ، بیاض کی مقبولیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں ۔

''اگلے زمانے میں جن لوگوں کو کچھ علمی مذاق ہوتا تھا وہ اپنے پاس ایک بیاض رکھا کرتے تھے ۔ کبھی اس کی تقطیع کتابی ہوتی جس کا شیرازہ عرض میں کاغذوں کو موڑ کر باندھا جاتا ہے ۔ کبھی خول میں کاغذوں کو موڑ کر بہی کی طرح باندھتے ۔ وہ ایک سادی کتاب ہوتی جو ہر وقت پاس رہتی . . . ۔

مذاق علمی بھی ایک طرح کا نہ تھا ، جو طبیب ہوتے وہ بیاض پر اپنے مجربات یا کہیں سے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ آتا اس کو لکھتے جاتے . . . قاضیوں اور مفتیوں کے پاس جو بیاضیں ہوتیں ان میں مفتیٰ بہ مسئلے اور معتبر کتابوں کے حوالے لکھ لیتے تاکہ موقع پر جب ضرورت پڑے تو ان سے کام لے سکیں ۔

شعر کی بیاضوں میں شعر و سخن کے رُموز ، عروض و قافیہ کی ضروری ضروری یادداشتیں ، قدما کے قصائد ، غزلیں ، رباعیاں ، معمّے ، پہیلیاں ، تاریخیں اور جہاں کوئی مزہ‌دار شعر سنا وہ اور اس کے تمام متعلقات قلم بند ہوتے تھے ۔

عام لوگ جو یک فنی نہیں ہوتے وہ بھی اپنے اپنے پاس بیاضیں رکھتے مگر ان کی بیاضیں معجونِ مرکب ہوتی تھیں ۔ ایک حصہ مجرّب نسخوں کے لیے مخصوص ہے تو دوسرا دعاؤں اور تعویذوں کے واسطے ۔ ایک برجستہ اشعار اور دل نشین کلام کے لیے ، نظم ہو یا نثر ، ایک اپنے بزرگوں ، دوستوں اور ناموران ملک کی تاریخہائے ولادت و وفات کے واسطے ۔ غرض کہ وہ ایسی چیز ہوتی جس سے بیکاری کے وقت ہر مذاق کا آدمی اپنا دل بہلا سکتا اور ضرورت کے وقت ان یادداشتوں سے کام لے سکتا ہے ۔

میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا ان میں کا ہر ایک ، ایک ایک بیاض کا مالک تھا اور اس کو اپنی عمر بھر کی کمائی سمجھ کر اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا تھا ۔ سید عبدالجلیل مرحوم

ایک سن رسیدہ بزرگ میرے رشتہ کے نانا تھے ۔ ان کی بیاض اتنی دلچسپ تھی کہ لوگ دُور دُور سے اس کو دیکھنے آتے ۔ وہ بیاض کیا تھی جام جہاں نما تھا ۔ ہندوستان کے عام انقلاب کی چشم دید تاریخ ، ناموران ملک کی موت و حیات کا ابھرا ہوا خاکہ ، فقہ و حدیث کے نوادر اور مشکلات کا حل ، شعرا کے نتائج فکر کا بہترین نمونہ ، غرض کہ وہ ایک ہی کتاب ہر مذاق کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا بہت بڑا ذریعہ تھی ۔

میں نے ان ہی بزرگوں کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی ۔ مجھ کو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا ۔ جب زمانے نے آنکھیں کھولیں اور کاموں میں لگ گیا ، پھر خبر نہیں رہی وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے ۔

سالِ گذشتہ میں صحت نے بیوفائی کی اور سال کا سال الجھاؤ میں گذر گیا ۔ کتاب بینی اور تصنیف و تالیف ، طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی ۔ مجبوراً طبیعت کو ایسی کتابوں کے مطالعے پر مائل ہونا پڑا جن سے دماغ پر زور نہ پڑے ۔ ان ہی کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانے میں ہر وقت پیش نظر رہتی تھی ۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ اس کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو اُن کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں ۔ تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا ۔ بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی جس کا نام ”گل رعنا“ میں نے رکھ دیا ہے ۔“[1]

گویا ”تذکرہ نگاری“ کی اساس بیاض ہے ۔ اُس زمانے میں چھاپہ خانے نہیں تھے ۔ اپنے کام کی چیزیں ہاتھ سے نقل کر کے بیاض میں محفوظ رکھنی پڑتی

۱۔ دیباچہ ”گل رعنا“ ، ص ۱ تا ۴ ، مؤلفہ مولوی عبدالحی مرقومہ ۱۳۴۰ھ ، مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳٦۴ھ طبع سوم ۔

تھیں ۔ چنانچہ جن لوگوں کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور انتخاب اشعار کا شوق تھا انھوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق اشعار کے انتخاب کا ایک تحریری ریکارڈ بیاض یا سفینہ یا ُجنگ کی صورت میں رکھنا شروع کیا اور کچھ دنوں بعد یہی بیاض تذکرے میں بدل گئی ۔

بیاض کے لغوی معنی ''از سواد بہ بیاض آوردہ و صاف کردہ شدہ''[۱] کے ہیں ۔ لیکن اصطلاح میں ایسی کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں اشعار و مطالب متفرقہ درج کیے جاتے ہیں ۔[۲] مثلاً بیاضِ عزلت اور بیاضِ طالب جن سے میر تقی میر اور قائم وغیرہ نے اپنے تذکروں میں مدد لی ہے ۔

بیاض ہی کے نوع کی چیز سفینہ یا ُجنگ بھی تھی ۔ لغات میں سفینہ کو اصطلاحاً ُجنگ اور بیاض کے مترادف بتایا گیا ہے ۔ لیکن ضخامت و طوالت میں اسے عام بیاضوں سے بڑا ظاہر کیا گیا ہے ۔ چنانچہ سفینہ کا لفظ کتاب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً حافظ کے اس شعر میں :

درین زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مئے ناب و سفینۂ غزل است

یہاں ''سفینہ'' بمعنی مجموعۂ غزلیات یا دیوان آیا ہے ۔ اُردو شعرا کے تذکروں میں بھی سفینہ کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً ''مسرت افزا'' مؤلفہ ابوالحسن میں میر زین الدین آشنا اور کاب علی غیرت کے تراجم میں لکھا ہے :

آشنا ـــ ''سخن آشنا تھے چند اشعار ایک آشنا کے سفینہ میں آشنا ہی کے نام سے نظر آئے ۔''

غیرت : ''کاب علی غیرت معلوم نہیں کون ہیں ان کا ایک شعر کسی سفینہ میں لکھا تھا ۔''

سفینۂ خوشگو اور سفینۂ بھگوان داس میں بھی یہی صورت ہے ۔ گویا فارسی میں یہ لفظ کتاب ، دیوان اور مجموعۂ اشعار اور بعض جگہ تذکرہ کے معنی میں

۱۔ فرہنگ آنند راج ، ص ۵۱۹ ، جلد اول ، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۹ع مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔

۲۔ فرہنگ نظام ، ص ۸۷ ، جلد دوم ، مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۱ھ مملوکہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

بھی استعمال ہوا ہے ۔

'جنگ کی بھی یہی کیفیت ہے ۔ فارسی لغات میں یہ لفظ ''بیاض بزرگ'' یا ''سفینۂ بزرگ'' کے معنی میں ملتا ہے ۔ اس کی اصل کا سراغ کسی نے نہیں دیا ۔ لیکن مختلف لغات سے پتا چلتا ہے کہ ترکی ، چینی اور ایشیا کی کئی زبانوں میں یہ لفظ ''سفینہ'' کے معنی میں مستعمل ہے ۔ بعض نے لغات کی روشنی میں اس لفظ کا جائزہ لے کر یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ لفظ ہندوستان سے فارسی میں گیا ہے اور فارسی کی اصطلاحات ادبیہ میں بمعنی کتاب مثل بیاض استعمال ہوتا ہے ۔[1] شعرائے اُردو کے تذکروں میں کمال کے مجمع الانتخاب سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے ۔ کمال نے دیباچے کے آخر میں اپنے تذکرے کا جو قطعۂ تاریخ درج کیا ہے اس کا آخری شعر یہ ہے :

ووہیں نکلی یہ مصرعِ تاریخ
'جنگِ اشعار و مجمعِ ابیات

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ کسی زمانے میں انتخابِ کلام کا رواج عام تھا ۔ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کا محبوب ترین مشغلہ یہی تھا ۔ وہ اپنے اپنے پسند کے اشعار منتخب کر کے رکھتے تھے اور اسے بیاض ، 'جنگ یا سفینہ کا نام دیتے تھے ۔ فارسی میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں سفینہ اور 'جنگ کے الفاظ تذکرۃ الشعرا کے معنی میں بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن ''بیاض'' کا لفظ ہمیشہ مجموعۂ اشعار کے معنوں میں آیا ہے ۔ آج بھی ان بیاضوں کا رواج ہے اور پہلے بھی تھا لیکن پرانی بیاضیں آج کی بیاضوں کے مقابلے میں یوں اہم ہو جاتی ہیں کہ وہ ہمارے شعری سرمائے کا اہم ورثہ اور قیمتی ماخذ ہیں ۔ ایسے ماخذ جن میں بہت سے ایسے شعرا کا منتخب کلام محفوظ ہے جن کے نہ تو دیوان شائع ہو سکے اور نہ ان کا ذکر کسی تذکرے یا تاریخی کتاب میں آ سکا ہے ۔ اس قسم کی متعدد قدیم بیاضیں پاک و ہند کی ذاتی اور پبلک لائبریریوں میں موجود ہیں ۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں تو اس نوع کی بیاضوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی شخص ان بیاضوں کی طرف خصوصی توجہ کرے

۱۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ، ص ۹ - ۱۰ ، از ڈاکٹر علی رضا نقوی چاپ تہران ۱۹۶۴ع ۔

اور مولوی عبدالباری کی ''دو نایاب زمانہ بیاضیں'' کے طرز پر ضروری تفصیلات کے ساتھ انھیں منظر عام پر لے آئے - ان بیاضوں کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جسے آج تذکرۃ الشعرا کا نام دیا جاتا ہے ، وہ بیاض ہی کی ترقی یافتہ ایک صورت ہے - گارسیں دتاسی نے اپنے خطبات اور تاریخ ادب ہندوستانی کے دیباچہ میں بیاض نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے - کریم الدین نے بھی دتاسی کے بیان کو طبقات الشعرا میں دہرایا ہے - بیاض نگاری کی حسب ذیل صورتیں اس وقت عموماً مروج تھیں :

۱- خود اپنے کلام کا انتخاب -

۲- مختلف شعرا کی دواوین سے پسندیدہ اشعار کا انتخاب -

۳- مختلف اصناف یا پسندیدہ اصناف کا انتخاب -

۴- مختلف موضوعات پر مختلف شعرا کے اشعار کا انتخاب -

۵- مختلف زبانوں کے شعرا کا انتخاب -

۶- قدما سے لے کر معاصرین تک کے کلام کا انتخاب -

۷- صرف منتخب اور نہایت مشہور شعرا کے اشعار کا انتخاب -

اس قسم کی بیاضیں بعض گھروں اور بڑے کتب خانوں میں آج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں - بعض بیاضوں میں صرف مختلف شعرا کے پسندیدہ اشعار ہیں ، شعرا کے تخلص درج نہیں ہیں اور بعض میں نام اور تخلص کا اہتمام بھی ہے - یہی بیاض تذکرہ نگاری کا نقش اول ہے - جب یہی نام یا تخلص بلحاظ حروف تہجی یا ابجدی کسی خاص قرینے سے مرتب کر دیے گئے تو اس کا نام تذکرہ ہو گیا - چنانچہ اردو میں ''گلدستۂ نشاط'' اور ''دیوان جہان'' اور فارسی میں ''چمن بے نظیر'' و ''دقائق الاشعار'' اس کی واضح مثالیں ہیں - ''دیوان جہان'' اور ''دقائق الاشعار'' دونوں بنیادی طور پر اشعار کے مجموعے ہیں لیکن چونکہ اشعار کے ساتھ ایک دو فقرے ہر شاعر کے متعلق بھی درج ہیں اس لیے ان کا شمار تذکروں میں ہوتا ہے اور ''گلدستۂ نشاط'' اور ''چمن بے نظیر'' مجموعۂ اشعار یا بیاض ہی کے زمرے میں رہتے ہیں -

۳- شعرا کی معاصرانہ چشمک : تذکرہ نگاری کو ترقی دینے میں شعرا کی معاصرانہ چشمک ، باہم رقابت ، گروہ بندی اور علاقائی تعصب کو بھی بڑا دخل رہا ہے - ولی و ناصر علی اور سودا و میر کے زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک اس

کے اثرات ادبی تاریخ میں پائے جاتے ہیں۔ اشعار میں تو اس قسم کی چشمک کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں لیکن اردو شعرا کے تذکرے بھی ان سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ خود میر کا نکات الشعرا جسے دستیاب تذکروں میں قدیم ترین خیال کیا جاتا ہے معاصرانہ چشمک ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ میر اپنے ایک معاصر محمد یار خاکسار کے بارے میں لکھتے ہیں :

''خاکسار تخلص عرف کلو۔ شخصے است خادم درگاہ قدم شریف شعر ریختہ می گوید و خود را دور می کشد بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ چنانچہ علی الرغم این تذکرہ ، تذکرۂ نوشتہ است ، بنام معشوقِ چہل سالہ خود۔ احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرار دادہ۔ آتش کینہ کہ بےسبب افروختہ چوں کبابم بو می دہد . . . فخر او ہمہ بر ریختہ است طرفہ این کہ آن ہم نامربوط و خود او ہم نادرست . . . الغرض بسیار کم فرصت و بےتہ است۔''[1]

اس اقتباس سے معاصرانہ چشمک ، شعرا کی گروہ بندی اور شاعرانہ رقابت تینوں کا اندازہ ہوتا ہے اور صاف پتا چلتا ہے کہ خاکسار نے میر کے جواب میں یا میر نے خاکسار کے جواب میں تذکرہ لکھا تھا۔ افسوس کہ خاکسار کا تذکرہ ناپید ہے ورنہ پتا چلتا کہ خاکسار نے میر پر کیا کیا چوٹیں کی تھیں۔ فتح علی حسینی گردیزی کے ''تذکرۂ ریختہ گویاں'' کا لب و لہجہ بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ معاصرین کے بعض تذکروں کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں کی طرز تنقید کو ہمسروں کی خردہ گیری سے تعبیر کیا ہے۔ کریم الدین ، قدرت اللہ قاسم ، شفیق اورنگ آبادی ، آزاد اور کئی تذکرہ نگاروں کے یہاں بھی دوسروں کے تنقیدی لب و لہجہ کا جواب دینے کی کوشش نظر آتی ہے۔

اسی طرح قطب الدین باطن اور نصر اللہ خاں خورجوی نے گلستان بےخزاں اور گلشن ہمیشہ بہار کے نام سے جو تذکرے مرتب کیے ہیں ، ان کے مطالعہ

۱۔ ''نکات الشعراء'' ، ص ۱۱۴ ، ۱۱۵ ، مرتبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۵ع۔

سے پتا چلتا ہے کہ ان دونوں کا اصل محرک، شیفتہ کا گلشنِ بےخار ہے۔ باطن کا خیال تھا کہ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں دہلوی شعرا کی بےجا تعریف کی ہے اور دوسرے علاقے کے شاعروں کو جان بوجھ کر کم رتبہ ثابت کیا ہے۔ شیفتہ نے باطن کے استاد نظیر اکبر آبادی کے اشعار پر غیر معیاری اور بازاری ہونے کا حکم لگایا تھا۔ باطن کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ چنانچہ انھوں نے گلشن بےخار کا جواب لکھ مارا اور شیفتہ کے ممدوحین کی تنقیص اور اپنے استاد و احباب کی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

۴۔ **مشاعروں کا رواج :** تذکرہ نگاری کے محرکات میں اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کی اس شاعرانہ فضا کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جس میں شاعری عام و خاص دونوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی۔ ہوا یہ کہ مغلوں کے سیاسی زوال کے بعد جب اہل ہند میں خارجی زندگی سے مقاومت کی قوت باقی نہ رہی تو انھوں نے داخلیت کے خول میں پناہ لینا چاہی۔ رفتہ رفتہ اس داخلیت پسندی نے انھیں عملی زندگی سے اس درجہ دور کر دیا کہ وہ ایک خیالی دنیا کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ اس خیالی دنیا کو آباد کرنے اور سجانے میں جو چیز سب سے زیادہ معاون ثابت ہوئی وہ مشغلۂ شعر و سخن تھا۔ اس مشغلے نے عمومی صورت اختیار کر کے معیار شعر و سخن کو کس درجہ پست کر دیا تھا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حالی نے اس دور کے "شعر و قصاید" کو ناپاک دفتر کا نام بےسبب نہیں دیا تھا۔ شعرگوئی نے واقعی مرض کی صورت اختیار کر لی تھی اور کسی نہ کسی طور پر سارا معاشرہ اس میں مبتلا تھا۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی اس عہد کے ایک تذکرے پر تبصرہ و بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"سلاطین و عمال، امرا و علما، سپاہ و اہلِ دیوان کے علاوہ ہر طبقے کے پیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً سنیر صیقل گر ہے۔ . . . محمد امان نثار معمار ہیں . . . حسین بخش بخشی پارچہ فروش ہے۔ مد سنگھ شبفتہ آہنگر ہے۔ خواجہ ہینگا شیدا علاقہ بند ہے۔ میر صادق علی صادق فیل بان ہے۔ شمبھو ناتھ عزیز مہاجن ہے۔ میر لطیف علی لطیف جواہرات کا دلال ہے اور مغل علی مغل علاقہ بند و سوداگر ہے۔ بدر الدین مفتون بزاز ہے۔ یکرنگ سنار ہے، محمد ہاشم شائق خیاط ہے . . .

محمد عارف رفوگر ہے - عنایت اللہ عرف کالو حجام ہے . . . غلام ناصر جراح ہے - مقصود ایک سقہ ہے - قرین ایک خاکروب ہے -''[1]

اس شاعرانہ فضا میں ''آبروئے شیوۂ اہلِ نظر'' گئی ہو یا باقی رہی ہو لیکن اتنی بات تو یقینی ہے کہ اس فضا میں بیاض نگاری ، انتخاب اشعار ، تحسین و تنقیص ، تبصرہ و تنقید اور تذکرہ نگاری کے مشغلوں کو ضرور یک گونہ تقویت پہنچی ہوگی -

۵- مشاعروں کا رواج بھی اُردو شاعری کی تاریخ میں ابتدا سے ملتا ہے - اس نے بھی تذکرہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد کی ہے - دہلی تو ان مشاعروں یا مراختوں کا مرکز خاص تھا - درد اور خان آرزو ہی کے زمانے سے وہاں جگہ جگہ شعری محفلیں منعقد ہونے لگی تھیں - خود خان آرزو ، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے یہاں ایسی محفلوں کے باقاعدہ انعقاد کا سراغ ملتا ہے - شفیق اورنگ آبادی نے درد کے ذکر میں لکھا ہے کہ :

''شاہ عبدالحکیم حاکم می گوید کہ این عزیز بزرگ عالی دودمان را فقیر مکرر بہ خانۂ خان آرزو روز مراختہ یعنی صحبت ریختہ گویان ہندی کہ در پانزدہم ہر ماہے مقرر بود دیدہ ام -''[2]

خان آرزو کی وفات کے بعد یہ محفل خواجہ میر درد اور بعد ازاں میر تقی میر کے یہاں منتقل ہو گئی - جیسا کہ خود میر نے درد کے سلسلے میں لکھا ہے :

''مجلس ریختہ کہ بہ خانۂ بندہ بہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بہ ذاتِ ہمین بزرگ است زیرا کہ پیش ازین این مجلس بہ خانہ اش مقرر بود -''[3]

ان مراختوں یا مشاعروں کو روز بروز فروغ حاصل ہوتا رہا اور ایک دن وہ آیا کہ بقول خواجہ احمد فاروقی وہ تمدنی زندگی کا اہم جزو بن گئے اور شادی و غم کی ہر تقریب میں منعقد ہونے لگے - چنانچہ قدرت اللہ قاسم نے ''عاشق'' کے

۱- مقدمہ ''مجموعۂ نغز'' مرتبہ حافظ محمود شیرانی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۳ع صفحات لح ، لط -

۲- چمنستان شعرا ، ص ۷۶ ، مؤلفہ ۱۱۷۵ھ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۸ع -

۳- نکات الشعرا ، ص ۵۰ ، مؤلفہ ۱۱۶۵ھ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۵ع -

ذکر میں لکھا ہے کہ :

''قریب دوازدہ سال بلا ناغہ روز جمعہ بہ انعقاد مجلس مشاعرہ بخانۂ خود پرداخت و بہ ہیچ مانع قوی بل اقویٰ موقوف نہ ساخت - حتیٰ کہ صبح فاتحہ روز سیوم فرزند ارجمند خود نمودہ و بعد ظہر مجلس مراختہ منعقد فرمود موقوف نہ ساخت -''[۱]

آخر آخر یہ روایت اتنی پختہ اور اس قدر عام ہوئی کہ شہر شہر ، قصبہ قصبہ ، قریہ قریہ بلکہ گھر گھر مشاعرے ہونے لگے اور آج تک کسی نہ کسی طور پر یہ سلسلہ جاری ہے - مشاعرے کے اس قبول عام کی بدولت انتخاب اشعار ، بیاض نگاری اور گلدستہ نگاری کا رواج بھی عام ہوگیا - جگہ جگہ مشاعرے منعقد ہوتے - ان میں شرکت کرنے والوں کے اشعار کا انتخاب یا پوری پوری غزلیں گلدستے کی شکل میں شائع کی جانے لگیں - کبھی کبھی شعرا کے مختصر حالات بھی ان گلدستوں میں شامل کر دیے جاتے اور ان کی حیثیت تذکروں کی سی ہو جاتی - اس قسم کے گلدستے آج بھی سیکڑوں کی تعداد میں مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں اور ان میں بعض ایسے ہیں جو تذکروں سے کم اہم نہیں ہیں مثلاً ''گلدستۂ سخن'' اور ''گلدستۂ شعر و سخن'' پیش کیے جا سکتے ہیں - ''گلدستۂ شعر و سخن'' میں امجد حسین نے ایک مشاعرے کی طرحی غزلیں جمع کی ہیں اور شعرا کے مختصر حالات بھی درج کیے ہیں - یہ گلدستہ ۱۲۹۱ھ میں مرتب ہوا اور اسی سال مطبع نول کشور سے شائع ہو گیا - ''شعر و سخن'' گلدستہ کا تاریخی نام ہے اور اسے نیاز علی پریشان نے ۱۲۸۶ھ میں مرتب کیا ہے - اس کے لیے انہوں نے ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ع مطابق ۱۰ رجب ۱۲۸۶ھ کو آگرہ میں ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا اور اخباروں میں کئی ماہ تک اشتہار دے کر شعرا کے حالات و طرحی غزلیں جمع کیں - اشتہار میں شعرا سے خصوصی گزارش کی گئی تھی کہ وہ اپنے حالات میں اپنا اصل نام ، تخلص ، ولدیت ، نام استاد ، مدت شاعری ، سکونت اور مشغلۂ تصنیف و تالیف کی تفصیل ضرور درج کریں - اس مشاعرے کے لیے فارسی اُردو دونوں کے لیے طرحی مصرعے الگ الگ دیے گئے تھے - یہ

۱- ''مجموعۂ لغز'' ، ص ۳۷۹ ، مؤلفہ ۱۲۲۱ھ ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ع -

مشاعرہ مہاراجہ بلوان سنگھ کے مکان میں ہوا تھا[1] اور اس میں اس عہد کے اکثر شعرا نے شرکت کی تھی۔ گارسیں دتاسی نے ۱۸۶۹ء کے خطبے میں اس مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔

اس قسم کے گلدستے جو کہ مشاعروں کی معرفت وجود میں آئے ہیں اور جن سے تذکرہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے کثیر تعداد میں ہیں اور اپنے دامن میں کلاسیکل شعر و ادب کا خاصا مواد سمیٹے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ایسے گلدستوں کا تحقیقی تنقیدی جائزہ لے کر ان کی ایک تاریخ مرتب کی جائے۔ یہ تذکروں سے کم دلچسپ اور کم مفید چیز نہ ہوگی۔

۶۔ **اُردو شاعری کی مقبولیت :** ان امور کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ہیں جو تذکرہ نگاری کی محرک ثابت ہوئی ہیں۔ میری مراد فارسی تذکرہ نگاری کے اثرات اور ان سے مسابقت لے جانے کی کوشش سے ہے۔ جب فارسی کی مقبولیت میں کمی واقع ہونے لگی اور ریختہ گو شعرا کو قبول عام نصیب ہوا تو فارسی کے مقابلے میں انھیں بھی تذکروں کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا۔ گویا فارسی کی تقلید اور تقابل نے اُردو میں تذکرہ نگاری کو جنم دیا اور کچھ دنوں بعد ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنھوں نے تصنیف و تالیف کے فطری جذبے کے تحت اُردو شعرا کے تذکرے مرتب کرنے شروع کیے اور ان کی کوششوں سے اس باب میں اتنا مواد جمع ہو گیا کہ اسے ایک مستقل فن کی صورت حاصل ہو گئی۔

اُردو شعرا کے تذکروں کی تعداد :

اُردو میں شعرا کی تذکرہ نگاری کا آغاز تقریباً اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوتا ہے اور آب حیات مؤلفہ ۱۸۸۰ء تک برابر قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیر اثر تنقید، تاریخ اور سوانح نگاری لے لیتی ہے۔ خود آب حیات طرز قدیم کے تذکروں سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس میں اُردو زبان کی تاریخ، لسانی مسائل، مختلف ادوار کی خصوصیات اور شعرا کی شخصیت و کلام پر رائے زنی کا وہ طریقہ اختیار

۱۔ داستان تاریخ اُردو، ص ۳۲۵، ۳۲۶ از مولانا حامد حسن قادری، مطبوعہ لکشمی نرائن اگروال آگرہ ۱۹۵۷ء، طبع دوم۔

کیا گیا ہے جو تاریخ و سوانح کا خاصہ ہونا چاہیے - چنانچہ اُردو زبان و ادب کے تقریباً سارے ناقدین آب حیات کو اُردو ادب کی پہلی تاریخی و تنقیدی کتاب خیال کرتے ہیں - ہم نے اسی لیے اس کتاب میں صرف آب حیات کے سالِ تصنیف ۱۸۸۰ع تک کو اُردو تذکرہ نگاری کا اصل دور قرار دیا ہے اور اس زمانے تک جو تذکرے لکھے گئے ہیں صرف انھیں کو موضوع بحث بنایا ہے - اس سے انکار نہیں کہ آب حیات کے بعد بھی تذکرے کے طرز پر متعدد کتابیں لکھی گئیں مثلاً :

۱- ''آثار الشعرائے ہنود'' مؤلفہ دیبی پرشاد بشاش لکھنؤ ، مطبوعہ ۱۸۸۵ع شاہجہان آباد -
۲- ''جلوۂ خضر'' مؤلفہ صفیر بلگرامی -
۳- ''یادگار ضیغم'' مؤلفہ ضیغم -
۴- ''آثار الشعرا'' مؤلفہ ممتاز علی -
۵- ''آب بقا'' مؤلفہ عبدالرؤف عشرت -
۶- ''تذکرۂ شعرائے دکن محبوب الزمن'' مؤلفہ عبدالجبار خاں ملکا پوری -
۷- ''گل رعنا'' مؤلفہ مولوی عبدالحئی -
۸- ''بہار سخن'' مؤلفہ شیام سندر لال -
۹- ''بیاض سخن'' مؤلفہ عبدالشکور شیدا -
۱۰- ''انتخاب زرین'' مؤلفہ سید راس مسعود -
۱۱- ''قاموس المشاہیر'' مؤلفہ نظامی بدایونی -
۱۲- ''تذکرۂ خندۂ گل'' مؤلفہ عبدالباری آسی -
۱۳- ''تذکرۂ شاعرات'' مؤلفہ عبدالباری آسی -
۱۴- ''شعر الہند'' مؤلفہ عبدالسلام ندوی -
۱۵- ''تذکرۂ ریختی'' مؤلفہ تمکین کاظمی -
۱۶- ''ہندو شعرا'' مؤلفہ عبدالرؤف عشرت -
۱۷- ''خمخانۂ جاوید'' مؤلفہ لالہ سری رام -
۱۸- ''جواہر سخن'' مؤلفہ محمد مبین چریا کوٹی -
۱۹- ''کاشف الحقائق'' مؤلفہ امداد امام اثر -

اس فہرست میں اور بہت سی تالیفات و تصنیفات کے اضافے کیے جا سکتے ہیں ،

لیکن چونکہ یہ سب کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور عام طور پر مل جاتی ہیں اور تاریخ و تنقید و سوانح کی بہتر اور جامع کتابوں کے سامنے ان کی حیثیت قدیم تذکروں کی طرح چنداں اہم بھی نہیں رہی ، اس لیے ان کو شامل کر کے ہم نے اس کتاب کو بے سبب طول دینا پسند نہیں کیا۔

اب رہا یہ سوال کہ ابتدا سے لے کر آب حیات کے سال تصنیف تک اُردو شعرا کے کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں۔ اس کا جواب بھی باوثوق دینا مشکل ہے۔ قدیم تذکرہ نگاروں نے تو خیر اس موضوع پر روشنی کے بجائے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارے جن بزرگوں نے اُردو شعرا کے بعض تذکروں پر مبسوط مقدمات لکھے ہیں ، انھوں نے بھی تذکرہ نگاری کی تاریخ یا توقیت کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس قسم کی اولیں فہرستیں ہمیں دراصل مستشرقین یعنی اشپرنگر اور گارسیں دتاسی کے یہاں ملتی ہیں۔ اشپرنگر کے یادگار شعرا ، مؤلفہ ۱۸۵۰ع مترجمہ طفیل احمد میں ماخذ کے طور پر بیس تذکروں کی فہرست تاریخ وار دی گئی ہے۔ لیکن اول یہ کہ اشپرنگر کی نظر سے بیس نہیں صرف چودہ تذکرے گزرے تھے دوسرے یہ کہ ان بیس میں بھی :

۱۔ ''گلدستۂ نشاط۔''[۱]

۲۔ ''چمن بے نظیر۔''[۲]

تذکرے نہیں بلکہ محض اردو فارسی اشعار کے مجموعے ہیں اور ان میں شعرا کے حالات درج نہیں ہیں۔

گارسیں کی فہرست تذکرات :

تذکروں کے سلسلے میں اس قسم کی فہرست ڈاکٹر اشپرنگر کے علاوہ

۱۔ ''گلدستۂ نشاط'' مؤلفۂ منو لال ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ع میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ۱۵۴ صفحات ہیں۔ آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کا نسخہ محفوظ ہے جس میں اردو اور فارسی کے اشعار درج ہیں۔

۲۔ چمن بے نظیر مؤلفہ محمد ابراہیم۔ یہ بھی مختلف شعرا کے اشعار کا مجموعہ ہے اور ۶۶/۱۲۶۵ھ ۴۹/۱۸۴۸ع میں بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص میں اس کے کئی مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔

فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی نے بھی دی ہے - دتاسی نے خود بھی ایک ضخیم تذکرہ ''تاریخ ادب ہندوستانی'' کے نام سے مرتّب کیا ، اس کی پہلی جلد ۱۸۳۹ع میں شائع ہوئی - لیکن پہلی جلد کے تکملے تک اسے سات قدیم تذکروں سے زیادہ کی خبر نہ تھی - سات میں بھی ایک ''گلدستۂ نشاط'' ہے - یہ تذکرہ نہیں صرف اشعار کا مجموعہ ہے - چنانچہ وہ ۴- دسمبر ۱۸۵۴ع کے خطبے میں لکھتا ہے :

''متواتر تحقیق اور تلاش سے مجھے سات تذکرے دستیاب ہوئے اور باوجود ناکافی سامان کے میں نے ہندوستانی ادب کی تاریخ لکھی جو اگرچہ ایک نامکمل تالیف ہے لیکن اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے اور سنہ ۱۸۳۹ع میں شائع ہو چکی ہے - اس کتاب کا ہندوستانی زبان میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے اور اس سے انگریز مستشرقین میں بھی اس زبان کے متعلق شوق پیدا ہو چلا ہے - ان کی اور میری تحقیقات نے مل کر بہت سے نئے تذکروں کا پتا چلایا - مگر میں ان سے زیادہ استفادہ نہ کر سکا کیونکہ ان میں متعدد تذکرے ایسے ہیں جو اب تک دستیاب نہیں ہوئے اور بعض کا پتا صرف اس طرح لگا کہ بعض مصنفین نے ان کا حوالہ اپنی کتابوں میں دیا ہے - ابھی بہت سے ایسے ہوں گے جن کا نام و نشان مجھے اب تک معلوم نہیں ہوا ہے -''[1]

گارسیں دتاسی نے بہت صحیح لکھا ہے ، اس وقت تک اکثر تذکرے دستیاب نہ ہوئے تھے لیکن جیسا کہ اس کے محولہ بالا خطبے سے ظاہر ہوتا ہے ، گارسیں نے متعدد تذکروں اور تاریخ ادب اردو کے کئی دوسرے مآخذ کا سراغ لگا لیا تھا - بقول مولوی عبد الحق گارسیں دتاسی نے اپنے اس خطبے میں کچھ اضافہ کر کے اسے ''ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف'' کے نام سے الگ کتابی صورت میں شائع کیا تھا[2] جسے مولوی عبد الحق نے گارسیں کے ۱۴ - دسمبر

۱- خطبات گارسیں دتاسی (۱۸۵۰ تا ۱۸۶۹ع) ، ص ۵۴ - ۵۵ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سنہ ۱۹۳۵ع -

۲- مقدمہ خطبات گارسیں دتاسی ، ص ب ، از مولوی عبد الحق مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۵ع -

۱۸۵۴ع کے خطبے میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی تلخیص سب سے پہلے محفوظ الحق نے اگست اور ستمبر ۱۹۲۲ع کے معارف میں پیش کی تھی بعد ازاں ڈاکٹر ریاض الحسن نے اس کی مکمل فہرست شائع کی۔ گارسیں کی تالیف ''ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف'' بقول ڈاکٹر ریاض الحسن تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اردو اور بعض ہندی تذکروں، شعری مجموعوں اور انتخابوں کی تفصیلات تھیں۔ دوسرے میں پہلے حصے کی تالیفات و تصنیفات کے مؤلفین و مصنفین کا تذکرہ تھا اور تیسرا حصہ ان کتابوں اور تصنیفوں کے ذکر پر مشتمل تھا جن کا سراغ دوسرے تذکروں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض الحسن کو گارسیں کی یہ کتاب روما یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیہ کے کتب خانے میں ملی تھی۔ اس کے حصۂ اول کا ترجمہ جس کا تعلق اردو شعرا کے تذکروں سے تھا انھوں نے شائع کر دیا ہے[1] لیکن تذکروں سے متعلق گارسیں کے رسالے کا اولین ترجمہ مولانا ذکاء اللہ نے کیا تھا اس کا ثبوت خود گارسیں کے مذکورہ بالا خطبے میں اس طور پر موجود ہے:

> ''مختصر احوال مصنفین ہندی کے تذکروں کا'' اس کا دوسرا نام ''رسالہ در باب تذکروں کا'' ہے۔ مؤلف اس کے ذکاء اللہ دہلوی ہیں۔ یہ رسالۂ ہذا کے پہلے اڈیشن کا محض ترجمہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔''[2]

لیکن مولانا ذکاء اللہ کا ترجمہ براہ راست نہیں تھا، ان سے پہلے کسی نے اسے فرانسیسی سے انگریزی میں منتقل کیا تھا جسے ذکاء اللہ نے اردو کا جامہ پہنایا چنانچہ ''رسالۂ تذکرات'' کے دیباچے میں مولانا ذکاء اللہ لکھتے ہیں۔

> ''اس کتاب میں ہندی اور اُردو تذکروں کا ذکر ہے اور ان کے مصنفین کا حال بہت تحقیق اور تدقیق سے لکھا ہے۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی۔ ایک صاحبِ کمال نے اس کے مضامینِ دل نشین کو ملاحظہ فرما کر انگریزی زبان میں ترجمہ کیا کیونکہ کتاب قابل اس کے تھی کہ ہندوستانی بھی اس سے مستفید ہوں اور اس کے مطالبِ عالی سے

۱- رسالۂ اُردو، بابت جنوری ۱۹۵۰ع، ص ۷۳-

۲- خطبات گارسیں دتاسی، ص ۱۰۹، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۵ع -

محروم نہ رہیں ۔''[1]

''رسالہ تذکرات کا ایک مطبوعہ نسخہ جو کہ مطبع مظہر العجائب سے باہتمام سرفراز حسین شائع ہوا ہے ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اردو سکشن میں موجود ہے ۔ اس کے حاشیے پر شاہ بشیر الدین بشیر کے ہاتھ کے نہایت کار آمد نوٹس ملتے ہیں ۔ اس کا سرورق چونکہ غائب ہے اس لیے سال اشاعت کا پتا نہیں چلتا ۔ پھر بھی اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ذکاء اللہ کا ترجمہ خزینۃ العلوم مؤلفہ درگا پرشاد نادر مطبوعہ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ع سے قبل شائع ہو چکا ہے ۔ اس لیے کہ ''اس ترجمے کا ذکر اس میں موجود ہے ۔ لیکن رسالہ تذکرات کی اصل گارسیں کا پانچواں خطبہ ہے ۔ اس خطبے میں گارسیں نے رسالہ کے مقابلے میں زیادہ مفصل بحث کی ہے اور زائد کتابوں کے نام لیے ہیں ۔

''رسالہ تذکرات'' مؤلفہ گارسیں دتاسی مترجمہ ذکاء اللہ نایاب تھا اب اسے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے دلی سے اپنے مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع کر دیا ہے ۔ اس سے انکار نہیں کہ گارسیں کا پانچواں خطبہ اور اس کا رسالہ جس کی تفصیلات ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے اس کے پانچویں خطبے میں شامل کر لی ہیں اور جس کا ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن بھی جنوری ۱۹۵۰ع کے رسالہ اردو میں شائع کر چکے ہیں ، تذکروں کے سلسلے میں خاصا معلوماتی ہے ۔ کسی قدیم تذکرے میں ان سے زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں ۔ ان میں گارسیں نے مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے :

۱۔ بھگت مالا ۔ ۲۔ نکات الشعرا ۔ ۳۔ سجن چرتر ۔ ۴۔ مجموعہ اشعار ۔ ۵۔ مجمع الانتخاب ۔ ۶۔ تذکرۂ گردیزی ۔ ۷۔ مخزن نکات ۔ ۸۔ مسرت افزا ۔ ۹۔ تذکرۂ شورش ۔ ۱۰۔ گلزار ابراہیم ۔ ۱۱۔ تذکرۂ مصحفی (ہندی گویاں) ۔ ۱۲۔ گلشن ہند ۔ ۱۳۔ تذکرۂ عشقی ۔ ۱۴۔ عمدۂ منتخبہ ۔ ۱۵۔ طبقات سخن ۔ ۱۶۔ دیوان جہاں ۔ ۱۷۔ عیار الشعرا ۔ ۱۸۔ گلشن بے خار ۔ ۱۹۔ گلستان بے خزاں ۔ ۲۰۔ گلدستہ نازنیناں ۔ ۲۱۔ انتخاب دواوین ۔ ۲۲۔ طبقات الشعرائے ہند ۲۳۔ گلدستہ نشاط ۔ ۲۴۔ مجموعہ واسوخت ۔ ۲۵۔ کوی پرکاش ۔ ۲۶۔ تذکرۂ

۱۔ ''رسالہ تذکرات'' ، ص ۱۶ ، ترجمہ مولانا ذکاء اللہ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی مطبوعہ دہلی ۔

میر حسن - ۲۷- تذکرۂ سودا - ۲۸- گلزار مضامین - ۲۹- گلدستۂ حیدری - ۳۰- تذکرۂ میر محمد علی ترمذی - ۳۱- تذکرۂ اختر - ۳۲- تذکرۂ عاشق - ۳۳- سرو آزاد - ۳۴- تذکرۃ الکاملین - ۳۵- تذکرۂ شوق (طبقات الشعرا) - ۳۶- تذکرۂ خاکسار - ۳۷- تذکرۂ محمد - ۳۸- تذکرۂ مضمون - ۳۹- تذکرۂ شیخ محمد ابراہیم ذوق - ۴۰- تذکرۂ جہاں دار - ۴۱- تذکرۂ امام بخش کشمیری - ۴۲- تذکرۃ النسأ (کریم الدین) - ۴۳- تذکرۃ الحکما اور تذکرۃ المفسرین - ۴۴- تذکرۃ المشاہیر - ۴۵- سبھا ولاس - ۴۶- انتخابِ مشتاق - ۴۷- چمن بےنظیر یا مجمع الشعرا - ۴۸- مجموعۂ دواوین - ۴۹- مجلس [مجالس] رنگین - ۵۰- گلدستۂ ہند - ۵۱- معیار الشعرا - ۵۲- انتخابِ میاں مقبول - ۵۳- مجموعۂ نغز - ۵۴- تذکرۂ آزردہ - ۵۵- دلہا رام کی نظمیں - ۵۶- وارتا بارتا - ۵۷- دو مجموعے - ۵۸- روضۃ الشعرا - ۵۹- گلدستۂ مسرت - ۶۰- تذکرۂ محمود -

جیسا کہ ''نگار'' ۶۴ع کے سالنامے میں راقم الحروف وضاحت کر چکا ہے، یہ ساری کتابیں تذکرے کے ذیل میں نہیں آتیں - یوں تو گارسیں نے ان کتابوں کے ذکر میں اکثر جگہ ان کے اصل نام، مصنفین کے نام، سال تصنیف و طباعت اور بعض دوسری تفصیلات میں غلطیاں کی ہیں، لیکن ان غلطیوں سے قطع نظر اس فہرست کتب میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں تذکروں کے ساتھ گلدستے، اشعار کے مجموعے، بیاضیں اور ہندی سے متعلق متعدد کتابیں شامل کر دی گئی ہیں - علاوہ ازیں گارسیں نے ایسے تذکروں کے نام بھی اس فہرست میں شامل کر لیے ہیں، جن کا وجود اب تک ثابت نہیں ہو سکا یا یہ کہہ لیں کہ یہ ہنوز غیر دستیاب ہیں - چنانچہ گارسیں نے جن کتابوں کا ذکر تذکروں کے تحت کیا ہے ان میں سے مندرجہ ذیل کو تذکروں کی فہرست سے خارج سمجھنا چاہیے:

۱- **بھگت مالا**، ''بھگت مال'': اس کتاب کا اردو شعرا سے کوئی تعلق نہیں ہے - اس کے بارے میں خود گارسیں نے لکھ دیا ہے کہ ''اس کتاب میں ہندوؤں کے وشنو اقوام کے گروہوں کا احوال ہے جنھوں نے مذہبی کویتیں بنائی ہیں -''

۲- **سجن چرتر**: اس کے متعلق بھی گارسیں نے رسالہ تذکرات ہی میں یہ صراحت کر دی ہے کہ یہ ہندی زبان میں ہے۔ سداسا کوی یا سداسا شاعر نے اسے تصنیف کیا ہے۔

۳- **گلدستۂ نشاط**: تذکرہ نہیں، اردو فارسی کے اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس کے مؤلف منو لال ہیں۔ آزاد لائبریری علی گڈھ میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ ۱۸۳۶ع کا مطبوعہ ہے۔

۴- **مجموعۂ واسوخت**: بقول گارسیں "۱۸۴۹ع مطابق ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوا ہے اور اس میں ۲۱ واسوخت شعرائے مختلف کے شامل ہیں"۔ اس کا مجموعۂ واسوخت مرتّبہ فدا علی عیش سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ عیش کا مرتّبہ "مجموعۂ واسوخت" ۱۲۸۵ھ میں پہلی بار مطبع نول کشور سے شائع ہوا ہے اور اس میں اکیس سے بہت زائد شعرا کے واسوخت ہیں۔

۵- **کوی پرکاش**: خود گارسیں نے لکھ دیا ہے کہ "ایک ہندی تذکرہ ہے اس میں عجیب و غریب کہانیاں ہیں"۔

۶- **تذکرۂ سودا**: بعض تذکروں میں ذکر ملتا ہے لیکن اب تک وجود ثابت نہیں ہو سکا۔

۷- **گلزار مضامین**: خود گارسیں کے مطابق مرزا جان طپش کی غزلوں اور اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس کے تذکرہ ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔

۸- **تذکرۂ میر محمد علی ترمذی**: گلزار ابراہیم اور طبقات الشعرائے ہند میں ذکر آیا ہے اب تک سراغ نہیں ملا۔

۹- **تذکرۂ عاشق**: مہدی علی عاشق کا مرتّبہ تذکرہ نہیں بلکہ گلدستۂ اشعار ہے۔ یہ بھی اب تک نایاب ہے۔

۱۰- **سرو آزاد**: اردو شعراء کا نہیں فارسی شعراء کا مشہور تذکرہ ہے۔ غلام علی آزاد بلگرامی کی تالیفات میں سے ہے۔

۱۱- **تذکرۃ الکاملین**: بابو رام چندر کے سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے بعض شعراء کا بھی ذکر ہے لیکن گارسیں نے خود ظاہر کر دیا ہے کہ یہ تذکرۃ الشعرا نہیں ہے۔

۱۲- تذکرۂ خاکسار: میر نے ذکر کیا ہے لیکن اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

۱۳- تذکرۂ محمد: گارسیں نے رسالہ تذکرات میں اس کے مصنف کا نام سید محمد خان بتایا ہے لیکن خطبات میں سید حافظ محمود خاں ظاہر کیا ہے۔ مجموعۂ نغز میں محمود خاں کا ذکر ملتا ہے لیکن تذکرہ کا ذکر نہیں ہے۔

۱۴- تذکرۂ مضمون: گارسیں کے مطابق امام الدین کا تخلص مضمون ہے، غلط معلوم ہوتا ہے۔ عشقی کے تذکرے میں مظلوم لکھا ہے۔ میر حسن کے تذکرے میں بھی امام الدین مظلوم کا ذکر آیا ہے اور ان کے تذکرے کا بھی ذکر ہے لیکن یہ ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔

۱۵- تذکرۂ ذوق: آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے ذوق کے تذکرے کا ذکر ضمناً کیا ہے۔ لیکن اس کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا اور نہ اس کے وجود کا اب تک سراغ لگ سکا ہے۔

۱۶- تذکرۂ جہاں دار: اس تذکرے کا وجود اب تک ثابت نہیں ہوا۔ مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں جہاندار کی ایک بیاض کا البتہ ذکر کیا ہے۔

۱۷- تذکرۂ امام بخش کشمیری: تذکرۂ ہندی میں مصحفی نے ذکر کیا ہے۔ امام بخش کشمیری کا کوئی تذکرہ اردو شعراء سے متعلق اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

۱۸- تذکرۃ النساء: اردو شاعرات کا تذکرہ نہیں بلکہ جیسا کہ خود گارسیں نے وضاحت کر دی ہے یہ کریم الدین کی تالیف ہے اور اس میں مختلف ملکوں کی شاعرہ و غیر شاعرہ مشہور عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۹- تذکرۃ الحکماء: اس نام کا کوئی تذکرہ جس کا تعاق شعرائے اردو سے ہو اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

۲۰- تذکرۃ المفسرین: اس نام کا بھی کوئی تذکرہ اب تک نہیں ملا۔ تذکرۃ الحکما اور تذکرۃ المفسرین کے مصنف کا نام گارسیں نے

سبحان بخش ظاہر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "فقط اپنی یاد سے کہتا ہوں کہ دو تذکرے ہیں" ۔ لیکن اردو شعراء سے متعلق ان ناموں کے تذکرے ہنوز نایاب ہیں ۔ ہاں طبقات الشعرائے ہند میں کریم الدین نے ان کتابوں کو سبحان بخش کی تالیفات بتایا ہے ۔

۲۱- تذکرۃ المشاہیر : ہنوز غیر دستیاب ہے ۔ مشاہیر کا تذکرہ ہو سکتا ہے لیکن شعرائے اردو سے مخصوص کسی تذکرے کا سراغ نہیں ملتا ۔

۲۲- سبھا ولاس : یہ کتاب ہندی زبان سے متعلق ہے ۔ اصلاً ہندی میں تھی ۔ انگریزی میں ترجمہ ہو کر اردو میں منتقل ہوئی ۔ اردو کے تذکرۃ الشعراء سے کوئی مناسبت نہیں ہے ۔

۲۳- نو رتن : گارسیں کی وضاحت کے مطابق اس کا تعلق بھی اردو شعراء سے نہیں ہے ۔ گارسیں نے رسالہ تذکرات میں اس کے مصنف کا نام عشق اور خطبات میں محمد بخش بتایا ہے ۔ ممکن ہے گارسیں کا اشارہ محمد بخش مہجور کی تالیف "نو رتن" کی طرف ہو ۔ یا پھر "نو رتن" مؤلفہ سید اشرف الدین احمد مراد ہو جس میں فارسی کے نو ممتاز شعرا کا انتخابِ کلام شامل ہے ۔ اس کا ایک پرانا مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے ۔

۲۴- انتخاب مشتاق : تذکرہ نہیں مشتاق کی بیاض اشعار رہی ہو گی ۔ مشتاق کا ذکر عمدۂ منتخبہ اور طبقات الشعرائے ہند میں اور گارسیں کے بیان کے مطابق شیفتہ ، عشق اور ڈاکٹر اشپرنگر نے بھی مشتاق کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن مشتاق کے تذکرے کا سراغ کسی نے نہیں دیا ۔ ہاں اشپرنگر کے یادگار شعرا میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے ہندوستان اور بنگال کے شعرا کے دواوین سے ایک انتخاب تیار کیا تھا ۔ یہ انتخاب بھی نایاب ہے ۔

۲۵- تذکرۂ محمود : رسالہ تذکرات میں گارسیں نے تذکرۂ محمد کا ذکر کیا ہے ۔ دسمبر ۱۹۵۴ع کے خطبے میں اسی کو تذکرۂ محمود ظاہر کیا ہے ۔ پچھلی سطور میں تذکرۂ محمد کی وضاحت کی جا چکی ہے ۔ تذکرۂ محمود کے نام کا کوئی تذکرہ ہنوز دستیاب نہیں ہوا ۔

۲۶- **صحفِ ابراہیم** : صاحب گلزار ابراہیم کی تالیف ہے - لیکن یہ اُردو شعرا کا نہیں فارسی شعرا کا تذکرہ ہے -

۲۷- **روضۃ الشعرا** : اُردو شعرا سے متعلق محمد حسین کلیم کی نظم ہے -

۲۸- **مجلس رنگین** : جسے مجالس رنگین کہنا چاہیے - سعادت یار خاں رنگین کی تصنیف ہے - اس میں انھوں نے اپنی سیاحتوں کا حال بیان کیا ہے - درمیان میں متعدد شعرا کا بھی ذکر آ گیا ہے لیکن تذکرۃ الشعرا سے اس کا کوئی تعلق نہیں -

۲۹- **معیار الشعرا** : تذکرہ نہیں گلدستہ ہے - یہ مہینے میں دوبار آگرہ سے نکلتا تھا -

۳۰- **گلدستۂ مسرت** : فارسی اشعار کا مجموعہ اور عبدالرحمٰن خاں شاکر کی تالیف ہے -

۳۱- **چمن بے نظیر** : اس کا دوسرا نام مجمع الا شعار بھی ہے - یہ تذکرہ نہیں بلکہ مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب ہے اور محمد ابراہیم موسیٰ کی تالیف ہے - انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں اس کے کئی نسخے مطبوعہ موجود ہیں -

۳۲- **انتخاب مقبول** : مجموعۂ نغز میں ذکر آیا ہے - قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ انعام اللہ خاں یقین کے پسر دوم میاں مقبول نبی المخاطب بہ مظہر الدین خاں نے مختلف شعرا کے کئی ہزار اشعار کا انتخاب کیا تھا لیکن وہ ناگہاں نذر آتش ہو گیا -

۳۳- **گلدستۂ ہند** : تذکرہ نہیں ہے - خود گارسیں نے رسالہ تذکرات میں لکھا ہے کہ اس میں قصے کہانیاں جمع کر دی گئی ہیں . . . آٹھ ابواب ہیں - ہر باب کا نام کتاب کی رعایت سے ''گلشن'' ہے - اکثر شعر اس کے قابل دیکھنے کے ہیں -

۳۴- **تذکرۂ اختر لکھنوی** : اُردو شعرا کا نہیں فارسی شعرا کا تذکرہ ہو سکتا ہے - گارسیں نے پانچویں خطبے میں اسے واجد علی شاہ اختر کی تالیف ظاہر کیا ہے - لیکن یہ صحیح نہیں ہے - غالباً گارسیں کی مراد ''آفتاب عالم تاب'' سے ہے لیکن یہ واجد علی شاہ اختر کی نہیں بلکہ قاضی محمد صادق اختر کی تالیف ہے اور اس کا تعلق

اُردو شعرا سے نہیں فارسی شعرا سے ہے ۔

۳۵- **مجموعۂ دواوین** : اس نام کا بھی کوئی تذکرہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ۔

۳۶- **گلدستۂ حیدری** : دراصل حیدری کی نظموں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے ۔ اس میں ایک باب ''گلشن ہند'' کے نام سے اُردو شعرا سے متعلق بھی ہے ۔ گویا ایک حصہ تذکرۃ الشعرا کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اسے ''گلشن ہند'' کے نام سے شائع کر دیا ہے اس کا تفصیلی ذکر الگ آئے گا ۔

۳۷- **دو مجموعے** : ان کے متعلق بھی گارسیں نے خطبے میں بتا دیا ہے کہ ہندی اشعار کے مجموعے ہیں اور کرنل بروٹن اور ترنی چرن نے مرتب کیے ہیں ۔

۳۸- **وارتا بارتا** : گارسیں کے بیان کے مطابق یہ ولبھ اور اس کے چیلوں کے عجیب و غریب قصوں پر مشتمل ہے ۔

۳۹- **دلہا رام کی نظمیں** : اس کا بھی اُردو شعرا کے تذکرے سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ غالباً مختلف افراد کے متعلق نظموں کا مجموعہ ہے ۔ گارسیں کے مطابق اس میں رام فرقے کے سنیاسیوں کا بیان بہت عظمت و کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کا بھی ذکر آیا ہے ۔

اُردو تذکروں سے متعلق کام کا جائزہ :

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گارسیں نے اپنے پانچویں خطبے اور رسالہ تذکرات میں جن ماخذوں کا ذکر کیا ہے اور جن کے ترجمے اور خلاصے محفوظ الحق اور ڈاکٹر ریاض الحسن نے معارف اگست ۱۹۲۲ع اور اُردو بابت اکتوبر ۱۹۵۰ع میں شائع کیے ہیں ، ان میں سے بیشتر پر تذکروں کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے متعدد کا وجود بھی مشتبہ ہے ۔

ہر چند کہ گارسیں دتاسی نے تذکروں کی فہرست دینے سے پہلے اس بات کا اظہار کر دیا تھا کہ :

''میں آئندہ صفحات میں ان تذکروں اور گلدستوں کی فہرست دوں گا

جو یا تو ہمیں دستیاب ہوئے ہیں یا کم از کم ہمیں ان کا پتا چل سکا۔"

لیکن افسوس ! اس کے مترجمین ، ترجمہ کرتے وقت اس بات کی نشان دہی نہ کر سکے کہ اس کی فہرست میں کس کس قسم کی کتابیں شامل ہیں ۔ ان میں کتنے گلدستے ہیں ، کتنے تذکرے مفقود ہیں اور کتنے دستیاب ؟ حیرت ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب بھی اس سلسلے میں بعض باتیں غیر ذمہ دارانہ کہہ گئے ہیں ۔ مثلاً محمد محفوظ الحق صاحب کے مذکورہ بالا مضمون پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ :

۱۔ گلستان سخن کے متعلق دہلی کے معتبر اصحاب کا بیان ہے کہ یہ دراصل صہبائی کی تالیف ہے ۔

۲۔ کسی تذکرے میں مجھے سید ابوالقاسم قاسم دہلوی کا نام نہ ملا ۔ دہلی کے مشہور حکیم قدرت اللہ قاسم نے البتہ تذکرہ لکھا تھا ۔

۳۔ صحف ابراہیم اور گلزار ابراہیم میری رائے میں ایک ہی تذکرے کے دو نام ہیں ۔"[۱]

یہ تینوں باتیں محل نظر ہیں ۔ گلستان سخن ، صہبائی کا نہیں قادر بخش صابر ہی کی تصنیف ہے ۔ اس کی تفصیل گلستان سخن کے ذکر میں آئے گی ۔ ابوالقاسم دراصل قدرت اللہ ہی کے نام کا جزو ہے اور "مجموعۂ نغز" انھیں کی تالیف ہے ۔ صحف ابراہیم اور گلزار ابراہیم ایک ہی تذکرے کے دو نام نہیں بلکہ دو مختلف تذکرے ہیں ۔ پہلا فارسی شعرا سے متعلق ہے اور دوسرا ریختہ گو شعرا سے ۔

غرض کہ یہ حضرات گارسیں دتاسی کی مذکورہ کتابوں کی نوعیت کا پورا تعین نہ کر سکے اور بعد کے مقالہ نگاروں نے گارسیں کی فہرست کو تذکروں کی فہرست سمجھ لیا اور ان کے ہاتھوں مختلف ادبی تاریخوں اور مقالوں میں تذکروں کے سنین اور کیفیات کے متعلق ایسی غلط سلط اطلاعات درج ہو گئیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا اس جگہ بہت مشکل ہے ۔ گارسیں کی فہرست اس لیے تشنہ رہ گئی تھی کہ اسے کبھی ہندوستان آنے کا موقع نہ ملا اور وہ یورپ ہی میں بیٹھ کر خطوط ، اخبارات ، سرکاری رپورٹوں اور رسائل کے ذریعے اپنی کتاب کے لیے مواد

۱۔ "معارف" اعظم گڑھ ، ص ۳۹۵ ، بابت نومبر ۱۹۲۲ع ۔

جمع کرتا رہا ۔ محفوظ الحق صاحب کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ :

''اُردو ادب و تاریخ کا یہ مشہور ماہر عرصے تک ہندوستان کی گلگشت کرتا رہا اور جب فرانس واپس گیا تو اس کا دامن یہاں کے پھولوں سے بھرا تھا ۔''

تذکروں کی تعداد اور توقیت کے بارے میں ایک طویل مضمون حکیم شمس اللہ قادری کا بھی ہماری نظر سے گزرا جس کے آغاز میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ :

''ذیل میں بیالیس تذکروں کی فہرست درج ہے ، اس کو تاریخی اعتبار سے عہدوار مرتّب کیا گیا ہے ۔ اس میں اکثر تذکرے ایسے ہیں جو چھپ گئے ہیں اور عام طور پر ملتے ہیں اور اگر نہیں چھپے ہیں تو اُن کے مخطوطے بڑے کتب خانوں میں بلا دقّت دستیاب ہو جاتے ہیں ۔ ان کے علاوہ چند ایسے تذکروں کے نام بھی ان میں شامل ہیں جن میں مصنف اور عہدِ تصنیف کا حال دوسرے تذکروں سے معلوم ہوا ۔ لیکن ان کی نسبت یہ دریافت نہ ہو سکا کہ آیا مفقود ہو چکے ہیں یا موجود ہیں اور اگر موجود ہیں تو ان کے مخطوطے کہاں ہیں ۔''[1]

حکیم صاحب نے بھی تذکروں کے سن تالیف اور نام کے سلسلے میں اکثر اسی قسم کی غلطیاں کی ہیں جو گارسیں کی فہرست میں ملتی ہیں اور صاف پتا چلتا ہے کہ اُنھوں نے ضرور گارسیں کی فہرست کو سامنے رکھا ہے ۔ چنانچہ اپنی فہرست میں اُنھوں نے

۱۔ تذکرۂ محمد علی ترمذی ،

۲۔ تذکرۂ مسرور ،

۳۔ گلشن ناز ، مؤلفہٗ درگا پرشاد ،

کو بھی شامل کیا ہے ۔ پہلے دو تذکرے اب تک نایاب ہیں ، صرف ان کا ذکر ملتا ہے ، اس لیے ان کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ۔ تیسرے کے متعلق وہ

۱۔ تاریخ ادبیاتِ اُردو کے قابل استناد مصادر ، ص ۳۹۰ ، مطبوعہ ''ہندوستانی'' الہ آباد ، بابت اکتوبر ۱۹۴۰ع ۔

لکھتے ہیں کہ :

"گلشن ناز تالیف درگا پرشاد نادر دہلوی فارسی اُردو شاعروں کا تذکرہ ہے"۔

یہ بھی خیال درست نہیں ۔ "گلشن ناز" صرف فارسی شاعرات کا تذکرہ ہے اور ۱۲۹۳ھ میں مکمل ہوا ہے ۔ نادر کے اُردو تذکرے کا نام "چمن انداز" ہے جو ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۶ع میں شائع ہوا ہے ۔

حکیم شمس اللہ قادری صاحب کی فہرست میں متعدد ادبی تاریخ و تالیفات مثلاً جلوۂ خضر ، آثار الشعرائے ہنود ، محبوب الزمن ، آب بقا ، گل رعنا ، جواہر سخن ، اور بہار سخن وغیرہ اس قسم کی ہیں جو آب حیات مؤلفہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ع کے بعد کی تصانیف ہیں اور اگر اس قسم کی ساری کتابوں کو تذکروں کے باب میں درج کیا جائے تو ان کی تعداد بیالیس نہیں بلکہ کئی سو ہو جائے گی ، اس لیے کہ صرف نکات الشعرا اور آب حیات کے درمیانی عرصے میں لکھے ہوئے دستیاب تذکروں کی تعداد ستر کے قریب ہے ۔

تذکروں پر عموعی تبصرے کے طور پر "دنیائے تذکرہ" کے نام سے افسر امروہوی صاحب کا بھی ایک مضمون نظر سے گزرا ۔ اس مضمون میں اُردو فارسی شعرا کے تذکروں ، گلدستوں ، بیاضوں ، شعری مجموعوں اور سوانحی و تاریخی کتابوں پر ملا جلا سرسری تبصرہ کیا گیا ہے ۔ لیکن اس میں نہ کوئی تاریخی ترتیب یا توقیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور نہ تذکرہ نگاری کے ادوار یا عہد متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا سے لے کر ۱۹۳۷ع تک کی ایسی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کے نام اس میں آ گئے ہیں جو فارسی یا اُردو ادب سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتی ہیں ۔ بلکہ اس مضمون سے بعض ایسی کتابوں کا سراغ بھی مل جاتا ہے جو مضمون کی اشاعت کے وقت زیر ترتیب یا تکمیل تھیں مثلاً اس مضمون میں مذکور ہے کہ :

۱- ۱۹۳۶ع میں مولوی محمود احمد بی اے عباسی امروہوی نے "تاریخ امروہہ" چار جلدوں میں لکھی جس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں ۔ چوتھی جلد جس میں شعرائے امروہہ کا ذکر ہوگا زیر ترتیب ہے" ۔

۲- اسی نوع کا ایک تذکرہ راقم الحروف نے "فروغ وطن" کے نام سے شیخ مصحفی اور ان کے تلامذہ کے حالات میں ترتیب دیا ہے جس

میں ان کے صاحبِ دیوان شاگرد کے لیے ایک جلد مقرر کی ہے۔
مکمل کتاب کی بیس جلدیں ہیں اور ابھی تک قلمی صورت میں ہیں۔

۳- ۱۹۳۶ء میں راقم الحروف نے اُردو شعرائے سندھ کے حالات، ''اُردو ادب میں سندھ کا حصہ'' کے نام سے جمع کیے جو تکمیل کو نہ پہنچنے کے باعث ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے۔

۴- ۱۳۵۱ھ میں راقم الحروف نے ''اندوختہ گریبان'' کے نام سے ایک تذکرہ ترتیب دیا۔ یہ تذکرہ بھی بعض وجوہ سے اب تک طبع نہ ہو سکا۔''

۵- ۱۹۳۲ء میں عزیزی سید ارشاد حسین شاد صابری امیٹھوی نے موجودہ شعرائے کراچی کے حالات بڑی کاوش سے جمع کیے۔ اس تذکرے کا نام ''دربار سخن'' ہے اور اب تک طبع نہیں ہوا۔''[1]

ظاہر ہے کہ معلومات عامہ کے لحاظ سے یہ مضمون بہت کارآمد ہے اور یقین ہے کہ اب سے ۳۴ - ۳۵ سال پہلے جب یہ شائع ہوا ہوگا تو معرکہ کی چیز خیال کیا گیا ہوگا۔ اس لیے کہ اس وقت تک اُردو تذکرہ نگاری پر کچھ زیادہ کام نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج جب کہ متعدد قدیم تذکرے تحقیقی مقدموں کے ساتھ منظر عام پر آ گئے ہیں، یہ مضمون چنداں مفید نہیں رہا۔ علاوہ ازیں افسر صاحب نے اس میں زیادہ تر بیسویں صدی عیسوی کی ان تالیفات کا ذکر کیا ہے جو عموماً دستیاب ہیں اور جنھیں عہد تذکرہ نگاری کے بعد کی چیز خیال کرنا چاہیے۔ جہاں تک قدیم تذکروں کا تعلق ہے، نکات الشعرا سے لے کر آب حیات تک کے اہم دستیاب تذکروں میں سے صرف دس بارہ تذکروں کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے۔

اُردو شعرا کے تذکروں کے سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' مطبوعہ رسالہ اُردو ۱۹۴۲ء[2] البتہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں پہلی بار تذکرہ نگاری کے فن اور اُردو شعرا کے تذکروں کی اہمیت پر مدلل بحث کی گئی ہے اور اُردو میں تذکرہ نگاری کا عہد متعین کیا گیا ہے۔

۱- ''دنیائے تذکرہ'' مطبوعہ سالنامہ ادب لطیف (لاہور) ۱۹۳۷ء۔
۲- بعد میں یہی مضمون کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۵۲ء۔

چنانچہ اس میں میر سے لے کر آزاد تک تقریباً پچیس دستیاب اور موجود تذکروں کے نام آئے ہیں ۔ ان میں سے عمدۂ منتخبہ ، عیار الشعرا ، تذکرۂ شورش ، تذکرۂ حیرت اور تذکرۂ خاکسار مقالہ نگار کی نظر سے نہیں گزرے جیسا کہ خود صاحب مقالہ نے اس کا اعتراف کیا ہے ۔

تذکرۂ خاکسار تو مفقود ہے لیکن "تذکرۂ حیرت" مؤلفہ ۱۱۷۴ھ کو اُردو شعرا کے تذکروں میں شمار کرنا مناسب نہیں ، اس لیے کہ یہ در اصل فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جسے قیام الدین حیرت نے "مقالات الشعرا" کے نام سے ۱۱۷۴ھ میں مرتب کیا تھا ۔ گارسیں دتاسی اور اشپرنگر نے اسے غلطی سے اردو شعرا کا تذکرہ سمجھ لیا ہے ۔ اس طرح پچیس میں سے صرف بیس قدیم تذکرے ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالے میں زیر بحث آئے ہیں اور ان کی تنقیدی و سوانحی اہمیت تفصیل سے واضح کی گئی ہے ۔

اُردو تذکرہ نگاری کے تعارف کے باب میں "دستور الفصاحت"[1] کے مرتّب مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مقدمہ خصوصاً قابل ذکر ہے ۔ اس میں عرشی صاحب نے نکات الشعرا سے لے کر آب حیات تک تقریباً پچیس ایسے تذکروں کا تعارف کرایا ہے جن سے موصوف نے کتاب مذکور کے حاشیوں کی ترتیب میں مدد لی ہے ۔

اب تک تذکروں کے سلسلے میں جن مضامین کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیس پچیس سال پہلے کے لکھے ہوئے ہیں ۔ اس کے بعد بعض تذکروں کے مرتّبین و مترجمین کے مقدمات بھی دیکھنے میں آئے ہیں ۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتے ۔ مثلاً لکھنؤ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ایم ۔ کے ۔ فاطمی صاحب نے پچھلے تین سال میں مقدمات و حواشی کے ساتھ بعض تذکروں کے اُردو ترجمے اور بعض تذکروں پر تفصیلی مضامین کتابی صورت میں شائع کیے ہیں ۔ لیکن ان کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ پندرہ بیس کے سوا دوسرے قدیم تذکرے ان کی نظر سے نہیں گزرے ۔[2]

۱۔ دستور الفصاحت ، مرتّبہ امتیاز علی خان عرشی ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔
۲۔ ملاحظہ ہو اُردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت ، ص ۳۷ ، مطبوعہ دانش محل امین آباد لکھنؤ ۔

نگار کا سالنامہ "تذکروں کا تذکرہ نمبر" اور اس کے اثرات :

مختصر یہ کہ اُردو تذکروں سے متعلق جن کتب و مقالات کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں سے کسی میں بھی بیس پچیس قدیم تذکروں سے زاید کا ذکر نہیں آیا حالانکہ نکات الشعرا ١١٦٥ھ مطابق ١٧٥٢ع سے لے کر آب حیات ١٢٩٧ھ مطابق ١٨٨٠ع تک اس سے کئی گنا زاید تذکروں کے حوالے مختلف جگہ نظر آتے ہیں - اس کمی کو پورا کرنے اور تذکروں کی جانب اہلِ علم کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے راقم الحروف نے نگار ١٩٦٤ع کے سالنامے کو تذکروں کے لیے وقف کیا تھا اور اس میں تذکرہ نگاری کے فن اور ارتقا پر بحث کرتے ہوئے ١١٦٥ھ/١٧٥٢ع سے ١٢٩٧ھ/١٨٨٠ع تک اُردو شعرا کے ٥٤ تذکروں کا تعارف کرایا تھا - اس نمبر کی نوعیت کا مفصل ذکر میں نے اس کتاب کے دیباچے میں کیا ہے - مجھے اعتراف ہے کہ نگار کے سالنامے میں بہت سی کمزوریاں تھیں - اس کے باوجود چونکہ یہ اردو فارسی میں تذکرہ نگاری کے متعلق اپنی نوعیت کا پہلا تفصیلی کام تھا اس لیے اسے سارے علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اس کی اشاعت کا نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتا تھا - یعنی ہمارے محققین و ناقدین نے اُردو کے اُس قیمتی ذخیرے کی جانب توجہ کی جو کتب خانوں میں پڑے پڑے ضائع ہو رہا تھا - نگار کے سالنامے سے پہلے عموماً لوگوں کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ اُردو شعرا کے تذکرے تقریباً کتنے ہیں، کہاں کہاں ہیں، ان کی کیا نوعیت ہے، کون کون سے فارسی میں ہیں اور کون کون سے اُردو میں، کتنے شائع ہو چکے ہیں اور کتنے غیر مطبوعہ ہیں؟ نگار کے ذریعے جب یہ اطلاعات ان کے سامنے آئیں تو یہی تذکرے جن پر گفتگو کرنا اور کچھ لکھنا غیر ضروری سمجھا جاتا تھا تحقیق و تنقید کا اہم موضوع بن گئے - جتنا کام تذکروں کے متعلق ہوا ہے کسی اور موضوع پر نہیں ہوا - ادارے اور افراد سبھی نے تذکروں سے دلچسپی کا اظہار کیا اور متعدد قلمی و نایاب تذکرے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گئے -

مقالات کے علاوہ کتابی صورت میں جو چیزیں گذشتہ چھ سات سال میں سامنے آئیں ان میں حسب ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :

تذکروں سے عام دلچسپی کا آغاز اور تحقیقی و تنقیدی کام کی رفتار :

۱- ''گلشن سخن'' : مؤلفہ مبتلا لکھنوی پروفیسر مسعود رضوی کے مقدمے اور تحشیے کے ساتھ ۱۹۶۵ع میں پہلی بار انجمن ترقی اُردو ہند (علی گڑھ) سے شائع ہوا -

۲- ''گلشن ہند'' مؤلفہ حیدر بخش حیدری کو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے مرتّب کیا - پہلے رسالہ اُردو علی گڑھ بابت ۱۹۶۷ع میں شائع ہوا پھر یہی علمی مجلس دہلی کے زیر اہتمام کتابی صورت میں منظر عام پر آیا -

۳- ''طبقات الشعرا'' : مؤلفہ قدرت اللہ شوق مرتبہ نثار احمد فاروقی مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۶۸ع میں شائع ہوا -

۴- ''سراپا سخن'' : مؤلفہ محسن علی مطبوعہ تھا لیکن نایاب تھا- اس کی ایک تلخیص ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے ۱۹۶۷ع میں نایاب بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کی - دوسری تلخیص ڈاکٹر اقتدا حسن کے ہاتھوں ۱۹۷۰ع میں اظہار سنز لاہور کی معرفت منظر عام پر آئی -

۵- ''گلستان سخن'' : مؤلفہ قادر بخش صابر بھی نایاب تھا - خلیل الرحمٰن داؤدی نے اسے دو جلدوں میں مرتّب کیا - ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمہ لکھا اور مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۶ع میں شائع کیا -

۶- ''بہارستان ناز'' : مؤلفہ فصیح الدین رنج مطبوعہ تھا لیکن بہت کمیاب - اس لیے اِس کو بھی ۱۹۶۵ع میں خلیل الرحمٰن داؤدی کے مقدمہ اور حاشیوں کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور ہی نے شائع کیا -

۷- ''گلشن ہمیشہ بہار'' - مؤلفہ نصر اللہ خاں خیشگی مرتّبہ ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۹۶۷ع میں انجمن ترقی اُردو کراچی کے زیر اہتمام دوبارہ شائع ہوا -

۸- ''مسرت افزا'' : مؤلفہ ابوالحسن کو قاضی عبدالودود معاصر میں بالاقساط شائع کر چکے تھے - ڈاکٹر مجیب قریشی نے علمی مجلس دلی سے اسے اُردو میں ترجمہ کر کے مفید مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۸ع میں شائع کیا - اسی سال اس کی تلخیص مع ترجمہ پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی کے ہاتھوں پٹنہ سے منظر عام پر آئی -

۹- ''بہار بے خزاں'' : مؤلفہ احمد حسن سحر غیر مطبوعہ تھا ڈاکٹر

نعیم احمد نے مرتب کیا اور مقدمہ لکھا ، علمی مجلس دلی نے ۱۹۶۸ع میں شائع کیا ۔

۱۰- ''رسالۂ تذکرات'' : مؤلفہ گارسیں دتاسی مترجمۂ ذکاء اللہ نایاب تھا ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اسے ضروری مقدمہ اور حاشیہ کے ساتھ ۱۹۶۷ع میں مجلس اشاعت کلاسیکی ادب دلی سے شائع کر دیا ہے ۔

۱۱- ''تین تذکرے'' : مصنفہ نثار احمد فاروقی ۱۹۶۸ع میں مکتبۂ برہان ، اُردو بازار دہلی سے شائع ہوئی ۔ اس میں طبقات سخن مؤلفہ مبتلا میرٹھی ، مجمع الانتخاب مؤلفہ کمال اور گل رعنا (فارسی تذکرہ) مؤلفہ لچھمی نرائن شفیق کی تلخیص ضروری مقدمات کے ساتھ اکٹھا شائع کی گئی ہیں ۔

۱۲- ''نسخۂ دلکشا'' : مؤلفہ ارمان کا پہلا حصہ مطبوعہ تھا دوسرا حصہ مخطوطے کی صورت میں تھا ۔ اس کے تراجم مالک رام نے اشعار محذوف کر کے ''تحریر'' دہلی بابت اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۶۹ع میں شائع کر دیے ہیں ۔

۱۳- ''گلزار ابراہیم'' : مطبوعہ تھا ۔ اس کی تلخیص یعنی اشعار چھوڑ کر اس کے تراجم کا اُردو ترجمہ ''گلشن سخن'' کی اُردو تلخیص کے ساتھ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ سے ۱۹۶۸ع میں پروفیسر عطا الرحمٰن کاکوی نے شائع کر دیا ہے ۔

۱۴- ''قطعۂ منتخب'' : مؤلفہ عبدالغفور نساخ ۱۸۷۴ع میں نول کشور لکھنؤ سے چھپا تھا ، بہت دنوں سے نایاب تھا ۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر نے رسالہ اُردو کراچی بابت ستمبر ۱۹۶۸ع اور دسمبر ۱۹۶۸ع میں بالاقساط شائع کر دیا ہے ۔

۱۵- ''مخزن نکات'' : مؤلفہ قائم ۔ سب سے پہلے مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے ۱۹۲۹ع میں شائع ہوا تھا ۔ دوبارہ اسے ۱۹۶۶ع میں اقتدا حسن کے مقدمہ کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ۔ ۱۹۶۸ع میں عطا کاکوی نے اس کی تلخیص مع اُردو ترجمہ پٹنہ سے شائع کی ۔

۱۶- ''ریاض الفردوس'' : مؤلفہ محمد حسین خاں شاہجہان پوری کو مرتضیٰ

حسین فاضل نے اپنے مقدمے اور حواشی کے ساتھ ۱۹۶۸ع میں شیخ مبارک علی لاہور کے زیر اہتمام شائع کیا۔

۱۷- ''عروس الاذکار'': مؤلفہ نصیر الدین احمد نقش کو افسر امروہوی نے مرتّب کر دیا ہے اور مقدمہ و حواشی بھی لکھ دیے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کراچی کی جانب سے بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔

۱۸- ''تین تذکرے'': پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے میر، قائم اور فتح علی حسینی کے تذکروں کے تراجم کا اُردو ترجمہ کچھ اشعار کو محذوف کرکے عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ سے ۱۹۶۸ع میں شائع کیا۔

۱۹- ''خوش معرکۂ زیبا'': مؤلفۂ سعادت خان ناصر بہت اہم تذکرہ ہے۔ غیر مطبوعہ تھا۔ خواجہ مشفق نے اسے تین جلدوں میں بسیط مقدمہ اور تفصیلی حواشی و تعلیقات کے ساتھ مرتّب کیا ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام اس کی پہلی جلد ۱۹۷۰ع میں شائع ہوچکی ہے، دو جلدیں آنے والی ہیں۔ علاوہ ازیں سید محمد شمیم احمد ''خوش معرکۂ زیبا'' پر تحقیقی کام کرکے لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ پروفیسر عطا الرحمٰن کاکوی نے پٹنہ سے اس کا خلاصہ بھی شائع کر دیا ہے۔

۲۰- ''تذکروں کے خلاصے'': عطاء الرحمٰن کاکوی نے کئی تذکروں کے ترجمے اور خلاصے شائع کیے ہیں۔ بعض کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ ان کے علاوہ بزم سخن مؤلفہ علی حسن خان سلیم اور ''طور کلیم'' مؤلفہ سید نور الحسن کلیم، ''چمنستان شعرا'' مؤلفہ لچھمی نرائن شفیق، ''طبقات الشعرائے ہند'' مؤلفہ کریم الدین کے حصّۂ سوم اور چہارم کے ترجمے اور خلاصے بھی انھوں نے ۱۹۶۷ع اور ۱۹۶۸ع کے درمیان شائع کیے ہیں۔

۲۱- ''مقالات'': متعدد تحقیقی مقالات بھی گذشتہ چھ سال کے اندر تذکروں کے بارے میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ تذکروں کی جانب اہل علم پوری طرح متوجہ ہیں اور ہر قدیم تذکرے کو مفید مقدمہ اور حواشی کے ساتھ منظر عام پر لانے کی کوشش جاری ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے نکات الشعرا سے لے کر گلشن بے خار تک تذکرہ نگاری کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لے کر وکرم یونیورسٹی ہندوستان سے

پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ۔ ان کا مقالہ ابھی شائع نہیں ہوا ۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نگار کے سالنامے ۱۹۶۴ع کے بعد تذکروں کے سلسلے میں خاص طور پر کام ہوا ہے ۔ لوگوں نے اپنے ذوق و شوق سے بھی تذکروں کی ترتیب و تدوین میں دلچسپی لی ہے اور دوسرے علمی و ادبی اداروں کے ساتھ ساتھ جامعات نے بھی تذکروں کو تحقیق و تنقید کا موضوع بنانے اور انھیں نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے ۔ اُردو ہی نہیں فارسی شعرا کے تذکروں کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے ۔ فارسی کے کئی تذکرے عمدہ تدوین اور قیمتی مقدمات کے ساتھ شائع کیے گئے ہیں لیکن ان کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ یہ اس کتاب کا موضوع ہے ، اس لیے صرفِ نظر کیا جاتا ہے ۔ فارسی شعرا کے تذکروں کے سلسلے کی بعض کڑیوں کا ذکر البتہ نامناسب نہ ہوگا ۔ میری مراد ڈاکٹر علی رضا نقوی اور احمد گلچین معانی کی تالیفات سے ہے ۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی نے ''تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان'' عنوان سے شعرا کے فارسی کے تذکروں کا جائزہ لیا ۔ ان کی کتاب تہران سے ۱۹۶۴ع میں شائع ہو چکی ہے ۔ احمد گلچین معانی کی دو کتابیں ایک ''فرہنگ سخنوران فارسی'' دوسری ''تاریخ تذکرہ ہائے فارسی'' بھی منظر عام پر آ چکی ہیں ۔

میں نے زیر نظر کتاب کی تالیف میں ، تذکروں کے سلسلے میں جو نمایاں کام بھی نگار سالنامہ ۱۹۶۴ع کے بعد ہوا ہے ، اس پر حتی الوسع نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے ، اور جو تذکرے پہلے نظر انداز ہو گئے تھے ان کی تفصیلات بھی کتاب میں شامل کر لی ہیں ۔ چنانچہ نگار کے تذکروں کے تذکرہ نمبر میں شعرائے اُردو کے تذکروں کی تعداد صرف ۴۵ ظاہر کی گئی تھی ۔ لیکن اس کتاب میں ٦٧ تذکروں پر مفصل مضامین شامل ہیں ۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ نکات الشعرا سے لے کر آب حیات تک اُردو شعرا کے تذکروں کی تعداد یہی ہے ۔ میری رسائی صرف ٦٧ تذکروں تک ہو سکی ہے ۔ کچھ اور تذکرے منظر عام پر آئیں گے اس لیے کہ متعدد تذکروں کے نام مختلف جگہ ملتے ہیں اور بعض نے تو ان کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا وہ ان کی نظر سے گزرے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ جن تذکروں کو ہم گم شدہ یا تلف شدہ خیال کرتے ہیں وہ کسی گوشے میں پڑے ہوں اور کسی وقت دستیاب ہو جائیں ۔

اُردو تذکروں کی تقسیم :

فارسی تذکروں کی طرح اُردو تذکروں میں بھی بڑی رنگا رنگی ہے - بظاہر وہ ایک ہی غرض سے لکھے گئے ہیں - بہ حیثیت مجموعی ان کا تنقیدی اسلوب اور تحسینی لب و لہجہ بھی ایک سا ہے - یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں بعض ایک دوسرے کے جواب یا تقلید میں لکھے گئے ہیں - بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض نے دوسرے تذکروں کا مواد بہ ادنیٰ تغیّر اپنا لیا ہے - اس کے باوجود ان تذکروں میں اُکتا دینے والی یکسانگی و یک رنگی نہیں ہے - مؤلف کے مزاج، تبحر علمی، انداز تحریر، علاقہ، ماحول، عہد اور مقامیت کا انفرادی رنگ ان تذکروں میں کم و بیش نظر آتا ہے، اس لیے ان تذکروں میں یکسانگی کے باوجود حدِ فاصل قائم کرنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا - چنانچہ ان کی ہیئت و موضوع کو نظر میں رکھ کر ہمارے ناقدین نے انھیں مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے -

محی الدین قادری زور مرحوم نے مصنفین کی نوعیت کا لحاظ رکھ کر تذکروں کی تین خاص قسمیں کی ہیں -

۱- وہ جو کسی بڑے شاعر کے نتیجۂ قلم ہیں -

۲- وہ جن کے مصنف خود بڑے شاعر نہیں لیکن بڑے شاعر کے گرویدہ شاگرد تھے -

۳- وہ جن کے مصنفین کو سخن گو نہیں بلکہ سخن فہم کہنا چاہیے -

پہلی قسم کے تذکروں میں عموماً بڑے شاعروں کا ذکر ہے - چھوٹے شاعروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور سوانح سے زیادہ کلام پر رائے دینے کی کوشش کی گئی ہے - دوسری قسم کے تذکروں میں عام خاص سب کا ذکر ہوتا ہے - لیکن اپنے استاد احباب اور اعزا کے بیان میں طرف داری سے کام لیا جاتا ہے اور مخالفین کی تنقیص کی گئی ہے - تیسری قسم کے تذکروں کی تعداد کم ہے لیکن شاعر کا اصلی مرتبہ معلوم کرنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے -"[۱]

گارسیں دتاسی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور شمس اللہ قادری وغیرہ نے

۱- "مقدمہ" گلزار ابراہیم، ص ۳۱، ۳۲، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۴ع -

ان تذکروں کو ان کے مواد کے اعتبار سے صرف دو خانوں میں تقسیم کیا ہے :

(الف) عام تذکرے جن میں ابتدا سے لے کر معاصرین تک کے حالات ردیف وار یا بلحاظ ادوار جمع کیے جاتے ہیں -

(ب) خاص تذکرے جن میں کسی خاص عہد کے شعرا یا خاص صنف کے شعرا یا کسی خاص علاقے کے شاعروں کا ذکر ہوتا ہے -

لیکن بعض مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے میں تذکروں کی مختلف خصوصیات کے اعتبار سے ذیل کی سات قسمیں کی ہیں -

اول : وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات جمع کیے گئے ہیں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے -

دوم : وہ تذکرے جن میں تمام قابل ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت و استیعاب ہے -

سوم : وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعرائے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخاب پیش کرنا ہے اور حالات جمع کرنے کی طرف زیادہ اعتنا نہیں - بیاضیں اور مجموعے اس صنف میں شامل ہیں -

چہارم : وہ تذکرے جن میں اُردو شاعروں کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقا دکھانا ہے -

پنجم : وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں -

ششم : وہ تذکرے جو کسی وطنی یا ادبی گروہ کے نمایندے ہیں -

ہفتم : وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقید سخن اور اصلاح سخن ہے -[1]

یہ تقسیمیں اپنی اپنی جگہ مناسب ہیں - بلکہ ان سے زاید خانوں میں بھی انہیں بانٹا جا سکتا ہے - مثلاً گارسیں کے تذکرے کو چھوڑ کر اُردو تذکروں کے دو گروہ بلحاظ زبان بھی کیے جا سکتے ہیں :

١- وہ تذکرے جو فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں مثلاً نکات الشعرا ،

١- ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' از ڈاکٹر سید عبداللہ مطبوعہ رسالہ اُردو بابت جولائی ١٩٤٢ع -

گلشن گفتار ، تحفۃ الشعرا ، مخزن شعرا ، عیار الشعرا ، ریختہ گویاں ، مخزن نکات ، چمنستان شعرا ، تذکرۃ الشعرا ، تذکرۂ ہندی گویاں ، ریاض الفصحا ، گلزار ابراہیم اور گلشن بے خار وغیرہ ۔

۲۔ وہ تذکرے جو اردو میں لکھے گئے ہیں مثلاً گلشنِ ہند ، گلدستۂ نازنیناں ، طبقات الشعرائے ہند ، انتخابِ دواوین ، انتخابِ یادگار ، شمیم سخن اور آبِ حیات وغیرہ ۔

اگر ہم معنوی اعتبار سے ان تذکروں کی خصوصیات پر غور کریں تو یہ ساری تقسیم صرف دو گروہوں میں ضم ہو سکتی ہے اس لیے انھیں متعدد خانوں میں بانٹنے کے بجائے ذیل کے دو حصوں میں بانٹنا زیادہ مناسب ہوگا :

۱۔ بیاضی تذکرے جن کا اصل مقصود انتخابِ اشعار ہے ۔ اس ذیل میں اُردو شعرا کے اکثر تذکرے آ جاتے ہیں ۔ آپ انھیں طرز قدیم کے تذکرے بھی کہہ سکتے ہیں ۔

۲۔ سوانحی تذکرے جن میں شعرا کے حالات جمع کرنے اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مثلاً گلزار ابراہیم ، طبقات الشعرائے ہند ، گلشنِ ہند ، گلستانِ سخن اور آبِ حیات وغیرہ ۔ انھیں جدید تذکروں کا نام دے سکتے ہیں ، اس لیے کہ ان کی روش پہلے تذکروں سے بہت مختلف ہے ۔

لیکن تذکروں کی معنوی حیثیت کو ان کے تہذیبی پس منظر اور عہد کے آئنے میں دیکھنے اور پرکھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بالحاظ زمانہ مندرجہ ذیل دو بڑے خانوں میں بانٹا جائے ۔

۱۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے تذکرے ۔

۲۔ انیسویں صدی عیسوی کے تذکرے ۔

اٹھارھویں صدی کے تذکروں کی نوعیت :

اٹھارھویں صدی عیسوی کے تذکرے ابھی تک سولہ سے زیادہ دستیاب نہیں ہوئے ۔ ان تذکروں میں نکات الشعرا ، ریختہ گویاں ، مخزن نکات ، طبقات الشعرا ، تذکرۂ میر حسن ، تذکرۂ شورش ، مسرت افزا ، گلشن سخن ، گلزار ابراہیم اور تذکرۂ ہندی شمالی ہند میں لکھے گئے اور تحفۃ الشعرا ، گلشن گفتار ، چمنستان

شعرا ، بہار و خزاں ، گل عجائب اور ریاض حسنی دکن میں ۔ گویا اردو شعرا کے تذکرے ، شمالی ہند اور دکن میں ساتھ ساتھ لکھے گئے اور دونوں جگہ فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں ۔

ان تذکروں کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب انیسویں صدی عیسوی کے تذکروں کے مقابلے میں عموماً مختصر ہیں ۔ ان میں پانچ ایسے ہیں جن میں ایک سو شعرا کے تراجم بھی نہیں ہیں ۔ بقیہ میں زیادہ سے زیادہ تراجم کی تعداد سوا تین سو کے لگ بھگ ہے ۔ چند ایک کو چھوڑ کر سب کے تراجم کی نوعیت بھی تقریباً ایک سی ہے یعنی بلحاظ حروف تہجی شعرا کے تخلص مرتّب کیے گئے ہیں اور پھر ان کے تراجم مختصر منتخبات کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں ۔ کلام پر رائے زنی کے لحاظ سے نکات الشعرا اور سوانح کے لحاظ سے گلزار ابراہیم سب سے بہتر ہیں ۔ ان میں زیادہ تذکرہ نگار ایسے ہیں جنھوں نے معاصر کی حیثیت سے دوسرے تذکرہ نگار سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن مآخذ کا ذکر بہت کم کیا ہے ۔ صرف تراجم کی مشابہت سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مستفید ہیں ۔ گلزار ابراہیم کو چھوڑ کر واقعات کی تفصیل اور سوانح کے سلسلے میں اہم باتوں کی تاریخیں بھی ان تذکروں میں نہیں ملتیں ۔ کلام کی معنوی حیثیت کے بارے میں ذاتی رائیں تقریباً مفقود ہیں ۔ میر کے سوا اس طرف کسی نے زیادہ توجہ نہیں کی ۔ عموماً ایک ہی قسم کے تعریفی کلمات سے ہر شاعر کو نوازا گیا ہے ۔ مخزن نکات اور تذکرۂ میر حسن میں شعرا کو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور عہد بہ عہد رنگ شاعری کی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن سوانحی اور تنقیدی اعتبار سے یہ نکات الشعرا سے بہتر نہیں ہیں ۔ بہ حیثیت مجموعی یوں سمجھ لیجیے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے تذکروں پر فارسی کی چھاپ بہت گہری ہے ۔ انگریزی حکومت اور اس کے تحت بدلتی ہوئی سماجی زندگی کی جھلک ان میں نظر نہیں آتی ۔ بلحاظ موضوع و مواد اور تفصیل و توضیح ان میں کوئی تنوّع نہیں ہے ۔

انیسویں صدی کے تذکرے اور مغرب کے اثرات :

طرز جدید کے تذکروں کا تعلق انیسویں صدی سے ہے اور یہ وہ صدی ہے جس کا آغاز اردو زبان و ادب کے حق میں بڑا مبارک ثابت ہوا ۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ فورٹ ولیم کالج کی معرفت پہلی بار اردو کا چھاپہ خانہ قائم ہوا اور

شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر کی طرف بھی توجہ کی گئی - اس سے پہلے قرآن پاک کے بعض لفظی تراجم اور فارسی قصوں کے دو ایک مسجع و مرصع اردو ترجمے تو ملتے تھے لیکن ادبی نثر کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا - ڈاکٹر گلکرائیسٹ اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف نے نثر کی جانب خصوصی توجہ کی اور اس توجہ کے نتیجے میں مختلف نوعیت کی متعدد نثری کتابیں تھوڑے ہی عرصے میں سامنے آ گئیں - نثر کی اس مقبولیت اور رفتار ترقی کا اثر تذکرہ نگاری پر بھی پڑا - سب سے نمایاں اور اہم بات یہ ہوئی کہ اردو شعرا کے تذکرے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھے جانے لگے - چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں جو دو تذکرے سامنے آئے ان میں تذکرۂ حیدری مؤلفہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ع مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری اور ''گلشن ہند'' مؤلفہ مرزا علی لطف مرقومہ 1215ھ/۱۸۰۱ع اردو زبان ہی میں ہیں - دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ تذکرہ نگاری سے اہل مغرب کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس دلچسپی کے نتیجے میں اردو شعرا کے بعض تذکرے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی لکھے گئے اور تذکرہ نگاری کی قدیم روش میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں - اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ اہل ذوق حضرات یا خود شعرائے کرام اپنے پسند کے اشعار اور منتخبات کی بیاضیں تیار کر لیتے تھے - ان بیاضوں میں اشعار کے ساتھ جب شاعر کا نام اور مختصر سوانح کا ذکر بڑھایا جاتا تھا تو وہ آسانی سے تذکرے میں بدل جاتی تھیں - اب یہ صورت نہ رہی ، بلکہ تذکرہ نگاری کے لیے مختلف ممکن ذرائع سے مواد فراہم کیا جانے لگا - پہلے یہ ہوتا تھا کہ خود شاعر یا اس کے دوستوں اور شاگردوں سے بہ آسانی جو کچھ معلوم ہو جاتا تھا ، بغیر تحقیق اسے تذکروں میں شامل کر دیا جاتا تھا - اگر کسی کی بیاض یا تذکرے سے استفادہ بھی کیا جاتا تو اسے راز ہی رکھا جاتا تھا - مآخذ کا سراغ یا حوالہ دینے کا رواج نہ تھا - انیسویں صدی کے تذکروں کی روش اس سے قدرے مختلف ہو گئی - اب دوستوں اور عزیزوں سے سنی ہوئی باتوں کے علاوہ اخبار ، رسائل ، اشتہارات ، فہرستِ کتب اور باہم مراسلت سے بھی مدد لی جانے لگی - گویا انیسویں صدی میں تذکرہ نگاری دستاویزی شہادتوں اور کارآمد حوالوں کی بدولت بیاض سے بہت آگے بڑھ کر ادبی تنقید ، ادبی تاریخ اور ادبی سوانح نگاری کی حدود

میں داخل ہو گئی ۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں بعض ایسے تذکرے وجود میں آ گئے جن میں شعراء کے نام ، تخلص ، تلمذ ، توطن ، تعلیم ، تربیت ، خاندان ، ماحول ، ذریعۂ معاش اور کارناموں کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ تحقیق سے مواد جمع کرنے اور تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش ملتی ہے ۔ اس کوشش نے انیسویں صدی کے تذکروں میں خاصا تنوّع پیدا کر دیا ہے ۔ یہ تنوّع مواد اور ہیئت دونوں میں ملتا ہے ۔ اس سے پہلے کے تذکرے ایک ہی نہج پر مرتّب کیے جاتے تھے ۔ فرق اتنا تھا کہ کسی کے یہاں شعرا کی تعداد کم تھی ، کسی کے یہاں زیادہ ، ورنہ انتخاب کلام اور سوانح حیات کے اختصار کے لحاظ سے وہ یکرنگی ہوتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ محسن کے "سراپا سخن" ، سعادت خان ناصر کے "خوش معرکۂ زیبا" ، نساخ کے "قطعۂ منتخب" ، مہجور کے "مدائح الشعرا" ، صہبائی کے "انتخاب دواوین" اور یکتا کے "دستور الفصاحت" کے طرز کے تذکرے اٹھارھویں صدی میں نظر نہیں آتے ۔ "سراپا سخن" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جسم کے سارے اجزا یعنی سر سے لے کر پاؤں تک کے موضوع پر شعرا کی جتنی غزلیں مل سکی ہیں انھیں یکجا کر دیا گیا ہے ۔ "انتخاب دواوین" اور "دستور الفصاحت" میں صرف نمایندہ شعرا کو جگہ دی گئی ہے ۔ "خوش معرکۂ زیبا" میں ہر شاعر کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس کے شاگردوں کا ذکر بھی بالالتزام ملتا ہے ۔ "قطعۂ منتخب" میں صرف قطعہ نگار شعرا کے حالات لکھے گئے ہیں اور "مدائح الشعرا" میں مؤلف نے جن شعرا کے کلام کی تضمین کی ہے ان کے تراجم شامل ہیں ۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ان تذکروں میں ادبی تاریخ اور اسالیب کی ارتقائی کڑیوں کو ملانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے جو اس سے پہلے اٹھارھویں صدی کے تذکروں میں نایاب ہے ۔

انیسویں صدی کے تذکروں میں پچھلے تذکروں کے برخلاف ایک اہم اضافہ یہ نظر آتا ہے کہ ان تذکروں میں شعرا کے حالات زندگی اور انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے مروجہ موضوعات و مسائل پر بھی بحثیں چھیڑی گئی ہیں ۔ مثال کے طور پر زبان کیا ہے ؟ اردو زبان کب اور کہاں پیدا ہوئی ؟ اس کی پیدائش کے کیا اسباب ہیں ؟ شاعری کیا ہے ، اس کا آغاز کب سے ہوا ہے ؟ اردو کے اولین شعرا کون کون سے ہیں ؟ مختلف زمانوں میں اردو شاعری کی

کیا خصوصیت و نوعیت رہی ہے ؟ شاعری کا فن کیا ہے ؟ اس فن کا ارتقاء کس طرح ہوا ہے ؟ شاعری کی بلحاظ ہیئت کتنی قسمیں ہیں ؟ ان اقسام کے لوازم کیا ہیں ؟ عروض و قافیہ کسے کہتے ہیں ؟ ان کے عیوب و محاسن کیا ہیں اور شاعری میں وہ کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں ؟ اس طرح کے اور بہت سے سوالات انیسویں صدی کے تذکروں کے مقدموں اور دیباچوں میں اٹھائے گئے ہیں اور ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس سلسلے میں گارسیں دتاسی ، امام بخش صہبائی ، صفا بدایونی ، کریم الدین ، احمد علی خاں یکتا اور قادر بخش صابر کے تذکرے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ ان تذکروں میں زبان اور شاعری کے متعلق جو تفصیلی بحثیں ملتی ہیں وہ آج ہمارے لیے کس حد تک قابل قبول ہیں ، یہ ایک الگ سوال ہے ۔ لیکن ان بحثوں کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں اس لیے کہ دراصل انہی بحثوں نے اردو کی ادبی تاریخ و تنقید کی مختلف کڑیوں کو ایک لڑی میں پرونے اور نئی راہ پر لگانے میں ہماری رہنمائی کی ہے ۔

اس صدی میں اشاعت و طباعت اور مواد کی فراہمی میں آسانیوں کے سبب تذکرہ نگاری کی رفتار بھی قدرے تیز رہی ہے ۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۸۵۷ع کے درمیانی عرصے میں دو درجن سے زائد تذکرے لکھے گئے ہیں ۔ ان تذکروں میں ''عمدۂ منتخبہ'' مؤلفہ اعظم الدولہ سرور ، ''مجموع مجمع الانتخاب'' مؤلفہ شاہ کمال ، ''ریاض الفصحا'' مؤلفہ مصحفی ، ''مجموعۂ نغز'' مؤلفہ قدرت اللہ قاسم ، ''تذکرۂ بے جگر'' مؤلفہ خیراتی لعل جگر ، ''دیوان جہاں'' مؤلفہ بینی نرائن جہاں ، ''طبقات سخن'' مؤلفہ غلام محی الدین مبتلا ، ''تذکرۃ الشعرا'' مؤلفہ ابن امین طوفان ، ''دستور الفصاحت'' مؤلفہ احمد علی خاں یکتا ، ''گلشن بے خار'' مؤلفہ مصطفی خاں شیفتہ ، ''تاریخ ادب ہندوستانی'' مؤلفہ گارسیں دتاسی ، ''انتخاب دواوین'' مؤلفہ امام بخش صہبائی ، ''مدائح الشعرا'' مؤلفہ عنایت حسین خاں مہجور ، ''تذکرۂ بہار بے خزاں'' مؤلفہ احمد حسن سحر ''گلدستۂ نازنیناں'' مؤلفہ کریم الدین ، ''گلستان بے خزاں'' مؤلفہ قطب الدین باطن ، ''خوش معرکۂ زیبا'' مؤلفہ سعادت خاں ناصر ، ''طبقات الشعرائے ہند'' مؤلفہ کریم الدین ، ''سراپا سخن'' مؤلفہ محسن ، ''یادگار شعرا'' مؤلفہ اشپرنگر ، ''گلشن ہمیشہ بہار'' مؤلفہ نصر اللہ خاں خورجوی اور ''گلشن سخن'' مؤلفہ قادر بخش صابر وغیرہ کے نام آتے ہیں ۔ یہ تذکرے بلحاظ زبان دو خاص گروہوں میں

تقسیم کیے جا سکتے ہیں ۔ ایک وہ جو فارسی زبان میں ہیں ، دوسرے وہ جو اردو یا کسی اور زبان میں لکھے گئے ہیں ۔ پہلے گروہ میں عمدۂ منتخبہ ، مجموعۃ الانتخاب ، ریاض الفصحا ، مجموعۂ نغز ، تذکرۂ بے جگر ، دیوان جہاں ، طبقات سخن ، تذکرۂ ابن طوفان ، دستور الفصاحت ، گلشن بے خار ، مدائح الشعرا ، تذکرۂ بہار بے خزاں اور گلشن ہمیشہ بہار کے نام آتے ہیں ۔ آپ ان تذکروں کو طرز قدیم کے تذکرے بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس لیے کہ ان کی روش ظاہری و معنوی دونوں لحاظ سے اٹھارھویں صدی کے تذکروں سے الگ نہیں ہے ۔ باقی تذکرے اُردو ، فرانسیسی یا انگریزی میں لکھے گئے ہیں اور یہ اپنے مواد و طریقۂ کار کے لحاظ سے پچھلے تذکروں سے اس درجہ مختلف ہیں کہ انہیں طرز جدید کے تذکرے کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔

اردو تذکروں کی معنوی حیثیت و اہمیت :

پچھلے صفحات میں ہم فارسی تذکروں کی معنوی حیثیت و نوعیت پر روشنی ڈال چکے ہیں ۔ اُردو شعرا کے تذکرے ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں ۔ بہ حیثیت مجموعی ان میں وہی خوبیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں جو فارسی تذکروں میں ملتی ہیں ۔ افسوس ہے کہ ان کی خوبیوں کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے ۔ ہاں ان کی خامیوں کو اکثر نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے اور ان میں قدیم تذکرہ نگار و جدید ناقدین دونوں شامل ہیں ۔ میر تقی میر کو محمد یار خاکسار عرف کلو سے یہ شکایت ہے کہ :

"احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرار دادہ ۔"[۱]

فتح علی حسینی گردیزی کو اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں سے یہ گلہ ہے کہ "علتِ غائی تالیف شان خردہ گیری ہمسران و ستم ظریفی با معاصران است ۔ در اظہار ما فی نفس الامر بایجاز پرداختہ بلکہ از جہت عدم اعتنا و قلت تتبع اکثر نازک خیالان رنگین نگار را از قلم انداختہ ۔

۱۔ نکات الشعرا ، ص ۱۲۲ ، مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۰ء ۔

مع ہذا در تصحیح اخبار و تحقیق احوال اعزہ اغلاط صریح بکار بردہ و خطاہاے نمایاں کردہ اند ۔''[۱]

شفیق اورنگ آبادی کو میر تقی میر سے ان کی عیب چینی اور تنقیص کا شکوہ ہے اور قدرت اللہ قاسم ان سے یوں خفا ہیں کہ . . . در تذکرۂ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ ۔''[۲]

اسی طرح قطب الدین باطن لکھتے ہیں کہ :

''گلشن بے خار تالیف نواب مصطفے خاں شیفتہ جو اول سے آخر تک دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں نوابی پر فریفتہ ۔ سب کو حقارت سے یاد کیا ، اپنی اوقات کو برباد کیا ۔ بجز سات شخصوں کے ہر ایک کی نسبت عبارت ہجو آمیز ہے ۔[۳]

بعد ازاں انیسویں صدی کے وسط میں ایک مغربی اسکالر گارسیں دتاسی اُردو شعرا کے تذکروں پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ :

''تمام تذکرے . . . بالکل نامکمل ہیں اور عموماً ان میں صرف شاعر کا نام اور اس کے کلام کا انتخاب پایا جاتا ہے ۔ لیکن بعض موقعوں پر جہاں حالات و واقعات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہاں بھی شاعر کی پرائیویٹ زندگی یا سال ولادت و وفات کے متعلق ایک حرف بھی بہ مشکل نظر آتا ہے . . . اور نہ اس کی تالیفات و تصنیفات کا کچھ مذکور نظر آتا ہے ۔ اور اکثر تو اس کے صاحبِ دیوان ہونے کا ذکر بھی نہیں ہوتا ۔''[۴]

۱۔ دیباچہ ''ریختہ گویاں'' ، مرتبہ مولوی عبدالحق ، ص ۳ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۳ع ۔

۲۔ ''مجموعہ نغز'' حصہ دوم ، ص ۲۳۰ ، مرتبہ حافظ محمود شیرانی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۳ع ۔

۳۔ ''گلستان بے خزاں'' مؤلفہ قطب الدین باطن ، ص ۴ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۵ع ۔

۴۔ دیباچہ ''تاریخ ادب ہندوستانی'' بہ حوالہ معارف بابت اگست ۱۹۲۲ع ۔

گارسیں دتاسی کے مترجم کریم الدین ، انھیں اعتراضات کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں کہ :

''اکثر جائے ان میں شعرا کا اور کچھ انتخاب اشعار کا لکھا ہے - جس کا حال بہت لکھا ہے ان کی پیدائش کی تاریخ نہیں لکھی اور نہ تاریخ وفات کسی کی لکھی ہے اور حالات خانگی ان کے بہت کم لکھے ہیں بلکہ ان کی تصنیفات کا ذکر بھی بہت کم ہے اور یہ بھی بہت کم ہے کہ اس شاعر کا دیوان بھی ہے یا نہیں - شاید بہ سبب رشک کے تذکرہ نویس نہ لکھتے ہوں - کیونکہ اگر یہ کہیں گے کہ اس کی تصنیف سے ایک دیوان بھی ہے تو شاید اس سے یہ نتیجہ نکلے کہ وہ بڑا شاعر تھا اور یہ امر ان کو چھپانا منظور ہو -''[۱]

بعد ازاں تذکرہ نگاری کے آخری دور میں صفا بدایوانی صاحبِ شمیم سخن کو پچھلے تذکرہ نگاروں سے یہ شکوہ ہے کہ وہ شعرا کے ذکر میں روایات کو مد نظر رکھتے ہیں اور کلام کا عمدہ انتخاب نہیں دیتے - ''خزینۃ العلوم'' کے مؤلف درگا پرشاد نادر کو پچھلے تذکروں پر یہ اعتراض ہے کہ ان میں دکنی شعرا کو نظر انداز کیا گیا ہے - خود محمد حسین آزاد کو تذکروں پر یہ اعتراض ہے کہ :

''ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے - نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے ، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی - انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سال وفات تک بھی نہیں کھلتا -''[۲]

تذکروں پر مذکورہ بالا اعتراضات جو خود قدیم تذکرہ نگاروں کی طرف سے کیے گئے ہیں اور اس میں میر تقی میر سے لے کر محمد حسین آزاد تک سبھی شامل

۱- دیباچہ طبقات الشعرائے ہند ، ص ۱۰ ، از کریم الدین و فیلن مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ع -

۲- آب حیات ، ص ۴ ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۵۴ع -

ہیں ، عہد حاضر کے ناقدین میں کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ، ہم اس جگہ صرف کلیم الدین کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :

"شاعر کی پیدائش ، اس کا خاندان ، اس کی زندگی کے مختلف واقعات ، اس کی تصنیفات ، اس کی تعلیم و تربیت ، اس کا ماحول ، ان میں سے کسی کے متعلق تشفی بخش سامان نہیں ملتا ۔"[1]

تذکروں کی کمزوریاں :

اب اگر ہم تذکروں کے قدیم و جدید ناقدین کی راؤں پر بیک وقت نظر ڈالیں اور تذکروں پر کڑی سے کڑی تنقید کو جائز رکھیں تو زیادہ سے زیادہ ان پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں :

۱- تذکروں میں حالات زندگی عموماً بہت مختصر اور انتخاباتِ کلام اکثر طویل ہیں ۔

۲- سوانح اور شاعر کے اندازِ سخن گوئی کے سلسلے میں تقریباً سب نے ایک ہی روش اختیار کی ہے ۔

۳- شاعروں کے حالات میں ان کے سال پیدائش و وفات اور عمر و عہد کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا ۔

۴- ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر سے یا بعض اشعار کئی کئی شاعروں سے منسوب کر دیے گئے ہیں ۔

۵- اکثر تذکروں پر ایک دوسرے کی تقلید کا اثر نمایاں ہے اور تازگی و ندرت بہت کم نظر آتی ہے ۔

۶- شعر کے محاسن میں زیادہ تر صنائع لفظی و معنوی کو اہمیت دی گئی ہے اور حسب ضرورت ان کو ظاہر کیا گیا ہے ۔

۷- اکثر طرفداری سے کام لیا گیا ہے اور شعرا کی تعریف و تنقیص ذاتی تعلقات کی بنا پر کی گئی ہے ۔

۱- "اردو شاعری پر ایک نظر" مطبوعہ اردو مرکز پٹنہ ۱۹۵۲ء طبع دوم ۔

۸۔ تنقیدی لب و لہجہ پر اخلاقی جوش غالب ہے اور عموماً سب کو اچھے الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ زندوں کو درازی عمر کی دعا دی گئی ہے اور متوفّین کو مغفرت کی۔

۹۔ اکثر شعرا کے اسلوب و سلیقۂ شعر کے لیے مبہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے شاعر کی حیثیت واضح نہیں ہوتی۔

تذکروں کی افادیت:

لیکن ان خامیوں کے باوجود ان تذکروں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ان میں سے جو اعتراضات خود تذکرہ نگاروں کی طرف سے وارد کیے گئے ہیں وہ عموماً رشک و رقابت، معاصرانہ چشمک، شاعرانہ تعلّی" اور علاقائی تعصبات کا نتیجہ ہیں۔ پھر چونکہ یہ تذکرہ نگار ایک دوسرے کی کمزوریاں گنوانے کے باوجود اپنے تذکروں کو ان عیوب سے پاک نہیں رکھ سکے اس لیے ان کے بیانات کو چنداں اہمیت دینا مناسب نہیں۔ لیکن جہاں تک جدید ناقدین کے اعتراضات کا تعلق ہے، انھوں نے قدیم تذکرہ نگاروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہمیں تذکروں پر تنقیدی و تحقیقی قلم اٹھاتے وقت اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک ایسے عہد، ماحول اور ادبی فضا میں لکھے گئے ہیں جس میں نقدِ شعر اور سخن فہمی کا معیار آج کے معیار سے بالکل مختلف تھا۔ ان تذکرہ نگاروں کے سامنے قدیم فارسی تذکروں کے سوا ادبی تنقید، سوانح اور تنقید کے وہ جدید اصول یا نمونے موجود نہ تھے جن کی آڑ لے کر آج انھیں مطعون اور کم رتبہ خیال کیا جاتا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کے مذاقِ ادب، طرزِ تنقید اور اندازِ تذکرہ نگاری کو بیسویں صدی عیسوی کے نقطۂ نگاہ سے جانچنا کسی طرح مناسب نہیں۔ چنانچہ جو لوگ قدیم تذکروں کو آج کے معیار یا اپنے خاص رجحانات و معتقدات کے تحت دیکھیں گے انھیں ضرور مایوسی ہوگی۔ البتہ جو لوگ ان تذکروں کو اس خاص فضا میں لے جا کر دیکھنے کی کوشش کریں گے جن میں وہ لکھے گئے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ ان میں ایک دو نہیں، انھیں سیکڑوں باتیں کام کی مل جائیں گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جدید نقادوں نے قدیم تذکروں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا اور چند تذکروں پر سرسری نظر ڈال کر رائیں قائم کر لی ہیں ورنہ کم از کم انھیں اس بات کا اندازہ ضرور

ہو جاتا کہ تذکروں پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ ہر ایک پر منطبق نہیں ہوتے ۔ ان میں یقیناً ایسے تذکرے بھی ہیں جن میں سوانح کے باب میں کچھ زیادہ احتیاط و توجہ سے کام نہیں لیا گیا ۔ لیکن انھیں تذکروں میں ایسے بھی موجود ہیں جن میں شعرا کے حالات زندگی کو احتیاط سے جمع کرنے ، شعرا کے ادوار قائم کرنے ، ہر دور کی شاعرانہ خصوصیات اجاگر کرنے ، شعرا کی ولدیت و سکونت کی نشاندہی کرنے ، ان کے اساتذہ و تلامذہ کے نام دینے اور ان کے سنینِ وفات و پیدائش کے اندراج کرنے میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے ۔ ایسے تذکروں میں ''گلزار ابراہیم'' ، ''گلشن ہند'' ، ''گلستان سخن'' ، ''شمیم سخن'' اور ''خزینۃ العلوم'' کے نام آسانی سے لیے جا سکتے ہیں ۔ تنقیدی راؤں کے سلسلے میں ''نکات الشعرا'' ، ''گلشن بے خار'' اور ''آب حیات'' کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ علاوہ ازیں تذکروں کی جو کمزوریاں اور گنوائی گئی ہیں وہ کسی ایک تذکرے میں مجتمع نہیں بلکہ متعدد تذکروں میں بٹی ہوئی ہیں ۔ بعض میں اشعار کے انتخاب کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ بعض میں حالات زندگی کو اہمیت دی گئی ہے ۔ بعض میں ولدیت و سکونت کا ذکر ضرور کیا گیا ہے ۔ بعض میں استاد و شاگرد کے نام خصوصیت سے درج کیے گئے ہیں ۔ بعض میں شعرا کے کلام پر رائیں ضرور دی گئی ہیں ۔ بعض میں معاصرانہ ادبی فضا پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس طرح اگر کسی خاص شاعر کے متعلق مختلف تذکروں کے اقتباسات جمع کریں تو ہمیں یقین ہے کہ اس کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جائے گی ۔ بات یہ ہے کہ اردو شعرا کے تذکرے درجنوں ہیں ، ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی ۔ بعض ایسے اعلیٰ درجے کے تذکرے موجود ہیں جن میں شاعروں کے حالات اور واقعات نہایت صحیح ہیں بالخصوص معاصرین کے متعلق ان کی معلومات ہر طرح قابل اعتبار ہیں ، بعض میں تنقیدی پہلو بھی معیاری ہے[1] ۔

تذکروں میں تنقید کی نوعیت :

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اردو میں ادبی تنقید کی داغ بیل تذکرہ نگاروں

۱۔ ''معیار شعر و سخن'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، مطبوعہ نگار ، انتقاد نمبر فروری ، مارچ ۱۹۴۶ع ص ۶۷ ۔

کے ہاتھوں پڑتی ہے ۔ تذکروں میں چونکہ شعرا کے حالات میں ایجاز و اختصار سے کام لیا جاتا ہے اس لیے کسی شاعر یا اس کے کلام کے متعلق مفصل تنقیدی رائے کی تلاش تو بے سود ہوگی ، لیکن ان میں کلام کے حسن و قبح پر اجمالاً ایسی رائیں ضرور مل جاتی ہیں جنھیں تنقیدی نقوش و اشارات کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کر سکتے ۔ یہ تنقیدی اشارات بھی عموماً کلام کی ظاہری صورتوں سے بحث کرتے ہیں اور معنوی خصوصیات کو ہاتھ نہیں لگاتے ۔ لیکن اس سے تذکرہ نگاروں کے تنقیدی شعور پر حرف نہیں آتا ۔ بات یہ ہے کہ یہ تذکرے جس ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا میں لکھے گئے ہیں اس میں آج کل کی طرح موضوع و مواد کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی بلکہ عربی و فارسی شاعری اور تنقید کے زیر اثر کلام کی ظاہری صورت ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا تھا ۔

اس وقت عربی فارسی کے کون سے تنقیدی اصول مروّج تھے اور شعر و ادب کو اس وقت کن معیاروں پر پرکھا جاتا تھا اس کا بھی مجمل ذکر سن لیجیے ۔ عربی کا مشہور ادیب اور نقاد ابو الفرج قدامہ جس کی تنقیدی رائے کو شعر و سخن کے سلسلے میں آج تک کسی نہ کسی طور پر اہم خیال کیا جاتا ہے اور جس کا سکہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے عربی فارسی ادب پر چل رہا تھا ، رقم طراز ہے کہ :

”طرز بیان شعر کا اصلی جزو ہے ، مضمون و تخیل کا بجائے خود فاحش ہونا شعر کو زائل نہیں کرتا ۔ شاعر ایک بڑھئی ہے ، لکڑی کی اچھائی برائی اس کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی ۔“

”بہترین مذہب غلو و مبالغہ ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس کی طرف سخن شناس اور با فہم شعرا کا میلان رہا اور بعض کا خیال تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کا قول یہ ہے کہ سب سے بہتر وہ شعر ہے جس میں سب سے زیادہ کذب ہو . . . . مبالغہ کرنا حد اوسط پر اکتفا کرنے کے بہ نسبت زیادہ بہتر ہوتا ہے ۔“

اسی طرح عربی کا دوسرا مشہور و مقبول ناقد ابن رشیق لکھتا ہے کہ :

”ادائے معنی کے لیے نئے نئے انداز نکالنا اور ایک ایک بات کو

کئی کئی طرح ادا کرنا شاعرانہ کمال ہے۔ گویا معانی پانی ہیں اور الفاظ کی ترکیب بہ منزلہ گلاس۔ گلاسوں میں کوئی سیمین ہے، کوئی طلائی، کوئی خزف کا ہے، کوئی صدف کا۔ کوئی پتھر کا کوئی کانچ کا۔ پانی یعنی معانی بہر حال وہی ایک ہیں جو مختلف ترکیبوں اور اندازوں میں کانوں کے واسطے سے نفس کے سامنے آتے ہیں اور اگرچہ تشنگیِ طلب کو وہی بجھاتے ہیں لیکن گلاسوں کی رنگا رنگی ایک لطف مزید دے جاتی ہے ... شعر کی عبارت چار چیزوں سے اٹھتی ہے لفظ، وزن، معنی و قافیہ پس اس کی حد ہے۔"[1]

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ قدیم عربی ناقدین اگرچہ معنی کی اہمیت کے بھی قایل تھے لیکن ان کی تنقید کے معیار و اصول عموماً الفاظ ہی سے تعلق رکھتے تھے اور کلام پر ادنیٰ و اعلیٰ ہونے کا حکم انھیں اصول کے پیش نظر لگایا جاتا تھا۔ لفظی تنقید کا یہ شعبہ بعد کو فن بلاغت کے نام سے منسوب ہوا اور اس میں علم معانی و بیان کے وہ سارے اجزا اور لوازم شامل ہوگئے جنھیں صنائع لفظی و معنوی، استعارات و تشبیہات، کنایہ و مجاز، عروض اور ردیف و قافیہ اور بعض دوسری لسانی و لغوی تشریحات کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا تنقید شعر عربوں کے نزدیک تخلیق شعر کی طرح ذوق اور وجدانی چیز تھی اور بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری ان کی نگاہ میں شعر کی خوبیاں یہ تھیں کہ زبان کے اعتبار سے سادہ اور رواں ہو، اس کی بندش میں چستی اور متانت پائی جاتی ہو، الفاظ قلیل اور معنی کثیر ہوں۔ تکلف اور آورد سے پاک ہو اور تشبیہات میں ندرت اور تغزّل میں رقت پائی جاتی ہو[2] ... رفتہ رفتہ ان تنقیدی معیاروں نے میکانکی صورت اختیار کر لی اور شعر میں معنی کو لفظ کا تابع بنا کر پرکھا جانے لگا۔ یہ اصول عربوں کی معرفت فارسی ادب پر بھی اثر انداز ہوئے اور فارسی شاعری پر

۱۔ "نگار" انتقاد نمبر، ص ۶۲-۶۳ بابت جنوری ۱۹۴۶ع۔

۲۔ ایضاً۔

سب سے پہلے قلم اٹھانے والے ادیب نظامی عروضی سمرقندی نے مجمع النوادر میں اس بات کا اظہار کیا کہ مذاقِ شعر و سخن میں پختگی اور لطف و تاثیر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اوائل عمری ہی میں شاعر کی نظر سے کم از کم بیس ہزار اشعار گزر جائیں اور علم عروض پر قابو حاصل ہو جائے اس لیے کہ نظامی سمرقندی کے نزدیک :

''شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صناعت انسباق مقدمات موہومہ کند و التیام قیاسات منتج براں وجہ معنی خرد بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد ، نیکو را در خلعت زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند و بہ ایہام قوت ہائے غضبانی و شہوانی را بر انگیزد تا بداں ایہام طباع را انقباضے و انبساطے بود و امور عظام را در نظام عالم سبب شود ۔''[1]

ان خیالات کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاعری کو محسوسات و جذبات کی ترجمانی کے بجائے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر ظاہر کرنے کا وسیلہ سمجھ لیا گیا ۔ چنانچہ رشید الدین وطواط نے عربی فن تنقید کی تقلید میں ایک ضخیم کتاب علم بدیع پر فارسی زبان میں لکھی اور اس میں صنائع لفظی و معنوی کو شعر کے حسن و اثر کا سبب قرار دیا ۔[2] کم و بیش لفظی تنقید کے یہی مباحث شمس قیس رازی کے یہاں زیر بحث آئے ہیں ۔ بلکہ اس نے وطواط کے مقابلے میں اس سے زیادہ تفصیل سے ردیف و قافیہ ، عروض اور علم معانی و بیان کے دوسرے لوازم کو کلام کے محاسن خاص میں شمار کیا ہے ۔[3]

غرض کہ جس وقت اُردو ، فارسی شعرا کے تذکرے مرتّب ہو رہے تھے اس وقت عربی و فارسی تنقید کے محور ، موضوع ، مواد یا معنی نہیں بلکہ ہیئت الفاظ اور علم بیان کے لوازم تھے ۔ اس لیے تذکرہ نگاروں کے تنقیدی لب و لہجہ

۱۔ ''مجمع النوادر'' چاپ تہران ۔

۲۔ حدائق السحر فی دقائق شعر از رشید الدین وطواط مملوکہ کتب خانہ جامعہ کراچی ۔

۳۔ العجم فی المعایر الا شعار العجم چاپ تہران ۔

کو اس وقت کے مروج معیار تنقید سے ہٹ کر دیکھنا مناسب نہ ہوگا ۔ بلکہ ہمیں ان کی تنقیدی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے لفظی تنقید کے ان اصول و ضوابط کو سامنے رکھنا ہوگا جو انیسویں صدی کے وسط تک شعر و ادب کا پیمانہ خاص خیال کیے جاتے تھے ۔ چنانچہ اگر ہم شعرائے اُردو کے تذکروں کو قدیم فنِ نقد کی روشنی میں دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اختیار و ایجاز کے باوجود اس میں تنقیدی مواد کی کمی نہیں ہے ۔ نکات الشعرا و مخزن نکات سے لے کر شمیم سخن و آب حیات تک تنقیدی شعور و اصول کا ایک ارتقائی سلسلہ ہے جو وقت اور ماحول کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی کی طرف اور ہیئت سے موضوع کی طرف بڑھتا گیا ہے ۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے تذکرہ نگار میر ، گردیزی ، قائم ، میر حسن ، لچھمی نرائن شفیق اور حمید اورنگ آبادی وغیرہ تنقیدی شعور سے بیگانہ نہیں ہیں ۔ ذوقی اور وجدانی تنقید کے ان اصولوں کی کارفرمائی ان کے تذکروں میں ملتی ہے جو عربی و فارسی کے زیر اثر اس وقت عموماً مروج تھے ۔ اس سے زیادہ ان تذکرہ نگاروں سے توقع کرنا ان کے ساتھ نا انصافی ہے ۔ لیکن اُنیسویں صدی کے اوائل میں علم و ادب کی روشنی اور فورٹ ولیم کالج کی تحریک نے جہاں برصغیر کے عام ادبی شعور کو متاثر کیا ہے وہاں اس زمانے کے ناقدین یعنی تذکرہ نگاروں کے اندازِ فکر اور اسلوب نگارش پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے ۔ چنانچہ ''گلزارِ ابراہیم'' ، ''طبقات الشعرائے ہند'' ، ''گلستان سخن'' ، ''گلشنِ بے خار'' ، ''شمیم سخن'' اور ''آب حیات'' کے تنقیدی لب و لہجے میں یہ اثرات اکثر جگہ نظر آتے ہیں اور صاف پتا چلتا ہے کہ اُردو کے ان تذکرہ نگاروں کا تنقیدی شعور ، عربی فارسی کے قدیم مروج معیاروں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے تذکرہ نگاروں سے الگ اپنی راہ نکالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے ۔ اس لیے کلیم الدین صاحب کی یہ رائے درست نہیں معلوم ہوتی کہ ان تذکروں کی اہمیت محض تاریخی ہے ، یہ دنیائے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔

افسوس ہے کہ کلیم الدین تذکروں کی تنقید کو اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کے تنقیدی معیار کے بجائے بیسویں صدی عیسوی بلکہ اپنے ذاتی معیار کی روشنی میں دیکھتے ہیں ۔ ورنہ ان تذکروں میں تنقیدی شعور کی اتنی کمی نہیں ہے جتنی کہ انھیں نظر آتی ہے ۔ اگر ہم عربی و فارسی کے مذکورہ بالا مروج اصول تنقید کو نظر میں رکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے قدیم ترین تذکرہ نگار ،

میر ، قائم ، میر حسن اور مصحفی سبھی ان اصولوں کا احساس رکھتے ہیں ۔ مثال کے طور پر میر نے نکات الشعرا میں تنقید کے جن اصولوں پر بار بار زور دیا ہے ان میں :

۱۔ ربط کلام ۔	۵۔ ایجادِ مضامین ۔
۲۔ خوش فکری ۔	۶۔ تہ داری ۔
۳۔ تلاشِ لفظِ تازہ ۔	۷۔ درد مندی ۔
۴۔ صفائیِ گفتگو ۔	۸۔ طرز خاص ۔

شامل ہیں[۱] اور ان اصولوں کی پاسداری تقریباً ہر قدیم تذکرہ نگار کے یہاں نظر آتی ہے ۔ ہرچند کہ ان اصولوں پر مفصل بحث کہیں نہیں کی گئی اور نہ تذکروں میں اس کی گنجائش تھی لیکن اشارات کی صورت میں یہ جگہ جگہ ملیں گے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان اشارات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تذکروں میں ان تنقیدی اشاروں کی بڑی اہمیت ہے ۔ ان کا تجزیہ کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ یہ چار عناصر سے مرکب ہیں ۔ اول شاعر کے کلام پر رائے ، دوم فارسی شاعروں سے مقابلہ ، سوم کلام پر اصلاح ، چہارم اس زمانے کی ادبی تحریکوں پر اشارے ۔ اس کے علاوہ بعض تذکرے ایسے بھی ہیں جن میں شعر و شاعری کے متعلق فنی مباحث بھی مل جاتے ہیں ۔[۲]

ان امور سے بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی پتا چلتا ہے کہ ابتدائی دور میں بھی فارسی سے اُردو میں کام لینے کی حدود مقرر تھیں جن کا سمجھنا سلیقۂ شعرگوئی کے لیے ضروری تھا - اُردو شعرا کے جتنے بھی تذکرے ہیں ان میں ایسے اشارات بہت صاف اور واضح ہیں جن سے یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ دورِ قدیم میں شعر و شاعری کا مذاق کیا تھا ۔ کن اصولوں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا ۔ بالفاظ دیگر مروجہ معیار تنقید کیا تھا جس پر شاعر اپنے کلام کو پرکھتے تھے ۔[۳]

۱۔ ''معیار شعر و سخن'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، مطبوعہ نگار ، انتقاد نمبر ۱۹۳۶ع ص ۶۹ ۔

۲۔ اُردو تنقید کا ارتقا ، ص ۹۲ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۶۱ع طبع ثانی ۔

۳۔ غزل اور متغزلین ، ص ۵۴ ، مطبوعہ اُردو مرکز لاہور ۱۹۵۴ع ، طبع اول ۔

تذکرہ نگاروں کے یہ تنقیدی اشارے اور فنی مباحث جن کا تعلق زیادہ تر زبان و بیان سے ہے خواہ کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہو جائیں لیکن جب تک ادب ، الفاظ کا فن رہے گا ، ان کی اہمیت کو نظری اور عملی دونوں قسم کی تنقیدوں میں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ وقت کے تقاضے تنقید میں ان کے دخل کو کم کر سکتے ہیں لیکن سرے سے انھیں خارج نہیں کر سکتے ۔ شعر و ادب کے سلسلے میں وہ شروع سے تنقید کا جزو رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے ۔ جدید تنقید خواہ کوئی صورت اختیار کرے ، اس کے اصول خواہ کتنے ہی بدل جائیں ، موضوع و مواد کو ہیئت و صورت پر خواہ کتنی ہی برتری حاصل ہو جائے ، تنقید سے ''ذریعۂ اظہار'' یعنی الفاظ کی وقعت کم نہ ہوگی ۔ انھیں پہلے بھی اہم خیال کیا جاتا تھا اور آج بھی اہم خیال کیے جاتے ہیں ۔ چنانچہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ :

''یہ بالکل درست ہے کہ شاعری کی اصل روح جذبات کا اظہار ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں داخلی بھی کہتے ہیں ۔ لیکن اگر طریق اظہار ناقص یا پیش پا افتادہ ہو تو شعر معیار سے گر جائے گا ۔ اسی طرح خارجی شاعری کو لے لیجیے ، جس کا انحصار زیادہ تر محاکات یا ظاہری نقاشی پر ہے کہ اگر اس کے خطوط اچھے نہ ہوں گے تو وہ بھی پسند نہ کی جائے گی ۔ اس لیے میرے نزدیک بنیادی چیز طریق اظہار ہے جس پر محاسن شعری کا انحصار ہے خواہ شاعری داخلی ہو یا خارجی ۔۱''

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ :

''بعض لوگ زبان کی صحت کے مسئلے کو لفظی حرف گیری کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ۔ ادب اور تحریر کی ہر قسم میں زبان کی صحت کی بڑی اہمیت ہے بلکہ ناگزیر حیثیت رکھتی ہے ۔ غور کیجیے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ کوئی ادبی تحریر اپنے اظہار و ابلاغ میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے وسائل اظہار بلیغ اور کامیاب نہیں ہو پاتے اور ادب کا واحد وسیلۂ اظہار زبان و بیان ہے ۔ کسی نے کبھی کوئی ایسا مصوّر دیکھا ہے جو اپنے

۱۔ ''نگار'' بابت جنوری ۱۹۶۴ع ۔

رنگوں کی صحیح ترتیب و ترکیب کے بغیر کامیاب تصویر بنانے کا مدعی ہوا ہے اور اگر ایسا کوئی ہے تو وہ یقیناً ژولیدگیِ تصور کا مریض ہے۔ یہی حال شاعری اور ادب کا ہے کہ اس میں زبان و بیان کی بلاغت کے بغیر کامیاب نظم یا نثر لکھنے کا دعویٰ صرف وہی کر سکتا ہے جو پتنگ آڑانے کا عادی ہے مگر ڈور کے بغیر۔"[1]

رشید حسن خان کا خیال ہے کہ:

"صحیح الفاظ اور مناسب طرز ادا کا انتخاب، ایک ایسے شخص کے خیالات کو خواہ ان میں کتنی ہی اجنبیت ہو، دوسرے مختلف الخیال لوگوں تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر دونوں اجزا میں سے ایک جزو بھی ناقص ہے تو اس صورت میں نہ بات بنے گی نہ دوسرے تک پہنچے گی۔"[2]

ان تفصیلات سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ شعرائے اُردو کے تذکروں میں جو تنقیدی اشارات کے اصول کارفرما نظر آتے ہیں وہ بے وقعت نہیں ہیں۔ ان کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے اور اگر کوئی شخص اس نقطۂ نگاہ سے قدیم تذکروں کا تفصیلی مطالعہ کرے گا تو صرف یہی نہیں کہ یہ تذکرے اپنے وقت کے مذاقِ سخن اور طرزِ تنقید کے نمائندے نظر آئیں گے بلکہ ان کی دائم و قائم تنقیدی اہمیت کا اعتراف بھی کرنا ہوگا۔

تذکروں کی سوانحی اہمیت:

ادبی تنقید کی طرح اُردو میں ادبی سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش بھی انھی تذکروں میں ملتے ہیں۔ چنانچہ قدیم شعرا کی زندگی اور سیرت و شخصیت کے متعلق جتنی کتابیں یا مقالات اب تک مرتب ہوئے ہیں یا ولی کے عہد سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک شعرا کے متعلق جو واقعات و حالات سامنے آئے ہیں ان سب کا سرچشمہ یہی تذکرے ہیں۔ دکنی شعرا سے لے کر شمالی ہند کے ممتاز

۱۔ نگار "نیاز نمبر" حصہ اول، ص ۲۱۰، ۱۹۶۳ع۔
۲۔ نگار "نیاز نمبر"، حصہ اول، ص ۲۲۵۔

اُردو شعرا حاتم ، سودا ، میر ، یقین ، قائم ، مصحفی ، انشا ، آتش ، ناسخ ، جرأت ، ممنون ، میر حسن ، تاباں ، غالب ، مومن ، ذوق ، نسیم ، انیس ، دبیر اور ظفر وغیرہ کے کلام و زندگی کی جتنی تصویریں آج ہمارے سامنے ہیں وہ انھی تذکروں کی مدد سے تیار کی گئی ہیں اور یقین ہے کہ آئندہ بھی قدما پر جو کچھ لکھا جائے گا تذکروں کے سہارے لکھا جائے گا ۔ یہ مانا کہ شعرا کی زندگی و سیرت کے متعلق تذکرہ نگاروں کے بیانات میں بعض جگہ اعتدال و توازن کی کمی ہے اور گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے کہیں کہیں باہم رفاقت و رقابت کے زیر اثر بیجا تعریف یا تنقیص سے بھی کام لیا ہے ، لیکن سارے تذکروں کا یہ حال نہیں ہے ۔ ان تذکرہ نگاروں میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے لاگ اور لگاؤ ، دونوں سے بے نیاز رہ کر شعرا کے حالات و کلام پر تبصرے کیے ہیں ۔ ان کی تحریروں میں اخلاق رواداریوں کی پاسداری کے باوجود بے باکی ، حق بیانی اور اعتدال کی مثالیں ملتی ہیں ۔ ایسے تذکروں میں ''نکات الشعرا'' ، ''تذکرۃ الشعرا'' (میرحسن) ''گلشن بے خار'' ، ''گلزار ابراہیم'' ، ''خوش معرکۂ زیبا'' ، ''عمدۂ منتخبہ'' ، ''شمیم سخن'' اور ''آبِ حیات'' وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے اکثر بے رو و رعایت لکھا گیا ہے ۔ علاقائی لگاؤ ، رشتۂ شاگردی و استادی ، گروہ بندی اور معاصرانہ نوک جھونک کے باوجود ان کی راؤں میں توازن پایا جاتا ہے ۔ وہ بے سبب ہر جگہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے یا دوستوں کو اوپر اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے ۔ دوستی یا دشمنی کے باوجود وہ عموماً خدا لگتی کہتے ہیں ۔ سودا و میر کی چوٹیں ، مصحفی و انشا کے معرکے کس سے چھپے ہوئے ہیں لیکن میر و مصحفی نے اپنے تذکروں میں انشا و سودا کے متعلق کوئی بات نہیں کہی جو ان کے مرتبۂ شاعرانہ کے منافی ہو ۔ اسی طرح ان تذکرہ نگاروں نے اپنے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں عام شعرا کی طرح شاعرانہ تعلّی سے کام نہیں لیا بلکہ اکثر نے اپنا حال بڑے انکسار سے لکھا ہے ، اور اپنے لیے ہر جگہ احقر ، فقیر ، حقیر ، کمترین ، خاکسار اور عاجز و بے نوا وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اس غیر جانب داری کو حتی الوسع برتا ہے جس کے بغیر سوانح نگاری معتبر نہیں رہتی ۔

تذکروں کے سوانحی پہلو کے سلسلے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ تذکروں میں شاعر کی پیدائش ، اس کا خاندان ، اس کی زندگی کے مختلف واقعات ، اس کی تفصیلات ، اس کی تعلیم و تربیت ، اس کا ماحول ، ان میں کسی کے متعلق کافی تشفی بخش سامان نہیں ملتا ۔ تذکرہ نویسوں میں یہ قدرت نہیں کہ ان واقعات کو اس طرح بیان کریں کہ شاعر کی تصویر میں جان آ جائے اور بولنے لگے ۔[۱]

یہ اعتراضات جیسا کہ پچھلی سطور میں اظہار کیا جا چکا ہے ، بڑی حد تک درست ہیں ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج بھی وہ کون سی ادبی تاریخ یا تنقیدی کتاب ہے جس میں کسی شاعر یا ادیب کے متعلق یہ ساری تفصیلات ایک جگہ مل جاتی ہوں اور اس انداز سے کہ اس کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر سامنے آ جاتی ہو ۔ اس لیے اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جب کہ آمد و رفت ، رسل و رسائل ، نشر و اشاعت اور کتابت و طباعت کے ذرائع بہت محدود تھے اور کتابیں عموماً ذاتی ذوق و شوق اور تسکین کے لیے لکھی جاتی تھیں ، ان تذکرہ نگاروں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ مستند سوانح حیات کے ساتھ کسی شاعر کی منہ بولتی تصویر پیش کریں نامناسب ہے ۔ ہاں کچھ تصویری خاکے اور رنگ ان تذکروں میں ضرور مل جائیں گے اور اگر ہم کسی شاعر کی مکمل تصویر دیکھنا ہی چاہیں تو مختلف تذکروں کی مدد سے بہ آسانی تیار کر سکتے ہیں ۔ جن بزرگوں نے قدیم شعرا کے تذکرے مرتب کیے ہیں اور ان پر تفصیلی مقدمات لکھے ہیں ، انھوں نے اس قسم کے سوانحی خاکوں کی بہترین مثالیں ہر تذکرے کے سلسلے میں درج کی ہیں ۔ ہم ان کی تفصیل میں اس جگہ نہیں جانا چاہتے لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ تذکرہ نگاروں نے جو سوانحی خطوط پیش کیے ہیں وہ بنیادی اور اصلی ہیں ۔ اس لیے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے عموماً انھیں شعرا کی تفصیل دی ہے جن سے وہ ذاتی طور پر یا کسی دوست کے ذریعہ واقف تھے ۔ اس کے برعکس جن سے وہ باخبر نہ تھے ، ان کے متعلق اپنی لاعلمی کا صاف اظہار کر دیا ہے ۔ ذاتی واقفیت جس کے بغیر سوانحی مواد میں جان نہیں آتی تذکرہ نگاروں کا اصل ماخذ ہے اور اس ماخذ کی بدولت معاصرین کی زندگی کے

۱۔ اُردو تنقید پر ایک نظر ، ص ۱۰ تا ۳۶ ، از کلیم الدین احمد ، مطبوعہ دائرۂ ادب ، بانکی پور پٹنہ ، طبع اول ، مملوکہ انجمن ترقیِ اُردو کراچی ۔

متعلق ان کی رائیں اس درجہ وقیع ہو جاتی ہیں کہ ہم انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں تحقیق کی اکثر گتھیاں انھیں تذکروں نے سلجھائی ہیں ۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کی شاعری داخلی طور پر صاف پتا دے رہی تھی کہ وہ کسی پری تمثال کے تیرِ عشق کے گھایل تھے ۔ لیکن خارجی شہادت کے بغیر کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس صوفی منش شاعر پر عشق بازی کی تہمت لگاتا ۔ نتیجتہً دوسرے غزل گو شعرا کی طرح ان کے رنگِ مجازی کو بھی حقیقت کا ایک رخ خیال کیا جاتا تھا ۔ لیکن جب ایک تذکرہ نگار نے میر کے متعلق یہ انکشاف کیا کہ :

''میر با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع میل خاطر داشت[۱]''

تو میر کی شاعری کا مفہوم ہی بدل گیا ہے ۔ اس کی شاعری زندگی سے فرار کا نتیجہ خیال کی جاتی تھی ، لیکن تذکروں کے مطالعہ کے بعد اس کا ہر شعر زندگی کے مسائل میں گتھا ہوا نظر آنے لگا ۔

اسی طرح دوسرے شعرا کی نجی زندگی کے متعلق ان تذکرہ نگاروں نے بعض ایسے راز فاش کر دیے ہیں جو شاعر کی شخصیت و کلام دونوں کی تفہیم کے لیے ضروری تھے لیکن ہماری نظر سے اوجھل تھے ۔ چند مثالیں دیکھیے :

۱- میر حسن کو بہ سبب تقاضائے جوانی محل کی ایک عورت سے محبت و موانست ہوئی ۔ چونکہ طبیعت موزوں تھی ، بہ پاس خاطر معشوقہ مثنوی بے نظیر تصنیف کی ۔ (خوش معرکہٗ زیبا)

۲- ''آفتاب رائے رسوا بر یک پسر کمبوہ منو نام تعشق پیدا کردہ بود'' ۔ (نکات الشعرا)

۳- ''میاں عبد الحیٰ المتخلص بہ تاباں . . . در وقت خویش نظیرے نہ داشت ۔ سید زادۂ بود بہ کمال حسن و وجاہت تمام عالم فریفتہٗ حسن او بود بلکہ گرم بازاری ریختہ ازاں شعلہ رو دوبالا شد ۔ اکثر اشخاص این فن را وسیلہ ساختہ دخیل صحبت او می شدند . . . عاشقِ معشوق مزاج بہ یک طفلے سلیمان نام تعشق داشت (تذکرۂ

۱- ''بہار بے خزاں'' مؤلفہ احمد حسین سحر ، مطبوعہ علمی مجلس ، دہلی ۱۹۶۸ ع

میر حسن - ص ۳۵ -)

۴- جعفر علی خان [زکی] - . . . ذہن و ذکا و طبع رسا داشت سرائی رام راجہ بود برو تعشق داشت - (تذکرۂ میر حسن - ص ۴۰) -

۵- نام امت الفاطمہ بیگم تھا - صاحب جی کے نام سے مشہور تھیں حسن و صفات میں مثل آفتاب تھیں - اپنے معالجے کے سلسلے میں مومن خاں سے سابقہ پڑا . . . خاں موصوف کی مثنوی قول غمیں انھیں کے حسن و جمال کی شرح ہے - (ترجمہ گلشن بے خار از احسان الحق فاروقی ص ۲۹۹ - طبع کراچی ۱۹۶۲ع) -

۶- خواجہ حسن دہلوی نام . . . بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے اس پر مرتے ہیں اور اکثر نام اس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں - (گلشن ہند ص ۸۹ ، ۹۰ - طبع اول لاہور ۱۹۰۶ع) -

۷- آزاد : اسمش میر مظفر علی در ہنگامے کہ برنزاکت کنیزے عاشق و منازعہ باپتنا بیگم داشت معاملہ او مرجوع با حقیر بود - (گلزار ابراہیم مع گلشن ہند - ص ۲۹ - مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۴ع) -

۸- فضایل علی خان بے قید . . . جوان محمد شاہی بود خوش خوراک و خوش پوشاک . . . با یکے از تپان ہند تعشق پیدا کردہ بود - (تذکرۂ میر حسن ، ص ۱۱۸ ، طبع دوم)

۹- نزاکت تخلص ، رمجو نام نارنول کی بتِ بازاری ہے جو شیفتہ مرحوم صاحبِ گلشن بے خار کی دوستداری سے شاعری میں نام پا گئی - (تذکرۃ النساء مؤلفہ درگا پرشاد نادر)

ان میں سے میر تقی میر ، میر حسن اور شیفتہ خود تذکرہ نگار ہیں - لیکن انھوں نے اپنے تذکروں میں اپنے معاشقوں کا سراغ نہیں دیا - پھر بھی دوسرے تذکرہ نگاروں نے راز کو راز نہ رہنے دیا اور وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ایک بے لاگ سوانح نگار ہی کہہ سکتا ہے -

ڈاکٹر سید عبد اللہ نکات الشعرا کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''تنقید سخن کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت کے متعلق اس قدر برہنہ اور واشگاف رائیں پائی جاتی ہیں جن کو پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے - ایک تو یوں بھی یہ بات زمانے

کی فضا کے خلاف تھی ، پھر یہ بات اور بھی مستزاد ہوئی کہ معاصرین پر رائے زنی کرتے ہوئے میر نے ان کی دلشکنی کی مطلق پروا نہیں کی ۔'' لیکن یہ چیز میر تقی میر ہی تک محدود نہیں ہے ، بلکہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اکثر یہی بے باک روش اختیار کی ہے اور نجی زندگی کی ایسی جزئیات و تفصیلات پیش کر دی ہیں کہ اگر ہم انھیں مختلف تذکروں سے یک جا کریں تو ہر شاعر کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ سکتی ہے ۔ لیکن ضرورت ہے قدیم تذکروں کو چھاننے کی ۔ یہ کام بہت مشکل ہے ۔ ہاں ان کی کمزوریاں بغیر مطالعہ بھی گنوائی جا سکتی ہیں ۔

تذکروں میں ادبی تاریخ کا مواد :

کریم الدین نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے کہ ''تذکرے اور طبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں ، خصوصاً زبان عرب اور فارسی میں اس قسم کی بہت ہی تصنیف ہوئی ہیں ، ان کی دیکھا دیکھی زبان اردو میں بھی اس طریق تصنیف کا استعمال کیا ہے'' ۔[1]

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم تذکرہ نگار تذکرہ نگاری کو تاریخ نگاری سے الگ چیز نہ سمجھتے تھے ۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان تذکروں میں تاریخ کے اوصاف نہ پائے جاتے ہوں ۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سنین اور ادوار کے تعین کا اہتمام نہیں کیا گیا ۔ واقعات و حالات کی تدوین و ترتیب بھی تاریخوں اور سنوں کا لحاظ رکھ کر نہیں کی گئی ۔ اس کے باوجود یہ تذکرے تاریخ و عہد کے احساس و اظہار سے یک سر خالی نہیں ہیں ۔ ابتدائی تذکروں میں زبان و بیان کے عہد بہ عہد ارتقا پر تاریخی تبصرے تو نہیں ملتے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ قدیم و جدید ادوار اور اسلوب شعر و ادب کی تبدیلیوں کا شعور ان میں پایا جاتا تھا ۔ چنانچہ قائم نے مخزن نکات مؤلفہ ۱۱۶۸ھ میں شعرا کے خاص ادوار قائم کیے ہیں اور دکنی و شمالی ہند کے شعرا پر غیر جانبدارانہ تنقیدی

۱۔ دیباچہ طبقات الشعرائے ہند ، مطبوعہ ۱۸۴۸ع ۔

رائے دے کر معاصر شعرا کے مراتب متعین کیے ہیں ۔[۱] قائم کے بعد میر حسن نے بھی یہی روش اختیار کی ہے اور ہر دور کو متقدمین ، متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کرکے شعرا کا ذکر کیا ہے ۔ گلزار ابراہیم مؤلفہ ۱۱۹۸ھ اور گلشن ہند مؤلفہ ۱۲۱۵ھ میں تاریخ نگاری کے عناصر اور بھی نمایاں ہو گئے ہیں ۔ گلزار ابراہیم کے مصنف علی ابراہیم خاں چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اس لیے انھیں شعرا کے حالات جمع کرنے میں بڑی آسانیاں تھیں ۔ چنانچہ انھوں نے اکثر تاریخ پیدائش و وفات کا تعین کیا ہے ۔ شعرا کے حالات خط و کتابت کے ذریعے فراہم کیے ہیں اور ان خطوط کے اقتباسات بھی دیے ہیں ۔ گلشن ہند میں مرزا علی لطف نے حالات کو مزید تفصیلی اور باوثوق بنانے کی کوشش کی ہے ۔ گارسیں دتاسی چونکہ مستشرق ہے اس لیے اس کا نقطۂ نظر تذکرہ نگاری کے باب میں بہت مختلف ہے ۔ وہ تاریخ ادب ہندوستانی کی پہلی جلد میں اردو زبان و ادب کی پیدائش اور ارتقا پر بحثیں کرتا ہے اور دیباچے میں اردو شاعری کے مختلف ادوار کا جائزہ لے کر شعرا کے حالات لکھتا ہے ۔ کریم الدین بھی طبقات الشعرا میں گارسیں کے پابند نظر آتے ہیں اور اردو شاعری و ادب کو تاریخی حیثیت سے موضوع بحث بناتے ہیں ۔ ''گلستان سخن'' ، ''انتخاب دواوین'' اور ''خزینۃ العلوم'' کے دیباچے بھی تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہیں ۔ ان میں مختلف ادوار کے اسلوب سخن ، زبان و بیان کی تبدیلیوں اور کلام کے محاسن و معائب کا ذکر آیا ہے ۔ نتیجۃً ہمیں ان تذکروں کے ذریعے اکثر شعرا کا سال وفات ، تاریخ پیدائش ، سکونت ، ولدیت ، شاگردی ، استادی ، مزاج ، پسندیدہ صنف ، انداز سخن گوئی ، طرز ادا اور اس کا شاعرانہ مرتبہ کم و پیش ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔ ''شمیم سخن'' اور ''آب حیات'' میں تذکرہ نگاری براہ راست تاریخ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے ۔ ان میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو کسی قدیم ادبی تاریخ سے توقع کی جا سکتی ہے ۔

لیکن تذکروں کا تاریخی مواد صرف شعرا کے حالات زندگی یا ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ تک محدود نہیں ہے ۔ ان میں بعض تحریکوں ، ادبی روایتوں ،

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''اردو کے قدیم تذکرے'' از حبیب اللہ غضنفر ، مطبوعہ ''اردو'' جنوری و اپریل ۱۹۵۳ع ۔

شعری محفلوں ، سماجی رسموں اور اخلاقی قدروں کا سراغ بھی ملتا ہے ۔
خواجہ احمد فاروقی نکات الشعرا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اگر تنقید ایک سماجی عمل ہے تو اس سے سماجی حالات بھی واضح ہو سکتے ہیں ۔ میر کی تنقیدوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ اس زمانے میں ہندو اور مسلمان میں بڑا اتحاد اور میل جول تھا اور بعض شعرا قیدِ مذہب و ملت سے آزاد تھے ۔
۲۔ اہلِ قلم اہلِ سیف بھی تھے اور سخن فہمی و شمشیر شناسی میں تضاد نہیں تھا ۔
۳۔ درویشی اور شاعری دوش بدوش چلتی تھیں ۔
۴۔ زمانے پر ایک انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا اس لیے بعض شعرا ہزل کی طرف مائل تھے ۔
۵۔ مشاعرے معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کی حیثیت ادبی جلسے کی ہی نہیں تھی ، تنقیدی ادارے کی بھی تھی ۔
۶۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ فارسی بھی زوال پذیر تھی اور اس کی خاکستر اُردو کے لیے سامان وجود بن گئی تھی ۔[1]

یہ باتیں نکات الشعرا تک محدود نہیں ہیں بلکہ سماجی زندگی کی یہ تفصیلات دوسرے تذکروں میں بھی ملتی ہیں اور ادبی تاریخ نگاری کے لیے بیش بہا سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

بحث کا ماحصل :

اوپر تنقید اور سوانح نگاری یا شخصیت کی عکاسی کے سلسلے میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بطور نمونہ یا مثال ہے ۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ جن تذکروں کے مندرجات کے حوالے دیے گئے ہیں صرف وہی کار آمد ہیں ۔ ایسا نہیں ہے ۔ ہر تذکرے سے اس کے اپنے عہد کی شاعرانہ فضا اُبھرتی ہے اور ادبی

۱۔ میر تقی میر : ”حیات اور شاعری“ ، ص ۵۲۹ ، ۵۳۰ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ۱۹۵۴ع اشاعت اول ۔

ذوق کی نمائش ہوتی ہے - ہم نے تذکروں کے سوانحی ، تنقیدی اور تہذیبی پہلوؤں پر اوپر مفصل گفتگو یوں نہیں کی کہ اگلے صفحات میں ہر تذکرے کی بحث میں الگ الگ ان پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کون سا تذکرہ کس نہج سے اور کن اسباب کی بنا پر اہم خیال کیے جانے کے لائق ہے - بہ حیثیت مجموعی اپنی جملہ کمزوریوں کے باوجود اُردو شعرا کے تذکرے ہماری تاریخ ادبیات کا ایک بیش قیمت حصہ ہیں - انھیں نظر انداز کر کے نہ تو ہم اُردو زبان و ادب کی ارتقائی منزلوں کا سراغ لگا سکتے ہیں اور نہ اس کے ماضی و حال اور مستقبل میں کوئی رشتہ قائم کر سکتے ہیں - چنانچہ کلاسیکی شاعری اور ادب دونوں سے متعلق آج ہم جو کچھ جانتے ہیں ، انھیں تذکروں کے توسط سے جانتے ہیں اور آئندہ بھی ادبی تاریخ و تنقید یا تحقیق و سوانح نگاری کا کوئی کام تذکروں سے بے نیاز رہ کر نہیں کیا جا سکتا - تذکروں کی یہی اہمیت ہے جو کسی ادیب یا ناقد کو ان کے مطالعہ پر اکساتی ہے اور مجبور بھی کرتی ہے -

نکات الشعرا :

اُردو کے مشہور شاعر میر تقی میر کی تصنیف ہے - میر کے والد محمد علی [خطاب از مرشد بہ نام علی متقی] اپنے زمانے کے خدا رسیدہ بزرگ تھے - میر تقی میر ۱۱۳۵ھ میں بمقام اکبر آباد پیدا ہوئے اور ۱۲۲۵ھ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی - ابتدائی تعلیم و تربیت اکبر آباد میں ہوئی - والد کے انتقال کے بعد دلی گئے اور اپنے علاقی بھائی کے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے ساتھ رہ کر علوم و فنون مروجہ میں مہارت حاصل کی - اُردو فارسی دونوں میں صاحب دیوان ہیں - اس کے علاوہ ذکرِ میر اور نکات الشعرا وغیرہ بھی ان سے یادگار ہیں -

اول تو خود میر تقی میر نے اپنے حالات زندگی پوری تفصیل سے لکھ دیے ہیں ، دوسرے یہ کہ اُردو کے تقریباً سارے قدیم و جدید تذکروں میں ان کے حالات ملتے ہیں - علاوہ ازیں پچھلے پچیس تیس سال میں ان کی زندگی اور فن پر مقالات و کتب کی صورت میں اتنا تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا ہے کہ اس جگہ ان

کے حالات میں کچھ لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔[۱]

میر تقی میر نے اپنے تذکرے کے آغاز، وسط یا اختتام، کہیں پر بھی سال تصنیف کا سراغ نہیں دیا ۔ صرف آنند رام مخلص کے ترجمے میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ:

''قریب یک سال است کہ در گذشت''

چونکہ آنند رام مخلص کی وفات ''خزانۂ عامرہ'' مؤلفہ آزاد بلگرامی کے مطابق ۱۱۶۴ھ میں ہوئی ہے، اس سے محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہوا ہے ۔ لیکن میر نے اس کا آغاز ۱۱۶۱ھ ہی میں کر دیا تھا[۲] ۔ رہا یہ مسئلہ کہ میر تقی میر نے اولیں تذکرہ نگار ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے وہ کس حد تک درست ہے اور مخزن نکات مؤلفۂ قائم، تذکرۂ ریختہ گویاں مؤلفہ گردیزی، تحفۃ الشعرا مؤلفہ قاقشال، گلشن گفتار مؤلفہ حمید اورنگ آبادی اور زیر بحث نکات الشعرا مؤلفہ میر تقی میر میں سے کون سا تذکرہ مقدم یا مؤخر ہے اس سلسلے کی بحث ہم پچھلے صفحات میں کسی جگہ تفصیل سے کر چکے ہیں، اس لیے اس جگہ اس کا دہرانا مناسب نہیں ۔

۱۔ میر کے سلسلے میں تذکروں کے علاوہ دیکھیے:

(۱) مقدمۂ کلیات میر مرتبہ مولوی عبدالباری آسی، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۹۴۰ع ۔

(۲) مقدمۂ انتخاب کلام میر مرتبۂ مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۵۰ع ۔

(۳) میر تقی میر حیات اور شاعری از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ۱۹۵۴ع ۔

(۴) ''میر نمبر'' دلی یونی ورسٹی میگزین مرتبہ نثار احمد فاروقی، مطبوعہ دلی یونی ورسٹی ۱۹۶۲ع ۔

(۵) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مطبوعہ ۱۹۶۸ع اُردو اکیڈیمی سندھ، کراچی ۔

(۶) ''ذکر میر'' از میر تقی میر، اُردو ترجمہ از مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ع ۔

۲۔ مقدمۂ دستور الفصاحت، ص ۶۴ مرتبہ مولانا عرشی، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

نکات الشعرا کا ایک صاف ستھرا قلمی نسخہ جو کہ ۱۱۷۲ھ میں یعنی تالیف کے صرف سات سال بعد لکھا گیا تھا، مولوی عبدالحق صاحب کے ہاتھ لگا اور انھوں نے مفید مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۵ع میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے شائع کر دیا - اس کے دو اڈیشن نکل چکے ہیں اور عام طور پر دستیاب ہیں - اس وقت دونوں اڈیشن میرے سامنے ہیں -

اس سے پہلے نکات الشعرا کا ایک اڈیشن محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقدمہ کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے - مولوی عبدالحق کا اڈیشن ٹائپ میں چھپا ہے، شروانی کا اڈیشن نستعلیق لیتھو میں - اس کے سرورق پر سلسلہ' انجمن ترقی اُردو نمبر ۲۸ درج ہے اور مولوی عبدالحق کے اڈیشن کے سرورق پر بھی انجمن کا یہی سلسلہ نمبر درج ہے - شروانی کے مرتبہ نکات الشعرا کی اشاعت اول بھی ہمارے پیش نظر ہے - اس میں کل ۲۲۶ صفحے ہیں - ۱۸۸ صفحوں میں اصل تذکرہ ہے اور ۳۸ صفحے میں شروانی صاحب کا بسیط مقدمہ ہے[1] - اس مقدمے میں میر صاحب کی پاک مشربی، ادب و تہذیب، تحقیق، بے لاگ رائیں اور انصاف، دوستی کے مراتب، اصلاحیں، طرز تحریر، طرز معاشرت، آب حیات اور نکات الشعرا اور انتخاب اشعار وغیرہ کے عنوانات قائم کر کے نکات الشعرا پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

۱۹۶۲ع میں اس کا اُردو ترجمہ ایم - کے - فاطمی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ دانش محل لکھنؤ سے شائع کیا - اسی سال ان کی مختصر کتاب ''اُردو تذکروں میں نکات الشعرا کی اہمیت'' بھی منظر عام پر آئی - ۱۹۶۳ع میں ایس - ایم شاہ نے ایم اے فائنل (اُردو) کے امتحان کے لیے نکات الشعرا کا ترجمہ کیا اور اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا - یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ٹائپ شدہ مسودہ کراچی یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے -

نومبر ۱۹۶۸ع میں پروفیسر عطا الرحمٰن کاکوی نے ''تین تذکرے'' کے عنوان سے نکات الشعرا، مخزن نکات اور تذکرۂ گردیزی کے تراجم کو اُردو میں منتقل کر کے یکجا شائع کیا - اس میں صرف نثری تراجم ہیں اشعار محذوف کر دیے

۱- نکات الشعرا اُردو، ص ۱ تا ۳۸، مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، اشاعت اول ۱۹۲۰ع -

گئے ہیں - شروع میں مختصر سا مقدمہ ہے جس میں تینوں تذکروں کا تعارف کرایا گیا ہے -[۱]

نکات الشعرا کے ایک قلمی نسخے کا تعارف مولانا عرشی نے دستور الفصاحت کے مقدمہ میں کرایا ہے - ایک اور نامکمل نسخے کا سراغ آزاد لائبریری علی گڑھ کے حوالہ سے نثار احمد فاروقی نے دیا ہے -[۲]

نکات الشعرا اُردو شعرا کے قدیم ترین تذکروں میں سے ہے اور ہمارے شعر و ادب کی تاریخ کے سلسلے میں ماخذ اول کی حیثیت رکھتا ہے - اس میں میر تقی میر نے لکھا ہے کہ:

"پوشیدہ نہ ماند کہ در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلائ شاہجہان آباد دہلی ، کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوال شاعران این فن بصفحۂ روزگار بماند - بناء علیہ این تذکرہ کہ مسمی بہ نکات الشعرا است نگاشتہ می شود -"[۳]

یعنی وہ پہلے تذکرہ نگار ہونے کے مدعی ہیں - جیسا کہ پچھلے صفحات میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ یہ بات کچھ ایسی غلط نہیں ہے - جس وقت میر نے اپنا تذکرہ مکمل کیا ہے اس وقت اگرچہ بعض تذکرے تکمیل کو پہنچ گئے تھے اور بعض لکھے جا رہے تھے ، ممکن ہے بعض کے متعلق انھیں خبر رہی ہو اور کچھ اجزا بھی ان کی نظر سے گزرے ہوں ، لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل صورت میں ان کے سامنے موجود نہ تھا کہ وہ اپنے تذکرے کو اس کا نقش ثانی خیال کرتے -

نکات الشعرا کی اہمیت ہمارے ادب میں تنقیدی بھی ہے اور سوانحی و تاریخی بھی - مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اس میں عموماً اور اکثر شعرا کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید

۱- "تین تذکرے" مرتبہ عطا کاکوی مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۶۸ع -

۲- نکات الشعرا کی ایک اور روایت ، ص ۳۹۲ ، از نثار فاروقی مشمولہ میر نمبر ، دلی کالج میگزین مطبوعہ ۱۹۶۲ع -

۳- دیباچہ نکات الشعرا ، ص ۱ ، مرتبۂ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ ۱۹۳۵ع -

پائی جاتی ہے ۔"[۱]

ایک اور جگہ مولوی عبدالحق صاحب نکات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"میر صاحب پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جہاں کوئی سقم نظر آیا ہے بےرو و رعایت اس کا اظہار کر دیا ہے اور ہر شاعر کے متعلق جو ان کی رائے ہے اس کے ظاہر کرنے میں انھوں نے مطلق تامل نہیں کیا ۔ یہ بات ہمارے تذکرہ نویسوں میں عام طور سے مفقود ہے ۔ وہ اپنے گروہ کے شاعروں کی جا و بے جا تعریف کرتے ہیں اور حریف گروہ والوں کی تعریف اول تو کرتے نہیں اور جو کرتے بھی ہیں تو دبی زبان سے اور اس میں بھی کوئی چوٹ ضرور کر جاتے ہیں ۔ میر صاحب کی شان اس سے بہت ارفع تھی وہ کسی جتھے سے تعلق نہیں رکھتے ۔ علاوہ اس کے میر صاحب نے حالات بیان کرنے میں بھی تا مقدور صحت سے کام لیا ہے اور بعض غلط فہمیوں کو سب سے اول انھوں نے رفع کیا ہے ۔"[۲]

آخری جملوں سے مولوی صاحب کی مراد یہ ہے کہ میر صاحب نے دوسرے تذکرہ نگاروں کے برخلاف یہ بتایا ہے کہ جو ریختہ شیخ سعدی سے منسوب چلا آ رہا ہے وہ در اصل سعدی دکنی سے تعلق رکھتا ہے ۔[۳] میرزا جان جانان کا صحیح نام مرزا جانِ جان ہے،[۴] اور ولی کا تعلق احمد آباد سے نہیں اورنگ آباد سے ہے ۔[۵] حالانکہ ولی کے سلسلے میں آج اکثر محققین کی رائے اس کے برعکس ہے ۔

یہ خیال صحیح ہے کہ میر تقی میر نے شعرا کے متعلق بے لاگ رائیں دی ہیں ۔ ان کی رائے سے ہم اختلاف کریں یا اتفاق ، اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ

۱۔ مقدمہ نکات الشعرا ، ص د ، مرتّبہ عبدالحق ، مطبوعہ ۱۹۳۵ع ۔

۲۔ مقدمہ تذکرۂ ریختہ گویان ، ص ۱۲ مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳ع ۔

۳۔ نکات الشعرا ، ص ۱۰۳ ، مطبوعہ ۱۹۳۵ع ۔

۴۔ نکات الشعرا ، ص ۵ ، مطبوعہ ۱۹۳۵ع ۔

۵۔ نکات الشعرا ، ص ۸۹ ، مطبوعہ ۱۹۳۵ ۔

شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی اچھا شعور رکھتے تھے۔ ان کے لسانی اور تنقیدی شعور کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرے کے آخر میں ریختہ اور اس کے اقسام کی تعریف کرتے ہوئے فن شعر کے معیار کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

بدان کہ ریختہ بر چندین قسم است از آنجملہ انچہ معلوم فقیر است نوشتہ می آید:

اول: آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعۂ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ نوشتہ شد۔

دویم: اینکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی چنانچہ شعر میر معرکہ نوشتہ آمد۔

سوم: آنکہ حرف و فعل پارسی بہ کار می برند و این قبیح است۔

چہارم: آنکہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد۔
آن جایز است و این را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ ناموس ریختہ می باشد آن معیوب است و دانستن این نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمین است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضایقہ ندارد۔

پنجم: ایہام است کہ در شاعران سلف درین فن رواج داشت۔ اکنون طبعہا معروف این صنعت کم است مگر بسیار بشستگی بستہ بشود . . .۔"

ششم: انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آن محیط ہمہ صنعتہا است۔[1]

گویا اس مختصر عبارت میں میر تقی میر کے ذہن میں اردو شاعری اور اس کے معیار فکر و فن کے متعلق جو اصول تھے ان کا اظہار کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے میر اردو شاعری کے پہلے ناقد ہیں جن کے یہاں عملی تنقید سے الگ، نظری

۱۔ نکات الشعرا، ص ۱۷۹ تا ۱۸۰، مرتّبہ عبدالحق، مطبوعہ ۱۹۳۵ع۔

تنقید کے سلسلے میں بھی بعض اصولوں اور راؤں کی نشان دہی ملتی ہے - یہ اصول آج ہمارے آپ کے لیے قابل قبول ہوں یا نہ ہوں لیکن کسی زمانے میں فن کو جانچنے کے پیمانے یہی تھے اور آج بھی ہم ، کلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر سہی ، ان اصولوں کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتے -

مختلف شعرا کے تراجم پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر تقی میر شاعری کے سلسلے میں جن چیزوں پر زیادہ زور دیتے ہیں وہ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱) دردمندی (۲) صفائے گفتگو (۳) تہ داری اور (۴) اصلیت یا حقیقت نگاری ہے -[۱] اردو کے بعض ناقدین اور تذکرہ نگار میر تقی میر کے انداز تنقید کو متوازن نہیں سمجھتے - ان کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی خود پسندی کے سبب بعض شعرا کی بے جا تعریف کی ہے اور بعض کو بے سبب لتاڑا ہے - خصوصاً حاتم ، یقین ، حشمت ، خاکسار اور یکرو کے بارے میں میر نے جو کچھ لکھا ہے اور جس تلخ لب و لہجہ کے ساتھ یاد کیا ہے اس کی بنا پر بعض انھیں ایک منصف مزاج نقاد تسلیم نہیں کرتے - بایں ہمہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے نکات الشعرا کے تنقیدی پہلو پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :

''نکات میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے اور تنقید سخن کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت کے متعلق اس قدر برہنہ اور واشگاف رائیں پائی جاتی ہیں جن کو پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے - ایک تو یوں بھی یہ بات زمانے کی فضا کے خلاف تھی ، پھر یہ بات اور بھی مستزاد ہوئی کہ معاصرین پر رائے زنی کرتے ہوئے میر نے ان کی دلشکنی کی مطلق پروا نہیں کی -''[۲]

تنقیدی پہلو سے قطع نظر سوانحی اور تاریخی اعتبار سے بھی نکات الشعرا کی اہمیت مسلم ہے - اس کے تراجم کے ذریعے صرف یہی نہیں کہ میر کی زندگی اور شخصیت کے بعض اہم اجزا ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ جن شعرا کا ذکر انھوں

۱- نگار ، لکھنؤ ، فروری مارچ ۱۹۴۶ع ، انتقاد نمبر حصہ دوم ، ص ۶۱ -
۲- شعرائے اردو کے تذکرے ، ص ۲۰ ، مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ع اشاعت اول -

نے کیا ہے ان پر اور ان کے ماحول پر بھی ایسی روشنی پڑتی ہے کہ ہمیں ان کی چہرہ نگاری اور سماجی شعور کا قایل ہی ہونا پڑتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ میر خاکہ بناتے وقت مناسب الفاظ پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ نہایت جامع اور پُر معنی ہوتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے صحیح لکھا ہے کہ میر نے اپنے تذکرے میں ایک سو سے زائد شعرا کے قلمی چہرے پیش کیے ہیں لیکن ان رنگا رنگ صورتوں میں خود ان کے چہرے کی بھی اصلی جھلک موجود ہے[۱] . . . اس جھلک میں جو باتیں بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں وہ ان کے مزاج کی شگفتگی اور خوش خلقی ہے۔ میر کے متعلق بعض ناقدین کا یہ خیال کہ وہ ایک افسردہ طبیعت، خشک مزاج، مردم بیزار اور خلوت پسند آدمی تھے، نکات الشعرا کی روشنی میں درست نہیں معلوم ہوتا۔ قزلباش خاں امید، میاں شرف الدین مضمون، خواجہ میر درد، یک رنگ، میر حسن علی، میر علی نقی، محمد حسین کلیم، میر حسن، فضل علی دانا اور میر عبد الرسول نثار وغیرہ کے تراجم سے ان کی شخصیت کا جو روپ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ میر ایک خوش اخلاق و خوش مزاج آدمی تھے۔ اپنے دوستوں پر خود بھی فقرے چست کرتے تھے اور دوسروں کے برجستہ فقروں کی کھلی داد دیتے تھے۔ عرسوں اور میلوں میں بھی شرکت کرتے تھے اور دوسروں کے یہاں شعر و سخن کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ خود اپنے گھر مشاعرے کرتے تھے اور دوسری جگہ بھی جاتے تھے۔ لوگوں سے ملنے ملانے میں بھی کوئی تکلف نہ تھا۔ لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ خود بھی دوسروں سے ملنے کے لیے جاتے تھے۔ دوستوں کی محفل میں بے تکلف ہنستے بولتے تھے اور ایک عام آدمی کی طرح محفل احباب سے لطف اٹھاتے تھے۔

غرضیکہ نکات الشعرا، تنقید اور سوانح دونوں لحاظ سے اردو شعر و ادب کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ اس کے ذریعہ میر اور ان کے معاصرین اور ماحول کے متعلق بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں، جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ تھیں۔

۱- میر تقی میر، حیات اور شاعری، ص ۵۲۶ تا ۵۲۹، مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۴ء۔

نکات الشعرا کی زبان فارسی ہے اور مولوی عبدالحق کے مرتّبہ مطبوعہ نسخے کی فہرست کے مطابق اس میں ایک سو تین شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ مطبوعہ فہرست میں شعرا کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی کر دی گئی ہے لیکن شعرا کے تراجم میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ سب سے پہلے امیر خسرو کا ذکر ہے، اس کے بعد مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا معز فطرت موسوی، مرزا جانِ جاں مظہر، شاہ ولی اللہ اشتیاق اور قزلباش امید کے ترجمے علی الترتیب شامل ہیں۔ سب سے آخر میں میر تقی میر نے اپنا ذکر کیا ہے۔ حالات میں صرف اس قدر ہے کہ:

> ''فقیر حقیر میر محمد تقی میر مؤلف این نسخہ متوطن اکبر آباد است بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہان آباد است۔''[1]

باقی پچیس صفحوں میں انتخاب کلام ہے۔ اس میں غزل کے اشعار، قطعات اور رباعیات سبھی شامل ہیں۔ میر کے ذکر کے بعد ڈیڑھ صفحے کا خاتمہ ہے جس میں میر نے ریختہ کی تعریف متعین کی ہے۔ آخری چند سطروں میں ترقیمہ ہے۔ اس جگہ امید اور دانا کے تراجم بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

قزلباش خان امید:

> مردے مغلے بود شاعر غرائے فارسی، نکتہ پرداز، بذلہ سنج، کوچک دل، عزیز دلہا، یار باش، خوش اختلاط، ہمیشہ خندان و شگفتہ رو بسر برد، داخل ذیل امرا بود و در ہر سیر و تماشا می رفت و صحبتہا میداشت چنانچہ یکروز در عرس سید حسن رسول نما صاحب قدس سرہ العزیز بندہ نیز بہ تحریک یاران موافق رفتہ بود و او ہم تشریف می داشت چون مرا از دور دید گفت کہ خوش باشد کہ من ہم درین ایام دو شعر ریختہ موزون کردہ ام بہ شنوید ازو است۔[2]

فضل علی:

> دانا تخلص مردیست نوکر پیشہ وارستہ لطیفہ گو شاگرد میاں مضمون، تلاش لفظِ تازہ بسیار می کند اصل او از شاہجہان آباد است اتفاقاً در

۱۔ نکات الشعرا، ص ۱۵۴، مرتّبہ مولوی عبدالحق مطبوعہ ۱۹۳۵ع طبع ثانی۔
۲۔ نکات الشعرا، ص ۷، مرتبہ مولوی عبدالحق مطبوعہ ۱۹۳۵ع طبع ثانی۔

موسم ہولی تاریخ پانزدہم کہ مجلس خانۂ فقیر مقرر است واقع شد میاں دانا نیز تشریف داشت لیکن بہ لباس عجیبے - یک تنی سیاہ بہ بر کردہ کہ دامنش تا بہ زانو بود چون رنگ ذات شریف و ریش ازحد زیادہ ہر دو سیاہ بود - مرزا رفیع کہ سابق گذشتہ بمجرد مشاہدہ کردن او گفت کہ ''یارو ہولی کا ریچھ آیا'' کہ بزبان فارسی خرس ہولی میتوان گفت چون در ہندوستان رسم است کہ در آن روزہا اداجیف و اطفال وغیرہم خرس و بوزنہ و اسپ و شتر برائے خوشی ہم دیگر می سازند این لطیفہ بسیار بہ موقع افتاد بلکہ صورت گرفت القصہ دانا عجب کسے است - گہ گاہ با فقیر نیز ملاقات می کند ازوست . . . -''[۱]

☆ ☆ ☆

۱- نکات الشعرا ، ص ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۵ع طبع ثانی -

گلشنِ گفتار

گلشنِ گفتار کے مصنف حمید اورنگ آبادی ہیں۔ ان کے حالات نہ کسی تذکرے میں ملتے ہیں اور نہ خود انھوں نے گلشنِ گفتار کے دیباچے یا خاتمے میں اپنے متعلق کچھ لکھا ہے۔ حتیٰ کہ شاعر کی حیثیت سے بھی اپنا ذکر نہیں کیا۔ دیباچے کے آخری حصے میں ''تعریف تالیف'' کے تحت صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ:

''من جرعہ چش صہبائے سخن معنی سنجان خواجہ خان بن ترکتاز خان بہادر قوی جنگ بن یکہ تاز خان غفراللہ لہما مسمیٰ بہ تخلص حمید نیز بہ احیائے سننِ سلف مدام بہ جام سخنوری مست و سرشار بودہ بہ افکارِ زمانۂ ناہنجار بیزار گردیدہ ذکر اشعار روشن فکرتان معانی آرایان نصیحت می دانم و فکر سخنان ہوش بخش مسرت افزا غنیمت می شمارم بسکہ از فیض سخن شوکتہا یافتم یمنِ خاطر را نزہت بخشیدم دل را از افکارِ علائق غنی ساختم و طبیعت را از کشاکشِ خلائق بے نیاز گردانیدم خواستم کہ شغلے پیش گیرم و تذکرۃ الشعرا نویسم لیکن جون عبارت آرایانِ معنی طراز اکثر تذکرۃ الشعرا فارسیہ بحیط تحریر درآوردہ اند تالیف آن تحصیل حاصل می انجامد بنا برین تذکرۃ الشعرائے ہندیہ ترتیب دادم و بہ مضامین تازہ دلہا را گلشن گلشن ساختم و نامش گلشن گفتار نہادم:

لکھا ہم نے جب تذکرے کو حمید
ہوا خوش جسے فہمِ اشعار ہے
تلاش اس کی تاریخ کی کر کے دل
کہا ''گلشن بزمِ گفتار ہے''

اس عبارت سے حمید کے متعلق صرف اتنی باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ ان کا نام

خواجہ خاں اور ان کے والد کا نام ترک تاز خاں اور دادا کا نام یکہ تاز خاں تھا ۔ خطابات و القاب سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کا تعلق متمول خاندان سے تھا ۔ شعر و سخن کا ذوق طبعی تھا ۔ اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کا شوق شروع سے ہی تھا ۔ خود بھی شاعر تھے ، فارسی شعرا کے تذکروں سے باخبر تھے ۔ اُردو شعرا کا کوئی تذکرہ ان کے علم میں نہ تھا اس لیے انھوں نے فارسی شعرا کے بجائے اُردو شعرا کا تذکرہ ترتیب دیا اور گلشنِ گفتار اس کا نام رکھا ۔ اُن کے بارے میں ایک دو باتیں اور داخلی شہادتوں کے ذریعے سامنے آتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ بعض دکنی شعرا سے ان کی ملاقات تھی اور بعض سے گہرے روابط تھے مثلاً مرزا ابدال بیگ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

"باشندۂ برہان پور از مدتے در رفاقت احقر ہستند کم گو و کم ملاقات اکثر اوقات خطوط بجانب دوستان تحریر می نمایند ۔"

(گلشنِ گفتار ، ص ۵۴ ، طبع اول)

اس سے پتا چلتا ہے کہ ابدال سے حمید کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے ۔ اسی طرح عاجز کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

"از آنجا کہ این احقر بہ ایشان محبتِ تمام دارد و ہم سخن گوئی بہ برکتِ فیض ایشان اکثر قصاید بے نقطہ وغیرہ مع غزلیات دیوان فارسی ترتیب دادہ و اشعار متفرقۂ ہندی نیز بہ دستور معروف جمع نمودہ دیوانِ ہندیِ ایشان مرتّب ساختہ ۔" (گلشنِ گفتار ، ص ۵۹)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمید شاعری میں عاجز کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنے استاد کے کلام کو دیوان کی شکل میں مرتّب کرنے کا کام بھی انجام دیا تھا ۔

اس سے زیادہ حمید اورنگ آبادی کے حالات زندگی کا پتا نہیں چلتا ۔

دیباچے میں حمید اورنگ آبادی کا جو قطعۂ تاریخ ملتا ہے اس کا آخری مصرعہ یہ ہے :

"کہا گلشن بزم گفتار ہے"

"گلشن بزم گفتار ہے" کو مادۂ تاریخ قرار دے کر گلشنِ گفتار کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ برآمد ہوتا ہے ۔ تحسین سروری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں یہ ظاہر

کیا ہے کہ گلشنِ گفتار کی بنا ۱۱۶۵ھ سے بہت پہلے پڑی ہوگی - موجودہ دستیاب نسخہ ان کے نزدیک اس تذکرے کا اصل نسخہ نہیں بلکہ نامکمل اور ناقص نسخہ ہے اس لیے کہ اس میں دکن اور شمالی ہند دونوں علاقوں کے بعض بہت معروف شعرا مثلاً میر تقی میر اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا - ان کا خیال ہے کہ حمید کے اصل تذکرے میں ان شعرا کے تراجم ضرور شامل رہے ہوں گے - اس سلسلے میں تحسین سروری نے مفصل بحث کرتے ہوئے جو دلیلیں دی ہیں وہ بالاختصار یہ ہیں[۱]:

۱- حمید اورنگ آبادی نے داؤد کے ذکر میں سراج اورنگ آبادی کو داؤد کا معاصر بتایا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ حمید، سراج سے واقف تھے - لیکن سراج کا ذکر موجودہ نسخے میں موجود نہیں ہے -

۲- گلشنِ گفتار کے دیباچے میں عاجز، سودا، عزلت، رسا، مضمون، جانِ جاناں، حاتم، داؤد، ولی، قاصر، مرزا جان، شیدا، جرأت، آزاد، موزوں، خسرو، سراج، قاسم، طالب، سعادت، فراق اور محبت وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ دراصل ریختہ گو شعرا کے تخلص ہیں جو دیباچے کی عبارت میں بطور تلازم لفظی استعمال ہوئے ہیں - ان الفاظ میں سے عاجز، سودا، عزلت، رسا، مضمون، جانِ جاناں، حاتم، داؤد اور ولی ایسے الفاظ بھی ہیں جو موجودہ تذکرے میں بطور شاعر موجود ہیں - باقی الفاظ سروری کے خیال میں شعرا کے تخلص ہیں اور اصل نسخے میں ان کا ترجمہ بھی ضرور شامل رہا ہوگا - موجودہ نسخہ چونکہ ناقص ہے اس لیے اس میں یہ نام موجود نہیں ہیں -

۳- موجودہ مطبوعہ نسخے میں نہ خاتمہ ہے نہ ترقیمہ بلکہ یہ تذکرہ عام تذکروں کی روش کے خلاف یکایک عزلت کے ترجمے پر ختم ہو جاتا ہے - شعرا کے ذکر میں کوئی ترتیب بھی موجود نہیں ہے -

---

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون ''تذکرۂ گلشنِ گفتار'' از تحسین سروری، مطبوعہ صحیفہ لاہور، بابت اکتوبر ۱۹۶۸ع، ص ۳۲ تا ۴۰ -

نہ اس میں تہجی ترتیب ہے نہ ابجدی اور نہ بلحاظ زمانہ ہی شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ موجودہ مطبوعہ نسخہ اصل نسخہ نہیں بلکہ کوئی نامکمل اور ناقص یا تلخیص کردہ نسخہ ہے ۔

تحسین سروری کی یہ دلیلیں ہرچند کہ قیاس پر مبنی ہیں لیکن نظر انداز کر دینے کے لائق نہیں ہیں ۔ ان میں خاص جان ہے اور یہ ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ گلشنِ گفتار کا کوئی اور نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا اور جب تک ایسا نہ ہو تحقیق کی دنیا میں حضور کو غیاب پر ترجیح دی جائے گی اور گلشنِ گفتار کو ۱۱۶۵ھ کی تالیف ماننا پڑے گا ۔

سید محمد ایم ۔ اے کو سٹی کالج کے استاد مولوی علی رضا ماہر شیرازی سے گلشنِ گفتار کا ایک قلمی نسخہ ملا تھا ۔ اس نسخے کو تحشیہ و ترتیب کے ساتھ انھوں نے ۱۳۳۹ فصلی مطابق ۱۹۲۹ع میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے شائع کر دیا ۔ ابتدا میں ۱۴ صفحے کا عالمانہ مقدمہ ہے اور حاشیے میں ہر شاعر کے ترجمے کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا ذکر گلشنِ گفتار کے علاوہ کن کن تذکروں میں آیا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کے پیشِ نظر صرف سات یعنی شفیق اورنگ آبادی ، علی ابراہیم خلیل ، غلام علی آزاد بلگرامی ، فتح علی حسینی ، قائم ، میر تقی میر اور قاقشال کے تذکرے رہے ہیں ۔ سید محمد ایم ۔ اے کا مرتّبہ مطبوعہ نسخہ دستیاب ہے اور یہی ہمارے سامنے ہے ۔

ایم ۔ کے ۔ فاطمی ایم ۔ اے نے ''تذکرۂ گلشنِ گفتار'' کے زیر عنوان اپنے مقدمے کے ساتھ اس کا اُردو ترجمہ شائع کیا اس میں مقدمہ سمیت ۸۰ صفحات ہیں ۔ اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے پیشِ نظر ہے ۔[1]

یہ اُردو شعرا کا مختصر ترین تذکرہ ہے ۔ اس میں صرف تیس شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ تذکرے کی زبان فارسی ہے ۔ اسلوب مقفیٰ و مسجع نہیں بلکہ صاف اور سادہ ہے ۔ اس کی اہمیت دو خاص سبب سے ہے : اول یہ کہ اُردو شعرا کے

۱۔ ''تذکرۂ گلشنِ گفتار'' مترجمہ و مرتّبہ ایم ۔ کے ۔ فاطمی ۔ مطبوعہ دانش محل لکھنؤ ۱۹۶۳ع ۔

قدیم ترین تذکروں میں سے ایک ہے اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ شمالی ہند کی طرح دکن میں بھی تذکرہ نگاری کی رسم بارھویں صدی ہجری کے وسط میں پڑ گئی تھی ۔ دوسرے یہ کہ دکنی شعرا کے متعلق بہت سی ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن سے شمالی ہند کے تذکرہ نگار اس سے پہلے ناواقف تھے ۔ حالاتِ زندگی اس تذکرے میں بھی بہت مختصر ہیں ۔ انتخابِ کلام میں غزل کے متفرق اشعار کے بجائے پوری پوری غزلیں دی گئی ہیں ۔ بعض غزلوں کے صرف پسندیدہ اشعار لےکر انھیں مختصر کر دیا گیا ہے ۔ مخمس اور مثنوی کے منتخبات بھی دیے گئے ہیں ۔[۱] غرض کہ انتخابِ کلام میں ایک طرح کا نیا پن ہے اور اس سے کسی خاص شاعر کے رنگ کلام کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے ۔

حمید اورنگ آبادی نے ہر شاعر کے ترجمے میں یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ کون کہاں کا رہنے والا ہے ۔ اس طرح اس میں پندرہ دکنی اور پندرہ شمالی ہند کے شعرا کا ذکر آیا ہے ۔ اگر ''مضمون'' کو بھی دکنی خیال کیا جائے تو دکنی شعرا کی تعداد سولہ ہو جاتی ہے ۔ مضمون کے متعلق حمید نے لکھا ہے کہ :

> ''مضمون عجب شاعر متوکل بودہ متوطن احمد آباد ''موجد ایہام''
> سید محمد ایم ۔ اے نے ''احمد آباد'' کی بجائے ''اکبر آباد'' مراد لی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے ۔ میاں شرف الدین مضمون دکنی نہیں ہیں ۔ ان کا تعلق اکبر آباد شمالی ہند سے ہے ۔ مضمون کا ذکر سارے تذکروں میں موجود ہے ۔'' تحسین سروری صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ :
>
> ''میرے خیال میں مضمون احمد آبادی اور شرف الدین مضمون دونوں الگ الگ شاعر ہیں ۔ بظاہر یہاں شبہہ کے کوئی اسباب نہیں ہیں ۔''[۲]

لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ حمید اورنگ آبادی نے مضمون کے ترجمے میں جو غزلیں درج کی ہیں وہ واضح طور پر شرف الدین مضمون کی ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مضمون احمد آبادی اور مضمون اکبر آبادی

۱۔ ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' سالنامہ نگار ۱۹۶۴ع ، مرتبہ راقم الحروف ، ص ۴۳ ۔

۲۔ صحیفہ (ص ۴۰) لاہور ، بابت اکتوبر ۱۹۶۸ع ۔

دراصل ایک ہی ہیں ۔[1]

اس تذکرے میں کئی شاعر برہان پور کے ہیں ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کسی وقت برہان پور بھی شعر و سخن کا مرکز تھا ۔ علاوہ ازیں بعض شعرا کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً حمید کا ولی کو اورنگ آبادی کے بجائے احمد آبادی لکھنا ، برہان پور میں ولی کے قیام اور سید معالی سے عشق کا تذکرہ کرنا ۔ رضی اور اشرف کو ولی کا شاگرد بتانا ۔ نصرتی کے ذکر میں مد مالتی کے قصے کو نظم کرنے اور ملک الشعرا کا خطاب پانے کا ذکر کرنا ، ایسی باتیں ہیں جو پہلی بار گلشنِ گفتار کے ذریعے ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ یہ مختصر سا تذکرہ نصرتی دکنی کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے اور عزلت کے ترجمے پر مکمل ہو جاتا ہے ۔ ہم اس جگہ دونوں کے ترجمے درج کر رہے ہیں :

نصرتی : دکھنی متوطن بیجا پور موسوم بہ تخلص نصرتی کہ نسخۂ مد مالتی بہ زبان ہندوی بہ نزاکت تمام و مضامین پر سر انجام ترتیب دادہ چنانچہ از بادشاہی خطاب ملک الشعرائی یافتہ در تعریف زلف دوست خوب از ریختۂ اوست ۔[2]

عزلت : ہم درین زمین شاہ عہد ولی سورتی کہ فضل و بلاغت و کمال ایشان از تحریر و تقریر بیرون است ۔ ریختۂ پر مضمون و موزون نمودہ و در ایام آصفجاہ نظام الملک بہ خجستہ بنیاد آمدہ چند گاہ با نواب مرحوم ہم صحبت بودند ۔ محاسن را می تراشیدند ۔ ہیچ احدے از فضلا و علما توانست کہ بہ بحثِ علم مقابل ایشان دم زند غرض ہم چو شخص را از جملہ مغتنمات زمانہ باید دانست ۔ در محافل امرا معزز و مکرم اند ۔ چند ریختہ ایشان منسلک قلم می شود ۔[3]

☆ ☆ ☆

۱۔ مقدمۂ گلشنِ گفتار ، ص ۲۲ مرتّبہ ایم ۔ کے ۔ فاطمی ، مطبوعہ دانش محل لکھنؤ ۱۹۶۳ع ۔

۲۔ گلشنِ گفتار ، ص ۶ ، ۷ ۔ مرتّبہ سید محمد ایم ۔ اے ۔ مطبوعہ خورشید پریس یوسف بازار ، نیا پل ، حیدر آباد دکن ۔

۳۔ گلشنِ گفتار ، ص ۶۵ ، ۶۶ مرتّبہ سید محمد ایم ۔ اے ۔

تحفۃ الشعراء

مصنف کا پورا نام مرزا افضل بیگ قاقشال ہے ۔ قاقشال کے حالات کا سراغ کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا ۔ مشکل یہ ہے کہ تحفۃ الشعراء میں بھی انھوں نے اپنا ذکر نہیں کیا ۔ وفا ایلچ پوری کے ترجمے میں یہ ضرور لکھا ہے کہ :

''شخصے ز عناد بموجب بعرض باطلے فقیر محرر را در عتاب آصفجاہ آوردہ بود ۔ چنانچہ تفصیل آن در ضمن احوال خود کہ در خاتمہ مرقوم ساختہ مفصل ظاہر خواہد گردید ۔'' (تحفتہ الشعرا ، ص ۱۲۱ ، ۱۲۲)

اس سے پتا چلتا ہے کہ تذکرے کے آخر میں وہ اپنا احوال لکھیں گے ۔ لیکن تذکرہ ان کے ذکر سے خالی ہے ۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ یا تو مصنف اپنا احوال کسی سبب سے نہ لکھ سکے اور تذکرہ نامکمل ہی رہ گیا یا پھر اس کا کوئی اور قلمی نسخہ موجودہ مطبوعہ نسخے سے الگ رہا ہوگا جو اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ۔

ناصر جنگ اور آصف جاہ اول کے تراجم سے مصنف کے حالات پر البتہ کچھ روشنی پڑتی ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ وہ اورنگ آباد کے رہنے والے اور آصف جاہ اول اور ان کے بیٹے ناصر جنگ کے متوسلین و ملازمین میں تھے اور فوج میں رسالہ دار کی خدمت پر مامور تھے ۔ جب ناصر جنگ نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کی اور معاملہ جنگ و جدل تک پہنچا تو اس دوران میں ایک روز آدھی رات کے وقت آصف جاہ کو اطلاع ملی کہ سرائے ہرسول پر ناصر جنگ قبضہ کرکے وہاں جو باروت اور سامانِ جنگ ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ۔ اس وقت صوبہ دار اورنگ آباد کے مشورے سے مرزا افضل بیگ قاقشال کو حکمِ شاہی کے تحت طلب کیا گیا ۔ قاقشال نے ہرسول پہنچ کر مورچہ بندی کر دی ۔ ناصر جنگ کی تخت نشینی کے بعد قاقشال ان کے لشکر سے وابستہ رہے ۔ جس وقت

ناصر جنگ اور ان کے وزیر با تدبیر مدارالمہام شاہ نواز خاں کے درمیان آدھی رات کے وقت فرانسیسیوں اور مظفر جنگ کے سلسلے میں صلاح و مشورہ ہو رہا تھا ، قاقشال بھی وہاں موجود تھے - اس واقعہ سے پندرہ دن پہلے مدارالمہام شاہ نواز خاں کے ایما پر قاقشال نے ارکاٹ کے ایک بزرگ شاہ غلام مصطفیٰ قادری سے ناصر جنگ کی ملاقات بھی کرائی تھی - جب ناصر جنگ شہید ہوگئے اور ان کا جنازہ اورنگ آباد لایا گیا تو قاقشال بھی جنازے کے ساتھ تھے -[۱]
عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی کے ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی قاقشال کے بچپن کے دوست تھے اور وہ اکثر ان کے گھر آیا کرتے تھے - جب قاقشال نے کوتوال پورہ بلدۂ اورنگ آباد میں نیا مکان بنوایا تو قاقشال کی فرمائش پر عاجز نے فی البدیہہ یہ قطعۂ تاریخ کہا تھا :

منزلِ عیش بہ از چار محل
کرد بنیاد چو مرزا افضل
گفت تاریخ بنایش ہاتف
منزلِ جاہ و مکانِ افضل

(تحفۃ الشعراء ، ص ۱۱۲)

مؤلف نے دیباچے میں میر غلام علی آزاد بلگرامی اور عارف الدین خاں عاجز کے حسبِ ذیل قطعات تاریخی دیے ہیں :

قدردانِ صاحبانِ معنی افضل بیگ خاں
کرد تالیفے مرتب از پئے اربابِ شعر
کلک او بر لوح گیتی بست نقشِ تازۂ
می شود تاریخ سالش "تحفۂ اصحاب شعر" (آزاد)
نسخۂ تازہ چو مرزا افضل
کرد تالیف بنام شعرا

۱- مقدمہ تحفۃ الشعرا ، ص ۱۲۲ ، مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۶۱ع -

سالِ اتمامِ سخن عاجز گفت
تحفۂ اوجِ کمالِ شعرا[1] (عاجز)

دونوں کے مادۂ تاریخ سے ۱۱۶۵ھ برآمد ہوتے ہیں - یہی اس کا سالِ تصنیف ہے - پہلی بار یہ تذکرہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مبسوط مقدمے کے ساتھ علی گڑھ میگزین ، بابت ستمبر ۱۹۳۸ع میں شائع ہوا - اس کے بعد ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اُسے مرتّب کیا اور ادارۂ ادبیات حیدر آباد دکن نے ۱۹۶۱ع میں اسے شائع کیا - دونوں مطبوعہ نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں -

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اس کے تین قلمی نسخوں کا سراغ دیا ہے ، دو کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں اور ایک کتب خانۂ سالار جنگ میں ہے - حفیظ قتیل نے تینوں نسخوں کی مدد سے مطبوعہ نسخے کا متن تیار کیا ہے اور جہاں ان نسخوں میں نمایاں اختلاف ہے وہ حاشیے پر درج کر دیا گیا ہے - یہ مطبوعہ نسخہ کتب خانوں میں عموماً دستیاب ہے -

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور صرف ۶۲ شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے - یہ اُردو شعرا کے قدیم ترین تذکروں میں سے ہے اور میر کے نکات الشعراء مؤلفہ ۱۱۶۵ھ اور حمید اورنگ آبادی کے گلشنِ گفتار مؤلفہ ۱۱۶۵ھ کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا ہے - اس میں ریختہ گو اور فارسی گو شعرا دونوں شامل ہیں اور بعض ایسے شعرا کے حالات اس میں مل جاتے ہیں جو کسی اور قدیم تذکرے میں مذکور نہیں ہیں - تذکرے کے دیباچے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مصنف اپنے عہد کے ممتاز علما و فضلا سے ذاتی طور پر واقف تھے - چنانچہ انھوں نے اس عہد تک کے سارے مشہور فارسی تذکروں سے استفادہ کیا ہے - شعرا کی تاریخ پیدائش اور وفات کی طرف یہاں بھی توجہ نہیں دی گئی - ہاں شعرا کے وطن اور جائے سکونت کا سراغ اکثر جگہ دے دیا گیا ہے - حالات زندگی یہاں بھی بہت مختصر ہیں لیکن

۱- ان تاریخوں سے ''تحفۃ الشعراء'' کا سن تصنیف ۱۱۶۵ھ ظاہر ہوتا ہے - مگر ذرا آگے چل کر فضلی کے حال میں غازی الدین خاں کو ''مرحوم'' لکھا ہے - غازی الدین خاں کی تاریخ وفات ۷ ذی الحجہ ۱۱۶۵ھ ہے اس لیے تذکرے کی تکمیل لازماً اس تاریخ کے بعد ہوئی - (ادارہ)

جو کچھ ہے بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رشک و مخاصمت سے پاک ہے۔[1] چوں کہ اس تذکرے میں اکثر انھیں شعرا کا ذکر ہے جو آصف جاہ اول اور ناصر جنگ کے عہد میں گزرے ہیں اور ان کے درباروں سے وابستہ یا ان کے معاصر تھے اس لیے اس تذکرے کے ذریعے اورنگ آباد کا قدیم ادبی ماحول ہمارے سامنے آ جاتا ہے ، خصوصاً آصف جاہ اول اور ناصر جنگ کے حالات جس تفصیل سے اس میں دیے گئے ہیں اس کی وجہ سے یہ تذکرہ تاریخی اہمیت کا بھی حامل ہے۔ اردو کے بعض شعرا مثلاً فضلی ، شاہ سراج ، عارف الدین خاں عاجز ، درگاہ قلی خاں ، عبدالحی وقار اور مرزا مظہر کے بارے میں اس تذکرے کے بیانات خاص طور پر اہم ہیں۔[2]

تذکرے میں شعرا کی ترتیب میں کوئی اصول نہیں برتا گیا بلکہ اُردو اور فارسی شاعروں کا ملا جلا ذکر کر دیا گیا ہے۔ بعض صرف فارسی کے شاعر ہیں ، بعض اُردو کے اور بعض دونوں زبانوں میں کہتے ہیں۔ اس کا اندازہ بھی انتخابِ کلام سے ہوتا ہے۔ تذکرے میں سب سے پہلے سید غلام حسین قادری کا ذکر ہے اور آخر میں مرزا جان جاناں مظہر کا۔ غلام حسین قادری کے صرف فارسی اشعار اور مظہر کے اُردو فارسی دونوں انتخابِ کلام میں درج کیے گئے ہیں۔ ہم اس جگہ افتخار اور مظہر جان جاناں کے نثری ترجمے درج کر رہے ہیں۔ یہ اُردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں :

افتخار : ''میر عبدالوہاب خاں افتخار تخلص دولت آبادی از سادات بخارا است۔ جدِ امجدش در زمان عالم گیر بادشاہ از ہندوستان بہ دکن آمدہ سکونت اختیار نمودہ و قرابت از سید مرتضیٰ خاں بہ عمل آمد میر مشار'' الیہ (نیز در آنجا سکونت داشتہ) از پریشان احوالی اوقات بسر می برد۔ نجیب و شریف است در شعر گوئی طبع رسا دارد ازوست۔''[3]

۱۔ علی گڑھ میگزین ، بابت ستمبر ۱۹۳۸ع ، مخزونہ ذاتی کتب خانہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

۲۔ مقدمہ تحفۃ الشعراء مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ، مطبوعہ ادارۂ ادبیات اُردو ، حیدرآباد دکن ۱۹۶۱ع۔

۳۔ تحفۃ الشعراء ، ص ۱۳۴۔

مظہر : ''میرزا جانِ جانان مظہر تخلص شاہجہان آبادی متصف بہ فضائل و کمالاتِ درویشی است از ہندوستان بہ دکن نیامدہ در بلدۂ شاہجہان آباد کوسِ سخنوری می نوازد دیوان مختصر او رسیدہ در فکرِ اشعار فارسی و ریختہ ہندی و ابیات ایہامے عدیم المثل و کلامش ہمہ پُر از درد و حال است تمام اشعارش مقبول طبائع و مرغوب دلہا گشت این چند اشعار آبدار از طبع گُہر سنجِ اوست ۔''[۱]

☆ ☆ ☆

۱۔ تحفۃ الشعراء ، ص ۱۶۳ ۔

تذکرۂ ریختہ گویاں

مصنف کا پورا نام سید فتح علی حسینی ہے - دلی کے رہنے والے تھے چوں کہ سادات گردیز سے تعلق رکھتے تھے اس لیے فتح علی حسینی گردیزی کے نام سے مشہور ہوئے - گردیزی کے والد سید عوض علی خاں محمد شاہ بادشاہ کے دور میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے اور رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے -

فتح علی حسینی اپنے زمانے کے خدا رسیدہ بزرگ خیال کیے جاتے تھے - قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعۂ نغز میں ضمناً گردیزی کا ذکر کئی جگہ ہادی و مرشد کی حیثیت سے کیا ہے - تصوف اور مذہب کے سلسلے میں فتح علی حسینی سے کئی رسالے یادگار ہیں - لیکن اردو شعر و ادب میں ان کا نام مندرجہ ذیل دو کتابوں کی وجہ سے زندہ ہے :

۱- ''ابطال الباطل'' یہ رسالہ دراصل سراج الدین علی خاں آرزو اور شیخ علی حزیں کے مابین اس علمی و ادبی نزاع سے تعلق رکھتا ہے جو بارھویں صدی ہجری کے وسط میں اہلِ علم و فن کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھی - اس نزاع میں فتح علی حسینی حزیں کے طرف داروں میں تھے - چنانچہ علی حزیں کے کلام پر آرزو اور ان کے ساتھیوں نے جو اعتراضات کیے تھے فتح علی حسینی نے اس رسالے میں ان کی تردید کی ہے اور اپنے جوابات کے ثبوت میں اساتذہ کے اشعار سے استناد کیا ہے بقول مولوی عبدالحق اس سے ان کی وسعتِ نظر اور ذوقِ سخن کا اندازہ ہوتا ہے -[1]

۲- زیرِ نظر تذکرہ ''ریختہ گویاں'' ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے -

---

۱- مقدمۂ تذکرۂ ریختہ گویاں ، ص ۴ ، مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۳ع -

فتح علی حسینی عربی فارسی کے عالم تھے اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ فارسی کے شاعر تھے اور ریختہ کو بھی پسند کرتے تھے۔ شاید خود اردو میں شعر نہ کہتے تھے اگر کہتے ہوتے تو اپنے تذکرے میں بطور شاعر اپنا ذکر ضرور کرتے۔ دوسرے تذکروں سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ وہ اُردو میں بھی کہتے تھے۔ فتح علی حسینی کا انتقال ۱۲۲۴ھ میں ہوا ہے۔ ثناء اللہ خاں فراق کے اس مصرعہ سے

"کہا ہاتف نے انتخابِ سلف"

یہی سال برآمد ہوتا ہے۔

تذکرے کے آخر میں فتح علی حسینی نے خود لکھ دیا ہے کہ اس کا تکملہ ۵ محرم ۱۱۶۶ھ کو ہوا ہے۔ لیکن اس کا آغاز اس سے بہت پہلے ۱۱۵۶ھ میں ہو گیا تھا اور تکملہ کے سنہ کے بعد بھی اس میں کچھ اضافے ہوئے ہیں۔[۱]

مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں یہ تذکرہ انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام شائع ہوا اور یہی دستیاب ہے۔ ۱۹۶۸ء میں عطاء الرحمٰن کاکوی نے اشعار کو محذوف کر کے اس کا اُردو ترجمہ نکات الشعراء اور مخزن نکات کے اردو ترجموں کے ساتھ یکجا شائع کیا اور "تین تذکرے" نام رکھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمے کے آخر میں لکھا ہے کہ:

"یہ تذکرہ ہم نے تین مختلف قلمی نسخوں سے مرتّب کیا ہے۔ ان میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جیسا کہ کاتب تذکرہ کی عبارت سے معلوم ہوگا کہ وہ حیدر آباد میں سید عبدالولی عزلت کے لیے ۱۱۷۲ھ میں (یعنی تصنیف سے چھ سال بعد) لکھا گیا تھا۔"[۲]

افسوس کہ مولوی صاحب نے ان قلمی نسخوں کے متعلق کوئی سراغ نہیں دیا کہ وہ کہاں اور کن کے پاس تھے اور ان کی کیا کیفیت تھی۔ انڈیا آفس

۱۔ مقدمہ دستور الفصاحت، ص ۴۸، مرتّبہ عرشی، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ء۔
۲۔ مقدمہ تذکرۂ ریختہ گویاں، مرتّبہ عبدالحق، ص ۱۷، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد ۱۹۳۳ء۔

لندن میں اس کے تین قلمی نسخے البتہ محفوظ ہیں۔ ایک ۱۱۸۰ھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا ۱۲۱۳ھ کا اور تیسرا ۱۲۱۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ علاوہ ازیں برٹش میوزیم لندن اور بانکی پور میں بھی گردیزی کے تذکرے کے قلمی نسخے موجود ہیں۔[1]

تمکین کاظمی نے ایک اور قلمی نسخے کی خبر دی ہے یہ ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ کا مکتوبہ ہے، اور حیدر آباد میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ۹۷ کے بجائے صرف ۴۹ شعرا کے تراجم شامل ہیں۔[2] مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اطلاع دی ہے کہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے اس میں دیباچہ اور ایک دو تراجم ساقط ہیں۔ غالباً محسن علی مؤلف سراپا سخن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔[3]

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں صرف ۹۷ شاعروں کا ذکر بلحاظ حروف تہجی آیا ہے۔ مولوی صاحب کے مرتبہ مطبوعہ نسخے میں ۹۸ شعرا کی فہرست اور ترجمہ شامل ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ گردیزی نے میر صلاح الدین پاکباز کے ترجمے میں لکھا تھا کہ پاکباز کا یہ شعر قزلباش خاں کو پسند تھا۔ اصل عبارت یہ ہے:

"این شعر خوش گاہ قزلباش خان مرحوم است:

قفس کے در کو باز اے بلبل اب صیاد کرتا ہے
خدا جانے کرے گا ذبح یا آزاد کرتا ہے"

مولوی صاحب کو اس جگہ مغالطہ ہوا اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہاں سے قزلباش خاں امید کا ذکر شروع ہو گیا۔ حالاں کہ یہ پاکباز کے سلسلے کی عبارت ہے۔ اگر قزلباش کا ذکر ہوتا تو تخلص کی رعایت سے ردیف الف کے ساتھ آتا یا نام کی رعایت سے ردیف ق کے ساتھ۔ پاکباز کے بعد امید یا قزلباش کے ذکر کا کوئی موقع نہیں تھا۔

۱۔ تین تذکرے، ص ۵، مرتبہ و ترجمہ پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی، مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۶۸ع۔
۲۔ "معارف" اعظم گڑھ، بابت فروری ۱۹۲۸ع۔
۳۔ مقدمۂ دستور الفصاحت، ص ۹۴، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع۔

سوانح اور تنقید کے لحاظ سے یہ تذکرہ کچھ ایسا اہم نہیں ہے - وجہ یہ ہے کہ اس میں انھوں نے کسی اپج سے کام نہیں لیا بلکہ معاصر تذکرہ نگاروں کے تراجم کو تھوڑا بہت بدل کر ایک نیا تذکرہ مرتّب کر لیا ہے - سبب تالیف کے سلسلے میں دیباچے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی چند سطریں دیکھتے چلیے :

"از ملاحظہ تذکرہ ہائے اخوان زمان کہ مشتمل بر اساس ریختہ گویانِ عہد محرر ساختہ اند و علت غائی تالیفِ شان خردہ گیری ہمسران و ستم ظریفی با معاصرانست در اظہارِ ما فی النفس الامر بہ ایجاز پرداختہ بلکہ از جہت عدم اعتنا و قلت تتبع کرد اکثر نازک خیالان رنگین نگار را از قلم انداختہ معہذا در تصحیح اخبار و تحقیق احوال اعزہ اغلاطِ صریح بکار بردہ و خطاہای نمایان کردہ اند بخاطرِ فاتر ریخت کہ تذکرۂ مرقوم سازد بے رودیدہ گی از روے انصاف خالیا عن الاعساف و اسامی نامی شعرا را بہ ترتیب حروف تہجی بنویسد تا حاضران را تذکارے و غائبان را یادگارے بود -"[1]

اس عبارت کا واضح مطلب یہ ہے کہ فتح علی حسینی کو بعض معاصر تذکرہ نگاروں کے مسودات دیکھنے کے بعد تذکرہ لکھنے کا خیال آیا ہے - وہ اپنے معاصرین کی روش تذکرہ نگاری سے مطمئن نہ تھے - ان کا خیال تھا کہ ان تذکرہ نگاروں نے انصاف سے کام نہیں لیا ، صرف اپنے احباب کو سراہا ہے - دوسروں کو یا تو نظر انداز کیا ہے یا خردہ گیری و عیب جوئی کے ذریعے انھیں کم رتبہ ظاہر کیا ہے - چنانچہ اس معاندانہ روش کے برخلاف حق و انصاف پر مبنی ایک تذکرہ لکھنے کا انھوں نے ادعا کیا اور ۱۱۶۶ھ میں اسے ہر طرح مکمل کر لیا -

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے تذکرے تھے جنھیں دیکھ کر فتح علی حسینی گردیزی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شعرا کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور اس ناانصافی کا ازالہ ہونا چاہیے - گردیزی نے واضح طور پر اپنے تذکرے میں

۱- دیباچہ تذکرۂ ریختہ گویاں ، ص ۳ ، مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ ۱۹۳۳ع -

کہیں اس بات کا سراغ نہیں دیا لیکن ان کے تذکرے کا دیباچہ، خاتمہ، شعرا کے بیشتر تراجم اور تذکرہ نگاری کی روش بتاتی ہے کہ ان کا اشارہ میر تقی میر کے نکات الشعراء کی طرف ہے جو کہ ۱۱۶۵ھ میں یعنی ان کے تذکرے سے ایک سال پہلے دہلی ہی میں ہر طرح مکمل ہو چکا تھا۔ گردیزی نے میر کے نکات الشعراء ہی کو سامنے رکھ کر اس کی تقلید اور جواب میں اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے تذکرے کا زیادہ مواد اسی تذکرے سے لیا ہے اور تجاہل عارفانہ سے کام لے کر میر کے تذکرے کی طرف سے انجان بن گئے ہیں۔ تذکرۂ ریختہ گویاں کی تحریر کے وقت نکات الشعراء کا کوئی نہ کوئی مسودہ گردیزی کے سامنے ضرور تھا اس کی شہادتیں خود انہیں کے تذکرے میں ایک جگہ نہیں کئی جگہ ملتی ہیں۔ شہادتیں یہ ہیں:

۱۔ میر نے نکات الشعراء میں ''ریختہ'' کی تعریف اور اقسام کے سلسلے میں جو باتیں بیان کی تھیں گردیزی نے بالکل وہی باتیں الفاظ کی بہت معمولی تبدیلی کے ساتھ دہرا دی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ میر نے ریختہ کی تفصیل تذکرے کے آخر میں دی تھی، گردیزی اسے اپنے دیباچے میں لے آئے ہیں۔

۲۔ گردیزی نے میر تقی میر پر طعن و تعریض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ کم رتبہ ظاہر کرنے کے لیے ان کے حالات میں صرف تین سطریں لکھی ہیں اور انتخاب کلام میں صرف ایک شعر دیا ہے، وہ بھی بہت معمولی شعر۔

۳۔ نکات الشعراء میں جن شعرا پر سخت تنقید کی گئی تھی تذکرۂ ریختہ گویاں میں ان کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مثال میں سجاد، حشمت، یقین اور خاکسار کے ترجمے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میر نے ان شاعروں کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا، گردیزی نے میر کے انتقام میں ان کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے۔

۴۔ میر نے اپنے تذکرے میں ۱۰۳ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ گردیزی کے یہاں صرف ۹۷ شعرا کے تراجم ہیں لیکن ان میں سے بیشتر وہی ہیں جو نکات الشعراء میں مذکور ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں گردیزی کے

تراجم اور میر کے تراجم کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھیے تو صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۵۔ میر اور گردیزی دونوں نے تذکرے کے اختتام پر ایک ہی طرح کی عبارتیں لکھی ہیں۔ تکملے کی تاریخ لکھنے کا ڈھنگ بھی یکساں ہے اور میر کی تقلید کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

یہ ہیں واضح شہادتیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ تذکرۂ ریختہ گویاں حقیقتاً نکات الشعراء کی ناکام تقلید کا دوسرا نام ہے۔ میر اور گردیزی کے معاصرانہ چشمک کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی بجز اس کے کہ گردیزی کو میر کی روش تذکرہ نگاری ناپسند تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سراج الدین علی خاں آرزو اور شیخ علی حزیں کے مابین جو نزاع تھی وہ میر اور گردیزی کی باہم مخاصمت کا سبب بنی ہو اس لیے کہ اس ادبی معرکے میں گردیزی کھل کر حزیں کے ساتھ تھے اور میر تقی میر بہرحال اس وقت تک اپنے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے طرف دار اور مداح تھے، سبب کچھ بھی رہا ہو اس سے انکار ممکن نہیں کہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میر کے حریف کی حیثیت سے ان کے تذکرے کے جواب میں لکھا ہے لیکن گردیزی کا تذکرہ سوانح و تنقید کسی لحاظ سے بھی میر کے تذکرے کو نہیں پہنچتا۔ دیباچے میں گردیزی نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنے تذکرے میں شعرا کے تراجم، نکات الشعراء کی بہ نسبت تفصیل سے لکھیں گے اور ناقدانہ تبصروں کے ذریعے حق و انصاف کے ساتھ ہر شاعر کا درجہ متعین کریں گے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کا تذکرہ بہت تشنہ اور مختصر ہے۔ صرف یہی نہیں کہ شعرا کی تعداد کے لحاظ سے میر کے تذکرے سے کمتر ہے بلکہ زبان و بیان، تحقیق و تنقید اور سوانح و تاریخ اور تراجم ہر اعتبار سے ان کا تذکرہ میر کے مقابلے میں بہت معمولی درجے کا ہے۔ ان کے تذکرے کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ یہ شعرائے قدیم کے حالات کے متعلق بہرحال ایک قدیم دستاویز ہے۔ خصوصاً ان شعرا کے حالات کے متعلق جن سے گردیزی کی ذاتی ملاقاتیں تھیں یا وہ پچیس شعرا جن کا ذکر نکات الشعرا میں نہیں بلکہ صرف تذکرۂ ریختہ گویاں میں آیا ہے۔

تذکرہ آرزو کے ترجمے سے شروع ہو کر یکرو کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ ہم

اس جگہ میر اور یقین کے تراجم بطور نمونہ نقل کر رہے ہیں :

میر : ''سخن سنج بے نظیر میر محمد تقی میر تخلص زادگاہش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد شمع استعدادش بر کردہ شعلۂ ادراک سراج الدین علی خان آرزو است فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ حقا کہ در آن تلاش معنی بے گانہ کردہ است و حرف آشنا را بروے کار آوردہ ۔''[1]

یقین : ''صاحب تلاش معنی رنگین انعام اللہ خان یقین تخلص پسر اظہر الدین خان بہادر مبارک جنگ نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی است و نبیسۂ نواب حمید الدین خان مرحوم ۔ شہباز خیالش بہ صید معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ اش برقلۂ قافِ سخن بہ پر افشانی ممتاز، بے اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گذاشتہ و تخمِ معنی در زمین سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سرزدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہِ السنہ جاری است استفادۂ سخن از افادت گاہ میرزا جان جاناں مظہر گرفتہ چنانچہ گوید :

جیون نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقیں
حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

با مؤلف اخلاص خالص دارد و اکثر ہا بہ ملاقات می پردازد ۔''[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ تذکرۂ ریختہ گویاں، ص ۱۴۶ ۔

۲۔ تذکرۂ ریختہ گویاں، ص ۱۳۷، ۱۳۸ ۔

مخزنِ نکات

مصنف کا پورا نام محمد قیام الدین ہے - عرفیت محمد قائم تھی اور قائم تخلص کرتے تھے - سن پیدائش متحقق نہیں - وفات کا سال ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ - ۹۴ع ہے -[۱] پیدا چاند پور ضلع بجنور میں ہوئے ، مدفون رام پور میں ہیں - معاشی ضرورتوں کے تحت ان کا قیام ٹانڈا ، چاند پور ، امروہہ ، بریلی ، سنبھل اور لکھنؤ میں بھی رہا - لیکن زندگی کا زیادہ حصہ دہلی میں گزرا -[۲] آخری عمر میں نواب احمد یار خاں کی دعوت پر رام پور چلے گئے اور وہیں انتقال کیا -

شعر و سخن کا ذوق طبعی تھا - پہلے شاہ ہدایت اور خواجہ میر درد کو غزلیں دکھائیں پھر سودا کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے اور ایک دن وہ آیا ، وہ خود صف اول کے شاعر بن گئے اور ان کا نام درد ، میر اور سودا کے ساتھ لیا جانے لگا - قائم کا ذکر اکثر تذکروں میں آیا ہے - شعرا کی فرہنگ میں ان تذکروں کے نام مل جائیں گے - لکھنؤ اور آگرہ یونیورسٹی میں ان پر تحقیقی کام بھی ہو چکا ہے چنانچہ محمد عرفان آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ع میں اور سید عبدالحئی لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ع میں قائم کی زندگی اور فن پر کام کرکے پی ایچ - ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں -[۳] غرض کہ گزشتہ چند برسوں میں قائم کے کلام و حیات پر خاصی توجہ دی گئی ہے - مقالات بھی لکھے گئے ہیں اور کتابی

۱- مقدمۂ دستور الفصاحت ، ص ۵۰ ، مرتّبہ مولانا عرشی ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع -

۲- مخزن نکات ، ص ۱۶ ، مرتّبہ اقتدا حسن ، مطبوعۂ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ع -

۳- ''آج کل'' دلی اُردو تحقیق نمبر ، ص ۹۱ ، بابت اگست ۱۹۶۷ع -

صورت میں دیوان و کلیات بھی جامع مقدمات کے ساتھ منظرِ عام پر آئے ہیں[1] اس لیے ان کے حالاتِ زندگی کی وضاحت میں جانا اس جگہ مناسب نہیں۔

قائم نے اپنے تذکرے کے آغاز یا اختتام پر تکملے کی تاریخ درج نہیں کی۔ صرف ایک داخلی شہادت ایسی ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے کا نام "مخزن نکات" تاریخی ہے اور یہ ۱۱۶۸ھ میں مکمل ہوا ہے۔ خواجہ اکرم کے ترجمے میں قائم لکھتے ہیں کہ:

"چون او را بر نوشتن این بیاض اطلاعے دست داد یک قطعہ متضمن بر تاریخ کہ بعد ازین مرقوم خواہد شد موزون نمودہ مع دیگر ابیاتِ خود پیش فقیر آورد و از آنجا کہ مادۂ تاریخ مناسب نام کتاب بود بنا علیہ بہ ہمان اسم موسوم نمود قطعۂ مذکور:

قائم رکھے ہمیشہ خدا تیرے نام کو
کرنے سے ذکر خیر کے ہے موجب نجات
تاریخ اس کتاب کی کی میں نے جب تلاش
پیرِ خرد نے مجھ سے کہا مخزن نکات"[2]

اس بیان سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ قائم کے نزدیک مخزن نکات کے تکملے کا سال ۱۱۶۸ھ ہے لیکن تذکرے کے مختلف تراجم کی روشنی میں محققین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ مخزن نکات کا آغاز ۱۱۶۸ھ سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور مؤلف نے ۱۱۶۸ھ کے بعد تک اس میں بعض اضافے کیے ہیں۔ چنانچہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مخزن نکات کے زمانۂ تالیف پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قائم نے پہلے اپنا تذکرہ بیاض کی صورت میں مرتّب کیا تھا اس بیاض کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلی تاریخ

۱۔ دیکھیے (۱) دیوان قائم مرتّبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، مطبوعۂ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ۔ (۲) کلیات قائم جلد اول، مرتّبہ ڈاکٹر اقتدا حسن مطبوعۂ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ع۔ (۳) اُردوے معلیٰ قائم نمبر دلی یونیورسٹی، مطبوعۂ یونین پریس دہلی، شمارہ نمبر ۸۔

۲۔ مخزن نکات، ص ۱۷۶، مجلسِ ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ع۔

۱۱۵۷ھ مطابق ۴۴-۱۷۴۳ع ملتی ہے ۔ اس وقت تک اُردو گو شاعروں کا کوئی تذکرہ مرتّب نہ ہوا تھا ۔ ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ - ۵۴ع) میں احمد شاہ کے معزول ہو جانے اور عالم گیر ثانی کے تخت نشین ہونے کے بعد اس بیاض نے تذکرے کی شکل اختیار کر لی اور مصنف نے اس کا تاریخی نام "مخزن نکات" رکھا ۔ جس سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس تاریخ کے بعد ہی اس نے جابجا اضافے کیے جس کا سلسلہ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ع تک جاری رہا ۔ کتاب کا دیباچہ ، بجز نام کے ، آغاز تصنیف بیاض کے وقت کا ہے اور خاتمہ جس میں مصنف نے انقلاب سلطنت کا ذکر کیا ہے ۱۱۶۸ھ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔"[۱]

"مخزن نکات" سب سے پہلے مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کی جانب سے ۱۹۲۹ع میں شائع ہوا ۔ اس کا مقدمہ ٹائپ میں اور تذکرے کا متن نستعلیق میں چھپا ہے۔ یہ تذکرہ دستیاب ہے ۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس تذکرے کے سال تصنیف ، مصنف ، اس کے ماحول ، تذکرے کے ماخذ اور اہمیت سب کے بارے میں اہم اطلاعات بہم پہنچائی ہیں لیکن یہ سراغ نہیں دیا کہ اس تذکرے کا مخطوطہ انہیں کس سے اور کہاں دستیاب ہوا اور اس کی کیا نوعیت ہے ۔ لیکن اس کے متعلق ایک روایت یوں بیان کی گئی ہے کہ اس نسخے کی جو مطبوعہ ڈمی اور ابتدائی پروف خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کے پاس محفوظ ہیں ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ مولوی صاحب کے مطبوعہ نسخے کے متن کو سب سے پہلے اصل ڈیوڑھی مستقیم الدولہ ، چھتہ بازار ، حیدر آباد دکن کے ایک تاجر کتب سید رستم علی نے لیتھو میں چھپوایا تھا ۔ مولوی صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے مطبوعہ نسخے کی ساری کاپیاں اور اس کے حقوق اس سے حاصل کر لیے اور اس پر ایک مقدمہ لکھ کر انجمن کی طرف سے شائع کر دیا ۔ صفحہ ۸۰ پر تاجر کا نام اور اشتہار چھپ چکا تھا جسے دبیز کاغذ کے پردے میں چھپا دیا گیا ۔[۲] یہی سبب ہے کہ مولوی صاحب کے مطبوعہ نسخے کا

۱۔ دستور الفصاحت ، ص ۵۹ ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

۲۔ مخزن نکات ، ص ۴۸ ، مرتّبہ ڈاکٹر اقتدا حسن ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ع ۔

متن لیتھو میں اور مقدمہ ٹائپ میں چھپا ہے -

"مخزن نکات" کی دوسری اشاعت مجلس ترقی ادب لاہور کے ذریعے ۱۹۶۶ع میں عمل میں آئی - اس کے مرتّب اقتدا حسن ہیں - اس نسخے کا متن انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطے پر مبنی ہے انجمن ترقی اُردو کا مطبوعہ نسخہ بھی سامنے رہا ہے - مرتّب نے اس کی ترتیب و تدوین میں کمال محنت و عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے اور ۵۰ صفحات پر مشتمل ایک بسیط مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے - حواشی و تعلیقات مزید ہیں - آخر میں اسمائے علم کا جامع اشاریہ ہے - مکمل نسخے میں ۲۵۲ صفحے ہیں اور متن کی صحت کے ساتھ ٹائپ میں چھاپا گیا ہے - اس میں ۱۲۸ شاعروں کا ذکر آیا ہے - اس میں چھ شاعر علیم شاہ ، محمد اعظم ، میر علی تقی [نقی] کافر ، قمر الدین منت ، مراد علی حیرت اور محمد شاکر زاہد ہیں یعنی مولوی صاحب کے نسخے میں ان کا ذکر نہیں ہے -

"مخزن نکات" کے دو طبقوں کا اُردو ترجمہ کتاب خانہ عالیہ رام پور میں بھی موجود ہے اس کی اطلاع مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دی ہے -[۱] یہ سید محسن علی محسن مؤلف سراپا سخن کا ترجمہ ہے اور اس میں مترجم نے اتنے اضافے کیے ہیں کہ یہ الگ تذکرہ بن گیا ہے - اسی لیے ہم نے اس کا ذکر الگ تفصیل سے کیا ہے -

پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے اشعار محذوف کرکے مخزن نکات کا اُردو ترجمہ بھی ۱۹۶۸ع میں نکات الشعراء اور ریختہ گویاں کے اُردو تراجم کے ساتھ یکجا بہ عنوان "تین تذکرے" کتابچے کی صورت میں عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ سے شائع کر دیا ہے -

"مخزن نکات" اُردو شعرا کے قدیم ترین تذکروں میں سے ایک ہے - یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۱۲۸ شعرا کے تراجم شامل ہیں -[۲] قائم نے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ "مخزن نکات" شعرائے اُردو کا پہلا تذکرہ ہے - چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں :

"بر ضمیر مہر تنویر سخن طرازان ہندوستان و طوطیان شکر شکن این

۱- دیکھیے مقدمہ دستور الفصاحت ، ص ۵۹ -

۲- مخزنِ نکات ، ص ۲ ، مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب لاہور ۱۹۶۶ع -

بوستان مخفی و محتجب نہ ماند کہ تا الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتاب تصنیف نہ گردیدہ و تا این زمان ہیچ انسان از ماجرائے شوق افزائے سخن وران این فن سطرے بہ تالیف نہ رسانیدہ ، بنابر این فقیر مؤلف محمد قیام الدین بعد از کوشش تمام و سعی ما لا کلام دواوینِ این اعزہ فراہم آوردہ پارۂ ابیات از ہر کدام بر سبیل یادگار در ذیل این بیاض کہ مؤرخ موسوم بہ ''مخزن نکات'' است بہ قید قلم در آوردہ ۔''

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ''مخزن نکات'' بقول عرشی صاحب دراصل ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ع میں شروع ہو کر ۱۱۶۸ھ میں مکمل ہوا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قائم نے دیباچہ آغاز تذکرہ ہی کے زمانے میں لکھ لیا تھا ، اس لحاظ سے ان کا دعویٰ درست ہو سکتا ہے ۔ ورنہ تکمیل تذکرہ کے لحاظ سے ان کے دعوے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے ۱۱۶۵ھ میں دکن کے دو تذکروں سے قطع نظر خود شمالی ہند میں میر کا نکات الشعراء مکمل ہو چکا تھا اور میر کے تذکرے کی بنیاد پر فتح علی حسینی نے بھی ۱۱۶۶ھ میں ''ریختہ گویاں'' کو مکمل کر لیا تھا ۔ علاوہ ازیں مخزن نکات اور نکات الشعراء کے بعض تراجم کی لفظی و معنوی مشابہت یہ بتاتی ہے کہ قائم کو میر کے تذکرے کی خبر تھی اور وہ اس کے متن و مواد سے بھی بے خبر نہ تھے ۔ مخزن و نکات کے بعض تراجم میں مماثلت کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ قائم اور میر دونوں معاصر تھے اور دہلی میں تھے ، تذکرہ کا مواد حاصل کرنے کے ذرائع دونوں کے پاس یکساں تھے ۔ قائم نے اپنے تذکرے میں بیاض عزلت سے واضح طور پر استفادہ کیا ہے چوں کہ شاہ عزلت اور سراج الدین علی آرزو کے مراسم خاص تھے اس لیے آرزو کے توسط سے میر کی رسائی بھی بیاض عزلت تک ضرور رہی ہوگی بلکہ قائم کے مقابلے میں میر کو عزلت سے زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملا ہوگا اور اسی لیے جہاں جہاں عزلت سے منسوب روایت کے بیان میں دونوں کے تراجم ایک سے ہیں ان میں میر کو سبقت دی جائے گی ۔[1]

۱۔ مقدمۂ مخزن نکات ، ص ۳۳ ، مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب ، لاہور ۱۹۶۶ع ۔

اس کے علاوہ بعض قرائن اور بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ قائم نے اگرچہ میر یا ان کے تذکرے کا نام کہیں نہیں لیا لیکن قائم کے بعض تراجم ایسے ہیں جو واضح طور پر میر کے تراجم کا جواب معلوم ہوتے ہیں۔ میر نے محمد علی حشمت، محمد یار عرف کلّو خاکسار اور انعام اللہ یقین پر بڑی لعن طعن کی تھی، اور ہر طرح انھیں کم رتبہ ثابت کیا تھا۔ قائم نے اپنے تذکرے میں ان تینوں کی تعریف کر کے گویا میر کی رائے کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر نے خاکسار کے بارے میں دیگر برائیوں کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ:

''شعر ریختہ کہتے ہیں بڑی ڈینگ کی لیتے ہیں اور کمینہ پن دکھلاتے ہیں۔ میرے پیچھے اس طرح ہاتھ دھو کر پڑے ہیں گویا کسی رسی بٹنے والے کی اولاد ہیں۔ محمد معشوق کنبوہ نائب میر بحر بڑے گرم جوش اور یار باش ہیں یہ سنا کہ خاکسار کا نام کلّو ہے تو برجستہ کہا: ع

کتّا ہے در یار کا کلّو ہے اس کا نام

چوں کہ کتّے کا نام اکثر کلّو رکھا جاتا ہے اس مقولے سے بڑا لطف آیا۔ جس نے اس کو خوش آمدانہ دُم ہلاتے دیکھا ہے وہی سمجھ سکتا ہے۔''

قائم نے خاکسار کے ذکر میں اسی طرح کی پھبتی کا ایک واقعہ سودا کے حوالے سے میر کے بارے میں لکھا ہے گویا میر نے خاکسار پر جو پھبتی کسی تھی اس کا جواب دیا ہے۔ خاکسار کے تذکرے میں قائم لکھتے ہیں کہ:

''مرزا رفیع سودا نقل فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اور خاکسار مرتضیٰ قلی خاں فراق کے مکان پر گئے۔ خاکسار نے بے موقع دورانِ گفتگو میں میر تقی میر کا شکوہ چھیڑ دیا اور حاضرین سے فرمائش کی کہ میر مذکور کی ہجو کہیں مگر سب میر سے آشنائی کے باعث اس سے باز رہے محض ان کی خاطر سے میں نے اس وقت یہ مطلع موزوں کر کے ان کے حوالے کیا:

میر کا مکھڑا ہی، نے تنہا گل زنبق سا ہے
پیٹ بھی اس کا جو میں دیکھا سو کچھ بھنبھق سا ہے

یہ شعر سنتے ہی قریب تھا کہ حاضرین ہنستے ہنستے ہلاک ہو جاتے اور

ان کا بھی یہی حال تھا ۔ جب کچھ دیر اسی طرح گزری کہ یاروں کی ہنسی رکی ہی نہیں تو اُن کی نگاہ اپنے پیٹ پر پڑی ۔ بس اُٹھے اور مرزا اور اُن کے دوستوں کو برا بھلا کہنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔"

اس طرح کی بعض باتیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہیں کہ قائم نے کسی نہ کسی رنگ میں میر کے تذکرے سے فائدہ ضرور اٹھایا ہے اور ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ وہ شعرائے اُردو کے پہلے تذکرہ نگار ہیں ۔ ہم اس سلسلے کی بحث پچھلے صفحوں میں الگ تفصیل سے کر چکے ہیں ۔

نکات اور مخزن کے بعض تراجم میں یکسانگی اور خاص طور پر خاکسار کے سلسلے میں میر کے اس بیان کی روشنی میں :

"بسیار سفلگی می کند بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ چنانچہ علی الرغم این تذکرہ تذکرۂ نوشتہ است بنام معشوقِ چہل سالۂ خود و احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ و خطابِ خود سید الشعرا پیش خود قرار دادہ آتشِ کینہ کہ بےسبب افروختہ است چون کبابم بُو می دہد این قسم بے مـن ریسمان می تابد کـہ گـوئی پسرِ رسن تاب است ۔"[۱]

نثار احمد فاروقی نے پہلے یہ سوال اٹھایا کہ :

"اگر میر کا تذکرہ سب سے پہلا ہے تو خاکسار نے اپنے معشوق چہل سالہ کے نام سے جو تذکرہ لکھا تھا اس کا حوالہ اس میں کیسے آ گیا ۔"[۲]

بعد ازاں "تذکرۂ معشوق چہل سالہ" کے عنوان سے الگ مضمون سپردِ قلم کر کے یہ رائے ظاہر کی :

"اس عبارت کا مفہوم اکثر حضرات نے غلط سمجھا یعنی محمد یار خاکسار نے میر کے تذکرے کا جواب لکھا تھا اور اس کتاب کا نام "معشوق چہل سالۂ خود" رکھا تھا ۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال

۱۔ نکات الشعراء ، ص ۱۱۲ ، طبع دوم ۔

۲۔ نکات الشعراء کی ایک اور روایت مشمولہ دلی کالج میگزین میر نمبر ، ص ۲۹۵ ، مرتبہ نثار احمد فاروقی ، مطبوعہ دلی ۱۹۶۲ع ۔

ظاہر کیا تھا کہ میر کی مراد یہ ہے کہ خاکسار نے ایک تذکرہ لکھا اور اسے اپنے معشوق چہل سالہ سے منسوب کر دیا۔ یعنی میر نے پھبتی اس تذکرے کے مؤلف پر کہی ہے'':

''اس معشوق چہل سالہ کا نام محمد قائم اور اس تذکرے کا عنوان مخزنِ نکات ہے اور میر اس کی تالیف کا ذمہ دار خاکسار کو قرار دیتے ہیں۔''[1]

لیکن فاروقی صاحب کی یہ رائے سراسر قیاسی اور دلائل سے عاری ہے۔ مخزن نکات یا کسی اور تذکرے سے اب تک اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ ''مخزن نکات'' قائم کی تالیف نہیں اور خاکسار اس کی تالیف کے ذمہ دار ہیں۔ تذکروں میں قائم اور خاکسار کے ایسے تعلقات کا بھی ذکر نہیں ملتا جس سے یہ کہا جا سکے کہ خاکسار کی نظر میں قائم معشوق کی حیثیت رکھتے تھے۔ ''مخزن نکات'' میں خاکسار کا لقب نہ تو سید الشعراء ظاہر کیا گیا ہے اور نہ ان کا ذکر سب سے پہلے آیا ہے۔ قائم نے خاکسار کا ذکر بھی اس انداز سے نہیں کیا کہ خاکسار کا مرتبہ میر سے بلند ظاہر ہوتا ہو۔ خود میر کے ذکر میں قائم نے سودا کے حوالے سے ایک لطیفے کے علاوہ ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جو قائم اور میر کے درمیان کشیدگی ظاہر کرتی ہو۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ ''خاکسار'' کے تذکرے سے مراد ''مخزن نکات'' اور معشوق چہل سالہ سے مراد ''قائم'' ہیں۔ رہی یہ بات کہ قائم نے خاکسار کا ترجمہ بدل دیا ہوگا اور مخزن نکات کا اصل نسخہ کوئی اور رہا ہوگا، سو جب تک کوئی ثبوت اس کی تائید میں نہ مل جائے، بات قیاس سے آگے نہیں بڑھتی اور قیاس کو قرائن و شواہد پر ترجیح دینا اصول تحقیق کے منافی ہے۔

محمد انصار اللہ نظر نے اس موضوع پر خاصی تفصیل سے بحث کی ہے اور نثار احمد فاروقی سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے مضمون کو محض شک اور قیاس

۱۔ ''تذکرۂ معشوق چہل سالہ'' مشمولہ اُردو ادب، ص ۴۳، شمارہ نمبر ۱، علی گڑھ ۱۹۶۷ء۔

پر مبنی بتایا ہے۔[۱] لیکن تحسین سروری صاحب نے نثار احمد فاروق اور محمد انصار اللہ نظر کے مضامین کو سامنے رکھ کر ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے۔ ان کی رائے میں میر و قائم کے تعلقات میں کشیدگی نہ تھی لیکن میر اور خاکسار میں ضرور لگتی تھی۔[۲] ان کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو یہ بات خود میر تقی میر کے بیان سے ثابت ہے دوسرے یہ کہ معاصر تذکروں کے تراجم سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کشیدگی سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قائم، خاکسار کے معشوق تھے یا قائم کی تالیف کے ذمہ دار خاکسار ہیں۔ اس لیے ''تذکرۂ خاکسار'' کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ قائم کا مخزن نکات ہے یا خاکسار کے تذکرے کا کبھی کوئی وجود نہیں تھا، سرِ دست درست نہیں معلوم ہوتا، مزید تحقیق کے بعد نئی باتیں سامنے آئیں تو اور بات ہے۔ اب تک کی تحقیق تو یہی ظاہر کرتی ہے کہ میر کا تذکرہ قائم کے تذکرے سے بلحاظ تکملہ مقدم ہے اور قائم کا قیام چوں کہ دلی ہی میں تھا اس لیے میر کے معاصر کی حیثیت سے وہ اس کے وجود اور مواد سے کسی نہ کسی طور پر ضرور باخبر رہے ہوں گے۔

لیکن نکات الشعراء اور مخزن نکات میں بعض تراجم میں یکسانگی و مماثلت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قائم نے فتح علی حسینی کے طرز پر میر سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کا تذکرہ میر کے تذکرے کا چربہ ہے، ایسا نہیں ہے۔ قائم کا تذکرہ اپنی ہیئت و معنویت دونوں لحاظ سے میر کے تذکرے سے بہت مختلف ہے۔ قائم کے یہاں شعرا کا ذکر میر و گردیزی کے برعکس حروفِ تہجی کی بجائے مندرجہ ذیل تین طبقوں میں بلحاظ زمانہ کیا گیا ہے:

(۱) طبقۂ اول: در بیان اشعار شعرائے متقدمین۔

(۲) طبقۂ دوم: در ذکر کلام سخنورانِ متوسطین۔

(۳) طبقۂ سوم: در بیان اشعار و احوال سخن طرازانِ متاخرین۔

۱۔ تذکرۂ خاکسار، مشمولہ اُردو ادب، علی گڑھ، ص ۱۰۳، شمارہ نمبر ۳، ۱۹۶۷ع۔

۲۔ قومی زبان کراچی، ص ۲۷، بابت اگست ۱۹۶۸ع۔

طبقۂ اول سعدی و امیر خسرو سے شروع ہو کر میر جعفر زٹلی کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ طبقۂ دوم کا آغاز آبرو و آرزو کے ذکر سے ہوتا ہے اور کمترین پر انجام کو پہنچتا ہے اور طبقۂ سوم میں سب سے پہلے فقیر کا ترجمہ ہے اور سب سے آخر میں اپنا ذکر کیا ہے۔ پہلے طبقے میں ۳۱ دوسرے میں ۳۴ اور تیسرے طبقے میں ۶۳ شاعروں کے تراجم شامل ہیں۔ ہر طبقے کے آغاز میں مؤلف نے اس عہد کے رجحانات اور خصوصیات فن پر تبصرے کیے ہیں۔ یہ تبصرے بہت مختصر ہیں لیکن یہ کیا کم ہے کہ تذکروں کی تاریخ میں پہلی بار اُردو شاعری کو اشخاص کے ساتھ ساتھ ادوار کی روشنی میں بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قائم کے تاریخی شعور کا ثبوت بہم پہنچایا ہے دوسری طرف بعد کے تذکرہ نگاروں کو ادب و زندگی کے رشتوں کا احساس دلایا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مخزن نکات کی اس خصوصیت کے پیش نظر بہت صحیح لکھا ہے کہ "تذکرہ نگاری میں یہ تاریخی احساس لٹریری ہسٹری کی طرف رجحان کا پہلا قدم ہے جو آگے چل کر آبِ حیات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔"[1] ڈاکٹر اشپرنگر نے بھی مخزن نکات کے بارے میں کم و بیش یہی بات کہی ہے کہ:

"This is the most valuable work of the early History of Hindustani Literature."[2]

ہر چند کہ قائم نے شعرا کے تراجم میں سنین یا تاریخ وفات کے درج کرنے کو ضروری نہیں سمجھا پھر بھی مضمون، ثاقب، عاصمی، محتشم علی، حشمت، محمد علی خان نادر اور گرامی وغیرہ کے تراجم میں ایسے فقرے موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ قائم تاریخی شعور سے بیگانہ نہ تھے۔

کہیں کہیں سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی اور سیرت و سوانح نگاری کی بعض خصوصیات کی ترجمانی بھی مخزن نکات میں ملتی ہے۔ اقتدا حسن نے اپنے مقدمے میں محمد حسین مخلص، حزیں، نثار، مظہر جانِ جاناں، خاکسار، ہدایت،

۱- شعرائے اُردو کے تذکرے، ص ۳۴، مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۵۲ع۔

۲- A catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani Manuscript, Vol. I, page 179.

مائل وغیرہ کے تراجم کی مدد سے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔[1] میر کی طرح کا تنقیدی شعور البتہ قائم کے یہاں نہیں ملتا۔ اقتدا حسن کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ خاکسار، محمد علی، حشمت، یقین اور حاتم کے بیان میں قائم نے میر کی بہ نسبت زیادہ اعتدال پسندی اور سنجیدگی کا ثبوت دیا ہے۔ میر نے یقیناً ان کے تراجم میں حد درجے تلخ اور ترش لہجہ اختیار کیا ہے لیکن جیسا کہ نکات الشعرا کے سلسلے میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں "تنقید" کھرے کھوٹے کا معیار ہونے کے سبب علمی و فنی بصیرت اور تاریخی شعور کے ساتھ ایک نقاد سے بے باکی و بے خوفی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہمارے یہاں یہ بے باکی و بے خوفی بعض اخلاقی قدروں کی پاسداری کے سبب آج بھی بہت کم نظر آتی ہے، نتیجۃً ہمارے تنقیدی سرمایے کا زیادہ حصہ سنجیدگی و اعتدال پسندی کے با وصف بے لاگ تبصرے کے ذیل میں نہیں آتا۔ عام طور پر ایک ہی طرح کے تعریفی کلمات اور مدحیہ فقرے سارے معاصرین کے بارے میں ملتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر ناقدین اپنے معاصرین کے سلسلے میں سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہہ کر انھیں ناراض نہیں کرنا چاہتے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اخلاق کے نام پر ہر طرف سے مطعون کیے جاتے ہیں۔ اخلاق کا یہ معیار جو آج بھی ہماری ادبی تنقید میں ایک طرح کی رکاوٹ بنا ہوا ہے اب سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے اس سے بھی کہیں زیادہ حائل تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قدیم تذکرہ نگار اپنے سے بزرگ شعرا خصوصاً معاصر شعرا کو بالعموم دعائے خیر اور مبالغہ آمیز جا بجا تعریفی کلمات ہی سے یاد کرتے ہیں۔ قائم بھی اسی قسم کے ایک صلح پسند تذکرہ نگار ہیں۔ میر کی طرح ان کے یہاں ہر شاعر کے متعلق کوئی انفرادی رائے رکھنے کا شعور اور اس رائے کو بے خوفی سے ظاہر کر دینے کی جسارت نظر نہیں آتی۔ میر کا مرتبہ بہ حیثیت تنقید نگار ان سے بہت بلند ہے۔ مخزن نکات میں بعض واقعاتی کمزوریاں بھی ہیں۔ مثلاً ریختہ کو سعدی شیرازی سے منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں۔ قائم سے پہلے میر تقی میر اپنے تذکرے میں اس کی تردید بھی کر چکے ہیں۔ جعفر علی خاں ذکی کے ترجمے میں قائم نے لکھا

۱۔ مقدمہ مخزن نکات، ص ۳۹ تا ۴۱، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

ہے کہ:

''مثنوی پنج صد بیت در تعریف قلیان بر طبق فرمائش محمد شاہ بادشاہ بسیار بہ تلاش نظم کردہ۔''

یہ بات صرف جزوی طور پر درست ہے۔ زکی نے مثنوی کا آغاز کیا تھا لیکن اس کا تکملہ حاتم نے کیا۔ یہ مثنوی حاتم کے ''دیوان زادہ'' میں شامل بھی ہے۔[1]

معاصر تذکرہ نگاروں کی طرح قائم کے تراجم میں بھی حالات سے زیادہ انتخابِ اشعار پر زور دیا گیا ہے۔ بدوں اشعار، اشرف الدین مضمون اور شاہ ولی اللہ کے تراجم اس جگہ بطور مثال نقل کیے جاتے ہیں:

''ولی شاہ ولی اللہ ولی تخلص۔ شاعریست مشہور مولدش گجرات است گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیائے مشاہیر است افتخارہا داشت۔ در سن چہل و چہار از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ میر ابو المعانی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بہ جہان آباد آمد گاہ گاہ بزبانِ فارسی دو سہ بیت در وصف خط و خالش می گفت چون در آنجا بسعادتِ ملازمتِ حضرت شیخ سعد اللہ گلش قدس سرہ، مستعد گردید بگفتن شعر بزبانِ ریختہ امر فرمودند و این مطلع تعلیماً موزون کردہ حوالۂ او نمودند:

خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کرون
بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کرون

بالجملہ بہ یمنِ تفول زبانِ ایشان سخن ازین بابا چنان حسنِ قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تر از مطلعِ آفتاب گردیدہ و ریختہ را قسمے بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آن وقت از راہ ہوش شعر ریختہ موزون می نمودند۔ چنانچہ قدوۃ السالکین زبدۃ الواصلین میرزا عبدالقادر بیدل رحمت اللہ علیہ نیز دربن زبان غزلے گفتہ کہ مطلع و مقطع اش این ست:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس جنسِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

۱۔ مخزن نکات، ص ۶۳، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

جب دل کے آسماں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

و این چند بیت کہ فقیر موافقِ فہمِ ناقصِ خود از دیوان ولی مذکور منتخب ساختہ اوست۔''[۱]

مضمون : شرف الدین مضمون تخلص از نبائر شیخ فرید شکر گنج قدس سرہ' بہ جمیع صفات موصوف و بہ ہمہ حسنات معروف بود مولدش جائے است در نواحِ گوالیار کہ او را جاجیو می گویند چون سنِ شریفش از چہل متجاوز گردید دست از قیدِ علائق برداشت و قدم در راہِ آزادگی گذاشت در زینت المساجد کہ بر کنار دریائے جمن چون از تعمیر زینت النسا بیگم است مسکنِ خود قرار دادہ بہ توکل می گذراند بسکہ خلیق و خوش صحبت بود اکثرے از مردم نجبا آخرِ روز بطریق سیر در حلقۂ مجلس او وارد می شدند بندہ نیز دو سہ مرتبہ بہ خدمت شریفش حاضر شدہ ام مدت دہ سال است کہ بہ اجلِ طبعی در گذشت شعر ریختہ را بہ تلاش الفاظ و معنیِ تازہ می گفت خدایش بیامرزاد۔''[۲]

☆ ☆ ☆

۱۔ مخزن نکات ، ص ۲۱ تا ۲۴ ۔
۲۔ مخزن نکات ، ص ۵۲ - ۵۳ ، مطبوعۂ مجلسِ ترقی ادب لاہور۔

"ریاض حسنی"[1]

"ریاض حسنی" یا تذکرۂ فتوت کے مصنف خواجہ عنایت اللہ فتوت ہیں۔ فتوت نے تذکرے میں اپنا حال لکھا ہے۔ خواجہ عبدالرحمٰن متوفی ۱۱۶۰ھ فتوت کے والد تھے اور بسلسلۂ ملازمت سرکار آصفیہ سے وابستہ تھے۔ فتوت متوفی ۱۲۳۱ھ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی، شعر و سخن میں شاہ سراج کے شاگرد ہوئے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنے ایک مضمون میں ان کے حالات قدرے تفصیل سے لکھ دیے ہیں۔[2] ہاشمی صاحب کے مضمون سے پہلے فتوت کا ذکر "گل عجائب" مؤلفۂ اسد علی خاں تمنا اور "محبوب الزمن تذکرۂ شعراء دکن" مؤلفۂ عبد الجبار خاں صوفی ملکا پوری میں آیا ہے۔ عبدالجبار خاں صوفی نے گل عجائب کے حوالے سے فتوت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"آپ نواب لشکر جنگ کے خلف الصدق ہیں اور خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت کے برادر۔ آپ کا مسقط الراس شہر اورنگ آباد ہے مولد و منشا بھی شہر مذکور ہے۔ سن شعور و تمیز کے بعد آپ نے علمائے شہر سے کتب درسیہ عربی و فارسی کی سند حاصل کی۔ آپ کو سخن سنجی میں سراج الدین سراج تخلص اورنگ آبادی سے تلمذ ہے۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کلام موزوں فرماتے ہیں۔ مشاعرے میں آپ کے اشعار پر تحسین و تعریف کا آوازہ بلند ہوتا ہے۔ ۱۱۹۵ھ تک زندہ رہے

۱- اس تذکرے کا نام بعض نے "تذکرۂ فتوت" بھی لکھا ہے۔

۲- نوائے ادب، بابت اپریل ۱۹۵۶ع۔

بارھویں صدی ہجری کے شروع میں فوت ہوئے ۔"[۱]

اوپر کی عبارت کی آخری سطر میں غلطی معلوم ہوتی ہے ۔ فتوت کا انتقال بارھویں صدی ہجری کے شروع میں نہیں تیرھویں صدی کے شروع میں ہوا ہے ۔

صاحب گل عجائب کا بیان فتوت کے بارے میں بہت مختصر ہے ۔ انھوں نے صرف اس قدر لکھا ہے :

"صاحب شوکت و حشمت خواجہ عنایت اللہ خان فتوت خلف الصدق لشکر جنگ است و چمنِ فکر را تازہ آب و رنگ برادرِ کلان خواجہ ابوالبرکات خان عشرت است و شاگرد سید سراج الدین است و بحرِ طبعش متّواج ازو است ۔"[۲]

اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ سنٹرل رکارڈ آفس حیدر آباد دکن میں موجود ہے ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے سب سے پہلے اس تذکرے کا مختصر تعارف شائع کیا تھا اور اس کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس میں ۲۲۱ صفحے اور ہر صفحے میں تقریباً بارہ سطریں ہیں ۔[۳] بعد ازاں اس کا تفصیلی تعارف نصیرالدین ہاشمی کی توجہ سے منظرِ عام پر آیا ۔ یہ قلمی نسخہ خواجہ محمد اکرم کے ہاتھ کا لکھا ہے جن کی فرمائش پر فتوت نے یہ تذکرہ لکھا تھا ۔ اس میں بسلسلۂ تاریخ تصنیف مندرجہ ذیل رباعی ملتی ہے :

تاریخ بنائے این ریاض حسنی
جُستیم ز فیضِ خاصِ آلِ مدنی
از روئے سرود بذل ہاتف گفت؟
گلدستۂ ریحانِ بہارِ معنی

آخری مصرعے کے اعداد میں حرف "ب" کے عدد شامل کرنے سے ۱۱۶۸ نکلتے ہیں ۔ یہی اس کا سالِ تصنیف کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس

۱۔ محبوب الزمن ، حصہ دوم ، ص ۹۰۹ ، مطبوعہ مطبع رحمانی حیدر آباد ۱۳۲۹ھ ، مملوکہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

۲۔ گل عجائب ، ص ۱۲ ، انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۶ع ۔

۳۔ سالنامہ سہیل ، ص ۱۱۳ ، ۱۹۳۶ع مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔

سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا سالِ تصنیف ۱۱۷۳ھ قرار دیا ہے اور ریاض حسنی کو تذکرۂ گردیزی سے مستفید بتایا ہے۔[1] ڈاکٹر حنیف نقوی کا ریاض حسنی سے متعلق ایک مفصل مضمون بھی شائع ہو چکا ہے۔[2]

یہ تذکرہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور نصیرالدین ہاشمی نے اس کی جو تفصیلات شائع کی ہیں وہی میرے سامنے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۱۸۵ شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ گویا اُردو شعرا کے قدیم ترین تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ اس میں شمالی ہند اور دکن دونوں علاقوں کے شعرا شروع سے لے کر معاصرین تک شامل ہیں۔ پہلا ترجمہ سراج الدین علی خاں آرزو کا ہے اور آخری یک دل کا۔ ابتدا میں پچیس صفحوں کا دیباچہ ہے۔ اس تذکرے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے ایسے شعرا کے حالات و منتخبات کلام بھی محفوظ ہو گئے ہیں جو نکات الشعراء، تحفۃ الشعراء، گلشن گفتار اور مخزن نکات وغیرہ میں محذوف ہو گئے تھے۔ بطور نمونہ نصرتی اور سودا کے تراجم اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں:

نصرتی: ''نصرتی سخن طراز دکن است مسکنش بیجا پور۔ اکثر قصہ ہا بہ زبانِ ہندوی مرتب ساختہ و در آن تلاش ہا بسیار کردہ دادِ معنی یابی دادہ۔ وقتیکہ شاہ اورنگ زیب عالم گیر غازی نور اللہ برہانہ ولایت دکن را تسخیر آورد و حکم نفاذ داد کہ سخن سنجان این ملک را نظر بگذاشتند۔ بموجب حکم گزرانیدند۔ کلام نصرتی را برہمہ افضل فرمود۔ بہ خطاب ملک شعرائے ہند سر فرازی یافت چنانچہ در مدح عاشق شہ باز بلند پرواز سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بکمال خشوع و خضوع می سراید۔''[3]

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف۔

۲۔ ''نیا دور'' لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۷۰ع۔

۳۔ بحوالہ ''نوائے ادب'' بمبئی بابت اپریل ۱۹۵۶ع۔

سودا : ''معنی یاب بے ہمتا مرزا محمد رفیع سودا ، فخرِ سخن گویانِ جہاں آباد است بلبلِ طبعش از آئینہ نمائے محمد میر میر گویائندہ چنانچہ می سراید :

سودا تُو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف''۱

☆ ☆ ☆

۱- بحوالہ ''مرزا محمد رفیع سودا'' ، ص ۴۱۷ ، از ڈاکٹر خلیق انجم ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ، علی گڑھ ۱۹۶۶ع -

چمنستان شعرا

مصنف کا پورا نام رائے لچھمی نرائن شفیق ہے ، ذات کے کائستھ تھے ، اُردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص کرتے تھے - ان کے والد رائے منسا رام نواب نظام الملک آصف جاہ (دکن) کے نمک خواروں میں تھے - منسا رام کو علم و ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی ، چنانچہ کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں - شفیق صفر ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ع میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے - یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اورنگ آباد ، شعر و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا - شفیق نے بہت جلد عربی ، فارسی اور علومِ متداولہ میں مہارت پیدا کر لی اور گیارہ بارہ سال ہی کی عمر سے شعر کہنے لگے - دیباچے میں خود لکھتے ہیں :

''بندہ لچھمی نرائن المتخلص بہ صاحب در ریختہ و شفیق در فارسی قبل ازین از سنہ دوازدہ سالگی مشقِ سخنِ فارسی می نمود -''

(چمنستان شعرا ، ص ۱ ، ۲ ، طبع اول)

شعر گوئی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی شفیق کو خاص شغف تھا چنانچہ کئی تاریخی کتابوں کے علاوہ تین تذکرے ان سے یادگار ہیں :

۱- ''شامِ غریباں'' : ایران سے ہندوستان آنے والے فارسی شعرا کا تذکرہ ہے -

۲- ''گلِ رعنا'' : ہندوستان و پاکستان کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے -

۳- ''چمنستانِ شعرا'' : برّصغیر پاک و ہند کے اُردو شعرا کا تذکرہ ہے -

شفیق کا ذکر کئی تذکروں میں آیا ہے - چمنستان کے دیباچے اور ردیف ''ص'' کے شعرا میں خود ہی شفیق نے اپنا ذکر کیا ہے اور خاصی تفصیل سے

کیا ہے -

مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ :

''چون این تالیف دلکشا و تصنیفِ روح افزا در سنہ خمس و سبعین و مأیۃ الف صورت تحریر پذیرفت و شاہدِ اسامی شعرا بموجب قاعدۂ جمل حلیۂ تسطیر در بر گرفت نام و تاریخ ''چمنستان شعرا نہادم -''

[چمنستان شعرا ، ص ۳]

اس سے ظاہر ہوا کہ چمنستان شعرا ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۱ع میں بہ عمر سترہ سال مکمل ہوا ہے لیکن اس میں ترمیم و اضافہ کا سلسلہ اس کے بعد بھی قائم رہا ہے - شفیق نے صاحب تخلص کے ساتھ جہاں اپنا ذکر کیا ہے وہاں یہ نقرہ بھی موجود ہے :

''الحال کہ ہزدہ از عمر گذشتہ باشد''

اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اسی سال غلام علی آزاد کے مشورے پر میں نے اپنا تخلص صاحب کے بجائے شفیق اختیار کر لیا ہے اور نئے تخلص کو اپنانے کی تاریخ ''تخلصِ نو'' سے ۱۱۷۶ھ نکالی ہے - اس سلسلے میں شفیق نے یہ قطعہ بھی لکھا ہے :

از حضرت فیض بخشِ آزاد گردید مرا تخلص انعام

تاریخ باہلِ بزم گفتم امداد شفیق شد مرا نام[۱]

آخری شعر کے دوسرے مصرعے سے بھی ۱۱۷۶ ہی نکلتے ہیں - اس کا واضع مطلب یہ ہے کہ شفیق نے اپنا ترجمہ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد ۱۱۷۶ھ کے اوائل میں لکھا ہے -

اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود تھا - اسی کو سامنے رکھ کر مولوی عبدالحق صاحب نے چمنستان شعرا کو مرتّب کیا اور اپنے معلومات افزا مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۸ع میں اسے انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے شائع کر دیا - یہی مطبوعہ نسخہ بڑے کتب خانوں میں موجود

۱- چمنستان شعرا ، ص ۹۳ مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۸ع ، طبع اول -

ہے اور یہی راقم الحروف کے سامنے ہے۔ اس مطبوعہ نسخے کا مخطوطہ چونکہ خستہ حالت میں دستیاب ہوا تھا اور کہیں کہیں اتنا کرم خوردہ تھا کہ الفاظ پڑھنے میں نہ آسکے اس لیے مطبوعہ میں بھی بعض جگہ فقرے، مصرعے اور الفاظ غائب ہیں۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ مطبوعہ تذکرہ کی فہرست میں شعرا کی تعداد ۲۱۳ ہے۔ دوسرے تذکروں میں شعرا کے ناموں کی ترتیب عموماً بلحاظ حروف تہجی ملتی ہے لیکن اس تذکرے میں روایت عام کے خلاف فہرست شعرا بلحاظ حروف ابجد مرتب کی گئی ہے۔ تذکرہ مصنف کے عہد جوانی کی یادگار ہے اور اس کی تالیف کے محرک، میر تقی میر اور فتح علی خاں حسینی ہیں۔ شفیق نے دیباچے میں بیان کیا ہے کہ:

"درین اثنا تذکرۂ نکات الشعرا من تصنیف میر محمد تقی میر و تذکرہ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شورے در عالم انداخت و جہانے را در اشتیاقِ اشعارِ ہند کہ بہم رسیدن آن اہلِ دکن را خیلے دشوار است تہ و بالا ساخت لہٰذا بخاطرِ فاطر و فکر ناقص گزشت کہ خود ہم این ہمہ اشعارِ ہر دو تذکرہ گرفتہ و دیگر لآلی را یک جا جمع ساختہ بطورِ سفینہ کہ انیس یکتائی و ہمدم تنہائی شود نقش باید بست۔"[1]

اس سے پتا چلتا ہے کہ شفیق نے گردیزی اور میر کے تذکروں سے استفادہ کیا ہے لیکن چمنستان شعرا کو نکات الشعرا اور تذکرۂ حسینی کا محض ملخص یا مجموعہ خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ نکات میں صرف ۱۰۳ اور تذکرۂ گردیزی میں صرف ۹۸ شعرا کا ذکر آیا ہے اس کے برعکس شفیق کے یہاں ۲۱۳ شاعروں کا ذکر آیا ہے گویا شفیق کے چمنستان شعرا میں شعرا کی تعداد میر اور حسینی کے تذکروں سے دو چند ہے۔

شعرا کے تراجم اور منتخبات کلام سے بھی صاف پتا چلتا ہے کہ شفیق نے میر و حسینی کے تذکروں ہی کو سامنے نہیں رکھا بلکہ اپنی طرف سے بہت کچھ اضافے کیے ہیں اور جگہ جگہ ترمیم و تنسیخ اور اصلاح و تنقیح سے کام لیا ہے۔

۱۔ چمنستان شعرا، ص ۲، ۳۔

"چمنستان شعرا" صرف یہی نہیں کہ دوسرے تذکروں سے ضخیم تر ہے بلکہ تراجم اور انتخاب اشعار کے سلسلے میں بھی جو اہتمام اس تذکرے میں کیا گیا ہے ، اس سے پہلے کے تذکروں میں نظر نہیں آتا ۔ اشعار کے انتخاب میں خصوصی توجہ یہ صرف کی گئی ہے کہ نہایت احتیاط سے ہر شعر کو اصل صاحب شعر سے منسوب کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں پیش رو تذکرہ نگاروں سے جو غلطیاں ہوئی ہیں اُن کی تصحیح اور نشان دہی بھی اکثر جگہ ملتی ہے ۔ جن اشعار کے مصنفین کے بارے میں انھیں شبہ تھا انھیں تذکرے کے آخر میں الگ جمع کر دیا ہے ۔ شفیق کی تذکرے کی زبان پاکیزہ اور عام فہم ہے ۔ شعرا کے کلام پر تبصرے ملتے ہیں لیکن نہ تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹا ہے اور نہ کسی کو بے سبب طعن و تعریض کا نشانہ بنایا گیا ہے ۔ ایک دو جگہ مثلاً میر تقی میر اور انعام اللہ یقین کے بارے میں مصنف کا بیان البتہ جذباتی ہو گیا ہے ۔ میر نے اپنے تذکرے میں یقین پر سرقے کا الزام لگایا تھا ، شفیق اس الزام سے برہم نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ اُنھوں نے دل کھول کر میر کو اس سلسلے میں برا بھلا کہا ہے اور یقین کو سارے متقدمین و معاصرین سے بلند مرتبہ شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ شفیق نے کہیں کہیں شعرا کے کلام پر اصلاحات دے کر متبادل مصرعے بھی لگا دیے ہیں لیکن کسی کا مذاق اڑانے کے خیال سے ایسا نہیں کیا گیا ۔ غرض کہ چمنستان شعرا متقدمین شعرا کے سلسلے میں ایک اہم ماخذ ہے اور اس میں متعدد ایسے شاعر مذکور ہیں جن کے متعلق معلومات کا ذریعہ اس تذکرے کے سوا ہمارے پاس کوئی نہیں ہے ۔ اس تذکرے میں چوں کہ شمالی ہند اور دکن دونوں علاقوں کے شعرا کے تراجم پر یکساں توجہ دی گئی ہے اس لیے اسے دونوں کا سنگم اور تاریخِ ادب کی گم شدہ کڑیوں کو ملانے والا پہلا سلسلہ خیال کرنا چاہیے ۔ اس تذکرے میں چوں کہ شعرا کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے اس لیے آرزو سراج الدین خاں سے شروع ہو کر غلام سید غلام کے ذکر پر ختم ہوتا ہے ۔ دونوں تراجم اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں ۔ اشعار البتہ محذوف کر دیے گئے ہیں ۔

آرزو : سراج الدین علی خاں سر رشتہ مزاج بشمع افروزی مجلس گفتگوے گرم می دارد و در میدان الفاظ تازہ و معانی دلچسپ قدم جستجو بسرعت می گذارد ۔ شمع وجودش در بزم اکبر آباد روشنی یافتہ و گیسوئے شاہد سخن را

بهانجا بشانهٔ فکر رسا به نهایت پیچ و تابے بافته گلدسته بند گلهائے خیالات رنگین و نو باوه نشان سخنهائے دل نشین است ۔ در گلشن ہند مثل او عندلیب ہزار داستان کم تر می توان پنداشت و در مجلس دکن ہم چون آن پروانهٔ چراغ سخن عدیم باید انگاشت غزالان معانی را بجدے مسخر کرد که می باید و سیه خردگان الفاظ پاکیزه را نوعے حلقے در گوش ساخته که می شاید ۔ در غزل گفتن کوه جان می کشد و دیوان خانهٔ ریخته ہم به نهایت پُرکاری طاق می بندد خضرِ طبعش چشمه چشمه متعطشِ اجسام کتب را آبِ زندگی بخشنده و آفتاب کلکش جهان جهان ظلماتِ نقصِ سخنِ غیر را موکشان کشیده ۔ معلوم شد که در ماه جمادی الثانی سنه تسع ستین و مأیة و الف ببلدهٔ لکهنؤ این جهانِ فانی را وداع نموده ، جا در عالم باقی گزید ۔ تاریخ وفاتش حضرت میر صاحب و قبله میر غلام علی آزاد مدظله العالی چنین بقید قلم آوردند تاریخ :

سراج الدین علی خان نادرِ عصر   ز مرگ او سخن را آبرو رفت
اگر جوید کسے سالِ وفاتش   بگو آن جانِ معنی آرزو رفت

نقاب از رخِ شاہدان خیالش باز می نماید ۔ ابیات"[۱] :

غلام : "سید غلام ، غلام تخلص از برگزیده ہائے درگاه و مقبولان اله' است اوقات را بکمال وارستگی و آزادی بسر می برد و خود را ہمشیر زادهٔ آبرو اظهار می کند از بس که از مزاجش به تصوف آشنا است اکثر اشعارش بلکه تمامے بفهم فقیر نمی آید و شاہد حسن آن پرده از رخ نمی کشاید ۔ آبرو و صادق و مبارک و بے ہمتا و غلام در ہر مقطع ریخته التزام دارد و پرورشی در ہر بحر می نماید چنانچه می فرماید :

آبرو صادق مبارک بےدلِ ہمتا غلام
ساعت طاعت . . . . "

نیز می گوید
بےدل مبارک ہے ۔ غلام صادق . . .

۱- چمنستان شعرا ، ص ٦ ، ٧ ، مطبوعه انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۸ع ۔

حق کے افضال سے ہر درد کا درماں یاں ہے ۔

و سنہ تولدش یک ہزار و یک صد و بست وچار است با فقیر ربط خاص دارد و اکثر گاہ از راہ کرم بغریب خانہ قدم رنجہ می نماید این چند انفاس نفیسہء او تبرکاً درین جا نوشتہ شدہ ۔''[1]

☆ ☆ ☆

۱۔ چمنستان شعرا ، ص ۵۵۷ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۸ع ۔

طبقات الشعراء

مصنف کا نام قدرت اللہ اور تخلص شوق ہے ۔ آبائی وطن موئی ضلع بریلی تھا ۔ چوں کہ اوائل عمر ہی سے قیام رام پور میں رہا ، اس لیے شوق رام پوری مشہور ہوئے ۔ طبقات الشعراء کے آخر میں شوق نے بہ حیثیت شاعر اپنا بھی ذکر کیا ہے ۔ لیکن بہت انکسار و اختصار کے ساتھ ۔ اصل عبارت یہ ہے :

''محمد قدرت اللہ صدیقی شوق ، متوطنِ موضع موئی عملۂ قصبۂ کابر توابعِ سرکارِ سنبھل ۔ این چند ابیاتِ واہیات از نتائجِ فکر ناقصِ این مؤلف است ۔ اگرچہ قابل نوشتن و درج نمودن کتاب نہ بود فاما محض برائے خاطر داشت بعضے یاران و داخل شدن در زمرۂ پنج سواران نوشتہ شد ۔ اُمید کہ بہ نظر ہر صاحب سخنے کہ در آید از نظر شفقت بکشاید و بہ دعائے خیر یاد نماید ۔''[1]

اس کے بعد طویل انتخابِ کلام ہے جس کے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شوق اُردو کے ایک قادرالکلام شاعر اور اپنے زمانے کے اُستاد فن تھے ۔ شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟ اس کا سراغ شوق نے نہیں دیا ۔ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں البتہ انھوں نے خود کو مولوی غلام طیب بھاری کا شاگرد ظاہر کیا ہے ۔ غلام طیب بھاری کا ذکر قدرت اللہ شوق نے اپنی تالیف ''تاریخ جام جہاں نما'' میں کیا ہے ۔ اس کتاب میں شوق نے اپنے خاندانی حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں ۔ نثار احمد فاروقی نے اپنے مقدمے میں یہ حالات درج کر دیے ہیں ۔

۱۔ طبقات الشعراء ، مرتبہ نثار احمد فاروقی ، ص ۶۲۳ ، ۶۲۴ ، مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب لاہور ۱۹۶۸ع ۔

قدرت‌اللہ شوق کے علمی و ادبی مرتبے اور تصنیفی شغف کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ان سے مندرجہ ذیل اہم کتابیں یادگار ہیں :

۱- ''تاریخ جام جہاں نما'' : فارسی زبان میں عالم کی تاریخ ہے ۔ خاتمۂ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ع) میں اس کی تالیف ہوئی تھی ۔[1] لیکن مؤلف نے آخر دم تک اس میں اضافے اور ترمیمیں کی ہیں ۔ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مرقومۂ ۱۲۷۰ھ موجود ہے ۔ احمد علی خاں شوق نے اس کا خلاصہ اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع کر دیا ہے ۔[2]

۲- ''تکملۃ الشعراء'' : فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے ۔ اس کے دو قلمی نسخے رام پور میں موجود ہیں ۔ کتاب میں سالِ تصنیف مذکور نہیں ہے ۔ البتہ دیباچے میں مصنف نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ تاریخ جام جہاں نما کے بعد یہ تذکرہ لکھا گیا ہے ۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس کے تکملے کا سال ۱۲۱۳ھ بتایا ہے ۔[3]

۳- ''طبقات الشعراء'' : یہ اُردو شعرا کا تذکرہ ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی ۔

قدرت اللہ شوق رام پوری کا انتقال ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ع) میں ہوا ہے ۔[4]

مؤلف نے دیباچے کی آخری سطور میں لکھا ہے کہ :

''از ایامِ طفلی بہ اتفاقِ صحبتِ سخن طرازان کہ ''الشعراء تلامیذالرحمٰن'' در شانِ شان واقع آمدہ است شوقِ کلام موزون از ہر زبانے کہ باشد خصوصاً زبانِ ریختہ بہ سببِ مناسبتِ ہم زبانی در دلِ عزیزم زیادہ از حد بود اکثر اشعار اُستادانِ این فن از دواوین مؤلفہ و ابیاض متفرقہ تلاش و تجسس نمودہ جمع نمودہ بودم می خواستم کہ این ہمہ مزخرفات

۱- دیباچۂ دستور الفصاحت ، ص ۷۰ ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

۲- اورائینٹل کالج میگزین ، جلد ۷ ، شمارہ ۱ ، بابت نومبر ۱۹۳۰ع ۔

۳- دیباچۂ دستور الفصاحت ، ص ۷۲ ۔

۴- دیباچۂ دستور الفصاحت ، ص ۷۰ ۔

را بطریقِ تذکرہ تالیف سازم فامّا بہ سبب عدم مساعدتِ روزگار فرصت وقت نمی یافتم و باوجودِ فرمائشِ بعضے عزیزان در تعویق می انداختم بالضرور رضامندیِ آن ہا کہ از جملہ لزومات بود مقدم جمیع امور دانستہ در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت ہجری (۱۱۸۸ھ) کہ تعطیل و تنہائی محض لاحقِ حالِ این ہیچ مدان بود بہ این صور و نقوش کاغذی صحبت برگزیدم و این چند اوراق در سلک تحریر در آوردم ۔"[۱]

اس عبارت سے پتا چلتا ہے کہ شوق نے انتخابِ کلام کا کام بہت پہلے سے شروع کر رکھا تھا اور منتخب اشعار کی ایک بیاض بھی تیار کر لی تھی ۔ اس بیاض کو انھوں نے ۱۱۸۸ھ میں تذکرے کی شکل دے دی ۔ مؤلف کے بیان کے مطابق تذکرے کا سالِ تصنیف ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۵ع ہے ۔ اعزالدین عزیز عثمانی بدایونی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ:

"تاریخ این تذکرۂ فقیر "حقیقت شعرا" خوب گفتہ"

یعنی طبقات الشعراء کا تاریخی نام "حقیقت شعرا" ہے ۔ اس سے ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ع) برآمد ہوتے ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ اولیں صورت میں ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۸۹ھ کے درمیان مکمل ہو چکا تھا لیکن نثار احمد فاروقی مختلف تراجم کی مدد سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس میں ۱۱۸۹ھ کے بعد بھی اضافے کیے گئے ہیں ۔[۲]

طبقات الشعراء کے چار قلمی نسخوں کا سراغ اب تک ملا ہے ۔ ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ہے ۔ دوسرا کتب خانۂ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ہے ۔ تیسرا نسخہ سنٹرل رکاڈس آفس حیدر آباد دکن میں ہے اور چوتھا نسخہ لالہ سری رام کے پاس تھا جس کے حوالے ان کی تالیف خم خانۂ جاوید، جلد اول، مطبوعہ ۱۹۰۸ع میں ملتے ہیں ۔ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن کا نسخہ ۱۲۱۰ھ کا مکتوبہ ہے ۔ اگست ۱۹۳۸ع میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے سب سے پہلے اس نسخے کی تلخیص کتابی صورت میں شائع کی اور ایک جامع

۱۔ طبقات الشعراء، ص ۳، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ع ۔

۲۔ مقدمۂ طبقات الشعراء، ص ۳۶ ۔

مقدمے کے ذریعے اس کی اہمیت کا احساس دلایا۔ نگار ۱۹۶۴ع کے سال نامے میں راقم الحروف نے طبقات الشعراء کے سلسلے میں جو تفصیلات دی تھیں وہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہی کے مرتبہ و ملخص طبقات الشعراء کے پیش نظر دی تھیں۔ بعد میں کتب خانۂ آصفیہ ہی کے نسخے کو بنیاد بنا کر نثار احمد فاروقی نے اس کا مکمل متن تیار کیا اور ایک بسیط مقدمہ بھی سپرد قلم کیا اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے جنوری ۱۹۶۸ع میں شائع کر دیا۔ یہ مطبوعہ نسخہ عام طور پر دستیاب ہے۔

تذکرے کی زبان فارسی ہے اور نسخۂ آصفیہ حیدر آباد مطبوعہ کی فہرست کے مطابق اس میں ۲۸۸ شعرا کے تراجم شامل ہیں۔ لیکن لالہ سری رام کے پاس طبقات الشعراء کا جو نسخہ تھا اس کے حوالے سے پچیس مزید شاعروں کا ذکر خمخانۂ جاوید میں کیا گیا ہے۔ یہ پچیس شاعر مع اُردو تراجم طبقات الشعراء، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور میں بطور ضمیمہ شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح شاعروں کی کل تعداد ۳۱۳ ہو گئی ہے۔

تذکرہ چار طبقات پر مشتمل ہے: طبقۂ اول میں ریختہ گوئی کے موجدین اور شعرائے دکن اور ان کے بعض معاصرین کا ذکر ہے۔ طبقۂ دوم میں شاعرانِ ایہام گو کو جگہ دی گئی ہے۔ طبقۂ سوم میں شعرائے متاخرین اور بعض دوسرے نو مشق شعرا مذکور ہیں۔ طبقۂ چہارم میں شعرائے تازہ گو اور بعضے نو مشقان دیگر شامل ہیں۔ اس آخری طبقے کو مندرجہ ذیل پانچ مقالوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ مقالۂ اول: در ذکر بعضے تازہ گویان سر آمدِ روزگار۔

۲۔ مقالۂ دوم: در ذکر بعضے سلاطین روزگار و وزرائے نامدار و امرائے والا تبار و بعضے منصب دارانِ سرکارِ فیض آثار و مصاحبان شاہزادۂ عالی مقدار۔

۳۔ مقالۂ سوم: در ذکر بعضے امرائے افغانانِ این دیار وغیرہ افاغنۂ قرب و جوار۔

۴۔ مقالۂ چہارم: در ذکر بعضے عزیزان و یارانِ ہم دم و دوست دارانِ ثابت قدم۔

۵- مقالۂ پنجم : در ذکر بعضے برادران و خویشان و دوست داران و یارانِ دل ریشان و بعضے نو مشقان کہ چندان مایۂ شاعری نہ دارند و بہ سبب موزونیِ طبیعت خود را از خود زیادہ پنداشتہ در جرگۂ شعرا می شمارند -

اس تقسیمِ ادوار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے شعرا کی ترتیب و تراجم میں جدت سے کام لیا ہے - قائم اور میر حسن نے بھی اپنے تذکروں میں طبقات قائم کیے ہیں لیکن قدرت اللہ شوق کے طبقات کی تقسیم ان دونوں سے بہت مختلف ہے - شوق نے شعرا کو ان کی عمر ، عہد ، مرتبۂ شاعری ، اُستادی ، نو مشقی ، قرابت ، دوستی اور حیثیت عرفی کے لحاظ سے متعدد خانوں میں بانٹ دیا ہے - شوق کی قائم کردہ ترتیب شعرا سے خاص فائدہ یہ پہنچتا ہے کہ شعرا کے مزید حالات اور کلام حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے - طبقات پر نظر ڈالتے ہی مختلف تاریخوں ، علمی کتابوں ، بیاضوں اور اُردو فارسی کے تذکروں کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے اور ہمیں کم و بیش اس کا فوری اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی خاص شاعر کی مزید تفصیلات اور کہاں کہاں مل سکتی ہیں - یہ تذکرہ اس بات کا سراغ بھی دیتا ہے کہ تذکرہ کی تالیف ۱۱۸۸-۸۹ع کے وقت کون کون سے شاعر اساتذہ کی صف میں شامل ہو گئے تھے - کون کون سے نو عمر اور نو مشق خیال کیے جاتے تھے - کن کن شاعروں سے مصنف کی ملاقات تھی - کن سے گہرے دوستانہ مراسم تھے - کن سے مؤلف کی رشتہ داری تھی اور کون کون سے شعرا مؤلف کے شاگرد تھے - غرض کہ اس تذکرے سے شعرا کے متعلق بعض ایسی تفصیلات ملتی ہیں جو سوانحی نقطۂ نگاہ سے اس تذکرے کو خاصا اہم بنا دیتی ہیں - شعرا کی تاریخ پیدائش اور سال وفات کی صراحت کا اہتمام تو اس تذکرے میں بھی نہیں ہے ، پھر بھی بعض شعرا کے تراجم سے ان کی عمر اور عہد کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے - اس لیے اس کی تاریخی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا -

رہی اس کی تنقیدی و تحقیقی نوعیت - سو اس میں بھی ، یہ اپنے معاصر تذکروں کے ہم رنگ ہے - کہیں کہیں دوسروں پر گرفت کی گئی ہے ورنہ زیادہ تر تعریفی کلمات ملتے ہیں - رائے کے اظہار میں ہر جگہ اعتدال کو برقرار رکھا گیا

ہے اور کسی کو معاندانہ انداز سے طعن و تعریض کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ میر تقی میر نے انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ خود شعر نہیں کہتے مظہر جانِ جاناں انھیں لکھ کر دیتے ہیں۔ شوق نے یقین کے ترجمے میں اس کی تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

''بعضے شعرا گمان بردہ اند کہ یقین شعر گفتن نمی دانست میرزا مظہر او را شعر گفتہ می داد محض خطا است . . . ۔'' (ص ۷۷)

میر محمد خاکسار عرف کلو کو شوق نے بھی صاحب تذکرہ بتایا ہے۔ لکھتے ہیں :

''مصنف تذکرۂ ہندی است ۔'' (ص ۹۹)

نواب امیر خاں انجام عمدۃ الملک کو ریختی کا موجد قرار دیا ہے، لکھتے ہیں :

''در فن ظرافت یکتا و در ادائے سخن گوہر بے بہا ، مقابل ریختہ کہ لفظے است مذکر ، ریختی تصنیف نمودہ ۔'' (ص ۶۸ - ۶۹)

اس طرح کی اور بہت سی تاریخی باتیں اس تذکرے کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔ ادبی تنقید کے لحاظ سے بھی اس میں بعض شعرا کے متعلق بڑے جچے تلے فقرے ملتے ہیں مثلاً میر کے متعلق لکھا ہے کہ :

''ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی تہ داری و پُرکاری او ظاہر و نمودار است ۔'' (ص ۲۰۶)

لیکن شوق کی زیادہ توجہ لفظی تنقید پر صرف ہوئی ہے چنانچہ شعر کی لفظی کمزوریوں کی جانب انھوں نے اکثر جگہ اشارے کیے ہیں اور اس سلسلے میں بڑے سے بڑے استاد کے ساتھ بھی کوئی رو رعایت نہیں کی۔ سودا کا شعر ہے :

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم

اس کے بارے میں شوق لکھتے ہیں :

''اگرچہ قافیۂ مصرعۂ اخیر در ظاہر مائل بہ نقصان است چرا کہ مدار قافیہ در تمام غزل بر کاف بیانیہ است و درین مصرع کاف مرکب بہ یا است فاما در تلفظ یکسان است شاید کہ شاعر مذکور بہ ہمین لحاظ جائز داشت ۔'' (ص ۱۲۶)

اسی طرح سودا کے اس قطعے

دل نے کہا یہ مجھ سے کہ میں کیا کروں نثار
آویں اگر جو حضرت سودا ادھر کہیں
انگشتری کے گھر کی طرح غیر سنگ و خشت
گھر میں تو خاک بھی نہیں آتی نظر کہیں

کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''قطعہ نہایت مربوط و مضبوط است فاماً در مصرعۂ ثانی بیت اول در کلمۂ شرط جمع شدہ ، یکے زائدہ است ۔'' (ص ۱۲۷)

سودا کا ایک اور شعر ہے:

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو الطاف
جھوٹی ہی تسلی ہو تو ضائع تو نہ ہوں میں

اس کے متعلق شوق لکھتے ہیں کہ:

''معنی لفظ ''مچ'' کہ درین شعر واقع شدہ در فہمید نمی آید پس معلوم شد کہ لفظ مہمل کہ در ہندوستان بہ وزن ہر لفظ در استعمال می آرند در شعر موزون شدن مضائقہ نہ دارد ۔ وقتے کہ در شعر استادان واقع شد پس عوام را سند است ۔'' (ص ۱۲۹)

سودا کے اس مطلع پر بھی انھوں نے گرفت کی ہے:

غنچے کو مسکرا کے اسے زار کر چلے
نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے

لکھتے ہیں کہ:

''مطلع نہایت مربوط اما در فہمید این نا فہم لفظ ''اسے'' کہ در مصرعۂ اول واقع است بیکار محض معلوم می شود ۔'' (ص ۱۳۶)

اسی طرح قائم کے اس شعر:

قائم کو اس طرح سے تُو دیتا ہے گالیاں
جس کو کسی نے آج تلک تُو نہیں کیا

کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''بزعم این نا فہم اگر بجائے لفظ ''کیا'' کہ ردیف است لفظ ''کہا'' باشد موافق محاورہ درست می نشست ۔'' (ص ۱۸۶)

مرزا جعفر علی حسرت کا شعر ہے :

تجھ کو ہے گر قتل کی چاہ حاضر ہوں میں بسم اللہ

اس کے متعلق شوق کی رائے ہے کہ :

''برائے رعایت ''بسم اللہ''، لفظ ''ذبح'' بجائے قتل بہتر است ۔''
(ص ۲۹٦)

زبان و بیان کے سلسلے میں اس قسم کی تنقیدی رائیں اس تذکرے میں اکثر جگہ ملتی ہیں اور اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ شوق ، شعر کی لفظی پرکھ کا نہایت اچھا سلیقہ رکھتے تھے ۔ طبقات الشعراء کے بارے میں نثار احمد فاروقی کی یہ رائے

''شوق نے اس تذکرے میں ایسی باتیں بہت کم لکھی ہیں جنھیں کھینچ تان کر ''تنقید'' یا تبصرہ کہا جا سکے ۔ زیادہ تر تعریفی کلمات ہیں ۔ البتہ کسی شعر پہ میر کی تقلید میں کہیں کوئی فقرہ چست کر دیتے ہیں ۔''
(ص ٦٦)

بہت سخت ہے ۔ اس سے انکار نہیں کہ قدرت اللہ شوق نے معاصر تذکرہ نگاروں سے اکثر جگہ استفادہ کیا ہے ۔ حالاں کہ اس کا اعتراف انھوں نے اپنے تذکرے میں واضح طور پر کہیں نہیں کیا ۔ پھر بھی بعض تراجم اور واقعات اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ شوق نے میر کے نکات الشعراء سے ضرور فائدہ اٹھایا ہے ۔ خصوصاً تذکرے کے آخر میں قدرت اللہ شوق نے ریختہ اور اس کے اقسام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ صریحاً میر کے تذکرے سے ماخوذ ہے ۔ با این ہمہ شوق کا اندازِ تبصرہ نگاری میر کے انداز سے بہت مختلف ہے ۔ شوق کے یہاں کسی پر فقرہ چست کرنے کی روش کہیں نہیں ہے ۔ ہر جگہ نہایت سنجیدگی اور ضروری احترامِ منصب کے ساتھ کلام پر اعتراضات کیے گئے ہیں اور ان کے اعتراضات اکثر جگہ درست ہیں ۔ میر کی طرح انھوں نے تلخ لہجے میں نہ تو کسی پر تنقید کی ہے اور نہ کسی کو ذاتی رنجش کے سبب لتاڑنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کا لب و لہجہ ہر جگہ سنجیدہ اور سلجھا ہوا ہے ۔ رہی یہ بات کہ شوق کی تنقید لفظی گرفت سے آگے نہیں بڑھتی ، سو اُس زمانے کی روشِ تنقید یہی تھی ۔ آج کل تنقید کا جو معیار اور مفہوم ہے اس سے پرانے لوگ نہ تو واقف تھے اور نہ اس کے نشانات قدیم تذکروں میں ملتے ہیں اور نہ ہمیں اس کی توقع

کرنی چاہیے ۔ اس لیے طبقات الشعراء کے مؤلف سے زبان و بیان کی تنقید کے سوا کچھ اور طلب کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔

اس تذکرے کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غزل کے اشعار کے ساتھ ساتھ قصیدہ ، مثنوی ، مخمس ، رباعی غرض کہ ہر صنف سخن کے نمونے حسبِ ضرورت دیے گئے ہیں ۔ ان نمونوں میں بہت سے ایسے ہیں جو خود صاحبِ کلام کے انتخاب کردہ ہیں اور تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہیں ۔

تذکرہ امیر خسرو کے ترجمے سے شروع ہو کر مؤلفِ تذکرہ قدرت اللہ شوق کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے ۔ چوں کہ مؤلف کو انتخاب اشعار کا خاص شوق تھا اور جیسا کہ شروع میں ظاہر کیا گیا ہے ، بیاضِ اشعار ہی کو بعد میں انھوں نے تذکرے کی شکل دے دی ہے اس لیے نثری تراجم مختصر اور منتخباتِ کلام خاصے طویل ہیں ۔ اس جگہ اشعار محذوف کر کے انعام اللہ خاں یقین اور محمد یار خاکسار کے ترجمے بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں :

یقین : انعام اللہ خان یقین پسر اظہر الدین خان سرہندی کہ در وقت محمد شاہ بادشاہ داخل ذیل امرا بود از اولاد شیخ احمد مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہ جوانے بود خوش رو و خوش گو و خوش خلق و قابل و منظور نظر و تربیت کردۂ میرزا مظہر موصوف بودہ ۔ در عین عنفوان جوانی پدرش بہ سبب تقصیرے کہ از یقین بہ وقوع آمدہ باشد کُشت ۔ یقین است کہ مغفرت شدہ باشد ۔ بعضے شعرا گمان بردہ اند کہ یقین شعر گفتن نمی دانست ۔ میرزا مظہر او را شعر گفتہ می داد محض خطا است ۔ فامّا در اشعارش اکثر اصلاح استاد بیشتر است ۔ چیزے مضائقہ نہ دارد ۔ مشق سخن او بہ پایۂ استادی رسیدہ بود فامّا اجلش مہلت نہ داد ۔ ہر قدر کہ دیوانش مرتب است ہمہ انتخاب و از درد خالی نیست از سخنان یقینیِ اوست ۔‘‘ (ص ۷۶ - ۷۷)

خاکسار : ’’محمد یار خاکسار عرف کلّو متوطن دہلی قدیم ۔ خادم درگاہ نبی کریم ۔ طبع سلیم و ذہن مستقیم دارد و نسبت خادمیت از تخلصش پیدا و خاکساری از مذاق سخنش ہویدا ۔ مصنف تذکرۂ ہندی است ۔ این چند ابیات دال بر خاکساری اوست ۔‘‘ (ص ۹۹)

☆ ☆ ☆

تذکرۂ شعرائے اردو

تذکرۂ شعرائے اُردو کے مصنف میر حسن دہلوی ہیں - میر حسن اُردو شعرا کے صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں - غزل گوئی میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں - لیکن ان کی شہرت دراصل مثنوی سحر البیان کے سبب ہوئی - سحر البیان اُردو کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے اور اس کی مقبولیت میں آج تقریباً دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا -

میر حسن کے والد میر غلام حسین ضاحک اُردو کے نامور شاعر تھے - دلی کی بربادی کے بعد میر حسن بھی اپنے والد کے ساتھ اودھ آئے - شعر و سخن میں ابتداءً اپنے والد ہی سے مشورہ لیا بعد ازاں اودھ کے قیام میں ضیاء الدین ضیا سے اصلاح لینے لگے - لیکن فنِ شعر میں وہ اپنے استاد کے بجائے سودا ، درد اور میر سے متاثر رہے ہیں - تذکرے میں اپنے متعلق خود لکھتے ہیں :

"اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرزِ اوشان از من کما حقہ ، سرانجام نہ یافت بر قدم دیگر بزرگان مثلِ خواجہ میر درد و میرزا رفیع سودا و میر تقی میر پیروی نمودم شروع جوانی از گردشِ روزگارِ بد ہنجار کہ ہرگز بہ کسے وفا نہ کردہ است بطرفِ لکھنؤ و فیض آباد رسیدم بارے کم و بیش از قدر دانی نواب فلک جناب سالارِ جنگ بہادر دام اقبالہ بلبِ نان رسیدہ در خدمتِ میرزا نوازش علی خان بہادر صحبت گزیدم کہ خلف ارجمند اوست -"[1]

میر حسن کی مثنوی "گلزارِ ارم" سے پتا چلتا ہے کہ میر و مومن کی طرح

۱- تذکرۃ الشعرائے اُردو ، ص ۸۵ ، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ۱۹۲۱ع/۱۳۴۰ھ -

وہ بھی کسی پردہ نشین کی محبت میں در پردہ گرفتار تھے ۔ نیز سعادت خان ناصر لکھتے ہیں :

''میر حسن ولد میر غلام حسین ضاحک ... دوازدہ سالگی میں شاہجہان آباد سے لکھنؤ میں آیا ۔ نواب سالار جنگ کے بیٹے سردار جنگ تھے ، ان کی سرکار میں معزز و محترم رہا ۔ بہ سبب تقاضاے جوانی محل کی ایک عورت سے محبت اور موانست ہوئی ۔ چوں کہ طبیعت موزوں تھی بہ پاس خاطر معشوقہ مثنوی بے نظیر تصنیف کی ۔ یہ تلازم کہ اس میں ہے شنیدہ نہیں دیدہ ہے ۔''[1]

میر حسن نے ۱۲۰۱ھ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ۔ مصحفی نے ''شاعر شیریں زبان'' سے ان کی تاریخ وفات نکالی ۔ میر حسن کی زندگی اور فن کے بارے میں قدیم تذکروں کے علاوہ بھی بہت سا کام ہو چکا ہے ۔ مولوی عبدالباری آسی[2] ، رام بابو سکسینہ[3] ، ڈاکٹر اعجاز حسین[4] ، حبیب الرحمٰن خان شروانی[5] ، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی[6] ، محمود فاروقی[7] ، خصوصاً ڈاکٹر

۱۔ مثنوی گلزار ارم ، ص ۱۳۶ ، مشمولہ مثنویات میر حسن نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۵ع ۔

۲۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ، ص ۴۰ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔

۳۔ تاریخ ادب اُردو ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ، طبع چہارم ۱۹۵۲ع ، صفحات ۱۲۲ تا ۱۳۵ ۔

۴۔ مختصر تاریخ اُردو ، مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۶ع ، ص ۸۷ ، ۸۸ ۔

۵۔ مقدمۂ تذکرۂ شعراے اُردو ، مطبوعہ انجمن ترقی ہند (ہند) دہلی ۱۹۴۰ع ، صفحات ۵۳ تا ۶۰ ۔

۶۔ دلی کا دبستان شاعری ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو دہلی ۱۹۴۹ع ، صفحات ۱۹۰ تا ۱۹۶ ۔

۷۔ میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا از محمود فاروقی ، مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۶ع ، طبع اول ۔

وحید قریشی[1] نے میر حسن کے حالات اتنی تفصیل سے لکھ دیے ہیں کہ اس جگہ اس سے زیادہ کچھ لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تذکرۂ شعرائے اُردو کے سالِ تصنیف کے متعلق اس کے مرتّب حبیب الرحمٰن خان شروانی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

"تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔"

لیکن تذکرۃ الشعرا طبع ثانی کے صفحہ ۲۰۸ پر ترقیمہ اس طور پر دیا ہوا ہے:

"در تاریخ یک ہزار و یک صد و نود و یک ہجری باتمام رسید۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ترقیمہ کے مطابق ۱۱۹۱ھ میں تذکرہ ہر طرح مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے بعد صرف ایک اضافہ ملتا ہے اور وہ شاہ فصیح کی تاریخِ وفات ہے۔ شاہ فصیح کے ذکر میں میر حسن نے لکھا ہے کہ:

"در سال یک ہزار و یک صد و نود و دو برحمت حق پیوست۔"

(ص ۱۵۳، طبع اول)

یہ عبارت شاہ فصیح کا ترجمہ لکھنے کے بعد بڑھائی گئی ہے۔ اس لیے کہ فصیح کا سارا ترجمہ ان کی حیات میں لکھا گیا ہے۔ اس اضافے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تذکرے کا تکملہ ۱۱۹۲ھ میں ہوا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے تذکرے کے عہدِ تصنیف کے بارے میں تفصیل سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ان دلائل کے پیشِ نظر میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ میر حسن نے ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ع) میں یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ع) میں ختم کر دیا تھا۔ بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخِ وفات ہے جو سنہ ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔"[2]

ڈاکٹر وحید قریشی بھی تذکرۂ شعرائے اُردو کے آغاز و تکملہ کے سلسلے میں کم و بیش اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ وہ مختلف شعرا کے تراجم کو زیرِ بحث

۱۔ (الف) میر حسن اور اُن کا زمانہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ع، (ب) مقدمۂ مثنویات میر حسن، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

۲۔ مقدمۂ دستور الفصاحت، ص ۶۸، ۶۹، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع۔

لاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''ان تراجم سے جن کے سنین ایک حد تک متعین ہو سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے تذکرۂ شعرائے اُردو کی تالیف کا کام ، اغلب یہ ہے کہ ۱۱۸۴ھ کے قریب شروع کیا ، زیادہ تر شعرا کے حالات ۱۱۸۸ھ کے آس پاس تحریر ہوئے - پہلا مسودہ ۱۱۸۹ھ میں تکمیل پا گیا - پھر خاتمہ ۱۱۹۱ھ میں لکھا گیا - بعد ازاں صرف شاہ فصیح کی تاریخِ وفات داخل تذکرہ ہوئی ، اس بات کا قرینہ نہیں کہ اس کے بعد اور اضافے ہوئے -''[۱]

میر حسن کا تذکرہ پہلی بار ۱۹۲۱ع میں اور دوسری بار ۱۹۴۰ع میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا - مطبوعہ نسخے بھی اگرچہ کمیاب ہیں پھر بھی دستیاب ہیں - اس کا ایک قلمی نسخہ جس کے متعلق خیال ہے کہ خود مصنف کے ہاتھ کا ہے کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے - اس کی تفصیلات عرشی صاحب نے دستور الفصاحت کے مقدمے میں دے دی ہیں -

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۳۰۴ اُردو شعرا کا ذکر آیا ہے - اس تذکرے میں بھی اگرچہ شعرا کے تخلص بلفظ حروف تہجی دیے گئے ہیں ، لیکن تذکروں کی عام روش سے الگ اس میں ادوار بھی قائم کیے گئے ہیں - اس سے پہلے قائم نے مخزن نکات میں شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کر کے بلحاظ زمانہ ان کا حال لکھا تھا - میر حسن نے اس پر مزید جدت کی ہے کہ ہر ردیف کے شعرا کے تین طبقے متقدمین ، متوسطین اور متاخرین کے نام سے قائم کیے ہیں -

مختصر سے دیباچے کے بعد اس میں سب سے پہلے بادشاہِ وقت شاہ عالم آفتاب کا ذکر آیا ہے اور ان کے یہ دو شعر بطورِ نمونہ دیے گئے ہیں :

صبح تو جام سے گزرتی ہے　　شب دلآرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گزرتی ہے

اس کے بعد شعرا کے حالات ردیف وار درج کیے گئے ہیں - حالات یہاں بھی بہت مختصر ہیں لیکن قدما کے سلسلے میں یہ تذکرہ یوں مفید ہے کہ میر حسن اپنے

۱- نقوش لاہور ، ص ۲۷۴ تا ۲۸۱ ، شمارہ نمبر ۶۱-۶۲-

معاصرین میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتے تھے - میر حسن نے اپنے تذکرے میں کسی کی تنقیص یا بے جا تعریف سے گریز کیا ہے - ان کی رائیں عام طور پر خوش اخلاقی اور اعتدال پسندی پر مبنی ہیں - پھر بھی منتخبات کلام اور بعض تنقیدی اشاروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ ادبی ذوق اور تنقیدی شعور رکھتے تھے - اشعار کا جیسا خوبصورت انتخاب اس تذکرے میں ملتا ہے وہ معاصر تذکرہ نگاروں کے یہاں کم نظر آتا ہے - جیسا کہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے مقدمے میں تفصیل دی ہے ، اس تذکرے سے اس زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی ماحول پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - تذکرہ شاہ عالم آفتاب کے ذکر سے شروع ہو کر یاس کے ذکر پر ختم ہوتا ہے - فقیر اللہ آزاد اور یاس کے ترجمے یہاں درج کیے جاتے ہیں :

آزاد : باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکھن رواج یافتہ - فقیر اللہ آزاد تخلص از حیدر آباد بود - در صغر سن یتیم شد - اہل محلہ عزیز می داشتند چون بحدّ بلوغ رسید عشق گل رُخے ورزید مانندِ عندلیبِ نالاں بہ آہ و فغان بسر می نمود و برنگِ صبا سراسیمہ می گشت یک جا قرار نمی گرفت - چنانچہ ہمراہ فراق دکھنی در شاہجہان آباد آمدہ بود - طبع درد مندی داشت و بسیار بہ صفا حرف می زد خدایش بیامرزد -[۱]

یاس : از خوبانِ جہان و از موزونان زمان خانِ عالیشان حسن علی خان ولد زین العابدین خان نبیرۂ نواب اسلام خان ابن عقیدت خان ابنِ نواب امیر خان کلان نعمت اللّٰہی - جوانیست بسیار خلیق و با غربا شفیق ، قدردان و قدر شناس ، المتخاص بہ یاس اکثر مشورۂ سخن با میان حسرت دارد ہنوز نو مشق است اگر طبعش باین فن راغب شود خوب خواہد گفت درین ولا مائل خواندنِ عربی است خوشا بحالش کہ عمر عزیز خود را بدیں نحو صرف نماید از متوسلان قریبۂ نواب عالیہ است این چند اشعار بطریق یادگار بقلم می آید -"[۲]

۱- تذکرۂ شعرائے اُردو ، ص ۴۰ ، مرتبّہ شروانی ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۱ع -
۲- تذکرۂ شعرائے اُردو ، ص ۲۲۴ ، مرتبّہ شروانی ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۱ع -

"تذکرۂ شورش یا رموز الشعراء"

مصنف کا نام سید غلام حسین ہے تخلص شورش اور عرف بھنیا ہے۔ ان کے والد کا نام محسن اور آبائی وطن عظیم آباد ہے۔ سلسلۂ نسب[1] شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے ملتا ہے۔ گلزار ابراہیم میں شورش کو خواہر زادہ "ملا" میر وحید اور شاگرد میر باقر حزیں و ظہور ظاہر کیا گیا ہے۔ حزیں کے انتقال کے بعد شاہ رکن الدین عرف میرزا گھسیٹا عشق کو بھی کلام دکھایا۔ کریم الدین نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ متکبر و مغرور آدمی تھے۔ لیکن صاحب مسرت افزا نے انھیں بسیار خوش خلق و بے نیاز و صاف گو بتایا ہے۔ تذکرۂ عشقی میں ان کے لیے نیک طینت و سادہ وضع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ شورش کو تصوف سے خاص مذاق تھا اور اشعار بھی زیادہ تر اسی رنگ میں کہتے تھے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ صاحب گلزار ابراہیم اور صاحب مسرت افزا نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا ہے۔

شورش کے دوست اور معاصر تذکرہ نگار ابوالحسن کے "تذکرۂ مسرت افزا" سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک مدت سے شعرا کا کلام اور حالات جمع کر رہے تھے اور جب کام تکمیل کو پہنچ گیا تو انھوں نے اس کا نام

"یادگارِ دوستاں رکھا"

۱۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (ف ۷۵۷ھ) نے شادی نہیں کی تھی۔ شورش شیخ کمال الدین ہمشیر زادۂ چراغ دہلی کے خاندان سے ہو سکتے ہیں۔ دیکھیے سرو آزاد، ص ۲۲۷، خزینۃ الاصفیا، جلد اول، صفحات ۳۵۳ تا ۳۵۷۔ تاریخ اولیاے صوبۂ دہلی، ص ۶۱ تا ۱۱۸۔ (ادارہ)

اور تاریخ تالیف کے سلسلے میں یہ مصرعہ دیا - ع

''یادگارِ دوستانِ روزگار''

اس مصرع سے تکملہ کا سال ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷-۷۸ع نکلتا ہے - تذکرۂ شورش کا ایک قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہے - اس کی فوٹو سٹیٹ کاپی پٹنہ یونیورسٹی نے حاصل کی تھی - پروفیسر کلیم الدین احمد نے اس کے متن کو بنیاد بنا کر تذکرۂ عشقی کے ساتھ دو جلدوں میں ''دو تذکرے'' کے عنوان سے لیبل لیتھو پریس رمنہ روڈ پٹنہ سے مختصر مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے - پہلی جلد ۱۹۵۹ع میں اور دوسری جلد ۱۹۶۳ع میں منظر عام پر آئی ہے - یہی مطبوعہ نسخہ ملتا ہے اور یہی پیشِ نظر ہے - ڈاکٹر محمود الٰہی نے تذکرۂ شورش کے ایک اور قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے[1] اور اسے آکسفورڈ کے قلمی نسخے سے زیادہ قدیم بتایا ہے - یہ نسخہ ''خانقاہ رشیدیہ جون پور'' (یو - پی - بھارت) کے متولی سید ہاشم علی سبز پوش رئیس گورکھپور کی ملکیت ہے اور ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس کا تعارف کرایا ہے - یہ تعارف ''مقدمۂ تذکرۂ شورش'' کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مقالات ''باز یافت'' میں شامل ہے اور ''قومی زبان'' کراچی بابت اپریل ۱۹۶۷ع میں بھی شائع ہو چکا ہے - ڈاکٹر محمود الٰہی نے بعض داخلی شہادتوں کی مدد سے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ نسخہ قدیم تر ہے اور آکسفورڈ کا نسخہ اس سے کم از کم دس سال بعد مرتّب کیا گیا ہے - متعدد تراجم ایسے ہیں جن میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور بعض جگہ یہ تبدیلیاں اس نوعیت کی ہیں کہ آکسفورڈ کے نسخے کو جون پور کے نسخے کے مقابلے میں کم رتبہ ثابت کرتی ہیں - بقول ڈاکٹر محمود الٰہی ''نسخۂ جونپور'' کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ:

''اس میں شورش کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے جس سے تحقیق کی بہت سی راہیں کھل گئی ہیں - اس مقدمے کو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - پہلے حصے میں شورش نے عظیم آباد

۱- ''باز یافت''، ص ۱۸۷ تا ۲۰۱، مطبوعہ دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ، طبع اول، دسمبر ۱۹۶۵ع، مملوکہ ضمیر نیازی -

میں شعری ماحول کا خاکہ پیش کیا ہے اور اپنی علمی و ادبی مصروفیات کا ذکر کیا ہے ۔ دوسرے حصے میں انھوں نے تذکرے کے سبب تالیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور تیسرے حصے میں وہ بیانات آتے ہیں جو شعر کی اہمیت و ماہیت اور اس کے اقسام پر مشتمل ہیں ۔ یہ تینوں حصے اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ۔ تذکرے کے سلسلے میں جو نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے ۔

۱- اس کا نام ''رموز الشعراء'' ہے ۔

۲- اس کی ترتیب شاہ رکن الدین عرف مرزا گھسیٹا کے ایما پر عمل میں آئی ۔ وہ بالخصوص تذکرۂ میر سے مطمئن نہیں تھے اس لیے چاہتے تھے کہ ایک بہتر تذکرہ لکھا جائے ۔

۳- مرتّب کا مقصد یہ تھا کہ شعرائے ہندوستان کے ساتھ شعرائے بہار کا بھی ذکر کیا جائے ۔''۱

مقدمہ کے متعلقہ اقتباسات یہ ہیں :

''بعہد نادر شاہی میر باقر موصوف از شاہ جہان آباد تشریف بہ عظیم آباد آوردہ ۔ گفتگو و شعر و شاعری بطور مرزا موصوف رواج یافتہ بہ تفصیل برادرِ گرامی قدر میر محمد رضائے جرأت کہ فاضل بودند ۔ در نثر و نظم مہارت کمال داشتند و گاہے غزل فارسی بہ مشورۂ فقیہہ صاحب می فرمودند ۔ میلان طبیعت احقر طرف ریختہ آمدہ غزل گفتہ بعد ازان برادر منظور ایں عاصی را بہ میر باقر مذکور سپرد فرمودہ تا بیت غزل اصلاح از میر باقر موصوف گرفتہ ۔

بعدہ مزاج احقر مائل طرف مثنوی شد . . . مثنوی شب و مثنوی درد و الم و باغ و بہار گفتہ بعدہ میر باقر و میر محمد رضائے جرأت رخصت از عالمِ فانی بہ عالم جاودانی نمودہ صحبت شعر و شاعری برہم خوردہ و زندگی بہ علالت گرویدہ ۔

۱- ''قومی زبان'' کراچی ، ص ۲۹ تا ۳۴ ، بابت اپریل ۱۹۶۷ع اور ''باز یافت'' ص ۱۸۷ تا ۲۰۱ ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ع ۔

بعد یک سال مزاج درست و بجا شده و مثنوی سوم در تالیفِ علی باغ مشتمل بر مدح حضرت مولوی محمد وحید باتمام رسانیده و گاہے غزل ہم می گفت و دیوان خود در می ساخت ۔

در این ضمن خمسۂ مرزا محمد رفیع سودا سلمہ تعالٰی کہ این مصرع یقین غفراللہ :

''کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے''

مصرع پنجم او بودہ ۔ شہرت درین یافتہ ۔ بعدہ غزل مرزا و اشعار حضرت خواجہ میر درد وغیرہ از دہلی رسیدہ و شہرت یافتہ و طرزِ سخن بطور دیگر گردیدہ ۔

حسب اتفاق در صوبہ داری محمد کاظم خان بہادر احترام الدولہ . . . محفلِ مشاعرہ بروز جمعہ قرار یافتہ . . . میر غلام علی اظہر گفتہ کہ شاہ رکن الدین عرف حضرت میرزا گھسیٹا صاحب مد ظلہ از مرشد آباد ترک روزگار نمودہ بہ عظیم آباد تشریف آوردہ اند ۔ اگر درین محفل مشاعرہ آیند احسن است ۔ احقر ہمراہِ میر مذکور رفتہ ملازمت نمودہ از راہ نوازش قبول فرمودند تا محفل مشاعرہ کم از کم یک سال نماندہ تشریف مع میر محمد امین صاحب دیوانہ غفرلہ ارزان می فرمودند ۔

چون تفصیل آن حضرت در دل این جا یافتہ و محفل مشاعرہ بہ جہت ماہ مبارک رمضان برہم خوردہ احقر بیشتر بہ خدمت حضرت میرزا صاحب می رفت در آن وقت اکثر مردم مثنوی حضرت مولوی روم و لمعات و شرح رباعیات مولوی حاجی (جامی) نور مرقدہ می خواندند ۔ این عاصی ہم از دور سماعت می نمود ۔ و سوا ازین ہر چہ ارشاد می فرمودند آن را بطور ملفوظ می ساخت ۔

روزے ارشاد شد کہ شخصے[1] در تذکرۂ خود یک شعر آن قصیدہ مرزا رفیع سودا نوشتہ است ۔

۱۔ غالباً نکات الشعراء کی طرف اشارہ ہے جس میں ''تضحیکِ روزگار'' کا صرف ایک شعر نقل ہوا ہے ۔

دیگر در دل خطره گزشت کہ در آن ایام طبیعت احقر مصروف بہ تالیف نیست ۔ چنانچہ اول ارشاد العارفین تالیف نمودہ بعدہ' احوال بادشاہان ہندوستان از . . . تا وقت جلوس شاہ عالم نوشتہ ۔ بعدہ' ملفوظات حضرت پیر دستگیر قمرالحق قدس سرہ کہ مسمیٰ بہ ''گنج فیاض'' است منتخب ساختہ و بعدہ در شرح این حضرت شاہ نعمت ہر چہ پیدا و ہر چہ پنہان است جملہ در یک وجود انسان است چون ازین فرصت یافتہ در اصلاح دیوان مصروف گشتہ چنانچہ بہ اصلاح حضرت مرزا صاحب درست ساختہ ، اما بباعث پریشانی کار کمال درین فن حاصل نہ کردہ ، حسرت علم در دل ماندہ ۔ روزے حضرت مرزا صاحب ارشاد فرمودند کہ مردمان کاہ را کوہ و کوہ را کاہ می نمایند اشعار ہر یک بہ طرز ہر یک نمی نوشتند اگر شما تذکرہ می نویسید بہ خوب است ۔ در دل خطرہ گزشت کہ طاقت انتخاب تا حال تحریر ہم نہ رسیدہ است . . . چنانچہ فرمود : (شعر گفتن گرچہ دُر سفتن بود ۔ لیک فہمیدن بہ از گفتن بود) ۔ و شاید حضرت برآن تربیت این عاصی می فرمایند کہ بہ سبب استقلال این کار سہم پیدا خواہد شد ۔

امر عالی را سعادت در این تصور نمودہ تحریر . . . و الاّ نہ این ہیچمدان را درین فن چہ شعور و چہ مقدور کہ دم زند . . . ۔

''و در ہندوستان اکثر بزرگان تذکرہ نوشتہ اند و اشعار شاعران قدیم و جدید بقید قلم آوردہ اند مگر در این شہرگاہے کسے تذکرۂ فارسی ہم نہ نوشتہ چہ ہندی . . . بنا برین محنت بر خود اختیار نمودہ کہ احوال و اشعار شاعران این جامع اشعار شاعران ہندوستان بقید قلم آورد کہ در زمانہ' حال و استقبال یاد گردد ۔ و اگر شاید بہ سمع کسے اہل دل برسد و خوش دل او شود یک گونہ باعث نجات این عاصی بود و احقر در این کلام ہرگز ارادۂ انشا نہ کردہ است ۔ اگر جائے سہو و خطاے باشد معاف فرمایند کہ ہیچ (نفس) بشر خالی از خطا نبود ۔ و ہر تصنیف را نام لازم است لہٰذا نام این تذکرہ ''رموزالشعراء'' داشتہ و اگر تذکرۂ شورش ہم گویند مضائقہ ندارد و بطور حرف تہجی مرقوم ساختہ بہ طول طویل نہ

پرداختہ ۔"[1]

ڈاکٹر محمود الٰہی نے آکسفورڈ اور جون پور کے نسخوں سے بعض شعرا کے تراجم ایک دوسرے کے مقابل نقل کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ آکسفورڈ کا نسخہ بعد کا ہے اور اس میں شورش کے کسی عقیدت مند نے تحریف سے کام لیا ہے ۔ شورش کے بعض بیانات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ میر کا تذکرہ نکات الشعراء ان کی نظر سے گزرا تھا اور غالباً اس سے متاثر ہو کر انھیں "رموز الشعراء" کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا تھا ۔ ڈاکٹر محمود الٰہی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :

"یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تذکرہ نکات الشعراء کے جواب میں لکھا گیا ہے لیکن مصنف کے سامنے یہ مقصد ضرور تھا کہ میر کی خامیوں کی نشان دہی کی جائے اور ان کے تذکرے پر اضافہ کیا جائے ۔ نکات الشعراء کے مقابلے میں "رموز الشعراء" نام رکھنا بھی اس رجحان کی توثیق کرتا ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ میر نے اپنے تذکرے کے آخر میں شعر کے اقسام بتائے ہیں ۔ شورش نے بھی یہ راستہ اپنایا ہے اور میر کے بیانات پر گراں قدر اضافے کیے ہیں ۔ میر نے شعر کی چھ قسمیں بتائی ہیں لیکن ان کی مثالیں نہیں پیش کیں ۔ شورش اس کی دس قسمیں بتاتے ہیں اور فارسی اور اُردو اشعار سے ان کی مثالیں پیش کرتے ہیں ۔ کہیں کہیں وہ اپنے نقد و نظر کی وضاحت کرتے ہیں تا کہ انھیں غلط نہ سمجھا جائے ۔ عربی و فارسی حروف و افعال ریختہ میں کس طرح استعمال کیے جائیں یا ان کی بندشوں اور ترکیبوں کا طور طریقہ کیا ہو ؟ ان سوالات پر شورش نے جو بحث کی ہے اسے اُردو قواعد سازی کی ابتدائی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا . . . ضرورت اس کی ہے کہ دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند نسخہ مرتّب کیا جائے تا کہ تحقیقی کام کرنے والے صحیح تر مواد

۱۔ "قومی زبان" کراچی ، ص ۳۱ ، بابت اپریل ۱۹۶۷ع اور "بازیافت" ، ص ۱۸۷ تا ۲۰۱ ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ع ۔

سے واقف ہو سکیں ۔"[۱]

کلیم الدین احمد کے مرتبہ تذکرے کی پہلی جلد میں 'الف' سے 'س' تک کی ردیفوں کے شعرا کا ذکر ہے اور دوسری میں 'ش' سے لے کر 'ی' تک کے شاعر مذکور ہیں، صورت یہ ہے کہ داہنے صفحے پر تذکرۂ شورش ہے اور بائیں صفحوں پر تذکرۂ عشقی ۔

تذکرہ فارسی زبان میں بلحاظ حروف تہجی مرتب کیا گیا ہے ۔ اس تذکرے میں بھی مؤلف کی توجہ حالات سے زیادہ شعرا کے اشعار پر رہی ہے ۔ حالاتِ زندگی زیادہ تفصیلی نہیں ہیں ۔ لیکن ہر شاعر کے متعلق بعض ضروری باتیں درج کر دی گئی ہیں ۔ مؤلف نے اکثر تراجم میں شاعر کا نام ، تخلص ، وطن ، ولدیت ، سکونت ، مشغلہ ، تلمذ اور تاریخ پیدائش و وفات کا سراغ دینے کی کوشش کی ہے ۔ اس میں قدما سے لے کر شورش کے معاصرین تک کا ذکر آیا ہے ۔ شاعروں کی تعداد پہلی اور دوسری جلد ملا کر ۳۱۹ ہے ۔ آفتاب سے لے کر سکندر تک ۱۳۹ شعرا پہلی جلد میں ہیں ۔ باقی شورش سے لے کر یقین تک دوسری جلد میں شامل ہیں ۔

ہر چند کہ شورش کے یہاں شعرا کے تراجم مختصر ہیں پھر بھی بعض وجوہ سے اس تذکرے کی اہمیت مسلم ہے ۔ بقول ڈاکٹر محمود الٰہی اس کی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلا تذکرہ ہے جو عظیم آباد میں لکھا گیا ہے اور اس سے وہ نقوش ظاہر ہوتے ہیں جنھیں ترتیب دے کر یہاں کے ابتدائی شعری ماحول کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے ۔ دوسرے یہ کہ وہ شعرا کے کلام پر بڑے اعتماد کے ساتھ آزادانہ اور بے باک رائے دیتے ہیں ۔ ان کے تذکرے میں گمنام لیکن بہت سے صوفی شعرا کا ذکر بھی ادب و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ عظیم آباد کی محفل شعرا اور بزم صوفیا دونوں کا ترجمان ہے اور بعض نئے حقائق کو منظر عام پر لے آتا ہے ۔

۱۔ "قومی زبان" کراچی ، ص ۲۹ ، بابت اپریل ۱۹۶۷ع اور "بازیافت" ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ع ۔

انجام اور ہدایت کے تراجم بطور نمونہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

انجام : امیر ابن الامیر صاحب تدبیر دانائے وقت ارسطوے زمان نواب امیر خان بہادر غفر اللہ تعالیٰ مخاطب بہ خطاب عمدۃ الملک انجام تخلص از اُمرایان عظام دہلی بودہ در فہم و فراست و عقل و کیاست از دانایان روزگار بودہ و در لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی نظیر خود نہ داشت دوسہ شعر ریختہ کہ از زبانِ شیرین بیانش ثروش نمودہ این است ۔''[1]

ہدایت : ''میاں ہدایت اللہ تخلص (ہدایت)، شاگرد خواجہ میر درد ساکن دہلی ازوست ۔''[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ ''دو تذکرے''، جلد اول، ص ۳، مرتّبہ کلیم الدین احمد، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۹ع ۔

۲۔ ''دو تذکرے''، جلد دوم، ص ۳۲۲، مرتّبہ کلیم الدین احمد، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۳ع ۔

بہار و خزاں

بہار و خزاں کے مصنف میر بہاء الدین حسین خاں عروج اورنگ آبادی ہیں۔ عروج کے والد کا نام ضیاء الدین حسین خاں اور وطن اورنگ آباد تھا۔ عروج اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ عروج نے فارسی شعرا کا تذکرہ بھی اسی نام سے لکھا تھا۔ اس کا ایک نسخہ جامعہ نظامیہ شبلی گنج میں موجود ہے جو ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مکمل ہوا ہے۔[1] یہ اطلاعات مجھے پروفیسر یوسف سرمست نے بہم پہنچائی ہیں اور بہار و خزاں کے شعرا کی فہرست بھی مرحمت فرمائی ہے۔[2] غالباً عروج نے شمیم سخن اور طبقات سخن کے طرز پر اپنا تذکرہ

۱۔ تذکرۂ بہار و خزاں کی تالیف ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۹۰ھ کے مابین معلوم ہوتی ہے۔ تمنا نے مرزا عطا تخلص ضیا اور میر اولاد محمد خاں ذکا بلگرامی کا حال ۱۱۸۳ھ میں شامل تذکرہ کیا ہے۔ میر غلام علی ارشد اور اسد علی خاں تمنا دونوں آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے۔ تمنا نے ۱۱۸۹ھ کے متصل ارشد کا حال لکھا ہے۔ ارشد ارسلان جنگ برادر حقیقی رکن الدولہ (مقتول صفر ۱۱۸۹ھ) کا متوسل تھا۔ عروج اور تمنا دونوں اورنگ آباد کے رہنے والے ہیں۔ دونوں کے تعلقات ہیں۔ ایک ہی زمانے میں دونوں نے تذکرہ لکھا ہے۔ شاہ قدرت اللہ بلیغ کا عروج شاگرد اور مرید ہے، گل عجائب میں تمنا نے بلیغ کے احوال سے بےخبری ظاہر کی ہے۔ اُردو کلام ظاہر ہے کہ "بہار و خزاں" سے لیا ہوگا۔ تمنا کا یہ کہنا کہ عروج نے ان دنوں تذکرہ لکھا ہے، واضح کرتا ہے کہ ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۹۰ھ کے درمیان "بہار و خزاں" تالیف ہو چکا تھا۔ تفصیلات: چمنستان شعرا، گلِ عجائب، سرو آزاد وغیرہ میں ملاحظہ ہوں۔ (ادارہ)

۲۔ خط بنام راقم الحروف بحوالہ نگار سالنامہ ۱۹۶۲ع، ص ۳۳۸، (تذکروں کا تذکرہ نمبر)۔

دو حصوں میں لکھا تھا، ایک فارسی شعرا کے لیے مخصوص تھا دوسرا اُردو شعرا کے لیے۔ عروج کا ذکر اسد علی خاں تمنا نے گل عجائب مؤلفہ ۱۱۹۲ھ میں اس طور پر کیا ہے:

''مصدر نکات فنون اوستادی میر بہاء الدین حسین عروج اورنگ آبادی والدِ ماجدش ضیاء الدین حسین خان رنگین است و طبع وقادش نگارندۂ تازہ مضامین۔ ولادتش در ماہ صفر المظفر سنہ خمس و سبعین مأتہ الف در اورنگ آباد دکن واقع گردیدہ۔ تحصیلِ متداولات عربی بخدمتِ میر انور الدین دل اتفاق افتادہ و اصلاحِ شعر ریختہ اول از میر مہربان گرفتہ بعد ازان کہ حضرت مولوی صاحب بلیغ دام قدرہ' تشریف آوردند چند کتبِ فنِ شعر بعالی خدمت گزرانید و مشقِ سخن فارسی و ریختہ ہر دو از آن جناب می کرد۔ بیعت بجنابِ مولوی صاحب کردہ و نشۂ فراوان از خمخانۂ معنی بہ دماغ و دل رسانده' فکرِ سخن کم می کند و آنچہ می گوید خوب می گوید درین ولا تذکرۃ الشعراء مسمٰی بہ خزان و بہار (بہار و خزان) نوشتہ و در آن تلاشہا کردہ۔ ہر کس کہ می بیند می داند کہ چہ خونہا خوردہ ازوست۔''[۱]

اسد علی خاں تمنا نے عروج کا سالِ پیدائش صفر ۱۱۷۵ھ ظاہر کیا ہے۔ چوں کہ عروج کا تذکرہ بہار و خزاں، ۱۱۹۲ھ سے قبل لکھا گیا ہے اس لیے تذکرے کی تالیف کے وقت عروج کی عمر سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔

عبدالجبار صدق ملکا پوری کے بیان کے مطابق ''بہاء الدین خاں عروج کی ولادت بمقام اورنگ آباد ۱۱۷۵ع میں ہوئی۔ کتب درسیہ کی تعلیم مولانا نور الدین سے حاصل کی۔ شاعری میں اولاً عبدالقادر مہربان سے ثانیاً مولوی قدرت اللہ بلیغ سے تلمذ تھا۔ بلیغ ہی سے علم عروض و قوافی کی کتابیں پڑھی تھیں۔ مشرباً صوفی اور پیر پرست تھے۔ شعر گوئی سے دلچسپی تھی۔ بقول مؤلف گل عجائب آپ نے ایک تذکرہ خزاں و بہار لکھا تھا۔ ابھی تذکرے کا مسودہ مبیضہ نہ ہوا

۱۔ گل عجائب، ص ۹۸، مرتّبہ' مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ع۔

تھا کہ ۱۲۳۰ھ میں عروج کا انتقال ہو گیا ۔ چنانچہ عروج کے بیٹے بہاء الدین حسین خاں ثانی نے مرحوم کے تذکرے کا مسودہ صاف کرایا ۔ عروج کا تعلق قدیم علمی و ادبی گھرانے سے تھا ۔ علم و فضل میں شہرت کے سبب ان کے جدِ امجد عالم گیر بادشاہ غازی کے عہدِ حکومت میں اورنگ آباد میں قاضی شہر کے عہدے پر مامور تھے ۔ جدِ امجد کے بعد عروج کے والد ضیاء الدین حسین خاں ان کی جگہ مقرر ہوئے اور والد کے انتقال کے بعد خود عروج آصف جاہ اول کے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ ۱۲۳۰ھ میں وفات پائی ۔ صوفی ملکا پوری نے اُردو فارسی دونوں کے اشعار بطور نمونہ دیے ہیں ۔''[1]

کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں اس تذکرے کا جو قلمی نسخہ محفوظ ہے اور جس کی تفصیلات راقم الحروف کو پروفیسر یوسف سرمست صاحب نے بھیجی ہیں اس کے آخری صفحات غائب ہیں اس لیے ترقیمہ یا سالِ تصنیف کا سراغ لگانا مشکل ہے ۔ لیکن چوں کہ گلِ عجائب مؤلفہ ۱۱۹۲ھ میں عروج کے شاگرد اسد علی خاں تمنا نے بہار و خزاں[2] کا ذکر کیا ہے اور صاحب تذکرہ ظاہر کیا ہے اس لیے یقیناً یہ ۱۱۹۲ھ سے قبل لکھا گیا ہے ۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنے ایک مضمون ''اُردو اور اس کے تاریخی ماخذ'' میں اس قلمی نسخے کا سراغ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''اس کا ایک اور نسخہ بھی تھا جو دریائے موسیٰ کی طغیانی میں برباد ہو گیا ۔ اس وقت جہاں تک مجھے علم ہے اس کا ایک نسخہ موجود

۱۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن ، ص ۸۳۷ ، حصہ دوم ، مطبوعہ مطبع رحمانی ، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ ۔

۲۔ گل عجائب میں عروج کا مندرجہ سنہ ولادت ۱۱۷۵ھ درست نہیں ۔ چمنستان شعرا (ص ۵۱۹) میں عروج کے والد رنگین کے قطعۂ وفات ۱۱۷۲ھ کو (جو عبدالقادر مہربان نے کہا تھا) غلط ثابت کرتے ہوئے شفیق نے کہا ہے کہ اعزہ نے مجھے ۲۴ جمادی الثانی ۱۱۷۰ھ کو رنگین کا فوت ہونا بتایا ہے ۔ اس لیے عروج کی ولادت قبل ۱۱۷۰ھ قرار پاتی ہے ۔

ہے - یہ بھی بوسیدہ ہو چکا ہے اور اگر طباعت کی جلد نوبت نہ آئی تو شاید بالکل مٹ جائے گا -"[۱]

یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے - بقول یوسف سرمست صاحب تذکرہ حد درجہ خستہ حالت میں پڑا ہوا ہے - سرورق اور آخر کے کچھ اوراق غائب ہو چکے ہیں - خط بہت شکستہ ہے اور مشکل سے پڑھنے میں آتا ہے - تخلص سرخی سے لکھے ہوئے ہیں لیکن انھیں بھی پڑھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے - ۱۲٦ صفحے اور ہر صفحے میں ۱۴ سطریں ہیں اور حالاتِ زندگی کے بعد اشعار درج کیے گئے ہیں -

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۸۱ شعرا کا ذکر بلحاظ حروف تہجی آیا ہے "بسم اللہ" کے بعد تذکرہ یوں شروع ہوتا ہے :

"ابتدائے سخن بحمد سخن آفرینے سزا است"

اشعار ایک دوسرے کے نیچے نثر کے طور پر بغیر کسی نشان کے لکھے گئے ہیں - افسوس کہ یہ تذکرہ براہِ راست مطالعے میں نہ آ سکا - چوں کہ اُردو شعرا کے قدیم ترین تذکروں میں سے ہے اس لیے اس کی اہمیت ظاہر ہے ، خصوصاً دکنی شعرا کے سلسلے میں یہ قیمتی معلومات کا خزانہ ہے - ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جن کی نظر سے یہ تذکرہ گزرا ہے ، لکھتے ہیں کہ اس میں بعض شعرا کے متعلق ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو کسی دوسرے تذکرے میں نظر نہیں آتیں - بطورِ نمونہ ایک شاعر کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے :

"عزلت — صاحب والا فطرت حضرت عبدالولی عزلت پسر سید سعد اللہ قدس سرہٗ اصلش از معمورۂ بریلی است و مولد و منشایش بندر سورت ، کتبِ متداولۂ عربیہ ہمہ آموختہ است و از فارسیہ نیز بہرہ اندوختہ خوش گو و خوش صحبت است خدایش سلامت دارد -"[۲]

☆ ☆ ☆

۱- سالنامہ سہیل ، ص ۱۱۳ ، مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی -

۲- مکتوب پروفیسر یوسف سرمست بنام راقم الحروف -

گلِ عجائب

''گل عجائب'' کے مصنف کا نام اسد علی خاں تھا، تمنا تخلص کرتے تھے۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن والد کی ملازمت کے سلسلے سے ان کا قیام حیدر آباد میں بھی رہا ہے۔ جیسا کہ فرہنگِ سخنوراں سے معلوم ہوگا، ان کا ذکر بعض تذکرہ نگاروں نے کیا ہے لیکن تفصیلی حالات کسی نے نہیں لکھے۔ اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ تمنا کی تعلیم و تربیت اورنگ آباد ہی میں ہوئی۔ شاعری میں آزاد بلگرامی سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور خود بھی استادی کے مرتبے پر پہنچ گئے تھے۔ چمنستان شعرا کے مؤلف لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی تمنا کے معاصرین میں تھے بلکہ بعض قرائن سے پتا چلتا ہے کہ دونوں آزاد بلگرامی کے شاگرد اور ہم مشق تھے۔[1] تمنا کے ایک شاگرد محمد علی خاں شوق نے اپنی مثنوی چہار درویش میں لکھا ہے کہ وہ تیرہ سال کی عمر میں تمنا کے شاگرد ہوئے تھے۔ استاد کی وفات پر انھوں نے تاریخ بھی کہی تھی۔ تمنا کا انتقال ۱۲۰۲ھ میں ہوا ہے۔[2] افسوس کہ تمنا نے اپنا ذکر تذکرے میں کہیں نہیں کیا صرف بعض شعرا کے تراجم سے ان کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

تذکرے کے شروع ہی میں بہ عنوان ''قطعہ تاریخ آغاز تذکرہ'' یہ دو شعر ملتے ہیں:

چون این تذکرہ را نمودم شروع   ز حق است امید اتمام او

۱۔ مقدمہ گل عجائب، مرتبہ مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۶ع۔

۲۔ مقدمہ گل عجائب، مرتبہ مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۶ع۔

تمنا بتاریخ سالش زمن خرد گفت آغاز صفحہ بگو[1]

"آغاز صفحہ بگو" کے اعداد ۱۱۹۲ ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ تذکرے کا آغاز ۱۱۹۲ھ میں ہوا ہے۔ آخر میں بھی مصنف نے مندرجہ ذیل دو قطعات بہ عنوان "قطعات تاریخ اختتام تذکرہ" دے دیے ہیں:

تذکرۂ شاعران شد چو تمام این زمان
شد دل و جان حزین مبتہج و شادمان
داشت تمنا دلم فکر بتاریخ او
آمدہ آواز غیب "شکر خدائے جہان"

ہزار شکر جناب مولا کہ تذکرہ شد تمام اکنون
درود بر ختم مرسلین و بر آل و اہلِ بیت او ہم
برائے تاریخ سال ختمش چو بود در دل مرا تمنا
گل عجائب شگفت نیکو بگلبنِ سادہ گفت طبعم

پہلے قطعے کے چوتھے مصرعے کا آخری ٹکڑا "شکر خدائے جہاں" مادۂ تاریخ ہے اور دوسرے قطعہ کے چوتھے مصرعے کے اس ٹکڑے سے

"گل عجائب شگفت نیکو بگلبن سادہ"

گلبن کی ب کو خارج کر دیں تو مادۂ تاریخ باقی رہتا ہے۔ دونوں سے ۱۱۹۴ برآمد ہوتے ہیں اور یہی اس کے تکملے کا سال ہے۔ گویا یہ تذکرہ ۱۱۹۲ اور ۱۱۹۴ھ کے درمیانی عرصے میں لکھا گیا ہے۔

اس کا ایک خستہ و خراب قلمی نسخہ کتاب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ تھا اسے مولوی عبدالحق صاحب نے بکمال عرق ریزی مرتّب کیا اور اپنے مقدمے

۱۔ "تذکرۂ بہار و خزاں" کے تحت ہم نے تفصیلی حاشیہ لکھا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "گل عجائب" کی تالیف ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۹۰ھ کے مابین ہوئی ہے۔ "گل عجائب" کا نام بقول مولوی عبدالحق مرحوم "رنگ دوم گل عجائب من مقالات الغرائب" تھا۔ اصل کتاب ناپید ہے اس لیے تاریخی قطعات مقالات الغرائب کے ہوں گے۔ دیکھیے حاشیہ تذکرۂ بہار و خزاں۔
(ادارہ)

کے ساتھ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے ۱۹۳۶ع میں شائع کر دیا ہے - یہی تذکرہ کتب خانوں میں ملتا ہے اور یہی ہمارے سامنے ہے -

اس تذکرے کی زبان بھی فارسی ہے اور اس میں ۵۱ شاعروں کا ذکر آیا ہے - ان شاعروں میں زیادہ تر وہی ہیں جو بارھویں صدی ہجری کے آواخر میں قلمرو آصفیہ سے تعلق رکھتے تھے - تراجم نہ بہت مختصر ہیں نہ طویل ، منتخبات البتہ خاصے طویل ہیں - تراجم یوں قابلِ اعتبار ہیں کہ اس تذکرے کے مذکورہ شعرا سے تمنا ذاتی طور پر واقف تھے - بقول مولوی عبدالحق اس تذکرے سے اس کے علاوہ بھی بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں - مثلاً یہ اطلاعات کہ آزاد بلگرامی اُردو میں صاحب دیوان تھے اور بہاء الدین حسین عروج نے ''بہار و خزاں'' نامی تذکرہ لکھا تھا ، اول اول اسی تذکرے کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں - تذکرہ سراج الدین علی خاں آرزو کے ذکر سے ردیف وار تخلص کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور یار کے ذکر پر ختم ہوتا ہے - میر بہاء الدین حسین عروج اور خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت کے تراجم یہاں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں :

عروج : ''مصدر نکات فنون' استادی میر بہاء الدین حسین خان عروج اورنگ آبادی والد ماجدش ضیاء الدین حسین خان رنگین است و طبع وقادش نگارندۂ تازہ مضامین ولادتش در ماہ صفر المظفر سنہ خمس و سبعین مأۃ الف در اورنگ آباد دکن واقع گردیدہ تحصیل متداولات عربی بخدمت میر انور الدین دل اتفاق افتادہ و اصلاح شعر ریختہ اول میر مہربان گرفتہ بعد ازان کہ حضرت مولوی صاحب بلیغ دام قدرۃ تشریف آوردند چند کتب فن شعر بعالی خدمت گزرانید و مشق سخن فارسی و ریختہ ہر دو زان جناب می کرد - بیعت بجناب مولوی صاحب کردہ و نشۂ فراوان از خمخانۂ معنی بہ دماغ و دل رساندہ فکر سخن کم می کند و آنچہ می گوید خوب می گوید - دریں ولا تذکرۃ الشعراء مسمی بہ خزان و بہار (بہار و خزاں) نوشتہ و در آن تلاشہا کردہ ہر کس کہ می بیند می داند کہ چہ خونہا خوردہ ازوست -''[۱]

۱- گل عجائب ، ص ۹۸ ، مرتبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۶ع -

فتوت : "صاحب شوکت و حشمت خواجہ عنایت اللہ خان فتوت خلف الصدق لشکر جنگ است و چمن فکر تازہ آب و رنگ برادر کلان خواجہ ابوالبرکات خان عشرت است و شاگرد سید سراج الدین است و بحر طبعش مواج ازوست ۔"[۱]

☆ ☆ ☆

۱- گل عجائب ، ص ۱۲۰ ، مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۶ع ۔

مسرت افزاء

مصنف کا پورا نام ابوالحسن امیر الدین احمد امر اللہ ہے - ابوالحسن ان کی کنیت ، امر اللہ عرف اور حقیقی نام امیر الدین احمد ہے - گارسیں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی میں مصنف کا نام ابوالقاسم امیر الدین احمد امر اللہ بتایا ہے - یہ درست نہیں ہے ابوالقاسم کی جگہ ابوالحسن ہونا چاہیے - ہر چند کہ مصنف نے شاعر کی حیثیت سے اپنا ذکر تذکرے میں نہیں کیا لیکن دیباچے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی زندگی اور تذکرہ دونوں کے متعلق ضروری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں - خیر الدین محمد حسرت اور کرم علی خاں شہید کے تراجم سے یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ خیر الدین محمد حسرت اور صلاح الدین مصنف کے بھائی تھے - خیر الدین محمد عہد شاہ عالم کے مشہور مصنف تھے اور ابوالحسن امیر الدین احمد کی تعلیم و تربیت انھی کی زیر نگرانی ہوئی تھی - خیر الدین محمد حسرت ہی کے ساتھ ابوالحسن ۱۱۹۲ھ میں کلکتہ کو روانہ ہوئے - راہ میں کچھ دنوں عظیم آباد اور مرشد آباد میں بھی ٹھہرے ، اس کے بعد بنارس اور لکھنؤ گئے - دیباچے میں تذکرہ کے تکملہ ۱۱۹۳ھ کے وقت انھوں نے اپنی عمر ۲۳ سال بتائی ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی پیدائش ۱۱۷۰ھ میں ہوئی ہوگی - شاہ غلام قطب الدین مصیب کے ترجمے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مصیب مصنف کے بہنوئی تھے اور ان کے بھانجے کا نام شاہ غلام حیدر تھا -

۱۱۹۲ھ میں کلکتے کے سفر کے دوران مصنف نے تذکرے کی بنا ڈالی اور ایک سال کے اندر یعنی ۱۱۹۳ھ میں اسے مکمل کر لیا - تذکرے کے خاتمے پر خود لکھ دیا ہے کہ ”میں نے ۱۱۹۳ھ میں کلکتہ کے سفر کے دوران غایت پریشانی میں اس تذکرے کو مرتّب کیا جب ۱۱۹۴ھ میں پھر لکھنؤ جانا ہوا تو اور شعرا کے حالات سے آگاہی ہوئی - اس طرح یہ تذکرہ مرتّب ہوا -“

گویا تذکرے کی اولیں تکمیل ۱۱۹۳ھ میں ہوئی ، نظر ثانی اور اضافے کا

سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا - چنانچہ علی ابراہیم خلیل، میر غلام حسین شورش، سید امام تصور اور مظہر جانِ جاناں کے تراجم سے پتا چلتا ہے کہ اس میں ۱۱۹۵ھ کے بعد تک اضافے ہوتے رہے ہیں - حاتم کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

"حاتم از شاہجہان آباد است ہم طرح میان آبرو گویند قلندر مشرب و دیر آشنا بود و رعونت و خود نمائی بحدے داشت -"

حاتم کی وفات ۱۱۹۷ھ میں ہوئی ہے - اوپر کا بیان چوں کہ صیغۂ ماضی میں ہے اس لیے ظاہر ہے کہ حاتم کا ترجمہ ۱۱۹۷ھ کے بعد لکھا گیا ہوگا -

اس تذکرے کے دو مخطوطوں کا سراغ اب تک لگا ہے، ایک آکسفورڈ یونی ورسٹی کے کتب خانے میں ہے، دوسرا خدا بخش لائبریری پٹنہ میں - پہلے نسخے کا متن آفسٹ کی مدد سے قاضی عبدالودود صاحب نے "معاصر" میں قسط وار شائع کر دیا ہے -[1] قاضی صاحب نے اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"اس کا صرف ایک نسخہ اس وقت دنیا میں موجود ہے -"[2]

میں نے سال نامہ نگار ۱۹۶۴ع کے "تذکروں کا تذکرہ نمبر" میں قاضی صاحب کے قول کو دہرا دیا تھا - بعد کو پتا چلا کہ اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی محفوظ ہے - پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی صاحب نے تلخیص کے ساتھ اس کا اُردو ترجمہ شائع کر دیا ہے -[3] آکسفورڈ کے نسخے میں دو سو چوّن شاعروں کا ذکر ہے - پٹنہ کے نسخے میں اگرچہ ترقیمہ نہیں ہے لیکن دو شاعروں کے نام غلام حسن خاں عباس اور میر محفوظ علی ہمدم کا اضافہ ہے - اس طرح نسخۂ آکسفورڈ میں ۲۵۴ اور نسخۂ پٹنہ میں ۲۵۶ شاعروں کے تراجم شامل ہیں -

آکسفورڈ کے نسخے کا بھی اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے - یہ ترجمہ ہر طرح

۱- ملاحظہ ہو "معاصر"، شمارہ نمبر ۵ تا ۸، بابت ۱۹۵۴ع اور ۱۹۵۵ع -
۲- معاصر، جلد دوم، حصہ نمبر ۵، ص ۱۷۶ -
۳- ملاحظہ ہو "مسرت افزا" (تلخیص و ترجمہ)، مرتّبہ سید شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی، مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ، اپریل ۱۹۶۸ع -

مکمل ہے ۔ عطاء الرحمٰن صاحب نے پٹنہ کے نسخے کی تلخیص کر دی تھی اور اشعار کو محذوف کر کے صرف نثری متن کا ترجمہ کیا تھا لیکن نسخۂ آکسفورڈ کے مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی نے پورے متن کو اُردو میں منتقل کیا ہے اور اس پر ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے ۔[۱]

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور کئی وجوہ سے اہم ہے اور بقول قاضی عبدالودود صاحب ، بعد کے کئی تذکرہ نگاروں مثلاً مصحفی اور محسن نے اپنے تذکروں میں اس سے مدد لی ہے ۔ معاصر تذکروں کی بہ نسبت اس تذکرے کے مؤلف نے شعرا کے حالاتِ زندگی قدرے تفصیل سے لکھے ہیں اور حالات جمع کرنے میں ذاتی کوشش و رسوخ سے کام لیا ہے ۔ ڈاکٹر مجیب قریشی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ تذکرہ مسرت افزا کی تالیف میں تذکرۂ میر حسن ، تذکرۂ فتح علی حسینی ، سرو آزاد مؤلفہ آزاد بلگرامی اور مجمع النفائس مؤلفۂ سراج الدین علی خان آرزو سے بھی مدد لی گئی ہے ۔ لیکن شعرا کے تراجم سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مؤلف نے اس سلسلے میں متعدد شاعروں سے ملاقات کی تھی اور ذاتی اثر و رسوخ کو استعمال کر کے حالات و اشعار فراہم کیے تھے ۔ علی ابراہیم خلیل کے ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ”گلزار ابراہیم“ کا ابتدائی مسودہ بھی دیکھنا چاہا تھا تاکہ اس سے بعض شعرا کے حالاتِ زندگی اور منتخبات کلام لے سکیں لیکن خلیل نے اپنا مسودہ دکھانے سے انکار کر دیا ۔

اس تذکرے سے بعض شعرا کے سوانح حیات کے سلسلے میں کئی ایسی اہم اور نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اس سے پہلے کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں ہیں ۔ مثلاً شیخ احمد وارث کے تذکرۂ ریختہ گویاں کا سراغ اس کے سوا اور کہیں نہیں ملتا ۔ وارث کے تذکرے کا ذکر دو جگہ آیا ہے ، ایک خود وارث کے ذکر میں ، دوسرے قطب الدین علی خاں شاداں غازی پوری کے ذکر میں ۔ مصنف کا بیان ہے کہ :

۱ ۔ قطب الدین علی خان شاداں غازی پوری پُر خلوص ، یار باش ، خوش معاش ، نکتہ دان ، شیریں زبان جوان ہیں ۔ خاندان عالیشان سے ہیں ۔

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو تذکرۂ مسرت افزا ، مترجمہ و مرتبہ ڈاکٹر مجیب قریشی ، مطبوعہ علمی مجلس دلی ، ۱۹۶۸ع ۔

ریختہ اور فارسی دونوں میں شعر کہتے ہیں - یہ چند اشعار شیخ احمد وارث کے تذکرے سے نقل کیے جاتے ہیں -

۲- شیخ احمد وارث فارسی و ہندی دونوں زبانوں کے نکتہ سنج ہیں بہت سی تصانیف کے مالک ہیں - فارسی اور ہندی کا دیوان مرتّب ہو چکا ہے اور شعرائے ریختہ کا تذکرہ بھی مرتّب کیا ہے -

ممکن ہے شیخ احمد وارث کا تذکرہ کہیں محفوظ ہو اور کسی وقت نکل آئے -

تذکرۂ وارث کی طرح ''سفینہ'' نامی ایک قدیم بیاض کا بھی سراغ اس تذکرے سے لگتا ہے - بیاض کا ذکر میر زین الدین آشنا اور کلب علی غیرت کے تراجم میں آتا ہے - مصنف کا بیان ہے کہ:

۱- میر زین الدین آشنا سخن آشنا تھے . . . چند اشعار ایک آشنا کے سفینہ میں آشنا ہی کے نام سے نظر آئے شاید انھی آشنا کے ہوں یا کوئی دوسرے آشنا ہوں جن کے احوال سے میں آشنا نہیں -

۲- ''کلب علی معلوم نہیں کون ہیں ان کا ایک شعر کسی سفینہ میں لکھا تھا -'' معلوم نہیں یہ ''سفینہ'' کہیں محفوظ ہے یا ضائع ہوگیا -

مسرت افزا سے یہ بھی سراغ ملا کہ رموز الشعراء یا تذکرۂ شورش کا ایک نام ''یادگار دوستان'' بھی تھا - چنانچہ صاحب مسرت افزا نے شورش کے ترجمے میں لکھا ہے کہ:

''جب میں اس شہر (عظیم آباد) میں تھا تو اکثر شیخ محمد رفیع رفعت کے گھر پر ان سے ملاقات ہوتی تھی - بہت خوش خلق ، بے نیاز ، صاف گو اور دیر آشنا تھے - مدت سے شعرائے ریختہ کا تذکرہ لکھنے میں مصروف تھے ، اس کے آغاز کو انجام تک پہنچایا ''یادگار دوستان'' نام رکھا ، اس مصرعہ سے تاریخ نکالی -

''یادگارِ دوستانِ روزگار''

تذکرہ تمام کر کے شعبان ۱۱۹۵ھ کے عشرۂ اولیٰ میں اس جہان پُر شور کو خیر باد کہا -''

ابو الحسن نے تذکرہ کیوں مرتّب کیا بظاہر اس کا جواب دیباچے میں اس

طور پر ملتا ہے :

''ماہ صفر ۱۱۹۲ھ میں اپنے برادر مکرم کے ہمراہ بہ ارادۂ سیاحت دیار مشرق میں جانا ہوا ۔ سفر کرتے ہوئے آخر عظیم آباد میں قیام ہوا ۔ دوستوں کی محبت اور ان کی خوش دلی کی وجہ سے کچھ دنوں وہیں ٹھہر گیا ۔ وہاں کے شعرا سے شناسائی ہوئی ۔ طبیعت میں شوق پیدا ہوا کہ ان کے حالات تحریر کروں . . . چاہا کہ موجودہ لوگوں کے لیے ایک تذکرہ اور آنے والوں کے لیے ایک یادگار چھوڑ جاؤں ۔''

لیکن میر تقی میر کے ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ در اصل نکات الشعراء نے مصنف کو مسرت افزا کی تالیف پر اکسایا ہے ۔ میر کے ترجمے میں مصنف نے لکھا ہے کہ :

''نکات الشعراء ان کی تالیف ہے ۔ اس میں انھوں نے عجیب طرح سے ریختہ گو شعرا کے کلام پر نکتہ چینی کی ہے ۔ جس کا بھی ذکر کیا ہے حقارت و بے دلی کے ساتھ کیا ہے اور ان کے بے رتبہ و ناپسندیدہ اشعار چن چن کر لکھے ہیں ۔ سچ بات یہ ہے کہ ''مسرت افزا'' کی تالیف کا سبب یہی تذکرہ تھا ۔ میں نے نکتہ چینوں اور حاسدوں کے برخلاف ہر ایک کے صحیح حالات لکھے ہیں ۔''

مصنف نے میر کی سیادت پر بھی شبہ کیا ہے اور انتخاب کلام کے سلسلے میں انھیں بے ذوق بتایا ہے ۔

ان تفصیلات کی روشنی میں تذکرۂ مسرت افزا تاریخ ، سوانح اور تنقید کے سلسلے میں ایک اہم تذکرہ قرار پاتا ہے اور شعرائے متقدمین و متوسطین کے بارے میں بہت سی نئی باتیں بہم پہنچاتا ہے ۔

صاحب مسرت افزا کی تذکرہ نگاری کا کیا انداز ہے ، اس کا اندازہ کرنے کے لیے علی ابراہیم خلیل اور ٹیک چند بہار کے اصل تراجم یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

بہار : ''ٹیک چند بہار تخلص در چمن سخنوری بہار از بیان اوست و نہال معانی معانی را سرسبزی از زبان او و در تحقیق لغت فارسی چندان مہارت داشت کہ در حیطۂ تحریر نمی گنجد ۔ کتابے مسمیٰ بہار عجم تالیف نمودہ و در اکثر مواقع دخلہا بر سراج اللغت سراج الدین علی خان آرزو و دیگر کتب لغت کردہ و رسائل

در صنائع و بدائع وغیره علوم از نتائج طبع اوست گاہے بہ تفنن طبع شعر ریختہ ہم میگفت از آنجملہ است ۔"[۱]

علی ابراہیم خلیل : "علی ابراہیم خان خلیل جامع اصناف کمال و شاعر عدیم المثالست ازان ابراہیم خلیل نار آزری گلزار شدہ و ازین ابراہیم خلیل سخنوری رونق و بہار پذیرفتہ ۔ مولدش موضع شیخ پورہ نواحی بلدۂ عظیم آباد است و نشو و نمایش مرشد آباد ۔ در وقت نواب مہابت جنگ مرشد آباد آمدہ و سامانے از ثروت و جاہ بہم رسانیدہ و در ایام حکومت نواب عالیجاہ میر محمد قاسم خان بہ اعلی مراتب حشمت و جاہ رسیدہ و سرآمد سرداران سرکارش گردید ۔ چون نیر طالعش در عروج بود روز بروز بمعارج دولت صعود مینمود تا در خانۂ نواب مظفر جنگ نائب ناظم بنگالہ مختار و مدار المہام گردیدہ لیکن از برہمی اطوار روزگار جفا کار خانہ نشین گشتہ و باوجود خانہ نشینی مرجع خلائق است ۔ طبعش بس موزون و رساست و فکرش از حد معانی یاب و عقدہ کشا ۔ شیرین زبانی او سامعانرا حلقہ بگوش میسازد و خوش خلقی و زباندانی او از سر منکران ہوش میرباید نظمش در سلک فصاحت منتظم و جواہر نثرش بغایت کامل العیار و مستحکم مدتیست کہ در پے تالیف تذکرۂ شعراے متقدمین و متاخرین کمر سعی بر میان بستہ و تذکرہ محافل الشعرا نامش نہادہ لیکن بلند حوصلگی طبع رساے وے قانع بر ماحصل نیست پیوستہ نائرہ ہل من مزید بگوش میرساند لہذا تاحال آغازش بہ انجام نہ رسیدہ و ابتدایش صورت اختتام نہ پذیرفتہ ۔ در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و دو ہجری کہ مؤلف بعزم کلکتہ وارد مرشد آباد شدہ از سبق معرفتیکہ با وے بود اکثر از ملاقاتہایش انبساط خاطر محزون و پریشان و انشراح طبیعت افسردہ و حیران حاصل میشد ۔ چون فقیر در آن زمان در پے تالیف

۱۔ "معاصر"، پٹنہ شمارہ نمبر ۶، ص ۳۰، بابت اپریل ۱۹۵۴ع ۔

حالات شاعران زبان ریختہ بود از دوستان آن دیار شنیدہ کہ وے در ضمن تالیف تذکرۂ محافل الشعرا تذکرۂ شعرائے ریختہ نیز ترتیب دادہ اشعار اساتذہ حمیدہ و پسندیدہ در آن درج لآلی آبدار درج نمودہ حالات وے نیز مشروحاً با اشعارش در آن مندرج است بخواہش تمام در خدمت وے استدعائے آن تذکرہ نمودم تا از آن حالات اساتذۂ کہ از حالات شان بما خبر نرسیدہ خصوصاً احوال وے از تالیف وے استخراج نمایم لیکن خدا داند بخاطرش چہ خطور کرد و ہمت رسایش چرا قصور نمود کہ ابا و انکار آورد ۔ مکرر ارشاد فرمود کہ بعدِ ترتیب پریشان ساختم واللہ اعلم ۔ بعد تحریر تذکرہ در ماہ رجب المرجب سنہ یکہزار و یکصد نود و پنجم ہجری کہ نواب عماد الدولہ گورنر جنرل مسٹر ہسٹنگز بہادر جلادت جنگ بعزم تسخیر ممالک مغرب زمین از کلکتہ نہضت فرمودہ وقت جلوہ افروز شدہ بلدۂ مرشد آباد خان موصوف را بصد اکرام و اعزاز بہمراہی خود سرفراز نمودہ چون راجہ چیت سنگھ از شامت کردار و اعمال خویش از ملک خود اخراج شد عدالت دیوانی آن ملک بمہ عدالت فوجداری بوے تفویض نمودہ بعنایت خلعت فاخرہ مختاری و حکمرانی بلدۂ بنارس وے را مباہی ساختہ اکنون دران ضلع مرجع خاص و عام و ملجائے انام آن مقامست ۔''[1]

''مسرت افزا'' کے سلسلے میں کئی مقالے شائع ہوئے ہیں لیکن سب سے وقیع اور کارآمد مقالہ قاضی عبدالودود صاحب کا ہے ، یہ مقالہ رسالہ اُردو کراچی میں شائع ہو چکا ہے ۔ قاضی صاحب نے اس مقالے میں صاحب تذکرہ کے حالاتِ زندگی ، تذکرے کے زمانۂ تصنیف ، اس کے مآخذ ، خصوصیات اور معائب و محاسن سب کا مفصل جائزہ لیا ہے ۔[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ ''معاصر'' پٹنہ ، شمارہ ٦ ، صفحہ ۷۲ ، بابت اپریل ۱۹۵۳ع ۔

۲۔ رسالہ اُردو کراچی ، ص ۵ تا ۳۴ ، بابت اپریل ۱۹٦۸ع ۔

گلشنِ سخن

مصنف کا اصل نام میرزا کاظم خطاب مردان علی خان، تخلص مبتلا تھا۔ لکھنؤ کے باشندے تھے، خطاب نواب منصور خان صفدر جنگ نے دیا تھا۔ والد کا نام محمد علی اور خطاب خان بہادر تھا۔ تذکرۂ ''روزِ روشن'' مؤلفہ مظفر حسین صبا میں مبتلا کے حالاتِ زندگی قدرے تفصیل سے ملتے ہیں، اس میں مبتلا کا سالِ پیدائش ۱۱۴۴ھ بتایا گیا ہے۔ لیکن خود مبتلا نے اپنے فارسی تذکرہ گلدستۂ معانی (جس کا تاریخی نام نظم معانی ہے) مؤلفہ ۱۱۶۱ھ میں اپنی عمر بیس سال سے متجاوز ظاہر کی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی پیدائش ۱۱۴۰ھ قرار پاتی ہے۔ مبتلا کہ فنِ شاعری، صرف و نحو، فقہ اور خوش نویسی میں اچھی دست گاہ تھی۔ فارسی، اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا ذکر اُردو شعرا کے متعدد تذکروں میں آیا ہے۔ مؤلف روزِ روشن کے مطابق بارھویں صدی ہجری کے آخر میں رحلت کی۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی نے بھی ''گلشن سخن'' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ۱۹۶۵ع کے مقدمہ میں تفصیلی حالات زندگی کے ساتھ لکھا ہے کہ مبتلا نے بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں انتقال کیا۔[۱]

مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب نے گلشن سخن قلمی مملوکہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''دیباچے میں مصنف نے ع

''آج پھولا ہے سخن کا گلشن''

مادۂ تاریخ نکالا ہے جس سے ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ع) برآمد ہوتے ہیں۔ چوں کہ کتاب میں جگہ جگہ یہی سنہ ''اکنون''، ''الحال'' کے ساتھ مذکور ہے

۱- مقدمۂ گلشن سخن، ص ۳۰، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ۱۹۶۵ع۔

اور مصنف کا دعویٰ بھی ہے کہ کتاب تھوڑے عرصے میں تصنیف ہو گئی تھی ، اس لیے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اسی ایک سال کے اندر کار تالیف سے مبتلا فارغ ہو گیا تھا ۔"[۱]

"گلشن سخن" مرتبہ مسعود حسین رضوی مطبوعہ ۱۹۶۵ع میں بھی عرشی صاحب ہی کے قول کی تائید کی گئی ہے ۔ رضوی صاحب کی نظر میں صرف ایک واقعہ ایسا ہے جو ۱۱۹۴ھ کے اختتام سے دس دن بعد پیش آیا ۔ یعنی مرزا مظہر جانِ جاناں کی وفات جو ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ میں ہوئی ۔ لیکن مشفق خواجہ صاحب نے تذکرے کی بعض داخلی شہادتوں کی مدد سے یہ ظاہر کیا ہے کہ :

"مبتلا نے اپنا تذکرہ ۱۱۹۴ھ میں نہیں بلکہ اس کے کئی سال بعد لکھا ۔"[۲]

اس کے بیان کی روشنی میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب گلشن سخن ۱۱۹۴ھ کے بعد لکھا گیا تو مبتلا لکھنوی نے اس کا مادۂ تاریخ ۱۱۹۴ھ کیوں دیا اور مختلف شعرا کے تراجم میں "اکنون" ، "الحال" اور "تا این زمان" اور "تا حال" کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ۱۱۹۴ھ کی صراحت کر کے اسے ۱۱۹۴ھ کی تالیف ظاہر کرنے پر کیوں اصرار کیا ؟

اس کے جواب میں مشفق خواجہ صاحب کا استدلال یہ ہے کہ :

(الف) "مبتلا نے "گلزار ابراہیم" سے سرقے کی حد تک استفادہ کیا ہے اور نہایت ہوشیاری سے گلزار ابراہیم کے بیانات کو اپنا لیا ہے اور شعرا کے حالات عمداً اس انداز سے لکھے ہیں کہ جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ گلزار ابراہیم کے وجود سے بالکل بے خبر ہے ۔ یہاں تک کہ اس نے علی ابراہیم خلیل کے شاعرانہ وجود سے بھی انکار کر دیا ہے ۔"

۱۔ دستورالفصاحت ، ص ۲۷ ، مرتبہ مولانا عرشی ، مطبوعہ ہندوستانی پریس رام پور ۱۹۴۳ع ۔

۲۔ گلشن سخن پر ایک نظر ، از مشفق خواجہ ، مطبوعہ رسالہ اُردو کراچی ، بابت جولائی ۱۹۶۷ ، ص ۱۳۳ تا ۱۳۶ ۔

(ب) "مبتلا کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے اس کے تذکرۂ شعرائے فارسی (گلدستہ، معانی یا نظم معانی) کا تو ذکر کیا ہے لیکن گلشن سخن کا نام تک نہیں لیا۔ اگر یہ تذکرہ ۱۱۹۴ھ میں لکھا جاتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ گلزار ابراہیم، تذکرۂ عشقی اور نشترِ عشق میں گلشن سخن کا ذکر نہ ہوتا۔"

یہ دونوں دلیلیں قابل توجہ ہیں۔ گلشن سخن میں مبتلا لکھنوی کا جگہ جگہ یہ اصرار کہ ان کا تذکرہ ۱۱۹۴ھ ہی میں ایک سال کے اندر مکمل ہوا ہے، فی الواقع شبہ میں ڈالتا ہے۔ گلشن سخن خاصا ضخیم تذکرہ ہے اور اس زمانے میں جب کہ مراسلت و مواصلت کے ذرائع محدود تھے ایک سال کے اندر اتنا مواد جمع کر لینا آسان نہ تھا۔ اُردو شعرا کے اکثر تذکرے کئی کئی سال کی محنت کے بعد تیار ہوئے ہیں۔ گلزار ابراہیم ہی کو لیجیے اس کے تکملہ کا سال اگرچہ ۱۱۹۸ھ ہے (حالاں کہ بعد کے اضافوں کا ثبوت بھی ملتا ہے) لیکن مؤلف کے بیان اور شعرا کے تراجم سے صاف پتا چلتا ہے کہ اس کا آغاز خلیل نے ۱۱۹۸ھ سے بہت پہلے کر دیا تھا۔ مشفق خواجہ صاحب نے تذکرۂ شورش مرقومہ ۱۱۹۱ھ سے خلیل کا ترجمہ نقل کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ خلیل کے تذکرے کی شہرت اس کے تکملہ سے کئی سال پہلے ہو چکی تھی۔ "گلزار ابراہیم" کے شہرت پا جانے کا ثبوت مسرت افزا سے بھی ملتا ہے۔ بلکہ صاحب مسرت افزا کا بیان غلام حسین شورش کے بیان سے بھی زیادہ قوی ہے۔ شورش نے تو صرف خلیل کے ذکر میں اس قدر لکھا ہے:

"قبل ازین تذکرۂ فارسی مرقوم فرمودہ اند۔ غالب است کہ تذکرۂ ریختہ ہم تحریر نمایند۔"

اس بیان میں تذکرے کے وجود کا تیقن نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مستقبل میں تذکرہ لکھیں گے۔ لیکن صاحب "مسرت افزا" کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ خلیل کے تذکرے کی خبر ۱۱۹۲ھ ہی میں عام ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ خلیل کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"۱۱۹۲ھ میں جب راقم کلکتہ کے ارادے سے مرشد آباد پہنچا تو پہلے سے شناسائی کی وجہ سے اکثر ملاقات ہوتی رہی اور افسردہ طبیعت ان کی

صحبت سے مسرور ہوتی رہی چوں کہ اس زمانے میں راقم شاعران ریختہ کا ایک تذکرہ مرتّب کرنے میں لگا ہوا تھا۔ دوستوں سے معلوم ہوا کہ "تذکرۂ محافل الشعرا" کے ضمن میں تذکرۂ شعرائے ریختہ بھی مرتّب کر چکے ہیں اور اساتذہ کے منتخب اشعار اس میں مندرج ہیں اور حالات بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ میں نے اس تذکرے کو دیکھنے کی از حد خواہش ظاہر کی کہ جن شعرا کے حالات سے میں واقف نہیں ہوں ان سے با خبر ہو سکوں لیکن خدا معلوم ان کے دل میں کیا خطرہ محسوس ہوا کہ دینے سے انکار کر دیا۔"[۱]

اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ گلزار ابراہیم ۱۱۹۲ھ بلکہ اس سے قبل شہرت پا چکا تھا۔ گلشن سخن کے مؤلف مردان علی خاں مبتلا کا قیام چوں کہ مرشد آباد، عظیم آباد اور بنارس میں بھی رہا ہے اس لیے خلیل سے ملاقات کا قوی امکان ہے۔ صاحب مسرت افزا ابوالحسن کو خلیل کے مسودہ نہ دکھانے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے انھیں دھوکا ہو چکا تھا اور کیا عجب کہ یہ دھوکا انھیں مبتلا نے دیا ہو۔ بہرحال گلزار ابراہیم اور گلشن سخن میں اس حد تک مماثلت و مشارکت ہے کہ یہ دونوں تذکرے اکثر جگہ ایک دوسرے کے چربے معلوم ہوتے ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے اس مماثلت کے ثبوت میں دونوں تذکروں سے کئی شعرا کے تراجم نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خلیل نے مبتلا سے نہیں بلکہ مبتلا نے خلیل سے استفادہ کیا ہے اور اس حد تک کہ یہ استفادہ سرقے سے جا ملا ہے۔

پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب کاکوی نے کچھ دنوں پہلے گلشن سخن اور گلزار ابراہیم کے نثری متن (اشعار خارج) کا اُردو ترجمہ ایک ساتھ شائع کیا ہے اور دونوں کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ایک مقدمہ بھی سپردِ قلم کیا ہے۔ مقدمے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی نظر سے مشفق خواجہ صاحب کا محولہ بالا مضمون گزرا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ بہر طور عطا کاکوی

۱۔ مسرت افزا، ص ۵۵ - ۵۶، (تلخیص و ترجمہ) مرتّبہ عطاء کاکوی، مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ، اپریل ۱۹۶۸ع۔

نے بھی اس بات کو دہرایا ہے کہ مبتلا نے خلیل کے مسودے سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ چنانچہ وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گلزار کے اجزا غیر مرتب شکل میں مبتلا کی نظر سے گزرے ہیں اور انھوں نے بہت کم عرصے میں اپنا تذکرہ مرتب کر لیا۔ خلیل نے اپنے فارسی تذکروں کی تکمیل کے بعد گلزار کے مکمل کرنے کا خیال کیا اور اس کا مسودہ ۱۱۹۸ھ میں تیار کیا۔ دونوں تذکروں کی مماثلت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ ان دونوں کو اک ساتھ شائع کیا جائے۔ عبارت چوں کہ دونوں کی حسب روایت فارسی میں تھی اس لیے اس کو اُردو میں منتقل کر دیا گیا۔ طوالت کے خوف سے اشعار حذف کر دیے گئے ہیں۔ صرف ہر شاعر کے حالات اور اشعار کی تعداد ظاہر کر دی گئی ہے۔"[۱]

دونوں تذکروں کی مماثلت پر مندرجہ بالا بحثوں کے باوجود مشکل یہ ہے کہ مبتلا نے خواہ گلزار ابراہیم ہی سے سرقہ کیوں نہ کیا ہو گلشن سخن کے تکملہ کا سال ۱۱۹۴ھ ہی رہتا ہے اور اس لیے تاریخی اعتبار سے گلشن سخن کو گلزار ابراہیم مؤلفہ ۱۱۹۸ھ سے مقدم ہی قرار دینا پڑتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ابھی یہ امر مزید تحقیق چاہتا ہے کہ مبتلا کی نظر سے خلیل کا مسودہ گزرا تھا یا اس کا تذکرہ گلزار ابراہیم سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح ابراہیم خلیل اپنے فارسی تذکروں کی ترتیب کے ساتھ ساتھ اُردو شعرا کا مواد بھی جمع کر رہے تھے بالکل اسی طرح مبتلا نے بھی اپنے فارسی تذکرہ "نظم معانی" کی ترتیب کے ساتھ ہی گلشن سخن کے لیے شعرا کے حالات و اشعار فراہم کرنے شروع کر دیے ہوں اور اس مواد کو ۱۱۹۴ھ میں باقاعدہ تذکرے کی تشکیل دے کر مکمل کیا ہو اور اسی لیے انھوں نے "تا حال"، "تا این زمان" اور "الحال" کے ساتھ ۱۱۹۴ھ کا سال بھی ظاہر کر دیا ہو۔ چنانچہ جس طرح دونوں تذکروں کی مماثلت سے یہ

۱۔ مقدمہ گلشن و گلزار، ص ۷، (اُردو تلخیص و ترجمہ)، از عطاء الرحمٰن کاکوی، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۸ع۔

گمان کیا جاتا ہے کہ مبتلا نے خلیل کے مسودے کا مواد اڑا لیا، بالکل اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ خلیل نے مبتلا کے تذکرے کا مواد کسی ذریعے سے حاصل کر لیا ہو اور یہ خیال کر کے کہ مبتلا کے تذکرے کی اب کوئی نقل موجود نہیں ہے نیز یہ کہ اگر وہ مبتلا کے تذکرے کا ذکر اپنے تذکرے میں کریں گے تو ان پر سرقے کا الزام آئے گا، انھوں نے دانستہ مبتلا کے تذکرے کو نظر انداز کر دیا ہو۔ یوں بھی گلزار ابراہیم کے مؤلف بہت بڑے سرکاری عہدوں یعنی مجسٹریٹی اور گورنری کے مناصب پر فائز تھے۔ انھیں مواد جمع کرنے کی جو سہولتیں حاصل تھیں وہ دوسروں کو نہ تھیں۔ خود عطاء الرحمٰن کاکوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"خلیل اپنے دو فارسی تذکروں کی ترتیب کے لیے بڑا اسٹاف رکھے ہوئے تھے اور انھی دونوں تذکروں کے ساتھ ساتھ بلکہ اختتام پر ریختہ گو شعرا کا تذکرہ بھی زیرِ ترتیب تھا۔"

ایسی صورت میں جیسا کہ اُردو ادب کی تاریخ میں سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں اور آج بھی یہ کام کسی نہ کسی پیمانے پر ہو رہا ہے کہ بڑے عہدیدار ادیبوں اور باذرائع مصنفوں کی کتابوں کے لیے مواد کی فراہمی کا سارا کام دوسرے غریب علما و فضلا معاش کی خاطر کرتے ہیں اور کتابوں کی اشاعت سے نام بڑے آدمیوں کا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ مبتلا کے تذکرے کا مواد خلیل نے کسی طرح حاصل کر لیا ہو۔ مبتلا جیسا کہ ان کے حالات سے ظاہر ہے ابراہیم خلیل کے مقابلے میں بہت کم رتبہ اور غریب آدمی تھے۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ان کے تذکرے کے قلمی مسودے غالباً دو تین سے زیادہ تیار نہ ہو سکے، اس لیے کہ اب تک اس کے صرف دو مخطوطوں کا سراغ ملا ہے۔ اس کے برعکس گلزار ابراہیم کے درجنوں مخطوطے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان حالات میں اگر مبتلا کے تذکرے کی شہرت جلد نہ ہو سکی اور ابراہیم خلیل کے تذکرے کی شہرت قبل از وقت ہو گئی تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ مبتلا نے اپنے تذکرے میں جگہ جگہ "تا این زمان"، "تاحال"، "الحال" اور "اکنوں" وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ ۱۱۹۴ھ کی صراحت کر کے سرقے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، سو یہ بات بھی کچھ اور توجہ چاہتی ہے۔ گلزار ابراہیم میں بھی ان الفاظ کا جگہ جگہ استعمال اور سنین کا اظہار

ہوا ہے - گلزار ابراہیم کے اُردو ترجمے سے چند مثالیں بالاختصار یہاں درج کی جاتی ہیں :

۱- حسرت میر محمد حیات : ''آج کل کہ ۱۱۹۵ھ ہے نواب مبارک الدولہ . . . کے متوسلین میں ہیں -''

۲- حسرت جعفر علی : ''آج کل کہ ۱۱۹۶ھ ہے مرزا موصوف کے اشعار لکھنؤ سے بنارس منگوا کر درج کیے -''

۳- میر حسن : ''آج کل کہ ۱۱۹۶ھ ہے اپنے اشعار لکھنؤ سے راقم کے پاس بھیجے -''

۴- خواجہ میر درد : ''آج تک کہ ۱۱۹۶ھ ہے دہلی میں گوشہ نشینی میں مست ہیں -''

۵- میر سوز : ''آج کل ۱۱۹۴ھ ہے لکھنؤ میں قیام ہے -''

۶- قائم : ''آج کل ۱۱۹۴ھ اپنے وطن کے اطراف میں رہتے ہیں -''

۷- میر تقی میر : ''آج کل کہ ۱۱۹۶ھ ہے سنا ہے کہ شاہجہان آباد میں مقیم ہیں -''

یہ صورت اکثر تراجم میں نظر آتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ خلیل نے یہ روش گلشن سخن کے مسودے کو دیکھ کر اختیار کی ہو -

میر الم اور علی اعظم خاں عاشق کے جو تراجم مشفق خواجہ صاحب نے اپنے مضمون میں دیے ہیں وہ بھی گلشن سخن کو گلزار ابراہیم کے بعد کی تصنیف یا اس کا سرقہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں - اول اس لیے کہ سنین کے اندراج کے سلسلے میں گلشن سخن کی جن معمولی کمزوریوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس زمانے میں تحقیق کے وسائل محدود ہونے کے سبب عام تھیں اور اکثر تذکرہ نگاروں کے یہاں ملتی ہیں - الم کے تذکرے کے سلسلے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

الم کے بارے میں مبتلا نے لکھا ہے کہ :

''از چند سال در مرشد آباد بہ سبب دوستی راجہ دولت رام استقامت دارد -''

حالاں کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ ۱۱۹۴ھ ہی میں مرشد آباد میں وارد ہوئے تھے - گلزار ابراہیم کی اصل فارسی عبارت اس وقت پیش نظر

نہیں لیکن اس کے ترجمے میں علی لطف نے صاف لکھا ہے :

''۱۱۹۴ھ میں رونق بخش بلدۂ مرشد آباد کے ہوئے تھے اور دوستی سے راجہ دولت رام کی چند مدت اس شہر میں رہے تھے۔''

اس سے ثابت ہے کہ مبتلا نے الم کا ترجمہ ۱۱۹۴ھ کے کئی برس بعد لکھا ہے۔

خواجہ صاحب نے کسی خارجی شہادت کے بغیر اس جگہ ابراہیم خلیل کے بیان کو یکسر صحیح اور مبتلا کے بیان کو غلط تسلیم کر لیا ہے۔ ورنہ ان کے معاصر تذکرہ نگاروں کے بیان سے تو خلیل کے بجائے مبتلا ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ ابوالحسن مؤلف مسرت افزا (مرقومہ ۱۱۹۳ھ) کا قیام بھی مرشد آباد میں رہا ہے اور اس کے اطراف میں وہ بھی مقیم رہے ہیں۔ الم کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ :

''مشرقی ممالک کی سیر و سیاحت کے لیے دہلی چھوڑ کر کچھ عرصے تک عظیم آباد میں رہے۔ مؤلف سے اس دیار میں ملاقات ہوئی۔ بارہا غریب خانہ پر تشریف لائے۔''[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ الم ۱۱۹۳ھ سے پہلے اطراف مرشد آباد میں موجود تھے۔ اسی طرح علی اعظم عاشق کے ترجمے کے سلسلے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

''علی اعظم خاں عاشق کے بارے میں مبتلا کا بیان ہے :

چند سال پیش ازین انتقال نمودہ۔

لیکن تذکرۂ شورش (سال تصنیف ۱۱۹۳ھ) میں عاشق کا حال اس طرح لکھا گیا ہے جیسے وہ زندہ ہو۔ اس بنیاد پر اگر عاشق کا سال وفات ۱۱۹۳ھ بھی فرض کر لیا جائے تو مبتلا کا اس واقعہ کو ۱۱۹۰ھ میں چند سال پیشتر کا واقعہ کہنا درست نہیں ہو سکتا۔''[2]

۱- مسرت افزا، ص ۳۷، مترجمہ و مرتبہ ڈاکٹر مجیب قریشی، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۸ع۔

۲- ایضاً، ص ۱۵۷۔

جب تک علی اعظم خاں عاشق کا صحیح سالِ وفات نہ معلوم ہو محض شورش کے بیان کے قرینے سے یہ کہنا کہ وہ ۱۱۹۳ھ تک ضرور زندہ تھے ، مناسب نہیں معلوم ہوتا - بلکہ یہاں بھی معاصر تذکرہ نگار ابوالحسن کے بیان سے مبتلا ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے - انھوں نے عاشق کو صیغۂ ماضی میں یاد کیا ہے اور صاف صاف لکھ دیا ہے کہ وہ ۱۱۹۳ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے - ان کا اصل بیان یہ ہے :

''بڑے بے نیاز و بے ریا تھے چند سال ہوئے کہ رحلت کر گئے -''

خود ابراہیم خلیل نے گلزار ابراہیم میں عاشق کے بارے میں لکھا ہے :

''راقم کے آشنا تھے - چند سال ہوئے وفات پائی -''[1]

ان مباحث کی روشنی میں یہ امر مزید تحقیق کا طالب ہے کہ گلشن سخن مؤلفہ ۱۱۹۴ھ کا مواد گلزار ابراہیم مؤلفہ ۱۱۹۸ھ کا سرقہ ہے - ہو سکتا ہے کہ واقعہ اس کے برعکس ہو - یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ گلزار ابراہیم کے تکملہ کے فوراً بعد یعنی بارھویں صدی ہجری کے آواخر میں مبتلا دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں -

''گلشن سخن'' ۱۹۶۵ع سے قبل غیر مطبوعہ تھا - اس کا اولیں تعارف مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ہمایوں (لاہور) بابت دسمبر ۱۹۳۳ع میں کرایا تھا - پھر ۱۹۴۳ع میں دستور الفصاحت مرتبہ مولانا عرشی کے مقدمے کے ذریعے اس کی بعض تفصیلات سامنے آئیں اور یہیں سے اس کا تذکرہ ''نگار'' ۴۶ع کے سالنامے میں آیا - اس تذکرے کے صرف دو قلمی نسخوں کا سراغ اب تک لگا ہے - ایک لکھنؤ میں حکیم سید علی آشفتہ کی ملکیت ہے ، دوسرا رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے - لکھنؤ کا نسخہ ناقص الطرفین ہے ، رام پور کا مکمل ہے - پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ان دونوں نسخوں کی مدد سے ''گلشن سخن'' کو مرتب کیا اور سیر حاصل مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ کے زیر اہتمام ۱۹۶۵ع میں شائع کر دیا - اس وقت یہی میرے سامنے ہے -

---

۱- ''گلشن و گلزار'' (تلخیص و ترجمہ) ، ص ۸۹ ، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۸ع -

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں[1] ۳۲۱ شاعروں کا ذکر مع حالات و منتخب کلام آیا ہے۔ شاعروں کے حالات کم اور کلام کا انتخاب زیادہ ہے۔ تصنیف کا سبب محض ادبی ذوق و شوق کی تسکین ہے۔ خود لکھتے ہیں:

''چنانچہ بہ خاطر رسید کہ از کلام ریختہ گویان سابق و حال کہ این زمان کمال اشتہار در قلمرو ہندوستان دارند . . . منتخب نمودہ صحیفہ جمع نماید تا از مطالعۂ آن شیفتگانِ محبوبانِ معنی حظے وافر بردارند۔ الحمد للہ العطایا کہ در اندک زمان کامیاب گردیدہ وجہ مقصد رسیدہ چون عقد خاطر را بہ ناخن حسن انجام تالیف کشود مسمیٰ بہ گلشن سخن نمود۔''

تذکرے بالعموم، غزل گو شعرا کے حالات اور غزل کے اشعار پر مشتمل ہوتے ہیں۔ گلشن سخن میں مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور ساقی ناموں کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ مثنوی کے سلسلے میں جعفر علی خاں زکی، قیام الدین قائم، فدوی لاہوری اور غلام حسین شورش وغیرہ کا نام آیا ہے۔ قصیدے کے سلسلے میں سودا، شورش اور جعفر علی حسرت کے نام آئے ہیں۔ ساقی ناموں کے سلسلے میں فقیہ، درد مند اور حمایت علی مجنون کا نام آیا ہے۔ مرثیے میں خواجہ امام بخش اسامی، خواجہ برہان الدین آثمی اور محتشم علی خاں حشمت وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ اس تذکرے کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ گلزار ابراہیم اور گلدستۂ حیدری کے ساتھ مناسب ہوگا، اس لیے کہ ان تینوں میں متنی مشابہت ہے اور ان کے مصنفین نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ افسوس کہ مسعود حسن رضوی ادیب اس پہلو کو نظر انداز کر گئے اور اسی لیے ان کا یہ کام تحقیقی اعتبار سے تشنہ رہ گیا۔

تذکرہ آفتاب کے ذکر سے شروع ہو کر یاس کے حالات پر ختم ہوتا ہے۔ ترتیب بھی بلحاظ حروف تہجی ہے اور متن کی ترتیب بھی اسی لحاظ سے ہے لیکن مطبوعہ گلشن سخن کے آغاز میں جو فہرست شعرا مرتّب کی گئی ہے وہ شیخ نجم الدین آبرو سے شروع ہوتی ہے، خاتمہ یونس کے ذکر پر ہوتا ہے۔ اس جگہ

۱۔ مطبوعہ نسخے کی فہرست شعرا میں صرف ۳۱۷ ہیں۔

آبرو اور یونس کے تراجم بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں :

آبرو : شیخ نجم الدین آبرو مشہور بہ شاہ مبارک از فرزندان شاہ غوث گوالیاری در اوائل سلطنت محمد شاہ غفران پناہ بہ شاہجہان آباد آمدہ سکونت ورزید ۔ در شیوۂ شاعری طرز خاصے دارد و رعایت لفظی و ایہام بسیار نماید کلیاتش یکہزار و پان صد بیت دیدہ شد ازوست ۔ (ص ۵۱ ، مطبوعہ) ۔

یونس : ''حکیم یونس از موزونان قدیم است این دو بیت ازوست ۔ (ص ۲۷۸ ، مطبوعہ) ۔

☆ ☆ ☆

گلزار ابراہیم

صاحب گلزار ابراہیم ، علی ابراہیم نام ، خلیل تخلص تھا - پٹنہ میں رہنے لگے تھے - وطن خاص شیخ پورہ ضلع مونگیر تھا - خلیل کی تعلیم و تربیت مرشد آباد میں ان کے ماموں زاہد حسین کی زیر نگرانی ہوئی - ان کے نانا "ملا" نصیر اپنے زمانے کے فاضل بزرگ تھے - مال و ثروت ، خاندانی وجاہت و شرافت کے ساتھ فضل و کمال بھی حاصل تھا - انگریزی دور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے - پہلے ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۱ع میں بنارس کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے پھر گورنر بنا دیے گئے - اشپرنگر اور بلوم ہارٹ نے جرأت کے اس مصرعے سے : ع

لو آہ مٹا مطلع ایوان عدالت

علی ابراہیم کا سال وفات ۱۲۰۸ھ بتایا ہے[1] - پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے بھی ۱۲۰۸ھ ہی کو ابراہیم خلیل کا سالِ وفات مانا ہے،[2] لیکن مخطوطات انجمن ترقی اُردو کے مرتبین نے جرأت کے مصرعے سے صرف ۱۲۰۵ھ[3] برآمد کیے ہیں اور اس سے اتنے ہی نکلتے ہیں -

علی ابراہیم خلیل کے حالات خود ان کے مرتّبہ تذکرۃ الشعراء اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں ملتے ہیں - ان تذکروں کی نشان دہی آخری

۱- بحوالۂ دستور الفصاحت ، ص ۸۷ ، مرتّبہ مولانا عرشی ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع -

۲- مقدمۂ گلشن و گلزار (تلخیص و ترجمہ) ص ۹ ، مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو ، پٹنہ ۱۹۲۸ع -

۳- مخطوطات انجمن ترقی اُردو (اُردو) ، جلد اول ، ص ۱۲۱ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی ، ص ۱۹۶ -

صفحات میں فرہنگ شعرا میں کر دی گئی ہے۔ خلیل سے فارسی شعرا کے دو تذکرے :

۱۔ خلاصۃ الکلام۔

۲۔ صحف ابراہیم۔

بھی یادگار ہیں۔ گلزار ابراہیم ان دونوں کے بعد مرتّب کیا گیا ہے۔

گلزار ابراہیم کے دیباچے میں اس کے عہدِ تصنیف کے بارے میں خود مصنف نے لکھا ہے کہ :

''اس زمانے میں کہ عہد شاہ عالم ہے اور نواب آصف الدولہ کی وزارت ہے اور نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کی حکومت ہے یہ تذکرہ مرتّب ہوا اور ۱۷۸۴ع مطابق ۱۱۹۸ھ میں مسودے سے فراغت پائی۔ اس تذکرے کا نام گلزار ابراہیم رکھا۔''

خلیل نے ''گلزار ابراہیم'' کی ترتیب کا کام، تکملہ سے کئی سال پہلے شروع کیا تھا۔ بعض تراجم کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ۱۱۹۸ھ کے بعد بھی بعض جگہ اضافے کیے گئے ہیں۔[۱]

''گلزار ابراہیم'' اُردو شعرا سے متعلق نہایت اہم تذکرہ ہے۔ مواد کی فراہمی میں جو وسائل اور ذرائع علی ابراہیم کو حاصل تھے وہ اس سے پہلے کے تذکرہ نگاروں کو حاصل نہ تھے۔ علاوہ ازیں خلیل نے اس کے مواد کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ایک مخطوطہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں ہے جس کا تعارف مولانا عرشی نے دستور الفصاحت میں کرایا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کراچی میں بھی اس کا ایک نامکمل نسخہ اُردو ترجمے کے ساتھ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ پٹنہ، حیدر آباد اور یورپ میں بھی اس کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد مختلف نسخوں کی مدد سے گلزار ابراہیم کو مرتّب کر رہے ہیں۔

گلزار ابراہیم پہلی بار مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۳۴ع میں شائع کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۸ع میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ''گلزار ابراہیم

۱۔ مقدمۂ گلزار ابراہیم، از محی الدین قادری زور، ص ۳۵، مطبوعہ ۱۹۳۴ع۔

پر ایک نظر'' کے عنوان سے جو مقالہ شائع کیا تھا اسے اس مطبوعہ نسخے میں بطور مقدمہ شامل کر دیا گیا ہے - اس میں ''گلشن ہند'' بھی مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ شامل ہے - ''گلشن ہند'' کو سب سے پہلے عبداللہ خاں نے حیدر آباد دکن سے ۱۹۰۶ع میں مولانا شبلی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ چھاپا تھا - بعد کو اس کی پرانی لوح ''گلزار ابراہیم'' مرتبہ ڈاکٹر زور میں شامل کر دی گئی - یہی مطبوعہ نسخہ میرے سامنے ہے -

جولائی ۱۹۶۸ع میں پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے گلزار ابراہیم کے نثری تراجم (اشعار خارج کرکے) کا اُردو ترجمہ گلشن سخن مؤلفہ مبتلا لکھنوی کے اُردو تراجم کے ساتھ بہ عنوان ''تذکرۂ گلشن و گلزار'' شائع کیا - اس میں کل ۱۲۸ صفحات ہیں - ابتدا میں مرتّب کا مقدمہ ہے -

گلزار ابراہیم فارسی میں ہے اور اس کے مطبوعہ نسخوں میں ۳۲۰ شاعروں کا ذکر ملتا ہے - مختلف خطی نسخوں میں اس تعداد میں ایک دو کی کمی بیشی پائی جاتی ہے - گلزار ابراہیم سے بعد کے اکثر تذکرہ نگاروں نے فائدہ اٹھایا ہے - گلشن ہند مؤلفۂ مرزا علی لطف اس کے ایک حصے کا اُردو ترجمہ ہے - دوسرا حصہ شائد مرزا علی لطف مکمل نہ کر سکے ، اس لیے کہ اس کا سراغ اب تک نہیں لگ سکا - سید حیدر بخش حیدری نے اپنے تذکرے میں اس تذکرے سے واضح طور پر استفادہ کیا ہے - اس کی وضاحت تذکرۂ حیدری کے ضمن میں کی جا چکی ہے - بعض محققین کا خیال ہے کہ مبتلا لکھنوی کا ''گلشن سخن'' بھی گلزار ابراہیم ہی کے مسودے کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا - لیکن یہ رائے ہنوز تحقیق طلب ہے - ہم نے گلشن سخن کے تبصرے میں اس پہلو پر تفصیل سے گفتگو کی ہے -

''گلزار ابراہیم'' میں تذکرہ نگاری کا انداز نہایت سنجیدہ اور سلجھا ہوا ہے - ہر شاعر کے متعلق مختلف ذرائع سے صحیح حالات معلوم کرنے اور تذکرہ نگاری کو سوانح نگاری سے قریب تر لانے کی کوشش کی گئی ہے - اس میں نہ کسی کو لتاڑا گیا ہے نہ کسی کو بے سبب بانس پر چڑھایا گیا ہے - بلکہ ہر جگہ اعتدال و انصاف کی راہ اختیار کی گئی ہے - نہ ڈاکٹر محی الدین

قادری زور کے قول کے مطابق[1] علی ابراہیم خلیل طبعاً منصف مزاج تھے اور شعر و سخن کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے - علاوہ ازیں وہ ایسے منصب و ماحول میں بسر کر رہے تھے کہ ہر شخص کے ساتھ انصاف کر سکتے تھے - چنانچہ انھوں نے کسی شاعر کے حالات درج کرنے میں پرانے تذکروں یا سنی سنائی باتوں پر اعتماد نہیں کیا بلکہ چھان بین کے بعد معتبر ذرائع سے مواد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے - جن افراد اور ذرائع سے حالات معلوم ہوئے ہیں اکثر ان کا سراغ بھی دے دیا ہے - ابراہیم خلیل کے یہاں شعرا کے حالات میں ان کی شخصیت، سیرت اور معاشرتی و معاشی زندگی کو بھی اجاگر کرنے کا رجحان ملتا ہے - اس تذکرے سے اصنافِ سخن کی رفتار اور مقبولیت کا اندازہ بھی کم و بیش کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ صاحب تذکرہ نے اس طرف واضح اشارے کر دیے ہیں - غرض یہ کہ یہ تذکرہ کئی وجوہ سے دوسرے تذکروں پر فوقیت رکھتا ہے - ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۲۸ع میں اس پر ایک جامع مقدمہ لکھا تھا، یہی مقدمہ مطبوعہ گلزار ابراہیم میں شامل ہے - اس وقت تک اُردو شعرا کے اکثر تذکرے لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے - اب گلدستۂ حیدری اور گلشن سخن بھی سامنے آ گئے ہیں - ضرورت اس کی ہے کہ گلزار ابراہیم، گلشن ہند، گلدستۂ حیدری اور گلشنِ سخن چاروں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ان کی قدر و قیمت اور ایک دوسرے سے استفادے کی نوعیت کا تعین کیا جائے - ممکن ہے پروفیسر کلیم الدین احمد گلزار ابراہیم کا جو نسخہ مرتّب کر رہے ہیں اس سے یہ کمی پوری ہو جائے -

بلحاظ ردیف گلزار ابراہیم کا آغاز آفتاب کے ذکر سے اور خاتمہ یاس کے تذکرے پر ہوتا ہے - اس جگہ یاس اور شورش کے ترجمے بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

شورش: "میر غلام حسین شورش مشہور بہ میر بہنیا خواہر زادہ "ملا" میر وحید و شاگرد باقر حزین ست باین خاکسار آشنا بود بہ محض پندار التفات بقبائح

۱- مقدمہ "گلزار ابراہیم"، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۴ع، مملوکہ قیصر ابن حسن -

افکار خود نمی نمود تذکرہ در ریختہ تالیف نمودہ خالی از دردے و حالتے نہ بود در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری رحلت کردہ ۔ اشعارش مدون و این اشعار خلاصہ دیوان اوست ۔''[۱]

یاس : ''حسن علی خان نسبِ آن عالی حسب بہ نواب عقیدت خان نعمت اللّٰہی پیوندد ۔ در این ولا شنیدہ شد در لکھنؤ بسر می بُرد و استصلاح ریختہ از مرزا جعفر علی حسرت می نماید این اشعار ازاں والا تبار است[۲] (دو شعر) ۔''

☆ ☆ ☆

۱۔ گلزار ابراہیم ، ص ۱۶۴ ، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۴ع ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۲۷۳ ۔

تذکرۂ ہندی گویاں

نام غلام ہمدانی تخلص مصحفی ہے، مصحفی کی تاریخ پیدائش پر اب تک علماے تحقیق کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ خود مصحفی کے بیانات کی روشنی میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۱۶۱ اور ۱۱۶۴ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔[1] ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ع میں بمقام لکھنؤ ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ مصحفی کے حالاتِ زندگی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور دستیاب ہے اس لیے اس کا دہرانا تحصیلِ حاصل ہے۔ قدیم تذکروں میں جہاں مصحفی کا ذکر آیا ہے اس کا سراغ فرہنگ سخنوران نامور مشمولہ کتاب زیر نظر سے لگایا جا سکتا ہے۔

مصحفی سے تین تذکرے یادگار ہیں:

(۱) عقد ثریا: فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اور ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ع میں لکھا گیا ہے۔

(۲) تذکرۂ ہندی: اُردو شعرا سے متعلق ہے اور ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ع میں مکمل ہوا ہے۔

(۳) ریاض الفصحا: یہ بھی اُردو شعرا سے متعلق ہے اور ۱۲۲۱ھ / ۱۲۳۶ھ کے درمیان مکمل ہوا ہے اس کا ذکر علیٰحدہ آگے آئے گا۔

تذکرۂ ہندی کا ایک قلمی نسخہ رام پور میں اور ایک خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ رام پور کا نسخہ ''سراپا سخن'' کے مؤلف سید محسن علی محسن کا مکتوبہ ہے، اس کی تفصیل عرشی صاحب کی مرتّبہ دستور الفصاحت کے مقدمے میں (ص ۸۵ - ۸۶) میں ملتی ہے۔ خدا بخش لائبریری کے متن کو بنیاد بنا کر

۱۔ مقدمہ کلیات مصحفی، ص ۴۰، مرتّبہ ۱۹۶۸ع، ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے بسیط مقدمے کے ساتھ اس تذکرے کو ۱۹۳۳ع میں شائع کر دیا ہے یہی مطبوعہ تذکرہ دستیاب ہے ، یہی میرے سامنے ہے -

تذکرے کے آخر میں قطعات تاریخ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے :

چون ز انعام خدائے کار ساز شد مرتّب این کتاب دلپذیر
بس کہ در معنی نظیر خود نداشت گفتہ شد تاریخ "جلد بے نظیر"

"جلد بے نظیر" کے ٹکڑے سے ۱۲۰۹ھ نکلتے ہیں - اس لحاظ سے اس کے تکملے کا سال ۱۲۰۹ھ قرار پاتا ہے - عرشی صاحب نے مختلف تراجم کی مدد سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کا آغاز در اصل ۱۲۰۰ھ کے قریب ہوا تھا جسے مصحفی نے آٹھ نو سال میں ہر طرح سے مکمل کر لیا -[۱]

"تذکرۂ ہندی گویان" فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۱۹۳ شاعروں کا ذکر آیا ہے - تراجم نثر مختصر اور منتخبات کلام طویل ہیں - شعرا کی فہرست ان کے تخلص کے اعتبار سے بلحاظ حروف تہجی مرتّب کی گئی ہے - سب سے پہلے آفتاب شاہ عالم کا ذکر ہے اور آخر میں میاں یکرو کا - اس کے بعد پانچ شاعرات کا مزید تذکرہ ہے - اس طرح یہ تذکرہ یکرو کے ترجمے پر نہیں بلکہ موتی کے ذکر پر ختم ہوتا ہے - یکرنگ اور موتی کے تراجم یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

یکرنگ : مصطفیٰ خان یکرنگ تخلص بقولے شاکر خان آرزو و بقولے میاں آبرو از فحوائے کلامش چنین می تراود کہ شاگرد مرزا مظہر خواہد بود برائے تیمّن دو شعرش قلمی می شود - ازوست :

ہرگز تم اب کسی کے سجن آشنا نہیں
سب خوبیاں ہیں تم میں ولے اک وفا نہیں
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت سنو
مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں[۲]

موتی : "موتی نامی از اہلِ طوائف اربابِ نشاط در فنِ خود صاحبِ مذاق و ذی اعتبار - اصلش از شاہجہان آباد است - دوازدہ سال گذشتہ کہ میرزا

۱- مقدمۂ دستور الفصاحت ، ص ۸۵ -

۲- تذکرۂ ہندی گویاں ، ص ۲۷۸ ، مرتّبہ عبدالحق ، مطبوعہ ۱۹۳۳ع -

ابراہیم بیگ مقتول را کہ ذکر ایشان در ردیف میم گذشت شیفتگی بر او شدہ بود تا امروز بایشان بر جادۂ وفاداری قائم است - چند سال گذشتہ کہ از دہلی بہ لکھنؤ رسیدہ - گاہ گاہے نقیر ہم برائے ملاقات مرزائے مذکور کہ بہ خانہ اش میروم بسیار بہ خوبی پیش می آید ازوست -"[۱]

اس تذکرے کے ذریعے اس زمانے کے مذاق ادبی ، انداز سخن گوئی ، شعرا کے حالات زندگی اور طرز فکر کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں - بات یہ ہے کہ مصحفی ایک خوش فکر شاعر تھے ، ان کے ملنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا - حاتم سے لے کر شاہ نصیر دہلوی تک سے ذاتی ملاقات تھی - ان میں سے ان کے بزرگ بھی تھے ، جیسے حاتم ، خواجہ میر درد ، میر ، سودا اور فغان وغیرہ ، بعض ہم عمر و ہم عصر تھے مثلاً قائم ، جرأت ، سوز ، بقا ، انشاء ، حسن وغیرہ ، بعض نومشق تھے اور نام پیدا کر رہے تھے مثلاً آتش ، ناسخ ، شاہ نصیر ، رنگین ، خلیق اور افسوس وغیرہ - مصحفی کے شاگردوں کی کثیر تعداد احباب سے علاحدہ تھی - مصحفی نے ان سب کا حال لکھا ہے اور زیادہ تر ذاتی معلومات کی بنا پر لکھا ہے ، اس لیے ان کے بیانات خاصے اہم ہو جاتے ہیں -

شعرا کے حالات کے ضمن میں بقول مولوی عبدالحق اس تذکرے سے اُس زمانے کی شعر و شاعری اور اُردو ادب کے اُتار چڑھاؤ کی کیفیت بھی معلوم ہو جاتی ہے مثلاً حاتم کا زباندان ہونا ، ولی کے دیوان کا شاہجہان آباد میں آنا ، لوگوں میں اس کا چرچا ہونا - بعض صاحبوں کا ایہام گوئی پر اُردو شاعری کی بنیاد رکھنا ، حاتم کا جگت اُستاد ہونا اور دہلی و لکھنؤ کی بہت سی باتیں ریاض الفصحا سے معلوم ہوتی ہیں -[۲] کلام کے متعلق تنقیدی رائیں بھی ملتی ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر لفظی حُسن و قبح سے ہے اور یہی اُس وقت کا دستور تھا -

☆ ☆ ☆

۱- تذکرۂ ہندی گویاں ، ص ۲۸۱ -

۲- مقدمہ تذکرۂ ہندی گویاں ، از مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو ، مطبوعہ ۱۹۳۳ع ، الف تا نون -

"عیار الشعراء"

"عیار الشعراء" شعرائے اُردو کا ایک قدیم اور اہم تذکرہ ہے۔ اس کے مصنف خوب چند ذکا ہیں۔ ان کے والد کا نام رائے سلامت رائے اور دادا کا نام عجائب رائے تھا۔ قوم کے کائستھ تھے۔ آبائی وطن سکندر آباد تھا لیکن خود دہلی میں رہنے لگے تھے۔[1] مطالعۂ کتب اور اہلِ کمال کی صحبت سے اکتساب کا ذوق و شوق بچپن ہی سے تھا۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نصیر الدین ناصر عرف کلّو دہلوی کے شاگردوں میں تھے اور استاد کے زیرِ اثر صنائع لفظی و معنوی ہی کو شعر کا حسن جانتے تھے۔ "گلشن بے خار" مؤلفۂ شیفتہ، "عمدۂ منتخبہ" مؤلفہ اعظم الدولہ سرور اور دوسرے تذکروں میں بھی جیسا کہ آخر میں دی ہوئی فرہنگ سخنوراں سے معلوم ہوگا، ذکا کا ذکر آیا ہے۔ خود ذکا نے "عیار الشعراء" میں دو جگہ اپنے حالات لکھے ہیں۔ ایک دیباچے میں، دوسرے ذکا تخلص کے تحت تذکرے کے درمیان میں۔ گارسیں دتاسی نے ذکا کا سالِ وفات ۱۸۴۶ع ظاہر کیا اور لکھا ہے کہ یہ سن ڈاکٹر اشپرنگر کو ذکا کے پوتے کے زبانی معلوم ہوا تھا۔[2] ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ذکا کے پوتے کے بجائے "ذکا کے بیٹے" لکھا ہے۔[3]

۱۔ دیباچہ عیار الشعراء (قلمی) مخزونہ انڈیا آفس لندن، فوٹو سٹیٹ مملوکہ انجمن ترقیِ اُردو کراچی۔

۲۔ پانچواں خطبہ، ص ۹۱، مؤرخہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ع، مشمولہ خطبات گارسیں دتاسی، مرتّبہ مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ع۔

۳۔ میر تقی میر حیات اور شاعری، ص ۶۱۰، مطبوعہ انجمن ترقیِ اُردو علی گڑھ ۱۹۵۴ع، طبع اول۔

گارسیں دتاسی نے لکھا ہے کہ :

"سنہ تالیف ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ع) یا اغلباً ۱۲۰۸ھ (۹۳-۱۷۹۴ع) سے ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ع) تک سمجھنا چاہیے ۔ اس لیے کہ مؤلف کا بیان ہے کہ اس نے اپنے استاد میر نصیر الدین نصیر عرف میر کلّو کی فرمائش پر تیرہ سال اس کے لکھنے پر صرف کیے ہیں ۔"[1]

گارسیں کا یہ بیان ڈاکٹر اشپرنگر کے بیان سے ماخوذ ہے اس لیے کہ خود اشپرنگر نے بھی عیار الشعراء کا عہدِ تصنیف ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۴۷ھ کے درمیان متعین کیا ہے ۔[2] یہ صحیح نہیں ہے ۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی رائے میں یہ تذکرہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ع سے شروع ہو کر ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ع کے قریب ختم ہوا ہے ۔[3] عرشی صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ ذکا نے دیباچے کے خاتمے پر اس کے تکملے کا سال خود اس طور پر بیان کر دیا ہے :

"تاریخ تذکرہ بدیہہ خاطر گزشتہ نیز درج نمودہ باللہ التوفیق :

اے ذکا ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار
آگے ہاتف کے کیا پیر خرد نے مذکور
منصفی کر کے وہیں اس نے یہ تاریخ کہی
آفریں کہہ کہ کیا اسم سبھوں کا مشہور"[4]

چوتھے مصرعے سے بقول مؤلف ۱۲۱۳ھ نکلتے ہیں حالاں کہ حقیقۃً ۱۲۱۸ھ برآمد ہوتے ہیں ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرف بیانیہ کی "ہ" شمار نہیں کی گئی ۔

۱۔ خطبات گارسیں دتاسی ، ص ۹۱ ، مطبوعہ انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ع ۔

۲۔ یادگار شعرا ، ص ۷ ، مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۴۳ع ۔

۳۔ دیوانِ غالب "نسخۂ عرشی" ، ص ۳۹۲ ، مطبوعہ انجمن ترقیِ اُردو ، علی گڑھ ۱۹۵۸ع ۔

۴۔ دیباچہ عیار الشعراء (قلمی) انڈیا آفس لندن ، فوٹو سٹیٹ مملوکہ انجمن ترقیِ اُردو کراچی ۔

لیکن اسے تکملے کا نہیں بلکہ آغاز کار کا سنہ خیال کرنا چاہیے - تذکرہ نگار عام طور پر آغاز و ارادہ ہی کے وقت تذکرے کا نام رکھ لیتے تھے اور قطعۂ تاریخ تالیف بھی انجام کار سے پہلے کہہ لیا کرتے تھے - ذکا نے بھی یقیناً یہی کیا ہے یعنی ''عیار الشعراء'' کی تالیف کے عین آغاز میں اس کی تاریخ کہی ہے اور اس لحاظ سے ۱۲۱۳ھ اس کا سالِ تصنیف درست ہے - لیکن چوں کہ اس کی تکمیل میں کئی سال لگے ہیں اور ۱۲۱۳ھ کے بہت بعد تک اضافے ہوتے رہے ہیں اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس کا تکملہ ۱۲۱۳ھ اور ۱۲۴۸ھ کے درمیان ۳۵ سال کے عرصے میں ہوا ہے - لیکن یہ بات صرف بعض اضافوں کی حد تک درست کہی جائے گی ورنہ اس کا زیادہ حصہ ۱۲۱۳ھ کے بعد چند سال میں مکمل ہو چکا تھا اس لیے کہ اعظم الدولہ سرور کے ''عمدۂ منتخبہ'' میں ذکا کو صاحب تذکرہ بتایا گیا ہے - عمدہ منتخبہ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ع اور ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۲ع کے درمیان دس سال کے عرصے میں مکمل ہوا ہے - چوں کہ ذکا کو صاحبِ تذکرہ لکھا گیا ہے اس لیے یہی کہنا درست ہوگا کہ عیار الشعراء کا اولیں مسودہ ۱۲۱۳ھ اور ۱۲۲۶ھ کے درمیان ہر طرح مکمل ہو گیا تھا جہاں تہاں اضافے البتہ اس کے بعد بھی ہوتے رہے ہیں -

اس تذکرے کے صرف دو قلمی نسخوں کا سراغ اب تک ملا ہے - ایک انجمن ترقیِ اُردو علی گڑھ میں اور ایک انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے -[1] علی گڑھ کا نسخہ بوسیدہ ہے اور کچھ صفحات بھی غائب ہیں - راقم الحروف نے ۱۹۶۴ع میں نگار کے تذکروں کا تذکرہ نمبر کے سلسلے میں سیفی پریمی صاحب سے اس کی تفصیلات منگائی تھیں اور انڈیا آفس کے نسخے کا مطالعہ اس کی مائیکرو فلم مملوکہ ترقیِ اُردو بورڈ کراچی کے ذریعے کیا تھا - اب اس نسخے کا فوٹو سٹیٹ دو جلدوں میں انجمن ترقیِ اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں بھی موجود ہے - انڈیا آفس کے نسخے کا عکس مالک رام صاحب کے پاس بھی ہے - ڈاکٹر گیان چند نے خبر دی تھی کہ مالک رام اسے مرتّب کر رہے ہیں[2] اور جلد

۱- سال نامہ نگار ۱۹۶۴ع ، ص ۸۱ ، مرتّبہ راقم الحروف -

۲- ''آج کل'' دہلی (اُردو نمبر) ، ص ۱۵ ، بابت اگست ۱۹۶۸ع -

شائع کر دیں گے لیکن اب تک یہ شائع نہیں ہوا۔ انڈیا آفس کے نسخے میں کل آٹھ سو اکیانوے صفحات ہیں اور اس کی فوٹو سٹیٹ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں ابتدا سے لے کر معاصرین تک نو سو اُنچاس شعراء کا ذکر آیا ہے۔ ابتدا میں دیباچہ ہے۔ جس کا آغاز اس طور پر ہوتا ہے:

''حمد بے حد داورے را سزد کہ بہ فلکِ قدرت نقشِ وجودِ انسان را بر کرسی نشانیدہ و ثنائے لا تعد مر خالقے را ارزد کہ بدستیاری قدرت عندلیبِ خوش لہجۂ سخن را بر شاخسارِ زبانہا غزل سرا گردانیدہ۔''

اس کے بعد مؤلف نے اپنے حالات، سببِ تالیف اور تاریخِ تالیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے بعد ازاں شاہ عالم آفتاب کے ترجمے سے اصل تذکرہ شروع ہو کر یونس کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔ شاہ عالم کے ترجمے میں القاب و آداب اور مدح کی طوالت کے سوا کام کی باتیں بہت کم ہیں۔ یونس کے ترجمے میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ:

''حکیم یونس از شاعرانِ قدیم فارسی گو۔ گاہ گاہے سر ریختہ گوئی ہم می داشت۔''

تین شعر بطورِ نمونہ دے دیے ہیں۔

تراجم کے خاتمے پر ''متفرقات'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

''بر ضمیر دانشورانِ نکتہ یاب و خردمندان فضیلت مآب پوشیدہ نہ ماند کہ چند اشعار دل نشین متفرقہ جمع کردہ بودم چون نامِ مصنفانِ اشعار مذکور تحقیق نہ شدہ بود و اشعار مذکور خاطر پسند و بسیار دل پسند بودند درین تذکرہ بطور متفرقات نگاشتم۔''

اس کے بعد تقریباً تین سو اشعار درج کیے گئے ہیں، یہ نہیں بتایا گیا کہ اشعار کن شاعروں کے ہیں۔ گویا مؤلف کے پاس پسندیدہ اشعار کی جو بیاض تھی وہ اس تذکرے کے آخر میں ٹانک دی گئی ہے۔

متفرق اشعار کے بعد مناجات و خاتمہ کے عنوان سے دو صفحے ہیں جن میں مصنف نے حمد و ثنا کے بعد تذکرے کی مقبولیت کی دعا اس طور پر مانگی ہے:

''الٰہی از لوثِ عصیان شرمندہ ام تو خداوندی و من بندہ ام۔

الٰہی کار تو غفاری است و شعار من گنہگاری است ۔
الٰہی از کردۂ خود پشیمانم و چارۂ کار خود جز از تو ندانم ۔
الٰہی آن دہ کہ آن :

تو آپ واقف اسرار ہے اگر کچھ بھی
سوائے اس کے ہمیں آرزوے دیگر ہو
تری جناب میں دن رات بس یہی ہے سوال
الٰہی وہ دے جو حق میں ہمارے بہتر ہو

''تمام شد تذکرہ''

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ یہ تذکرہ انھوں نے بڑی محنت اور ریاضت سے تیار کیا ہے ۔ تراجم بہت مختصر ہیں ، حالات زندگی کے سلسلے میں اکثر جگہ صرف شاعر کے نام اور تخلص ہی کو کافی سمجھا گیا ہے ۔ تنقیدی اشارے بھی نہیں ملتے ۔ ہاں بعض شاعروں کے ذکر میں القاب و آداب کو طول دے کر مروّجہ اخلاقی قدروں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ شاعروں کی تاریخ پیدائش اور وفات کی طرف بھی چنداں توجہ نہیں کی گئی ، مولد و مسکن کا ذکر البتہ کہیں کہیں آ گیا ہے ۔ شعرا کا حال ردیف وار درج ہوا ہے اور ہر تخلص کے ساتھ عموماً شاعر کا پورا نام بھی تحریر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ مجموعۂ اشعار تھا ، شعرا کے مختصر حالات شامل کر کے تذکرہ بنا دیا گیا ہے ۔ مؤلف نے تذکرے میں سب سے زیادہ جگہ خود اپنے ترجمے کو دی ہے ۔ یہ ترجمہ ص ۲۱٦ سے لے کر ص ۲۸۲ تک چھیاسٹھ صفحات میں پھیلا ہوا ہے ۔ نثری ترجمہ تین صفحے کا ہے باقی تریسٹھ صفحوں میں نو سو سے زائد اشعار کا طویل انتخاب ہے ۔ خوب چند ذکا نے میر نصیر الدین دہلوی عرف کلّو کے ترجمے کو بھی خاصی جگہ دی ہے ۔ مخطوطے کے ص ۲۴۸ سے ص ۲٦۱ تک ۱۳ صفحوں میں ان کا ترجمہ پھیلا ہوا ہے ۔ نثری ترجمہ ڈیڑھ صفحے کا ہے باقی صفحوں میں اشعار کا انتخاب ہے ۔ نصیر کی ذکا نے بڑی تعریف کی ہے اور شاعری میں خود کو ان کا شاگرد بتایا ہے ۔ گارسیں دتاسی نے عیار الشعراء کے متعلق لکھا ہے کہ :

''یہ ان تذکروں میں سے ہے جن کا علم مجھے بالواسطہ ہوا ۔ یہ فارسی زبان

میں ہے اور اس میں تقریباً پندرہ سو شاعروں کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ ان کے کلام کا نمونہ ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا قلمی نسخہ ایک ہزار صفحے کا ہے جس کے ہر صفحے میں پندرہ سطریں ہیں۔ اس فاضل مستشرق کی رائے ہے کہ اس تذکرے میں تنقید کا نام نہیں اور مکررات اور غلطیوں سے پُر ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس کا کوئی نسخہ یورپ میں نہیں۔"[۱]

گارسیں نے یہ بات ۲ دسمبر ۱۸۵۴ع کے خطبے میں کہی ہے۔ اس میں بعض باتیں صحت سے دور ہیں۔ عیار الشعراء میں پندرہ سو نہیں صرف نو سو انچاس شاعروں کے تراجم شامل ہیں۔ انڈیا آفس لندن میں اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے اس لیے یہ کہنا کہ یورپ میں کوئی نسخہ نہیں ہے صحیح نہیں ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے جس نسخے کی نشان دہی کی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ وہی ہو جو انڈیا آفس لندن میں ہے اور جس کی فوٹو سٹیٹ مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے کہ اس میں بھی آٹھ سو اکیانوے صفحات ہیں اور ہر صفحے میں پندرہ سطریں ہیں۔ ڈاکٹر اشپرنگر کے حوالے سے گارسیں دتاسی نے اس تذکرے کی جن کمزوریوں کا ذکر کیا ہے وہ بھی صحیح ہے۔ با ایں ہمہ جیسا کہ خود گارسیں نے لکھا ہے اس میں تاریخ ادب کے سلسلے کی بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں۔ یہاں میر تقی میر اور غالب کے ترجمے بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

میر : شاعرے است غرا۔ زاد بومش خطۂ اکبر آباد وے سرآمد شعرائے ہند است غلغلۂ سخن در چار دانگ ہندوستان جنت نشان انداختہ و کلامش مدارجے بہم رسانده چند دیوان و مثنویات و یک نسخۂ تذکرہ مختصر و قصائد و رباعیات و مخمس و مسدس و ہجو و مدح و دیگر تصانیف بےشمارہ ازو بروے کار آمدہ۔ در لکھنؤ بصیغۂ اوستادی در سرکار فیض آثار نواب وزیر الممالک آصف الدولہ یحییٰ خان بہادر ہزبر جنگ بمواجب

۱۔ خطبات گارسیں دتاسی، ص ۹۱، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۵ع۔

دو صد روپیہ شرف اختصاص دارد ۔ الیوم در نواح لکھنؤ، بعقل ناقص این بندہ ہم چو او عدیل شاعر زبردست و سیر مشق بسیار گو و خوش و شیرین بیان خوش زبان بر نہ خاستہ غرض کہ در تالیف فارسی و علی الخصوص در ریختہ گوئی بالکل لاثانی است ۔ بندہ چشم آشنا نیست الا سخن بہ آشنا ۔''

اسد : ''مرزا اسد اللہ خان غالب عرف مرزا نوشہ المتخاص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خان عرف مرزا دولہ نبیرۂ مرزا غلام حسین کمیدان ساکن بلدۂ اکبر آباد ۔ شاگرد مولوی معظم شاعر فارسی و ہندی است ازوست ۔''

اس کے بعد غالب کے دس اشعار بطورِ نمونۂ کلام دیے ہیں ۔ غالب کے سلسلے میں ذکا کا ترجمہ یوں بہت اہم ہے کہ اس میں کئی شعر ایسے ہیں جو غالب کے کسی متداول دیوان میں شامل نہیں ہیں ۔ مندرجہ ذیل تین شعر دیکھیے :

نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیر، چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقاء میرے بعد

یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ کے سوا کسی اور مروجہ دیوان میں موجود نہیں ہیں ۔ نسخۂ حمیدیہ کا مسودہ ۱۲۳۷ھ میں مکمل ہوا تھا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں اشعار ۱۲۳۷ھ سے پہلے کے ہیں جب کہ غالب کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی ۔ لیکن عیار الشعراء میں ذیل کے دو شعر ایسے ہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی نہیں ہیں :

صبا لگا وہ طمانچے طرف سے بلبل کے
کہ رُوے غنچۂ گل سُوے آشیاں پھر جائے

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں شعر عیار الشعراء میں محفوظ رہ کر ہم تک پہنچے ہیں ۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی[۱] اور مالک رام[۲] نے بعد کو انھیں اپنے مرتّبہ نسخوں میں شامل کر لیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ دیوانِ غالب اُردو نسخۂ عرشی ، ص ۳۹۵ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ، علی گڑھ ۱۹۵۸ع ۔

۲۔ دیوانِ غالب ، مرتّبہ مالک رام ، ص ۳۶۴ ، مطبوعہ آزاد کتاب گھر دلی ۱۹۶۰ع ، طبع دوم ۔

تذکرۂ عشقی

مصنف کا نام شیخ محمد وجیہہ الدین اور تخلص عشقی ہے۔ والد کا نام شیخ غلام حسین مجرم ہے اور آبائی وطن عظیم آباد تھا۔ مجرم فارسی کے ممتاز شاعر تھے اور فن تاریخ گوئی میں خاص مہارت رکھتے تھے اور عشقی کے بیان کے مطابق اس شغف کی وجہ سے آخر عمر میں انھوں نے اپنا ایک اور تخلص تقدیر بھی کر لیا تھا۔ فارسی میں صاحب دیوان تھے۔[1] والد کی طرح عشقی کا بھی فارسی ذوق بہت اچھا تھا۔ انھوں نے اپنے ترجمے میں لکھا ہے کہ ''بیشتر اوقات بہ تصنیف و تالیف نظم و نثر فارسی می پردازد و بشیوۂ طرزِ ریختہ اصلاً میلے و رغبتے نہ دارد''۔ کبھی کبھی دو چار شعر اُردو میں بھی کہہ لیتے تھے۔ اپنے انتخابِ کلام میں انھوں نے اُردو کے چھ اور فارسی کے چار شعر درج کیے ہیں۔[2] عشقی کا ذکر اکثر تذکروں میں آیا ہے۔

عشقی نے اپنا تذکرہ ۱۲۱۱ھ میں مکمل کیا تھا۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے اور ایک قاضی عبدالودود صاحب کے کتب خانے میں ہے۔ آکسفورڈ کے نسخے کے کچھ اوراق غائب ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے ان دونوں کی مدد سے اسے مرتّب کیا اور تذکرۂ شورش کے ساتھ بہ عنوان ''دو تذکرے'' اس کو دو جلدوں میں مختصر مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا۔ پہلی جلد ۱۹۵۹ء میں اور دوسری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ جلدیں دستیاب ہیں اور راقم الحروف کے پیش نظر ہیں۔

۱- ''دو تذکرے''، جلد دوم، ص ۲۶۸، مرتّبہ کلیم الدین احمد، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۳ء۔

۲- ایضاً، ص ۹۳۔

یہ تذکرہ بھی تذکرہ نگاری کی عام روایت کے مطابق فارسی میں ہے۔ سوانح شعرا کی صورت وہی ہے جو دوسرے تذکروں میں پائی جاتی ہے، کہیں تراجم بہت مختصر ہیں اور کہیں خاصے طویل۔ منتخبات کلام کی بھی یہی کیفیت ہے۔ پھر بھی تذکرۂ شورش کی بہ نسبت عشقی کے منتخبات مختصر ہیں۔

مطبوعہ نسخے کی پہلی جلد میں 'الف' سے 'س' تک اور دوسری جلد میں 'ش' سے 'ی' تک کے شعرا کے تراجم بلحاظ حروف تہجی شامل ہیں۔ بلحاظ فہرست شعرا کی تعداد ۳۴۹ ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا اور ولی دکنی کے تراجم بطورِ نمونہ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

انشا : ''انشا تخلص اسمش میر انشاء اللہ بن حکیم میر ماشاء اللہ مردیست خوش طبع و شیرین زبان و جوانے است ذہانت پیشہ فصیح بیان اصل بزرگانِ او نجف اشرف و ولادت گاہ او شہر مرشد آباد است۔ می گویند کہ اکثر فنونِ عربیہ کہ عبارت از علم صرف و نحو و معانی باشد دخل تمام پیدا کردہ و در السنۂ مختلفہ اشعار منظوم ساختہ۔ بالفعل در شہر لکھنؤ بہ رفاقتِ نواب سعادت علی خان خلفِ دوم وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر سعادت اندوز گردید بفراخی‌حال می گزارند این دو (۴۰) شعر از واردات طبع اوست۔'' (ص ۸، جلد اول)

ولی : ''ولی تخلص موسوم بہ شاہ ولی اللہ، از ریختہ گویان گجرات است گویند در عہدِ میمنت مہد خلافتِ اورنگ زیب عالم‌گیر بہ دارالسلطنت شاہجہان آباد آمدہ۔ از فیضانِ صحبت شاہ گلشن قدس سرہ، گلہائے سعادت چیدہ، بچاشنی فقر و تصوف آشنا گردیدہ معہذا شاعر مرقوم در طرزِ ریختہ زبانِ قدیم مہارت درست و قدرتِ معقولے داشت و در زمرۂ امثال و اقران عصر خویش رایت ناموری افراشت جمیع پیروانِ شیوۂ ریختہ او را اولین استاد می دانند و مروج این فن شریف می خوانند غرض کہ یادگار روزگار بود۔ خدایش بیامرزد ازو است۔''

(ص ۳۰۱، جلد دوم)

☆ ☆ ☆

گلشنِ ہند

نام میرزا علی خاں تخلص لطف ہے - مصنف نے تذکرے میں مختصراً اپنا حال لکھا ہے - لطف کے والد کا نام کاظم بیگ خان تھا ہجری تخلص کرتے تھے - نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور صفدر جنگ کے توسط سے شاہی دربار تک پہنچ گئے - لطف کی تعلیم و تربیت والد ہی کی عاطفت میں ہوئی - لطف فارسی اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے - ان کا بیان ہے کہ فارسی میں وہ اپنے والد کے شاگرد ہیں لیکن اُردو میں کسی سے اصلاح نہیں لی - مختلف تذکرہ نگاروں کے بیانات سے لطف کے بیان کی تائید نہیں ہوتی - گلشن بے خار مؤلفہ شیفتہ اور سخن شعرا مؤلفہ نساخ میں انھیں میر تقی میر کا اور تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں شرف الدین ملول کا شاگرد بتایا گیا ہے - ڈاکٹر خلیق انجم نے اُن کا ذکر سودا کے شاگردوں میں کیا ہے اور اپنی کتاب ''مرزا محمد رفیع سودا'' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ۱۹۶۶ع کے صفحہ ۹۵۰ پر اُن کے حالاتِ زندگی قدرے تفصیل سے لکھ دیے ہیں - لطف کا اصل وطن دلی تھا لیکن ان کا قیام حیدآباد ، لکھنؤ ، مرشد آباد اور عظیم آباد میں رہا ہے - ان کی پیدائش کا سال معلوم نہیں وفات کا سال ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ع ہے -

میرزا علی لطف کی دو کتابیں خصوصیت سے شہرت رکھتی ہیں - ایک ان کی مثنوی عشقیہ ، دوسرے یہی تذکرہ ''گلشن ہند'' جو اس وقت زیرِ بحث ہے -

مرزا علی لطف نے دیباچے میں خود واضح کر دیا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ع میں مکمل ہوا ہے لیکن قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ حصہٴ نظم میں بعد کو بھی اضافے ہوئے ہیں - اس تذکرے کو پہلے پہل عبداللہ خاں نے رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر حیدر آباد دکن سے ۱۹۰۶ع میں شائع کیا - اس میں مولانا شبلی کے حاشیائی نوٹ اور مولوی عبدالحق کا بسیط

مقدمہ شامل ہے ۔ بعد کو اس مطبوعہ نسخے کی لوح گلزار ابراہیم کے ساتھ شامل کر دی گئی ، گویا ''گلزار ابراہیم'' کے ساتھ ۱۹۳۴ع میں انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام گلشن ہند دوبارہ شائع کیا گیا ۔ یہی نسخہ عام طور پر دستیاب ہے اور یہی اس وقت میرے پیشِ نظر ہے ۔

''گلشن ہند'' کے متعدد مخطوطے دستیاب ہیں ۔ تنہا انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں چار مخطوطے محفوظ ہیں ۔ مخطوطات کے مرتبین نے چاروں کا تفصیلی تعارف شائع کر دیا ہے ۔[1]

گلشن ہند اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے جو اُردو زبان میں لکھا گیا ہے ۔ گلدستۂ حیدری بھی اس کے ساتھ کی تصنیف ہے ۔ گلشن ہند طبع زاد تذکرہ نہیں بلکہ گلزار ابراہیم مؤلفہ علی ابراہیم خلیل کا ترجمہ ہے ۔ یہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش پر لکھا گیا ہے ۔ گلزار ابراہیم میں ۳۲۰ شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ میرزا علی لطف نے بقول عرشی صاحب گلزار ابراہیم کے ۶۸ شاعروں کے حالات کا ترجمہ مع اضافات کیا ہے ۔ یوں مطبوعہ نسخے میں ۶۸ نہیں بلکہ ۶۹ شاعروں کے تراجم شامل ہیں ۔[2]

جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے ''گلشن ہند'' کی نوعیت محض ترجمے کی نہیں ہے ۔ مولوی عبدالحق صاحب نے گلشن ہند کے مقدمے میں لکھا ہے کہ :

> ''یہ نرا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت اضافہ کیا ہے ۔ حالات میں بھی ، کلام میں بھی جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت اختیار کر لی ہے ۔''

یہ تذکرہ میر امن کی باغ و بہار سے بھی کچھ پہلے لکھا گیا ہے ۔ گویا اس زمانے کی تصنیف ہے جب کہ ادب سے متعلق اُردو نثر کا کوئی نمونہ یا معیار موجود نہ تھا ۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ قدیم نثر اُردو کا ایک قیمتی سرمایہ ہے ۔ مولوی عبدالحق صاحب کے لفظوں میں :

''اس کے ذریعے محقق علم اللسان کو اور ان لوگوں کو جنھیں زبان کا

۱۔ دیکھیے مخطوطات انجمن ترقی اُردو (اُردو) ، جلد اول ، ص ۱۲۳ تا ۱۳۰ ، مرتبہ افسر صدیقی ، و سید سرفراز علی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۶۵ع ۔

۲۔ گلشن ہند ، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۰۶ع ۔

چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں ۔ مثلاً دکن کی زبان میں بعض الفاظ روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں مثلاً ''کر کے'' کا خاص استعمال جو یہاں روز سننے میں آتا ہے اس تذکرے میں بھی پایا جاتا ہے ۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :

شورش تخلص متوطن عظیم آباد کے مشہور میر بہنیا کر کے تھے ۔

فعل کے بعض استعمال بھی بعض وقت بالکل ایسے ہیں جو حیدر آباد میں اکثر سنتے ہیں مثلاً فعل متعدی میں فعل بلحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے ، دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں ۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے :

دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت وہیں ٹھہرائے ۔''

زبان کی طرح شعرا کے سوانح اور تاریخی حالات کے متعلق بھی اس تذکرے سے بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ انکشاف کہ ''میر تقی میر فورٹ ولیم کالج میں بغرض تالیف و تصنیف برائے ملازمت کرنیل اسکاٹ کے روبرو پیش ہوئے لیکن پیرانہ سالی کے سبب وہ منتخب نہ ہو سکے'' اول اول اسی تذکرے سے ہوا ہے ۔ اسی طرح شاہ عالم آفتاب ، ابوالحسن تانا شاہ ، آصف الدولہ ، امیر خاں انجام ، قزلباش خاں امید اور سراج الدین علی خاں آرزو کے حالات مرزا علی لطف نے بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اور اس تفصیل میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو اس سے پہلے کے تذکروں میں نہیں ہیں ۔[۱] شعرا کی تاریخ پیدائش ، تاریخ وفات ، سکونت ، آبائی وطن اور تلمذ و استاذی کی نشاندہی بھی اس تذکرے میں اکثر جگہ کی گئی ہے ۔

تذکرہ شاہ عالم آفتاب کے ذکر سے شروع ہو کر مصطفیٰ خاں یکرنگ کے ذکر پر ختم ہوتا ہے ۔ بطورِ نمونہ یکرنگ اور حاتم کے ترجمے اس جگہ درج کیے

۱۔ مقدمۂ گلشن ہند ، از مولوی عبدالحق ، مطبوعہ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ع ۔

جاتے ہیں :

یکرنگ : یکرنگ تخلص مصطفیٰ قلی خاں نام ، متوطن شاہجہان آباد کے ، نواسوں میں خان جہان خان لودی کے اور معاصر شاہ نجم الدین آبرو کے تھے ۔ منصب داروں میں محمد شاہ بادشاہ اور شہرۂ آفاق ساتھ عزت و ماہ (جاہ) کے ۔ مشہور سخنوروں میں شاہجہان آباد کے اور معروف زبان آوروں میں اس خجستہ بنیاد کے تھے ۔ طور ان کی گویائی کا پیرو قدما کی گفتگو کے ہے اور طرز ان کے کلام کی روپے پر مضمون و آبرو کی ہے لیکن از بسکہ شیوۂ سابق یارانِ حال کے غیر مرغوب ہے تو آہنگ قدیم سمع خراش و دماغ کوب ہے بلدۂ شاہجہان آباد میں انھوں نے اس سرائے فانی سے سفر کیا اور دلوں پر احباب کے داغ حرمان کا دے دیا اشعار پُر معنی و خوش بیان ان کے منتخبِ دیوان ہیں ۔"[1]

حاتم : حاتم تخلص شاہجہاں بادی مشہور ریختہ گویوں میں سے دلی کے تھا ، ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور مرزا رفیع سودا کا ۔ شاعر خوش بیان تھا ، صاحبِ دیوان تھا ۔ ایک دیوان میں نہایت خرچ ابہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے ، جامع ہے طرز متاخرین اور طرز ابہام کا ۔"[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ گلشن ہند ، ص ۱۹۵ ، مرتبہ مولوی عبدالحق مطبوعہ رفاہ عام سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ع ۔

۲۔ گلشنِ ہند ، ص ۸۱ ، مطبوعہ رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ع ۔

عمدۂ منتخبہ

خود مصنف کے بیان کے مطابق ان کا اصل نام میر محمد خاں تخلص سرور اور اعظم الدولہ خطاب تھا ۔ غالب ، مومن ، ذوق اور شیفتہ کے معاصرین میں تھے اور شیفتہ سے ان کے گہرے مراسم تھے ۔ سرور کے باپ کا نام نواب ابو القاسم مظفر خاں تھا ۔ سرور نے اپنا ذکر ''عمدۂ منتخبہ'' میں دو جگہ کیا ہے ۔ ایک دیباچے میں دوسرے شعرا کے ضمن میں ۔ دونوں جگہ اختصار و انکسار سے کام لیا ہے اور اپنا احوال کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن دوسرے تذکروں کے تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور ایک بلند پایہ شاعر ، ادیب اور علم دوست شخص تھے ۔ گارسیں دتاسی ، قدرت اللہ قاسم ، کریم الدین شیفتہ اور جیسا کہ فرہنگ سخنوراں سے معلوم ہوگا ، بعد کے دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر اہتمام کے ساتھ کیا ہے ۔ ان تذکرہ نگاروں کے بیانات کی روشنی میں سرور کی وفات کا سال ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ع قرار پاتا ہے ۔ شیفتہ اور کریم الدین سرور کے معاصر تھے ، دونوں نے ۱۲۵۰ھ ہی بتایا ہے ۔ نساخ کے ''سخنِ شعرا'' اور صفا کے ''شمیم سخن'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔

سرور کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں دو کاموں کی وجہ سے زندہ ہے ۔ ایک یہی زیرِ بحث تذکرہ دوسرے مثنوی ''سبعہ سیارہ'' ۔ سبعہ سیارہ کا ذکر یوں تو اکثر تذکروں اور تاریخ و تنقید کی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اس کا تفصیلی تعارف مولانا حامد حسن قادری مرحوم کے ہاتھوں منظر عام پر آیا ۔ سبعہ سیارہ میں مثنوی کی سات مشہور بحروں میں سات مثنویاں شامل ہیں ۔ اس میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کا قطعۂ تاریخ بھی ہے جس کا آخری مصرع یہ ہے : ع

بگو تاریخ ہم ''دریائے اعظم''

''دریائے اعظم'' سے سبعہ سیارہ کا سالِ تصنیف ۱۲۳۶ھ نکلتا ہے ۔ اس کے

دیباچے میں سرور نے لکھا ہے کہ اس سے پہلے وہ ایک دیوان اور ریختہ گو شعرا کا ایک تذکرہ مکمل کر چکے تھے -

صاحب آبِ حیات کا بیان ہے کہ سرور کے تذکرے کی تاریخ شیخ محمد ابراہیم ذوق نے "دریائے اعظم" سے ۱۲۳۶ھ نکالی تھی - آزاد کا بیان صحیح نہیں ہے - یہ تاریخ تذکرے کی نہیں "سبعہ سیارہ" کی ہے اور سبعہ سیارہ کا دیباچہ ظاہر کرتا ہے کہ تذکرہ اس سے پہلے مرتّب ہو چکا تھا - اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عمدۂ منتخبہ ۱۲۳۶ھ سے قبل لکھا گیا ہے - تذکرے کے آخر میں سید غالب علی خاں سید ، رضی خاں بہادر رضی ، ثناء اللہ خاں فراق ، سید نظام الدین خاں ممنون ، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان ، میر قدرت اللہ خاں قاسم ، میاں محمد نصیر ، بھولا ناتھ عاشق ، نواب غلام حسین خاں حسین اور قلندر بخش آفرین کے جو قطعات تاریخ دیے ہوئے ہیں[1] ان سے بھی عمدۂ منتخبہ کا سال تصنیف ۱۲۳۶ھ سے قبل ثابت ہوتا ہے - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے مختلف شعرا کے تراجم ، قلمی نسخے کے ترقیموں اور مختلف اعداد کے قطعات کی روشنی میں ۱۲۱۵-۱۶ھ مطابق ۱۸۰۰-۱ع کو عمدۂ منتخبہ کا سال آغاز اور ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ع کو سالِ اختتام قرار دیا ہے -[2] لیکن مخطوطات انجمن ترقی اُردو کے مرتبین افسر صدیقی اور سرفراز رضوی کا خیال ہے کہ اس میں ۱۲۲۴ھ کے سات آٹھ سال بعد تک اضافے ہوتے رہے ہیں -[3] یہ بات میر شمس الدین فقیر اور مرزا نوشہ غالب کے ترجموں کی روشنی میں کہی گئی ہے اور درست ہے اس لیے کہ اس کی تصدیق بعض دوسرے تراجم سے بھی ہوتی ہے - مثلاً شیخ پیر بخش سرور کے ترجمے میں اکبر شاہ ثانی کے ۲۳ ویں جلوس شاہی کا ذکر ہے - اکبر شاہ ثانی ۱۲۲۱ھ میں شاہ عالم کے بعد تخت نشین

۱- عمدۂ منتخبہ ، ص ۸۳۱ تا ۸۳۵ ، مرتّبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، مطبوعہ دلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ع -

۲- مقدمۂ عمدۂ منتخبہ ، مرتّبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، مطبوعہ دلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ع -

۳- مخطوطات انجمن ترقی اُردو (اُردو) ، جلد اول ، ص ۱۳۸ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی ۱۹۶۵ع -

ہوئے تھے اس لحاظ سے پیر بخش سرور کا ترجمہ ۱۲۴۳ھ کے بعد لکھا جانا چاہیے۔ لیکن چوں کہ "عمدۂ منتخبہ" کے بیشتر دستیاب قلمی نسخوں میں مسودے کی صفائی کی تاریخ ۱۲۲۴ھ دی ہوئی ہے اس لیے اسی کو سالِ تکملہ سمجھنا چاہیے۔ باقی تاریخیں ان معمولی اضافوں اور ترمیموں سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ مصنف اپنی وفات ۱۲۵۰ھ سے قبل تک کرتا رہا ہے۔ ۱۲۱۶ھ کو سالِ آغاز یوں ماننا پڑتا ہے کہ سید غالب علی خاں کے قطعۂ تاریخ کے آخر میں یہ شعر ہے:

عمدۂ منتخبہ اس کی وہیں سید نے
لکھی تاریخ وہی نام بھی اس کا رکھا

"عمدۂ منتخبہ" سے ۱۲۱۶ھ برآمد ہوتے ہیں اور اعظم الدولہ نے اسی سے اپنے تذکرے کو موسوم کرنا پسند کیا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے "عمدۂ منتخبہ" مطبوعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ممنون کے "قطعہ تاریخ" کے مطابق تذکرے کا آغاز مواد فراہم کرنے کی حیثیت سے ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔ تحریر کی ابتدا ۱۲۱۶ھ سے ہوئی اور ابتدائے ۱۲۲۴ھ میں کتابی شکل اختیار کر لی۔[1] اضافے آخر دم تک ہوتے رہے۔ عمدۂ منتخبہ کے عہد تالیف کے سلسلے میں ضمیر نیازی کا مضمون مطبوعہ قومی زبان کراچی، بابت اکتوبر ۱۹۶۹ع بھی نظر سے گزرا۔ ان کے نتائج مذکورہ بالا بحث سے مختلف نہیں ہیں۔

عمدۂ منتخبہ کے چار قلمی نسخوں کا سراغ اب تک ملا ہے۔ ایک پیرس کے کتب خانے میں ہے۔ بقول خواجہ احمد فاروقی اس کا کاتب کم سواد ہے۔ اس نے جا بجا غلطیاں کی ہیں۔ اس کے خاتمے پر لکھا ہے:

"تمت، تمام شد تذکرۃ الشعراء تالیف نواب اعظم الدولہ بہادر بتاریخ نہم ماہ جنوری ۱۸۴۹ع"۔ لیکن اس کے بعد وہ عبارت بھی مع تاریخ لکھ دی ہے جو لندن کے قلمی نسخے کے آخر میں بطور ترقیمہ ملتی ہے یعنی ۱۲۲۴ھ نہم محرم کا ذکر اس میں بھی ہے۔

دوسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے اور اس کے آخر میں یہ

۱۔ اشتر و سوزن، (ص ۱۵-۱۶)، مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی ۱۹۶۴ع۔

عبارت ملتی ہے :

''الحمد للہ کہ بہ فضلِ ایزدِ متعال نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ھ . . . صورت اختتام پذیرفت ۔''

عمدۂ منتخبہ کا تیسرا نسخہ انجمن ترقیِ اُردو کراچی میں ہے ۔ اس کا بھی سنِ کتابت ۱۲۲۴ھ ہے ۔ مخطوطات انجمن ترقیِ اُردو کراچی کے مرتبین نے اس کے تعارف میں بتایا ہے کہ لندن کا نسخہ اسی کی نقل ہے جس میں بعد میں بہت سے اضافے کیے گئے ۔[1] قاضی عبدالودود صاحب نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے ۔[2]

چوتھا نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے ۔ اس تذکرے کے متعلق گمان کیا جاتا ہے کہ یہ سرور کا اصلاح شدہ ہے ۔[3]

''عمدۂ منتخبہ'' پہلے پہل مارچ ۱۹۶۱ع میں شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا ۔ اسے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے لندن کے نسخے کو سامنے رکھ کر مرتّب کیا ہے اور اس پر ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے ۔ اس میں پیرس کے نسخے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۔ لیکن انجمن ترقی اُردو کراچی اور نیشنل میوزیم کراچی کے مخطوطے ڈاکٹر فاروقی کی نظر سے نہیں گزرے ۔ یہی مطبوعہ نسخہ دستیاب ہے ۔

قاضی عبدالودود صاحب اور فائق رامپوری نے اس مطبوعہ نسخے پر معرکہ آرا تبصرے کیے ہیں اور اس کے متن و حواشی کی سیکڑوں غلطیوں کی نشان دہی کی ہے ۔ قاضی صاحب کا ساٹھ صفحات کا یہ طویل تبصرہ اُن کی کتاب ''اشتر و سوزن'' میں شامل ہے اور فائق رامپوری کا تبصرہ جولائی ۱۹۶۳ع کے صحیفہ میں شائع ہوا ہے ۔

۱۔ مخطوطات انجمن ترقی اُردو (اُردو) ، جلد اول ، ص ۱۳۶ تا ۱۳۷ ۔

۲۔ اشتر و سوزن ، ص ۱۲ ، مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی ، سلسلۂ مطبوعات تحقیقات نمبر ۷ ، ۱۹۶۴ع ۔

۳۔ صحیفہ لاہور ، ص ۶۲ ، بابت جولائی ۱۹۶۳ع ، مضمون کلب علی خاں فائق رامپوری ۔

یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۹۹۶ شاعروں کا ذکر کیا ہے - قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے کہ صحیح تعداد ۱۰۰۵ ہے -[۱] خواجہ احمد فاروقی صاحب کے پاس چوں کہ مخطوطے کی صاف نقل نہیں تھی ، اس لیے وہ اسے اکثر جگہ پڑھ نہ سکے اور خالی جگہ چھوڑ دی - چنانچہ اس میں متعدد شعرا کے تخلص چھوٹ گئے ہیں - قاضی صاحب نے ان سب کی نشان دہی کی ہے - ان میں قدما سے لے کر معاصرین تک سبھی شامل ہیں - زبان سادہ و صاف ہے - یہاں بھی سوانح سے زیادہ انتخابِ اشعار پر زور دیا گیا ہے - بعض شعرا کے کئی کئی سو اشعار دیے گئے ہیں - مثلاً مصحفی کے ۷۱۹ میر کے ۴۷۹ اور احسان دہلوی کے ۳۸۷ اشعار درج ہیں - قاضی ودود نے بہت سے شعرا کے اشعار کی تعداد اپنے تبصرے میں گنوا دی ہے -[۲] تاریخی اور تنقیدی اشارے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں - لیکن بہ حیثیت مجموعی اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو پچھلے تذکروں سے مختلف ہو - سوائے اس کے کہ بعض معاصرین کے سلسلے میں سرور کے بیانات زیادہ قابلِ اعتماد ہیں اور ان سے کچھ باتیں نئی معلوم ہو جاتی ہیں - بعض ایسے شعرا کا ذکر بھی اس میں مل جاتا ہے جو اس سے پہلے کے تذکروں میں مذکور نہیں ہیں - انتخاب کلام میں غزل کے اشعار کے ساتھ ساتھ بعض شعرا کے ضمن میں دوسرے اصنافِ سخن کے منتخبات بھی دیے گئے ہیں - سرور کے تذکرے سے بعد کے تذکرہ نگاروں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے - معاصر تذکروں میں گلشنِ بے خار مؤلفہ شیفتہ اور مجموعہ نغز مؤلفہ قدرت اللہ قاسم بھی اس سے مستفید ہیں - اشپرنگر نے عمدۂ منتخبہ کو ذکا کے تذکرے ''عیار الشعراء'' سے ماخوذ بتایا ہے لیکن تقابلی مطالعے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی - سرور کا تذکرہ بلحاظ مواد و طرزِ تحریر ، ذکا کے تذکرے سے بہت مختلف ہے - یہ ضرور ہے کہ سرور ذکا کے تذکرہ سے مطلع تھے ، اس لیے کہ عمدۂ منتخبہ میں ذکا کا ذکر اس طور پر موجود ہے :

''ذکا تخلص خوب چند نام ، قوم کایت ، شاگرد میاں نصیر - جوانے

۱- اشتر و سوزن ، ص ۳۰ -

۲- ایضاً ص ۳ -

سلیم الطبع مزاجش بہ صلاحیت راغب ۔ کلامش تمکین از چندے طبعش از گفتن شعر انحراف ورزیدہ مشارۂ الیہ ہم تذکرۃ الشعرا تالیف کردہ در علم اخلاص و دوستی راسخ دریافت گردیدہ ۔''[1]

"عمدۂ منتخبہ'' میں چوں کہ شعرا کے منتخبات خاصے طویل ہیں اس لیے اس سے ایک فائدہ یہ پہنچتا ہے کہ بعض شعرا کے بعض ایسے اشعار ہمارے سامنے آ جاتے ہیں جو ان کے کلیات یا دواوین میں نظر نہیں آتے ۔ اس کی اہم مثال مرزا نوشہ غالب کا ترجمہ ہے ۔ اس ترجمے کے آخر میں سرور نے غالب کے ۵۴ اشعار نقل کیے ہیں ۔[2] ان میں بعض اشعار ایسے ہیں جو نسخۂ عرشی اور مالک رام کے سوا غالب کے کسی متداول دیوان حتٰی کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی نہیں ہیں اور صرف عمدۂ منتخبہ کے ذریعے ہمارے سامنے آئے ہیں ۔[3]

تذکرے کے شعرا کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی ہے لیکن مطبوعہ نسخے میں باقاعدہ ترتیب نہیں ہے ۔ شوق تخلص کے ۱۱ شاعر ہیں ان کا ذکر ایک جگہ لگاتار نہیں ، مختلف جگہوں پر آیا ہے ۔ آفتاب کے ترجمے سے تذکرے کا آغاز ہوتا ہے اور یکرنگ کے ترجمے پر انجام کو پہنچتا ہے ۔ بطور نمونہ اس جگہ مرزا نوشہ غالب اور جعفر علی حسرت کے تراجم نقل کیے جاتے ہیں ۔

حسرت: ''حسرت تخلص میاں جعفر بزرگانش پیشۂ عطاری اختیار کردہ بودند ۔ در اطراف مشرق بہ شعر گوئی علم استادی می افراشت و شاگرد بسیار بہم رسانیدہ و در سرکار مرشد زادۂ عالم و عالمیان مرزا جہان دار شاہ مرحوم در سلکِ ملازمان با امتیاز منسلک بودہ بعد چندے بہ ہدایت درویشے کامل ترک لباس ظاہری ساختہ در گوشۂ عزلت منزوی گشت

۱۔ عمدۂ منتخبہ ، ص ۳۰۵ ۔

۲۔ عمدۂ منتخبہ ، ص ۱۱۶ تا ۱۲۰ ۔

۳۔ مفصل بحث کے لیے دیکھیے :

(۱) راقم الحروف کا مضمون ''غالب کے اولیں تعارف نگار'' ۔ مطبوعہ رسالہ اُردو کراچی ، غالب نمبر ، حصہ اول ۱۹۶۹ع ۔

(۲) راقم الحروف کی کتاب ''غالب شاعرِ امروز و فردا'' ، ص ۱ تا ۳۳ مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۶۹ع ۔

صاحبِ تصانیف شاگرد سرپ سنگھ (کذا) دیوانہ۔"[1]

اسد : "اسد تخلص اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد جوان قابل و یارباش و درد مند ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن غم ہاے عشق مجاز، تربیت یافتۂ غم کدۂ نیاز، در فن سخن سنجی منبعِ محاورات میرزا عبد القادر بیدل علیہ الرحمۃ و ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرزِ خود ست و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ بہ مضامین نازک موزون گشتہ روبۂ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد۔ از نتائجِ طبعِ اوست۔"[2]

ضرورت اس بات کی ہے کہ "عمدۂ منتخبہ" کو از سرِ نو ترتیب دے کر شائع کیا جائے۔ یہ کام سارے دستیاب نسخوں کے متنوں کو سامنے رکھ کر کیا جانا چاہیے۔ انجمن ترقی آردو کراچی اور نیشنل میوزیم کے نسخوں کو خاص طور پر سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ کئی وجوہ سے یہ نسخے لندن اور پیرس کے نسخوں سے اہم ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مرتبہ مطبوعہ نسخے پر جو تبصرے ہوئے ہیں وہ بھی اس سلسلے میں حد درجہ مفید و معاون ثابت ہوں گے۔ خصوصاً قاضی عبدالودود[3] اور کلب علی خان فائق رامپوری[4] کے تبصرے ایسے ہیں جنھیں نظر انداز کر کے عمدۂ منتخبہ کے بارے میں رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

☆ ☆ ☆

۱۔ عمدۂ منتخبہ مطبوعہ، ص ۲۲۲۔

۲۔ ایضاً مطبوعہ، ص ۱۱٦۔

۳۔ اشتر و سوزن، ص ۱ تا ٦۰۔

۴۔ "صحیفہ" لاہور، ص ٦۱ تا ٦۵ جولائی ۱۹٦۳ع۔

تذکرۂ حیدری

یا

گلشنِ ہند

پورا نام سید حیدر بخش ہے ، حیدری تخلص کرتے تھے ، دلی کے رہنے والے تھے ۔ ان کا شمار اُردو کے ممتاز نثر نگاروں میں ہوتا ہے ۔ طبقات الشعراء مؤلفہ کریم الدین ، سخن شعرا مؤلفہ نساخ ، یادگار شعرا مترجمہ طفیل احمد اور ریاض الوفاق مؤلفہ ذوالفقار علی مست وغیرہ میں ان کے مختصر حالات زندگی ملتے ہیں ۔ مولانا حامد حسن قادری[۱]، سید محمد ایم ۔ اے[۲] ، محمد عتیق صدیقی[۳] ، ڈاکٹر عبادت بریلوی[۴] ، ڈاکٹر اقتدا حسن[۵] اور ڈاکٹر مختار الدین احمد[۶] وغیرہ نے تذکروں سے استفادہ کرکے حیدری کے حالاتِ زندگی تفصیل سے لکھ دیے ہیں ۔ حیدری ، فورٹ ولیم کالج میں منشی کی حیثیت سے ملازم تھے ۔ ان کی متعدد کتابیں یادگار ہیں ۔ ان میں قصۂ مہر و ماہ ، قصۂ لیلیٰ مجنوں ، طوطا کہانی ، آرایش محفل ، ہفت پیکر ، گلِ مغفرت اور گلدستۂ حیدری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ۔

آخر الذکر کتاب ''گلدستۂ حیدری'' میں حیدری کی متفرق نثری تحریرات

۱۔ داستان تاریخ اُردو ، مطبوعہ لکشمی نرائن اگروال ، آگرہ ۱۹۵۷ع ۔

۲۔ ''ارباب نثر اُردو'' ، مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ ، حیدر آباد دکن ۱۹۳۷ع ۔

۳۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ، علی گڑھ ۱۹۶۰ع ۔

۴۔ مقدمہ ''مختصر کہانیاں'' مطبوعہ اُردو دنیا کراچی ۔

۵۔ رسالہ اُردو کراچی ، ص ۶۷ تا ۷۸ ، بابت جولائی ۱۹۶۶ع ۔

۶۔ تذکرۂ حیدری (گلشن ہند) ، ص ۱۱ تا ۲۰ ، مطبوعہ علمی مجلس دلی ۱۹۶۷ع ۔

اور منظومات شامل ہیں ، اس کے ایک حصے کا نام ''گلشن ہند'' ہے ۔ یہ حصہ شعرائے اُردو کے تذکرے پر مشتمل ہے اور اسی حصے کو تذکرۂ حیدری یا گلشن ہند کہا جاتا ہے ۔

''گلدستۂ حیدری'' جس کا ایک جزو ''گلشن ہند'' تذکرۂ شعرائے اُردو کے نام سے الگ شائع ہو چکا ہے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا ہے ۔ تذکرے کے آخر میں حیدری نے جو قطعہ تاریخ دیا ہے اس سے بھی یہی سال نکلتا ہے ۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے لکھا ہے کہ اس تذکرے کی ترتیب حیدری نے ۱۲۱۴ھ میں شروع کی اور راقم کے خیال کے مطابق کم از کم ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء تک وہ اس پر نظر ثانی کرتے رہے ۔

پہلی بار یہ تذکرہ ''گلدستۂ حیدری'' کے ساتھ شائع ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے چار نسخوں کا سراغ دیا ہے[1] اور اس کی اولیں طباعت کا زمانہ اگست ۱۸۰۲ء سے قبل بتایا ہے ۔ ''گلدستۂ حیدری'' کا چوں کہ کوئی نسخہ پاک و ہند میں محفوظ نہ تھا اس لیے ایک مدت تک اُردو کے محققین و ناقدین اس سے بے خبر رہے ۔ آخرکار اُردو کے مایۂ ناز ادیب و محقق ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اسے ڈھونڈ نکالا اور ''گلشن ہند'' یعنی تذکرۂ شعرائے اُردو کے حصے کو الگ کتابی صورت میں اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں شائع کر دیا ۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کاوش پہلے علی گڑھ کے رسالۂ اُردو ادب کے ذریعے منظر عام پر آئی ، پھر اسی کو علمی مجلس دلی کے زیر اہتمام کتاب کی صورت میں منتقل کر دیا گیا ۔[2]

شعرائے اُردو کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو فارسی کے بجائے اُردو میں لکھا گیا ہے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس تذکرے کا نام بھی ''گلشن ہند'' ہے ۔ اسی نام کا

۱۔ پہلا انڈین انسٹی ٹیوٹ (اُردو) باڈلین لائبریری میں ہے ۔ پہلے یہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ میں تھا ۔ دوسرا برٹش میوزیم لندن میں ہے ، تیسرا نسخہ گارسیں دتاسی کے پاس تھا ، چوتھا نسخہ کھنبایت کے ایک ذاتی کتب خانے میں موجود ہے ۔

۲۔ ملاحظہ ہو ''گلشن ہند'' ، از حیدر بخش حیدری ، مرتّبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو ، مطبوعہ علمی مجلس دلی ، اشاعت اول ، فروری ۱۹۶۷ء ۔

ایک تذکرہ مرزا علی لطف نے ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ع میں مکمل کیا تھا اور اسی کو اب تک اُردو زبان میں شعرائے اُردو کا پہلا تذکرہ خیال کیا جاتا تھا۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ در اصل گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہے اگرچہ انھوں نے اپنی طرف سے بھی اس میں اضافے کیے ہیں۔ یہ پہلی بار ۱۹۰۶ع میں شائع ہوا ہے۔ گلدستۂ حیدری کے تکملہ کا سال ۱۸۰۲ع/۱۲۱۷ھ اور طباعت کا زمانہ اگست ۱۸۰۳ع سے پہلے کا ہے۔ اس لحاظ سے اُردو زبان میں شعرائے ریختہ کا پہلا تذکرہ گلشن ہند مؤلفہ مرزا علی لطف نہیں بلکہ ''گلشن ہند'' مؤلفہ حیدری قرار پاتا ہے۔

اصل تذکرے سے پہلے حیدری نے ایک صفحے کی مختصر تمہید لکھی ہے۔ اس کا پہلا پیرا گراف حمد و منقبت ہے۔ دوسرا اور آخری پیرا گراف سبب تالیف کے طور پر حسبِ ذیل ہے:

''بعد اس کے صاحبان طبیعت پر معلوم ہو کہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری خلف سید ابوالحسن نجفی ساکن دلی شاگرد قبلۂ کونین مولوی غلام حسین غازی پوری تعلیم یافتہ مجلس نواب ابراہیم علی خان بہادر مرحوم سن بارہ سو چودہ ہجری میں اکیسوین رجب کو تری کی، راہ بنارس سے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ بعد قطع منزل غازی پور کے قریب پہنچا۔ وہاں مرزا محمد علی، مرزا محمد فاضل کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے وہ بھی ایک کشتی میں سوار ہوئے اس سمت کو آتے تھے۔ ملاقات ہوئی، صاحب سلامت پیدا کی یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کے پاس جا بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں ان کی سیر کرو اور اچھے اشعار ان میں سے انتخاب کر کے ایک نسخہ بطور تذکرے کے ترتیب دو جو تمھاری یادگاری رہے۔ اگرچہ طبیعت اس فقیر کی صعوبات سفر اور تکالیفِ زمانہ سے ہر آن مشوش رہتی تھی، لیکن ان کی خاطر ازبس کہ عزیز تھی۔ وے دیوان دیکھے، موافق اپنے حوصلے کے اشعار چنے اور نام ان کے مصنفوں کے بقدر تحقیقات کے احاطۂ تحریر میں لا کر اس تذکرے کا نام گلشن ہند رکھا۔ اب التماس صاحبانِ سخن اور نقادانِ عالی طبع سے یہ ہے کہ سیر کے وقت اگر غلطی عبارت یا نامربوطی محاورہ نظر سے گزرے تو لطف و

مہربانی سے اصلاح فرمائیں اور ذیلِ عنایت سے چھپائیں - جو یہ نہ ہو سکے تو جی ہی میں رکھیں ، ظاہر نہ کریں - المسئول من اللہ حسن القبول -"

حیدری نے تذکرے کی ترتیب و تکمیل کے سلسلے میں دیباچے میں محنت کشی کے جو دعوے کیے ہیں ڈاکٹر اقتدا حسن اس سے اتفاق نہیں کرتے - انھوں نے تذکرۂ حیدری اور گلزار ابراہیم کے تراجم کا باہم مقابلہ کر کے یہ بتایا ہے کہ حیدری کا تذکرہ در اصل گلزار ابراہیم سے ماخوذ ہے -[1] دونوں تذکروں کے اک ساتھ مطالعے کے بعد ڈاکٹر اقتدا حسن کے خیال سے متفق ہونا پڑتا ہے - اس میں ۲۸۹ شعرا کا ذکر بلحاظ حروف تہجی کیا گیا ہے - تذکرہ نگاری کی روش عام کے مطابق اس میں بھی حالاتِ زندگی بہت مختصر ہیں - زیادہ تر ہر شاعر کے متعلق ایک یا نصف سطر لکھی گئی ہے - یعنی صرف نام اور تخلص دیا گیا ہے - تین سطروں سے زیادہ کی کوئی عبارت اس تذکرے میں نہیں ہے - اشعار کے انتخاب کا بھی یہی حال ہے - صرف ایک ایک دو دو شعر بطورِ نمونہ دیے گئے ہیں - ایسی صورت میں اس تذکرے کی حیثیت محض تاریخی ہو جاتی ہے ، سوانحی اور تنقیدی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے - صرف یہ کہ اس تذکرے کے ذریعے بہت سے شعرا کے صحیح نام ، تخلص ، ولدیت ، سکونت اور تلمذ و استادی کا سراغ مل جاتا ہے - تذکرے کا مؤلف چوں کہ اپنے زمانے کا ممتاز نثر نگار ہے اور معاصر شعرا و ادبا سے اس کے ذاتی تعلقات تھے اس لیے اس کے دیے ہوئے حالاتِ زندگی مختصر ترین سہی بہر حال قابلِ اعتماد ہیں -

تذکرہ "آفتاب" کے ذکر سے شروع ہو کر "یار" کے ذکر پر ختم ہوتا ہے - دونوں کے تراجم بطور نمونہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

(۱) آفتاب تخلص ، مہر سپہرِ جہان بانی ، شاہ عالم بادشاہ ابن عالم گیر ثانی - بیالیس برس سے تا حال سن بارہ سو چودہ ہجری اوپر سریر سلطنت کے مانند مہر سپہر کے جلوہ گر ہیں اور آفتاب تخلص رکھتے

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے رسالہ اُردو کراچی ، ص ٦٧ - ٧٨ ، بابت جولائی ١٩٦٦ع -

ہیں ، یہ تصنیف خاص ہے :

صبح تو جام سے گزرتی ہے
شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے (ص ۲۲)

(۲) یار تخلص ، نام میر احمد شاہ ، اللہ یار کے بیٹے - جوان حسین و رعنا - میر تقی میر کے شاگرد تھے شعر اچھا کہتے تھے - یہ ان سے ہے :

آفریں اے دست گستاخِ محبت آفرین
یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا (ص ۳۰۲)

سوانح اور انتخاب کلام کی یہی کیفیت ہر جگہ ہے حتیٰ کہ حیدری نے خود اپنا تذکرہ صرف ایک سطر میں اس طور پر کیا ہے :

"حیدری تخلص ، نام سید حیدر بخش ، شاہجہان آبادی - یہ غزل اس فقیر کی ہے اور قطعہ بھی اسی کا ہے ۔" (ص ۵۱)

☆ ☆ ☆

مجمع الانتخاب

مجمع الانتخاب کے مصنف کا پورا نام شاہ محمد کمال ہے - کمال تخلص کرتے ہیں - آبائی وطن کڑا مانک پور تھا - شاعری میں قائم کے شاگرد تھے - ان کے والد قادر نواز خاں عہد مغلیہ میں صاحب منصب و جاگیردار تھے - عہد محمد شاہی میں بنگال گئے اور نواب بنگال کے ملازم ہو گئے - آخرکار دہلی آئے اور شاہ محمد تقی جیلانی کے مرید و خلیفہ ہوئے - اس کے بعد ترک دنیا کرکے عظیم آباد کے قریب ایک ویرانے کو محی الدین پور کے نام سے آباد کیا اور وہیں سپردِ خاک ہوئے - اس وقت شاہ کمال کی عمر چودہ سال تھی - سیاحت کے شوق میں پہلے عظیم آباد گئے پھر آصف الدولہ کے ابتدائی زمانے میں فیض آباد و لکھنؤ میں مقیم ہوئے - بعد ازاں حیدر آباد چلے گئے وہیں اپنا تذکرہ مجمع الانتخاب مکمل کیا اور اس میں شمالی ہند کے شعرا کے علاوہ حیدر آباد کے متعدد وہ شعرا بھی شامل ہو گئے جو اس وقت حیات تھے - مصحفی نے کمال کا نام شاہ کمال الدین حسین تخلص کمال بتایا ہے -[1] اعظم الدولہ سرور نے بھی کمال الدین حسین ہی لکھا ہے -[2] غالباً مصحفی اور سرور ہی کی تقلید میں گارسیں دتاسی نے مؤلف کا نام شاہ کمال الدین حسین درج کیا ہے[3] لیکن یہ بیانات صحیح نہیں ہیں - مؤلف نے

۱- تذکرۂ ہندی ، ص ۱۹۰ ، مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۳ع -

۲- عمدۂ منتخبہ ، مؤلفہ سرور ، ص ۵۳۱ ، مرتّبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، مطبوعہ دلی ۱۹۶۱ع -

۳- خطبہ ۴ دسمبر ۱۹۵۴ع ، مشمولہ خطبات گارسیں دتاسی ، ص ۸۴ ، مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ، دکن ۱۹۳۵ع و تاریخ ادب ہندوستانی قلمی ، ص ۳۳۳ (اُردو جلد دوم) -

خود تذکرے کے دیباچے میں اپنا نام شاہ محمد کمال لکھا ہے۔[1] جیسا ابھی ظاہر کیا گیا، کمال کا ذکر دوسرے تذکروں میں بھی آیا ہے۔ لیکن تفصیلی حالات مجمع الانتخاب ہی میں ملتے ہیں۔ مؤلف نے اس میں چار جگہوں پر اپنا ذکر کیا ہے: ایک دیباچے میں، دوسرے خاتمے پر، تیسرے کمال کے تحت اپنے ترجمے میں، چوتھے ایسے شعرا کے ذکر کے ساتھ جن سے کمال کے دوستانہ روابط تھے۔ نصیر الدین ہاشمی جنھوں نے سب سے پہلے اس کے ایک قلمی نسخے مخزونہ کتب خانۂ سالار جنگ حیدر آباد دکن کا تفصیلی تعارف شائع کیا اپنے مضمون میں مصحفی و گارسیں دتاسی کے مکمل بیانات بھی درج کر دیے ہیں اور خود کمال کے بیانات کی مدد سے ان کے حالات زندگی بھی تفصیل سے لکھ دیے ہیں۔[2] راقم الحروف نے اس کی تلخیص نگار ۱۹۶۴ع کے سال نامے میں دے دی ہے۔[3] بعد ازاں "مجمع الانتخاب" مخزونہ سالار جنگ کی تلخیص مع حالاتِ مؤلف، نثار احمد فاروقی کی توجہ سے منظرِ عام پر آئی۔ ان کا مضمون طبقات الشعراء مؤلفۂ قدرت اللہ شوق اور گل رعنا مؤلفۂ لچھمی نرائن شفیق کی تلخیص کے ساتھ شائع ہوا ہے۔[4] احوال مؤلف کے سلسلے کے دیگر حوالے اصلاً مصحفی اور خود مؤلف کے بیانات سے ماخوذ ہیں۔ اس جگہ ہم مصحفی کا بیان بطور مثال من و عن نقل کر رہے ہیں:

"کمال تخلص معروف بہ شاہ کمال چشتی ولد قادر نواز خان وطنِ بزرگانش شاہ جہان آباد و در زمانۂ خویش منصب دار بادشاہی بودہ اند از چندے والد ایشان در موضع محی الدین پور کہ متصل صوبۂ بہار است کہ بطریق ایمہ و خارج جمع بنامِ ایشان مقرر است، توطن گزیدہ۔ چنانچہ تولد شاہ مذکور در ہمان موضع واقع شدہ، لیکن نشو و نما در عظیم آباد

۱۔ دیباچہ مجمع الانتخاب (قلمی)، منقولہ از نسخۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن مملوکہ انجمن ترقی اُردو، کراچی۔

۲۔ رسالہ اُردو، ص ۶۷ تا ۹۱، بابت جنوری ۱۹۵۶ع۔

۳۔ "تذکروں کا تذکرہ نمبر"، ۱۰۹، مرتبہ راقم الحروف۔

۴۔ تین تذکرے (تلخیص و مقدمہ)، مطبوعہ مکتبہ برہان اُردو بازار دہلی، ۱۹۶۸ع۔

یافتہ ۔ بعد انتقال والد ماجد خود در سن شانزدہ سالگی ترک لباس اختیار کردہ و بیعت در قصبۂ سلون در حضور پیر شاہ کریم عطا صاحب کہ فرزند و جانشین حضرت پیر شاہ اشرف قدس اللہ سرہ اند ، نمودہ ۔ درویشانہ قدم در وادی سیاحت گزاشتہ ، در ہمان عالم بہ لکھنؤ وارد شدہ ۔ ازان ایام در ہمین شہر اقامت ورزیدہ ، اوقاتش ہمیشہ بتوکل گزشتہ از ہفت سال راجا بھولاس رائے بہادر ، بمکانِ خویش جا دادہ ، خدمتش را موجب سعادت می داند و بسیار بخوبی پیش می آید و چون بمقتضاے موزونی طبع شوق شعر از طفولیت دامن گیر بود ازین جہت دواوین اساتذۂ سلف و حال را زیادہ از سی جمع نمودہ ، ببرکت سیر کلام ایشان و فیض صحبت این کاملان خود را نیز بپایہ اعتبار کشیدہ ۔ پیش تر شعر خود از نظر محمد قائم می گذرانید حالا از چندے رجوع این امر بہ قلندر بخش جرأت دارد ۔ ماسوا این در اخلاق درویشانہ ، با صاحبان معنی مزاجش بیک وتیرہ ، مرنج و مرنجان اکثر در مشاعرۂ فقیر حاضر شدہ با کلام این خاکسار از تہ دل دوستی دارد چنان چہ ہر سہ دیوان را بدست خود نقل گرفتہ و تذکرہ را کہ تیار شدہ ، بخریداران تمام بردہ ، غرض کہ ذاتش چون نام خود کمال مجسم است عمرش از سی سال متجاوز خواہد بود ۔''[۱]

مجمع الانتخاب (قلمی) مخزونہ انجمن ترقی اُردو کے دیباچے میں مندرجۂ ذیل مصرعِ تاریخ ملتا ہے :

''جُنگِ اشعار و مجمعِ ابیات''

اس سے ۱۲۱۸ھ برآمد ہوتے ہیں ۔ مصرع سے پہلے نثر میں بھی مؤلف نے صراحت کر دی ہے کہ ''در ۱۲۱۸ھ یک ہزار و دو صد و ہجدہ ہجری ترکیب یافتہ ۔''

اگر اس کا تاریخی نام ''مجموعۂ انتخاب'' قرار دیا جائے تو اس سے بھی ۱۲۱۸ھ نکلتے ہیں ۔ یہی تاریخ دوسرے مخطوطوں میں ملتی ہے ۔ نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانۂ سالار جنگ کے جس نسخے کا تعارف کرایا ہے اس کے خاتمے میں لکھا ہے :

''لاچار در یک و نیم سال اول ہمہ مسودہ ہا را بدست خود ردیف وار بقید

۱- بحوالہ ''تین تذکرے'' ، مطبوعہ مکتبۂ برہان دلی ۱۹۶۸ع ۔

اسم اسائی ریختہ گویان تذکرہ ترکیب دادہ بعد ازان برائے نواب صاحب معز الیہ در سن یک ہزار دو صد و نوازدہ [کذا] ہجری بسیار در اضطرابی بطور انتخاب ازان مسودہ مذکور صاف کنانیدہ گزرانیدم و نام این مجمع الانتخاب نہادہ شد۔''

یہی عبارت رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے مخطوطے میں ملتی ہے۔ اس سے پہلے کی سطریں یہ ہیں:

''وقتیکہ حیدر آباد رسیدم ہمہ مسودہ ہمراہ فقیر بودند درین اثنا نواب معلٰی القاب نواب نورالامرا بہادر کہ ذکرش در آغاز کتاب گزشتہ متحرک اجتماع مسودہ تذکرہ شدند۔''[۱]

اس کے بعد کی عبارت اور دیباچے کی آخری سطریں نسخۂ سالار جنگ کے مطابق ہیں۔ گویا لندن کا مخطوطہ اور کتب خانۂ سالار جنگ کا وہ مکمل نسخہ جس کا تعارف نصیر الدین ہاشمی نے کرایا ہے ایک ہی مسودے کی نقل ہیں۔ دونوں نسخوں کے دیباچے سے صاف پتا چلتا ہے کہ کمال نے نواب نورالامرا کی فرمائش پر حیدر آباد میں اس تذکرے کا پہلا مسودہ ۱۲۱۸ھ میں مکمل کیا اور ۱۲۱۹ھ میں اس کی ایک صاف ستھری نقل ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ نثار احمد فاروقی صاحب نے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ شاہ کمال نے ۱۲۱۸ھ میں یہ انتخاب مع تراجم شعرا کے مکمل کر لیا۔ لیکن اس کا آغاز اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اضافے بھی ۱۲۱۹ھ کے بعد تک ہوتے رہے ہیں۔ نثار احمد فاروقی مختلف تراجم کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مجمع الانتخاب کا زمانۂ تصنیف و ترتیب ۱۲۱۲ھ سے ۱۲۵۴ھ تک تقریباً ۴۲ سال پر پھیلا ہوا ہے۔[۲]

''مجمع الانتخاب'' کے کئی قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لیکن تذکرہ مکمل صورت میں ہنوز غیر مطبوعہ ہے صرف اس کی تلخیص تفصیلی

۱۔ مجمع الانتخاب (قلمی) منقولہ از رائل ایشیا ٹک سوسائٹی لندن، مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی۔

۲۔ تین تذکرے (تلخیص و مقدمہ)، ص ۱۱۔

تعارف کے ساتھ نثار احمد فاروقی نے شائع کر دی ۔[۱] اس کے دو نسخے کتب خانۂ سالار جنگ حیدر آباد میں ہیں ۔ دونوں کے تعارفات نصیر الدین ہاشمی اور نثار احمد فاروقی نے شائع کر دیے ہیں ۔ ان میں ایک نسخہ ناقص ہے اور ایک مکمل ہے ۔ مکمل نسخہ ۲۵ ذی قعد ۱۲۱۹ھ بروز منگل مطابق ۵ فروری ۱۸۰۵ع کا مکتوبہ ہے ۔[۲] ایک ناقص نسخہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ میں ہے نثار احمد فاروقی نے اس کی تفصیلات بھی شائع کر دی ہیں ۔[۳] اس کا ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں بھی ہے اس کا حوالہ ایک جگہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے دیا ہے ۔[۴] گارسین دتاسی مجمع الانتخاب کے بارے میں رقم طراز ہے کہ :

"یہ ان تذکروں میں سے ہے جن کا علم مجھے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے خاص اصحاب کی بدولت اس وقت سے ہے جب کہ میں اپنی تاریخ ادب شائع کرنے والا تھا . . . افسوس ہے کہ جو نسخہ مجھے ہاتھ لگا اگرچہ وہ بہت عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے لیکن کاتب نے بڑی بے پروائی سے لکھا ہے یہی نہیں بلکہ بے سمجھے بوجھے اس میں تصرف بھی کر دیا ہے ۔"[۵] (خطبہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ع)

معلوم نہیں کہ گارسیں کا اشارہ کس نسخے کی طرف ہے ۔ بظاہر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ معلوم ہوتا ہے لیکن بیان ایسا مبہم ہے کہ دوسرا بھی ہو سکتا ہے ۔ اس کی ایک نقل جو اس وقت راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ہی کے نسخے سے تیار کی گئی ہے ، انجمن ترقی اُردو

۱- تین تذکرے (تلخیص و مقدمہ) ، ص ۹۴ تا ۱۴۲ ، مطبوعہ مکتبۂ برہان اردو بازار دلی ۱۹۶۸ع -

۲- تین تذکرے (تلخیص و مقدمہ) ، ص ۹ ، مطبوعہ مکتبۂ برہان اردو بازار دلی ۱۹۶۸ع -

۳- اردو نامہ کراچی شمارہ ہشتم -

۴- میر تقی میر حیات اور شاعری ، ص ۶۱۳ ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۴ع -

۵- خطبات گارسیں دتاسی ، ص ۸۴ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۵ع -

کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے ۔ اس میں اشعار نہیں صرف نثری تراجم ہیں ۔ اس کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اصل قلمی نسخے میں چھ سو چوبیس صفحات ہیں ۔ اس کے آخر میں مؤلف کا کہا ہوا گیارہ اشعار کا قطعۂ تاریخ ہے :

ووہیں نکلی یہ مصرع سے تاریخ
'جنگِ اشعار و مجمعِ ابیات

ترقیمہ میں لکھا ہے کہ :

''تمام شد مجمع الانتخاب بتاریخ دوم شہر ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ از دست شیخ کریم علی ۔''

یہ نسخہ بلحاظ دیباچۂ تراجم اور خاتمہ کتب خانۂ سالار جنگ کے مکمل نسخے کے عین مطابق ہے ۔ صرف یہ کہ نسخۂ سالار جنگ ۱۲۱۸ھ کا لکھا ہوا ہے اور ایشیاٹک سوسائٹی لندن کا نسخہ اس کے ۳۷ سال بعد ۱۲۵۶ھ میں لکھا گیا ہے ۔

نثار احمد فاروقی نے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو اور قاضی عبدالودود کے حوالوں سے لکھا ہے کہ مجمع الانتخاب کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں اور ایک کتب خانۂ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی ہے ۔[1] ڈاکٹر تنویر احمد نے اطلاع دی ہے کہ زاہدہ ابوالحسن نے ایم ۔ اے ۔ فائنل (اُردو) کے لیے اس تذکرے پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں ایک اور نسخے کی نشان دہی کی گئی ہے جو حیدر آباد کے کسی ذاتی کتب خانے میں ہے ۔[2]

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور نثار احمد فاروقی کی دی ہوئی تلخیص کے مطابق اس میں دو سو چھہتّر شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ نصیر الدین ہاشمی نے شعرا کی تعداد صرف ۲۲۶ ظاہر کی ہے ۔ غالباً یہ کسی ناقص نسخے کے مطابق ہے ۔ تذکرے کا مطالعہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر انتخابِ کلام ہے ۔ بہت مختصر نثری تراجم شامل کر کے اسے تذکرۃ الشعراء بنا دیا گیا ہے ۔ انتخابِ کلام کی طوالت نے اس تذکرے کو خاصا ضخیم کر دیا ہے ورنہ نثری

۱۔ تین تذکرے (تلخیص و مقدمہ) ، ص (ii) ، مطبوعہ دلی ۱۹۶۸ع ۔

۲۔ رسالۂ تذکرات ، ص ۵۶ ، مطبوعہ دلی ۔

مواد کے لحاظ سے یہ ایک مختصر سا تذکرہ ہے - غزل کے اشعار کے ساتھ ساتھ دوسرے اصناف مثلاً مخمس ، مثنوی ، ہجو ، قصیدے اور مرثیے کے منتخبات بھی جگہ جگہ درج کیے گئے ہیں - اس تذکرے میں جیسا کہ خود مؤلف نے صراحت کر دی ہے ، میر ، قائم اور مصحفی کے تذکروں سے خصوصاً مدد لی گئی ہے اس لیے زیادہ تر وہی شعرا مذکور ہوئے ہیں جو نکات الشعراء ، مخزن نکات اور تذکرۂ ہندی میں شامل ہیں - بہت سے تراجم ایسے ہیں جو صرف شاعر کے نام اور تخلص پر ختم ہو جاتے ہیں - عموماً ایک دو سطریں ہی ہر شاعر کے متعلق لکھی گئی ہیں - صرف چند شاعروں کے تراجم میں تفصیل سے کام لیا ہے اور اشعار بھی بکثرت نقل کیے ہیں مثلاً قلندر بخش جرأت کا ترجمہ - اس میں بھی شاعر کا احوال مع القاب و آداب چھ سات سطروں میں ہے - ہاں انتخاب کلام میں غزل کے اشعار ، دوہرے ، رباعیاں اور مخمس سبھی نقل کیے گئے ہیں - رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے نسخے کی جو نقل ہمارے سامنے ہے وہ آصف الدولہ آصف کے ترجمے سے شروع ہو کر یکرو کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے - اس کے بعد چند شاعرات یعنی دلھن بیگم زوجۂ نواب آصف الدولہ ، جینا بیگم زوجۂ جہان دار شاہ ، گنا بیگم زوجۂ عماد الملک اور زینت ، ایک زنِ بازاری کا ذکر ہے - زینت کے ذکر میں لکھا ہے کہ :

”زن طوائف در فیض آباد می باشد یک غزل میر حسن (میر مستحسن خلیق) نزدِ مصحفی صاحب آوردہ بود تخلص معلوم نیست چنانچہ ازوست -“

نثار احمد فاروقی نے کتب خانۂ سالار جنگ کے جس نسخے کی تلخیص دی ہے اس میں اوپر کی سطروں کے بعد یہ الفاظ بھی ملتے ہیں :

”تحقیق معلوم نیست کہ زن رقاصہ یا زن کسبے فرقہ ایست -“

اس جگہ دو ترجمے نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں :

اکبر : اکبر تخلص عرف بھجو بیگ کہ فکر شعر بہ ایہام می ساخت شاگرد میاں شاہ حاتم صاحب - فقیر او را در زمرۂ خواصان مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بہادر می دید و ملاقات ہم می شد چنانچہ این غزلہاے ازوست -“

تصور : "تصور تخلص میر احسان حسین ولد سید حیدر حسین خاں شاگرد میاں جرأت سلمہ اللہ تعالیٰ - جوانِ خوش خلق و خوش فکر است از فقیر بسیار ربط و اتحاد دارد و بجمیع صفت موصوف - فقیر در لکھنؤ گذاشتہ آمدہ است - حق تعالیٰ سلامت دارد ، در مسودۂ فقیر بسیار غزلہا میر معز الیہ بودند مگر گم شدہ - حالا یک مخمس و چند شعر کہ از تذکرۂ مذکور یاد بود بقیدِ قلم در آوردہ - ازوست -"

☆ ☆ ☆

ریاض الفصحا

نام غلام ہمدانی اور مصحفی تخلص ہے - ان کا ذکر پچھلے صفحات میں ''تذکرۂ ہندی گویاں'' کے ضمن میں ہو چکا ہے -

''ریاض الفصحا'' کے دیباچے کے آخر میں خود مصحفی نے لالہ چُنّی لال حریف کی یہ تاریخ دی ہے :

صد شکر کہ این ذخیرۂ اہلِ سخن　　شد انجمنِ سپہر را رشک افزا

از خامۂ فکر خود برآوردہ حریف　　سالِ تاریخِ او ریاض الفصحا

گویا ''ریاض الفصحا'' تذکرے کا تاریخی نام ہے - اس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۲۱ھ نکلتا ہے - لیکن تذکرے کے آخر میں دیے ہوئے قطعات سے پتا چلتا ہے کہ یہ اس کا سالِ آغاز ہے اور اس کا تکملہ ۱۲۳۶ھ میں ہوا ہے - دیگر قطعوں کے علاوہ آخر میں مصحفی کا کہا ہوا یہ قطعۂ تاریخ ملتا ہے :

در سوادِ اعظمِ این تذکرہ　　ماند از رفتار چو پاے قلم

یافتم تاریخِ ختمش مصحفی　　یادگارِ خامۂ جادو رقم

آخری مصرعے سے ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتے ہیں - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاض الفصحا ۱۲۲۱ھ میں شروع ہو کر ۱۲۳۶ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے - ریاض الفصحا کا ایک قلمی نسخہ رام پور میں اور دوسرا خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے - رام پور کے نسخے کی تفصیل عرشی صاحب نے دی ہے -[۲] خدا بخش لائبریری کا قلمی نسخہ رمضان بیگ طیان کے ہاتھ کا ہے اور ۱۲۳۸ھ

۱- ریاض الفصحا ، ص ۳ ، مرتّبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ، اورنگ آباد ۱۹۳۴ع -

۲- مقدمۂ دستور الفصاحت ، ص ۸۷ ، مطبوعہ ۱۹۴۳ع -

کا مکتوبہ ہے - اس کو بنیاد بنا کر مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۳۴ع میں اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو سے شائع کر دیا - اس میں مولوی صاحب کا جو مقدمہ ہے یہ وہی ہے جو مصحفی کے تذکرۂ ہندی گویاں مطبوعہ ۱۹۳۳ع میں شامل ہے - مولوی صاحب کا مرتّبہ "ریاض الفصحا" بھی دستیاب ہے اور یہی میرے سامنے ہے -

یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے اور پہلے تذکرے سے ضخیم ہے - اس میں ان تین سو اکیس شاعروں کا ذکر ہے جو پہلے تذکرے میں مذکور ہونے سے رہ گئے تھے - یہ وضاحت خود مصحفی نے "ریاض الفصحا" کے دیباچے میں کر دی ہے - شعرا کی ترتیب اس میں بھی بلحاظ حروفِ تہجی ہے - دیگر خصوصیات کم و بیش وہی ہیں جو تذکرۂ ہندی کے سلسلے میں مذکور ہو چکی ہیں - تذکرے کا آغاز امیر کے ذکر سے ہوتا ہے اور یار کے ذکر پر تذکرہ ختم ہو جاتا ہے - اس جگہ دونوں کے تراجم بطور مثال نقل کیے جاتے ہیں :

امیر : "نواب قمر رکاب امین الدولہ معین الملک امیر تخلص عرف مرزا مینڈو خلف نواب شجاع الدولہ مرحوم و مغفور - جوانیست بزیور فضل و کمال آراستہ ، در نظم و نثر فارسی و علم تواریخ مہارتِ کلی دارند و بر فقیر از ابتدائے ملاقات تا در شاہجہان آباد توجہ و مہربانی می فرمودند و در لکھنؤ ہم اکثر بخدمت کیمیا خاصیتِ ایشان می رسم اشعار موزون کردہ در ہر دو زبان بسیار بلند دارند اما آنچہ بالفعل بہم رسیدہ این است -"
(ص ۳ ، ۴)

یار : "میر احمد ، یار تخلص :

آفرین اے دستِ گستاخِ محبت آفرین
یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا -" (ص ۳۷۷)

☆ ☆ ☆

مجموعۂ نغز

مصنف کا نام قدرت اللہ اور تخلص قاسم ہے ۔ انشا ، مصحفی اور جرأت کے ہم عصروں میں تھے ۔ عظیم بیگ و انشا کے معرکوں میں قدرت اللہ قاسم ، عظیم کے ہمنوا تھے ۔ شاعر کی حیثیت سے اُن کا مرتبہ بہت بلند نہ سہی لیکن ان کے علم و فضل میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ۔ تذکرہ لکھنے سے پہلے ایک ضخیم دیوان تین ہزار پانچ سو اشعار کی ، ایک نظم معراج نامہ ، اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات و کرامات پر مشتمل بطرز شاہنامہ پانچ ہزار سے زائد اشعار کی ایک مثنوی مکمل کر چکے تھے لیکن علمی و ادبی کاموں میں صرف مجموعہ نغز کو اہمیت حاصل ہوئی ۔ ادبی تاریخ میں اسی تذکرے کی بدولت ان کا نام زندہ ہے ۔[1] قدرت اللہ قاسم کا ذکر شاعر کی حیثیت سے متعدد تذکروں میں آیا ہے ۔ مجموعہ نغز کے مرتّب نے بھی ان کے حالاتِ زندگی خاصے تفصیل سے لکھے ہیں ۔ قاسم کا انتقال ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ع میں ہوا ہے ۔[2]

مجموعہ نغز کے آخر میں سیف الدولہ سید رضی خاں رضی کے اُردو فارسی اشعار ہیں جن میں ”کمالِ لذت“ مادۂ تاریخ قرار دیا گیا ہے ۔ فارسی اشعار اور اُردو اشعار کے آخری شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں :

از خواندن این کتاب و سال تصنیف حقّا کہ رضی یافت ”کمالِ لذت“
از بسکہ کمال لذت اس میں پائی تاریخ بھی سوجھی ہے ”کمالِ لذت“

۱۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر ، ص ۱۱۵ ، سالنامہ نگار پاکستان ۱۹۶۴ع ، مرتّبہ راقم الحروف ۔

۲۔ مقدمہ دستور الفصاحت ، ص ۸۹ ، مرتّبہ مولانا عرشی ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

"کمال لذت" کے ٹکڑے سے ۱۲۲۱ھ برآمد ہوتے ہیں، یہی اس تذکرے کا سالِ اختتام ہے۔ دیباچے میں میر علی خاں سید اور ثناء اللہ فراق کے جو قطعات تاریخ درج ہیں ان سے بھی ۱۲۲۱ھ نکلتے ہیں۔ "مجموعۂ نغز" سید میر علی کے مصرعے کا ٹکڑا ہے، اس کے اعداد بھی ۱۲۲۱ھ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا آغاز اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ عرشی صاحب کا خیال ہے اس کا آغاز ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۶ھ کے درمیان ہوا ہے۔[۱] اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ۱۲۱۹ھ میں قدرت اللہ قاسم نے ان سے ان کا تذکرہ طلب کیا اور اس میں سے شعرا کے اشعار منتخب کر کے اپنا تذکرہ مرتّب کر لیا۔[۲] لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ "مجموعۂ نغز" کی داغ بیل ۱۲۱۹ھ سے پہلے پڑ چکی تھی۔

اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ مولانا محمد حسین آزاد کے ذخیرۂ کتب مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق یہ نسخہ قدیم ترین ہے اور خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مجموعۂ نغز کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں بھی ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے دونوں قلمی نسخوں کے متن کی مدد سے اس تذکرے کو مرتّب کیا اور اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے دو جلدوں میں شائع کر دیا۔ اب یہی مطبوعہ نسخہ دستیاب ہے اور یہی میرے سامنے ہے۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں قدما سے لے کر معاصرین تک ۶۰۳ شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ شعرا کے حالات بھی قدرے تفصیلی ہیں اور کلام کے انتخابات بھی طویل ہیں۔ اشعار سے شعرا کے رنگِ سخن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ زبان سجع اور قافیہ سے خالی نہیں ہے۔ ہر شاعر کے تخلص کے ساتھ خصوصاً انھوں نے قافیہ اور سجع کا اہتمام کیا ہے۔ مثلاً مظہر، میر، درد، سودا، سوز،

۱۔ مقدمۂ دستور الفصاحت، ص ۸۹، مرتّبہ مولانا عرشی، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ء۔

۲۔ "عمدۂ منتخبہ"، ص ۵۶۱، مرتّبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مطبوعہ دلی ۱۹۶۱ء۔

فراق اور ہدایت وغیرہ کا ذکر اس طور پر آیا ہے :

۱- سخن سنج ہنر گستر میرزا جانِ جاناں مظہر -

۲- سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر -

۳- مملکت سخن سازی را یکہ تاز مرد خواجہ میر درد -

۴- سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا -

۵- شاعر فصاحت افروز محمد میر سوز -

۶- دوستدار سراپا وفاق حکیم ثناءاللہ فراق -

۷- استاد صاحب درایت ہدایت اللہ خان ہدایت -

اس تذکرے کے مطالعے سے اس زمانے کی ادبی اور سماجی فضا دونوں پر روشنی پڑتی ہے - ہر چند کہ سیاسی و معاشی فضا ، تفریح طبع کے لیے ناموافق تھی ، بقول شیرانی ''فتنہ و آشوب کی گھٹائیں ہر طرف چھائی ہوئی تھیں . . . دہلی ویران ہو رہی ہے اور اس کے فرزند تلاشِ معاش میں در بدر اور خاک بسر پریشان حال پھرتے ہیں ، لیکن راجا سے پرجا تک جس کو دیکھو شاعری کے شوق میں ڈوبا ہوا ہے - عورت ، مرد ، عالم ، جاہل ، مسلمان ، ہندو ، بلکہ فرنگی زادوں تک میں یہ ذوق سرایت کر گیا تھا - سلاطین ، عمال ، امرا ، علما ، سپاہ ، اہلِ دیوان اور ہر طبقے کے پیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا تھا - چنانچہ مجموعۂ نغز کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ منیر قلعی گر ہے ، محمد امان نثار معار ہے ، حسین بخش بخشی پارچہ فروش ہے ، مد سنگھ شگفتہ لوہار ہے ، میر صادق علی صادق فیل بان ہے ، شمبھو ناتھ عزیز مہاجن ہے ، میر لطیف علی لطیف دلال ہے ، بدر الدین مفتون بزاز ہے ، یکرنگ سنار ہے ، محمد ہاشم شائق درزی ہے ، محمد عارف رفو گر ہے ، عنایت اللہ کلّو حجام ہے ، غلام ناصر جراح ہے ، مقصود ایک سقہ ہے اور قرین خاکروب ہے -''[۱] غرض کہ ہر وضع اور ہر قماش کے شعرا موجود تھے - اگرچہ فرخ آباد ، رام پور ، لکھنؤ ، عظیم آباد ، مرشد آباد اور حیدر آباد وغیرہ میں بھی شعر و شاعری کے مرکز قائم تھے لیکن سب سے بڑا مرکز دلی

۱- مقدمہ نسخۂ مجموعۂ نغز ، مرتبہ حافظ محمود خاں شیرانی ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۳ع -

ہی تھا - یہاں مشاعرے بکثرت ہوتے تھے اور ہر خیال و ہر طبقے کے لوگ اس میں حصہ لیتے تھے -

مجموعۂ نغز کے تراجم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر فرید الدین آفاق ، احسن اللہ احسن ، غلام اشرف اشرف ، غفور بیگ افسوس ، خواجہ احسن اللہ خاں بیان ، حافظ محمد حفیظ ، غلام محمد راقم ، مظہر علی خاں شفیق ، میاں نیاز احمد نیاز اور فیض علی سرور وغیرہ قدرت اللہ قاسم کے شاگرد تھے - یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ لوگ مکتبی شاگرد تھے یا اصلاح سخن کے سلسلے کے تلامذہ تھے -

یہ تذکرہ ایک اور لحاظ سے بہت اہم ہو جاتا ہے - اس کے ذریعے اُردو ادب کی مشہور کتاب ''آبِ حیات'' کے ایک ماخذ کا سراغ مل جاتا ہے - صاف پتا چلتا ہے کہ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کی تالیف میں ''مجموعۂ نغز'' سے خاصی مدد لی ہے - چنانچہ آبِ حیات کے مندرجات میں :

۱- ولی اور ناصر علی کے مابین شاعرانہ تعلّی کا قصہ -

۲- شاہ مبارک کے حالات و اشعار -

۳- شرف الدین مضمون کا حال و کلام -

۴- آرزو کا کلام اور ان کی بدیہہ گوئی -

۵- سودا کے شعر کو حدیث قدسی کہنے کا واقعہ -

۶- میر و میرزا کے سلسلے میں ایک کو دریا دوسرے کو نہر بتانا -

۷- سودا کا لطیفہ قائم علی امیدوار کے ساتھ -

۸- بقاء اللہ خاں بقا کے حالات -

۹- میر صاحب کی بد دماغی اور تنک مزاجی کا تذکرہ -

۱۰- ولی کے متعلق شاعر یست از شیطان مشہور تر کا حکم لگانا -

۱۱- محمد امان نثار کے حالات -

۱۲- جرأت کے ابتدائی حالات اور مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مشاعرے میں ان کی شرکت کا حال -

۱۳- میر حسن کے بہت سے حالات -

۱۴- ماشاءاللہ خاں کے حالات -

۱۵- انشا اور عظیم بیگ کا معرکہ -

غرض کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو آب حیات میں مذکور ہیں اور

محمد حسین آزاد سے منسوب چلی آ رہی ہیں ، لیکن ان میں سے اکثر کا ماخذ دراصل قدرت اللہ قاسم کا ''مجموعۂ نغز'' ہے - آزاد نے بعض جگہ اس کا سراغ دیا ہے ، اکثر جگہ محذوف کر گئے ہیں -

یہ تذکرہ آفتاب شاہ عالم کے ذکر سے شروع ہو کر یکرو کے احوال پر ختم ہوتا ہے - اشعار محذوف کر کے ولی اور یقین کے تراجم بطور مثال یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

ولی : ''ولی تخلص سخن سنجان شان جلی المشہور بہ محمد ولی است ولی عزیزے بود از سکنۂ دیار دکن و مریدان شاہ سعد اللہ گلشن علیہا الرحمت و الغفران و امر ہما اللہ تعالیٰ فی روضات الجنان گویند نسبت تلمّذ ہم بجناب ایشان داشت و در آخر ہا باستصواب شان ہمت بہ سخن طرازی می گماشت و العلم عنداللہ تعالیٰ شانہ و عظم برہانہ بہرحال بآئینے کہ قدوۂ متغزلان سخن پرداز شیخ شیراز قدس سرہ رویۂ غزل از کتم عدم بہ منصۂ ظہور جلوہ گر شد - تدوین دیوان ریختہ مردف و مملو انواع سخن و مشحون اقسام امور این فن از وے بصفحۂ روزگار ثبت افتاد اگرچہ اشعار متفرقۂ ریختہ پیش از وے ہم علی الاختلاف الروایتین از طبع دربار بلبل خوش نوائے گلزار قدس ، عندلیب دستان سرائے ہمیشہ بہار اُنس ، خسرو سخن سنجان طوطی ہندوستان مظہر عشق حضرت اویس محمد کاسہ لیس قدس سر ہما و روح روحہما سلطان نکتہ پردازی گیہان خدیو سخن سازی قدوۂ متغزلان پیشوائے صاحبدلان ، صوفی صافی منش درویش پاکیزہ روش ، شیخ صاحب درد زبدۂ حضرات سہرورد ، بادشاہ قلمرو بے نیازی ، سعدی شیرازی اسکنہ اللہ بحبوحۃ الجنان ، یا سعدی دکنی علیہ الرحمت و الغفران و دیگر سخن سنجان ہم ریختہ اما تدوین جملگی انحاء شعر از وے بظہور پیوستہ مختصر کلام حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی زبان ثابت است و سخن بر سخنش ابلیس منشی و شیطنت ، میر [پیر] خان کمترین کہ خدایش بیامرزد بسیار بموقع و بجا گفتہ کہ :

ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں

قطع نظر از زبان دکنی شعرش بہ مرتبۂ اعلیٰ شاعری و سخنش بدرجۂ

علیاے سخنوری است قصہ کوتاہ یک صد و نود و چار شعر از اشعار آبدار آن استاد والا نزاد می نگارم منہ ۔ عفی اللہ عنہ ۔''[1]

یقین : ''یقین تخلص انعام اللہ خان مرحوم است وے از شیخ زادہاے فاروقیہ و پیر زادہاے مجددیہ و نبیسۂ حمیدالدین خان نیمچہ و جوان یار باش ، عمدہ معاش ، ظریف الطبع ، لطیفہ گو ، بذلہ سنج ، پاکیزہ خو بود ۔ جدش را حضرت خلد مکان نور اللہ برہانہ' بدستور خاص بہ عزت ہر چہ تمام تر شقہا قلمی فرمودہ و قاسم ہیچمدان سراپا نقصان آنہا را نزد مقبول نبی خان مقبول برأے العین مشاہدہ نمودہ ۔ پدرش قطع نظر از پیر زادگی بہ مصاحبت حضرت فردوس آرام گاہ نور اللہ مفجعہ کلاہ گوشہ بآسمان می سود ۔ خودش در ایام دولت نواب غفران مآب وزیر الممالک عماد الملک غازی الدین خان بہادر بسیار بجاہ و مکنت ایام بکام دل بسر می فرمود ۔ از ارشد ترین شاگردان سخن سنج فیض گستر مرزا جان جانان مظہر است عفی اللہ عنہا و آنکہ شاعر بے نظیر محمد تقی میر در تذکرۂ خود قلمی نمودہ کہ دیوان وے ازان مرزا مغفور است افتراے محض و کذب خالص است کہ از ممر حسد ازوے سرزد ۔ اکثر غزلہا بدیہہ بہ حضور سرا پا سرور آگاہ رموز خفی و جلی سید فتح علی خان حسینی دام ظلہم گفتہ ۔ ملخص کلام ، وے شاعرے بود فصاحت آئین بلاغت آگین شیرین زبان غاذب البیان نکتہ سنج معانی را گنج طرز نوے بدستش افتادہ انداز جدید را رونق تازہ دادہ ہمیشہ غزل پنج بیتی می گفت اما بطرز بہین دُر معنی می سفت دیوانے مختصر نُہ صد بیت علی التخمین در کمال عذوبت و شیرینی دارد این یکصد و ہفتاد و پنج بیت از اشعار آبدارش کہ قاف تا قاف عالم را فرا گرفتہ این عاصی بہ انواع المعاصی می نگارد منہ ، عفی اللہ عنہ ۔''[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ مجموعۂ نغز ، جلد دوم ، ص ۲۹۶ ، ۲۹۷ ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ء ۔

۲۔ مجموعۂ نغز ، جلد دوم ، ص ۳۵۵ ۔

"طبقاتِ سخن"

"طبقات سخن" کے مؤلف شیخ غلام محی الدین ہیں - میرٹھ کے باشندے تھے اور عشق و مبتلا دونوں تخلص کرتے تھے - شیخ غلام محی الدین کا ذکر "عیار الشعراء" مؤلفہٗ خوب چند ذکا ، "گلشن بے خار" مؤلفہٗ شیفتہ ، "گلستان بے خزاں" مؤلفہٗ باطن ، "مجموعۂ نغز" مؤلفہٗ قدرت اللہ قاسم ، "طبقات الشعرائے ہند" مؤلفہٗ کریم الدین ، "یادگار شعرا" مؤلفہٗ اشپرنگر اور "تاریخ ادب ہندوستانی" مؤلفہٗ گارسیں دتاسی میں ملتا ہے - علاوہ ازیں خود مؤلف نے "طبقات سخن" میں تین جگہ اپنا ذکر کیا ہے ، ایک عشق تخلص کے تحت ، دوسرے میم کی ردیف میں مبتلا کے تحت ، تیسرے تذکرے کے خاتمے پر - پہلے دو مقامات پر مختصر ذکر کیا ہے لیکن خاتمے پر قدرے تفصیل سے کام لیا ہے - 'ن' کی ردیف میں "نعمی" تخلص کے تحت اپنے والد نعمت اللہ ولد امان اللہ کا ذکر بھی مفصل کیا ہے - ان سب کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ مبتلا کے والد شاہ نعمت اللہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے اور نعمی تخلص کرتے تھے - مبتلا کو اوائل عمری ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا اور علم صرف و نحو سے خاص دلچسپی تھی - والد کے فارسی دیوان کی ترتیب میں انھوں نے خاص مدد کی تھی - پہلے مبتلا تخلص کرتے تھے پھر عشق اختیار کر لیا - تیر اندازی کا شوق تھا اور طب سے بھی یک گونہ دلچسپی تھی - جب شاہ عالم پٹنہ سے دہلی روانہ ہوئے تو ہمراہیوں میں نواب نجف خاں کے ساتھ ابراہیم بیگ الم بھی تھے - مبتلا کی ان سے ملاقات ہوئی اور الم سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ مبتلا کے بجائے اپنا تخلص عشق رکھ لیا - اُردو فارسی کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ، لیکن اُردو میں اُن کا نام طبقات سخن اور مثنوی لیلیٰ مجنوں کی بدولت زندہ ہے - مثنوی لیلیٰ مجنوں کی تفصیلات کے لیے ڈاکٹر رضی الدین احمد کا مضمون قابلِ مطالعہ ہے -[1] مبتلا

۱- نوائے ادب بمبئی ، بابت اکتوبر ۱۹۶۳ع -

کے بیٹے شرف الدین احمد مسرور نے بھی "تذکرۂ اُردو" کے نام سے ایک تذکرۃ الشعراء مرتب کیا تھا۔[۱]

تذکرے کا نام تاریخی ہے "طبقات سخن" سے ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۸ع برآمد ہوتے ہیں۔ فیض عام کالج شاہجہان پور میں اس تذکرے کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ برلن میں بھی اس کا ایک خطّی نسخہ ہے جس کی مائیکرو فلم دلی یونیورسٹی لائبریری اور خدا بخش لائبریری پٹنہ نے حاصل کر لی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے نسخۂ شاہجہان پور کی تلخیص ضروری تصریحات کے ساتھ "ہماری زبان" علی گڑھ میں بالاقساط شائع[۲] کر دی ہے اس کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:

"تمت بالخیر، تذکرۂ تالیف خواجہ غلام محی الدین صاحب بخط بندہ رام سروپ ولد روشن رائے دھوسر (   ) قصبۂ باغپت بروز پنج شنبہ بتاریخ بست و ہشتم ماہ اگھن ۱۲۲۳ف مطابق چہارم ماہ دسمبر ۱۸۱۵ع موافق دوازدہم شہر محرم ۱۲۳۱ھ۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قلمی نسخہ سالِ تصنیف کے تقریباً نو سال بعد لکھا گیا ہے۔

نثار احمد فاروقی نے ایک اور قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ برلن کے نسخے کی نقل ہے یا شاہجہان پور کے نسخے کی یا کسی اور تذکرے کی، اس لیے کہ مضمون نگار نے اس کا سراغ نہیں دیا اور نسخہ بھی ناقص بتایا گیا ہے۔ چوں کہ اس پر ثبت شدہ مُہر میں "بالمکند ۱۲۴۲ھ" درج ہے اس لیے ممکن ہے کہ کسی وقت یہ نسخہ غالب کے شاگرد لالہ بالمکند صبر کی ملکیت رہا ہو۔[۳] کتابی صورت میں یہ تذکرہ اب تک شائع نہیں ہوا حالاں کہ جامع مقدمہ کے ساتھ اس کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

۱- تذکرۂ بے جگر، از خیراتی لال بے جگر، ص ۱۰۶، قلمی مملوکہ مشفق خواجہ۔

۲- "ہماری زبان" علی گڑھ، بابت ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ع تا ۸ اپریل ۱۹۶۰ع، مملوکہ ضمیر نیازی۔

۳- نگار لکھنؤ، ص ۲۵، بابت ستمبر ۱۹۵۹ع۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں ایک سو سے کچھ زائد شعرا کا ذکر آیا ہے۔ دیباچے میں مؤلف نے اس تذکرے کا پورا نام ''جواہرِ تاریخ'' موسوم بہ ''طبقاتِ سخن'' بتایا ہے اور یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ ''عہد محمد شاہ بادشاہ سے لے کر تا زمان جلوس سنہ عہد محمد اکبر شاہ خلد اللہ سلطنتہ مطابق سنہ [یک] ہزار و دو صد و بست و دو ہجری'' تک کے شعرا اس میں شامل ہیں۔ مؤلف ہی کے بیان کے مطابق اس تذکرے کے دو حصے ہیں۔[1]

طبقۂ اول: ''اشعار ہندی شعرائے زمان ماضی و حال۔''

طبقۂ دوم: ''اشعار فارسی خود بضمن خاتمہ و بعضے احوال۔''

گویا پہلا حصہ اُردو شعرا سے متعلق ہے دوسرا حصہ فارسی گو شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے بھی اپنی تقریظ مشمولہ ''یادگار شعرا'' میں ''طبقات سخن'' کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ:

''اس میں دو طبقے ہیں: طبقۂ اول میں سو سے زیادہ شعرائے ریختہ کا حال اور طبقۂ دوم میں شعرائے فارسی کا حال ہے۔ مؤلف نے ذاتی تحقیق سے کام لیا ہے۔''[2]

پروفیسر رضوی کا بیان خود اشپرنگر کی فہرست کتب اور اس سے مستفید خطبۂ گارسیں دتاسی سے ماخوذ ہے۔ گارسیں نے ''طبقات سخن'' کے مؤلف شیخ غلام محی الدین عشق و مبتلا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یہ تذکرہ (طبقات سخن) فارسی میں ہے اور نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ - ۸ع) نکلتا ہے۔ یہ تذکرہ دوسروں کی نقل نہیں ہے۔ اس کے دو حصے ہیں جن کا نام مؤلف نے طبقات رکھا ہے۔ پہلے طبقے میں ریختہ کے سو شعرا کا ذکر اور دوسرے میں اسی قدر فارسی شاعروں کا۔''[3]

۱- ہماری زبان، علی گڑھ، بابت ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ع۔

۲- ''یادگار شعرا''، مرتبہ طفیل احمد، ص ۸، مطبوعہ ۱۹۴۳ع۔

۳- پانچواں خطبہ، مؤرخہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ع (اُردو ترجمہ) مشمولہ خطبات گارسیں دتاسی، ص ۸۹، مرتبہ مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ع۔

نثار احمد فاروقی صاحب نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کے بیان کی تردید کرتے ہوئے نہ جانے کس بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ مبتلا میرٹھی کے زیر بحث تذکرہ ''طبقات سخن'' کے دو طبقے نہیں ہیں۔ یہ صرف شعرائے ریختہ کا تذکرہ ہے اور نام بھی محض تاریخ کے التزام کی وجہ سے ''طبقات سخن'' رکھ دیا گیا ہے۔''[1]

یہ مانا کہ ''شاہجہان پور'' کے نسخے میں طبقۂ دوم جس کا تعلق فارسی شعرا سے ہے، نہیں ہے۔ لیکن دیباچے میں مؤلف کی دی ہوئی تفصیل بتاتی ہے کہ یہ دو طبقوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کا بیان ہے کہ برلن کے نسخے میں طبقۂ دوم بھی شامل ہے۔[2]

طبقات الشعراء کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد مؤلف نے شاعری کی ابتدا پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں روایتی باتیں درج کی گئی ہیں اور قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل کا واقعہ درج کر کے حضرت آدمؑ کو شعر کا موجد قرار دیا ہے۔ اس کے بعد امیر خسرو، سعدی شیرازی اور شاہ ولی اللہ ولی کا ذکر ہے اور انھیں گجراتی بتایا گیا ہے۔ دیباچے کے بعد ردیف وار ناموں کے ساتھ شاہ عالم آفتاب کے ترجمے سے اصل تذکرہ شروع ہوتا ہے، سب سے آخر میں یکرنگ کا ترجمہ ہے۔ خاتمے پر پھر مؤلف نے اپنے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں۔

تنقیدی حیثیت سے یہ تذکرہ اہم نہیں ہے لیکن سوانح شعرا کے سلسلے میں اس سے بعض نئی اور کار آمد باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً اس تذکرے میں ولی کا اصل نام شاہ ولی اللہ اور وطن گجرات بتایا گیا ہے۔ میر محمد کا نام میر محمد علی ظاہر کیا گیا ہے۔ ٹیکا رام تسلی کے بارے میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ انھوں نے نثر میں کچھ لطیفے بھی لکھے تھے۔ اس سے یہ بھی سراغ لگتا ہے کہ مظہر جانِ جاناں نے سنبھل کے دوران سفر میں میرٹھ میں بھی قیام کیا تھا۔

''طبقات سخن'' میں قائم اور مصحفی کے تذکروں سے بالخصوص مدد لی گئی ہے۔ لیکن بعض شعرا سے ذاتی ملاقاتوں کے سبب نئی باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں میں خیراتی لعل بے جگر نے طبقات سخن سے

۱۔ نگار (لکھنؤ)، ص ۴۳، بابت ستمبر ۱۹۵۹ع۔

۲۔ ہماری زبان، علی گڑھ، بابت ۸ اپرایل ۱۹۶۰ع۔

خاص فائدہ اُٹھایا ہے اور مآخذ کا ذکر جگہ جگہ کر دیا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون میں بعض تراجم کے سلسلے میں دونوں کے اندراجات کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔[1] ڈاکٹر محمد حسن نے ''طبقات سخن'' کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

''یہ تذکرہ کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں ۱۲۲۲ھ کی ابتدائی اُردو نثر کے چار نمونے ملتے ہیں جن سے دو ٹیکا رام تسلی سے منسوب لطیفے ہیں اور ایک اور اس کا جواب ہے جو حسین علی مرزا پوری نے مصنف کو لکھا ہے۔ دوسرے اس میں بہت سے شعرا کا تفصیلی انتخاب درج ہے۔ تیسرے بعض شعرا سے مصنف نے اپنی ملاقات کا حال یا ان سے خط و کتابت کا حال لکھا ہے جیسے مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد وغیرہ۔ چوتھے اس لحاظ سے بھی یہ تذکرہ اہم ہے کہ اس میں بعض شعرا کے بارے میں نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔''[2]

تجلی اور ثناء اللہ خاں فراق کے تراجم بغیر اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

تجلی : میاں حاجی تجلی دہلوی۔ میر غلام علی نام خلف میر طالب حسین کلیم ہمشیرزادہ میر تقی قصہٴ لیلیٰ مجنوں نام بزبان ہندی در عشق آن برہمنہ کہ برو فریفتہ در حبالہٴ نکاح آوردہ بود بسیار دلچسپ گفتہ و دیوان ضخیم دارد و شخصے موزون فکر روشن طبع صاحب فطرت است۔''

فراق : حکیم ثناء اللہ خاں فراق دہلوی: ''صاحب دیوان ضخیم است و برادر زادهٔ ہدایت اللہ خاں است کہ شاگرد میر درد صاحب غفرلہ بود۔ چنانچہ در ردیف الہا از نتائج طبع او نوشتہ خواہد شد۔ فراق در ہمعصران حال بسا مغتنم ہر چند مؤلف را باو صحبت نیفتادہ لیکن گویند کہ مہذب اخلاق است۔''

☆ ☆ ☆

۱۔ نگار (لکھنؤ)، ص ۳۵ تا ۴۳، ستمبر ۱۹۵۹ع۔
۲۔ ہماری زبان، علی گڑھ، بابت ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ع۔

تذکرۂ آزردہ

مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی تالیف ہے۔ آزردہ اپنے وقت کے عالم متبحر تھے اور اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں خصوصاً غالب، مومن اور شیفتہ و فضل حق خیر آبادی سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ قدیم تذکروں میں ان کے تراجم سے پتا چلتا ہے کہ ان کا شمار ہندوستان کے افاضل میں ہوتا تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور شعر کہتے تھے۔ صاحب طور کلیم کا بیان ہے کہ ''آزردہ نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے فیض روحانی پایا تھا اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے والد مولوی فضل امام سے علوم سیکھے تھے۔ علما و فضلا میں سے ان کا مدِ مقابل کوئی ایسا نہ تھا جو سخن کو اتنی بلندی تک پہنچا سکے، ہر زبان میں سادگی و پُرکاری سے گفتگو کر سکے، فارسی اور ریختہ میں دلکش اشعار کہہ سکے اور عربی لہجے میں شعر آفرینی کر سکے۔''[1] آزردہ کے متعلق انھی باتوں کو صاحب بزم سخن نے دہرایا ہے[2]۔ نصراللہ خاں خیشگی[3] اور مرزا قادر بخش صابر[4] نے بھی اپنے تذکروں میں آزردہ کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ان کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی

۱، ۲- طور کلیم و بزم سخن، مؤلفۂ نورالحسن خاں و حسن علی خاں مرتّبہ و مترجم پروفیسر عطاءالرحمٰن کاکوی، مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ، سنہ ۱۹۶۸ع -

۳- گلشن ہمیشہ بہار، ص ۵۲، مرتّبہ ڈاکٹر اسلم فرخی، انجمن ترقی اُردو کراچی، سنہ ۱۹۶۷ع -

۴- گلستان سخن جلد اول، ص ۲۰۹ تا ۲۱۳، مرتّبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، سنہ ۱۹۶۶ع -

ہے لیکن سوانح حیات کے سلسلے میں کوئی کام کی بات نہیں ملتی - کریم الدین کا بیان ہے کہ "سنہ ۱۸۴۷ع میں قریب پچاس برس کی ان کی عمر ہوگی[1] - نواب مصطفٰی خاں شیفتہ[2] اور سرسید احمد خاں نے بھی صدرالدین خاں آزردہ کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور دونوں نے ان کے علم و فضل کو نیازمندانہ سراہا ہے - سرسید نے عربی، فارسی اور اُردو اشعار کے ساتھ ساتھ ان کی عربی اور فارسی نثر کے نمونے بھی درج کر دیے ہیں -[3] قدیم تذکروں میں یادگار شعرا مؤلفۂ ڈاکٹر اشپرنگر، "سخن شعرا" مؤلفۂ عبدالغفور نساخ، ارمغان گوکل پرشاد، "گلستان بے خزاں" مؤلفۂ قطب الدین باطن، "بہار بے خزاں" مؤلفۂ احمد حسین سحر، "شمیم سخن" مؤلفۂ مولوی عبدالحئی صفا بدایونی، "تذکرۂ بشیر" اور گارسیں دتاسی کی "تاریخ ادب ہندوستانی" بھی آزردہ کے ذکر سے خالی نہیں ہے لیکن اول تو تراجم بہت مختصر ہیں دوسرے یہ کہ ان میں آزردہ کے متعلق کوئی نئی بات نہیں ملتی - ہاں علما کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں سے بعض میں آزردہ کا ذکر قدرے تفصیل سے آیا ہے اور ان کے ذریعے آزردہ کی زندگی کی بعض ایسی تفصیلات سامنے آتی ہیں جو شعرا کے تذکروں میں نہیں ملتیں - فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

"مفتی محمد صدرالدین خاں صدرالصدور دہلی تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشا، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے - ولادت دہلی میں ہوئی - علوم نقلیہ فقہ حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز اور اُن کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں اور فنونِ عقلیہ کو مولوی فضلِ امام خیر آبادی والد مولوی فضل حق خیر آبادی سے

۱- طبقات الشعرائے ہند، چہارم، ص ۵۸، ضمیمہ رسالہ معاصر نمبر پٹنہ سنہ ۱۹۶۴ع -

۲- گلشن بے خار، ص ۱۰، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، سنہ ۱۸۷۴ع -

۳- تذکرۂ اہلِ دہلی، ص ۸۷، مرتّبہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، کراچی ۱۹۶۵ع، طبع دوم -

اخذ کیا ۔ آپ صاحبِ وجاہت و ریاست اور اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے ۔ بجز شاہ دہلی کے تمام اعیان و اکابر اور علما و فضلا خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے ۔

سنہ ۱۲۷۳ھ میں دہلی کے غدر میں آپ کو سخت چشم زخم پہنچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام جائیداد اور املاک بھی جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا ہوئی تھی سرکار میں ضبط ہو گئی بلکہ جہاد کے فتویٰ کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظر بند رہے ۔ چوں کہ اصل میں بے قصور تھے آخرکار رہائی پا کر لاہور تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانہ مالیتی تین لاکھ روپیہ جو دہلی کی لوٹ میں نیلام ہو گیا تھا حضور لارڈ کارنوالس صاحب کے پاس جو اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور دہلی میں مولانا ممدوح کے بڑے مہربان رہ چکے تھے مطالبہ کیا ۔ لیکن چونکہ جائیداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا متعذر تھا اس لیے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوئے لیکن اتنا ہو گیا کہ جائیداد غیر منقولہ جو سرکار میں ضبط ہو گئی تھی واگزار ہو گئی اور مولانا موصوف دہلی واپس جا کر چندے بستی نظام الدین اولیا اور پھر اپنی حویلی خاص واقع دہلی میں خانہ نشین ہوئے ۔ سنہ ۱۲۷۶ھ میں مؤلف ''حدائق الحنفیہ'' نے ان سے ملاقات کی تھی اس وقت ان کی عمر ۸۷ سال تھی ۔ اکاسی سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے ، مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات کہی[1]

چراغش ہست تاریخِ ولادت

کنوں گفتم چراغِ دو جہان بود ۔''

''تذکرۂ علمائے ہند'' کے مؤلف مولوی رحمان علی نے لکھا ہے کہ ان کا آبائی تعلق کشمیر سے تھا ، پیدائش دہلی کی تھی اور دو سال فالج کے مرض میں

۱۔ حدائق الحنفیہ ، ص ۴۸۱ تا ۴۸۳ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ، سنہ ۱۸۹۱ع مطابق سنہ ۱۳۰۸ھ ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو پاکستان ، کراچی ۔

مبتلا رہ کر وفات پائی۔[1] تذکرۂ علماے ہند کے مرتّب و مترجم محمد ایوب قادری نے اپنے حاشیائی نوٹ میں بتایا ہے کہ مفتی صدرالدین خاں آزردہ سنہ ۱۲۰۴ھ مطابق سنہ ۱۷۸۹ع میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ لطف اللہ کشمیری تھا۔[2]

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مفتی صدرالدین خاں آزردہ کا علمی و ادبی مقام کتنا بلند تھا۔ عربی و فارسی میں انھوں نے متعدد چیزیں یادگار چھوڑی ہیں لیکن اُردو میں ان کا ذکر ان کی شاعری اور ان کے تذکرۃ الشعراء کی بدولت کیا جاتا ہے:

"تذکرۂ آزردہ کا اولین ذکر شیفتہ کے یہاں سودا کے ترجمے میں اس طور ملتا ہے، 'در تذکرۂ خود کہ بہ ایجاز و اختصار تمام در حال ارباب نظم ریختہ نوشتہ است۔'"[3]

گارسیں دتاسی نے شیفتہ کے بیان پر شبہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"ڈاکٹر اشپرنگر صاحب جو آزردہ کے ساتھ کمال رابطہ و اتحاد رکھتے تھے کہتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کا ذکر کبھی نہیں سنا۔"[4]

اُردو کے اکثر محققین بھی چند دنوں پہلے تک تذکرۂ آزردہ کے وجود پر شبہ کرتے تھے اس لیے کہ اس کا کوئی نسخہ ان کے سامنے نہ آیا تھا لیکن اس میں اب شبہ کی کوئی گنجائش یوں نہیں رہی کہ آزردہ کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ میں دستیاب ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا بیان ہے کہ:

"مفتی صدرالدین آزردہ کے اس تذکرے کا واحد نسخہ آکسفورڈ میں

۱۔ تذکرۂ علماے ہند، مرتّبہ و مترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، سنہ ۱۹۶۱ع، طبع اول۔

۲۔ تذکرۂ علماے ہند، ص ۲۴۸۔

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۰۰، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۴ع۔

۴۔ رسالۂ تذکرات، ص ۱۴، مترجمہ مولانا ذکاء اللہ، مرتّبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مطبوعہ دہلی۔

محفوظ ہے ۔ یہ ناقص الآخر ہے اور ردیف نون پر ختم ہو جاتا ہے ۔ اس میں انشا کا ترجمہ ان کے عالمِ دیوانگی سنہ ۱۲۲۶ھ اور ۱۲۳۳ھ کے مابین داخل کیا گیا ہے غالباً یہی اس کا زمانۂ تالیف بھی ہے ۔ اس کا ایک عکس ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (علی گڑھ) کے پاس ہے دوسرا عکس جو ہلکے مٹیالے رنگ کے کاغذ پر ہے اور اصل مخطوطہ کے سائز پر تیار کیا گیا ہے وہ اکبر علی خاں (رامپور) کے پاس ہے ۔''[1]

افسوس کہ اس تذکرے کے تراجم تک میری رسائی نہ ہو سکی اور اس کا ذکر تشنہ رہا ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ رسالۂ تذکرات ، ص ۷۰ - ۷۱ ۔

دیوانِ جہاں

مصنف کا نام بینی نرائن، تخلص جہاں ہے۔ والد کا نام مہاراجا لکشمی نرائن تھا۔ نواح لاہور کے رہنے والے تھے۔ بینی نرائن جہاں معاشی پریشانیوں سے مجبور ہو کر کلکتہ گئے وہاں بھی کئی سال بے روزگار رہے، لیکن جیسا کہ خود بینی نرائن نے منظوم دیباچے میں ظاہر کیا ہے، منشی سید حیدر بخش حیدری سے ان کی ملاقات ہوئی اور حیدری کے ذریعے ان کی رسائی مشہور مستشرق ٹامس روبک سے ہوئی۔ روبک نے انھیں کسی خدمت پر مامور کرا دیا اور بینی نے انھی کی ایما پر اُردو شعرا کا یہ تذکرہ مرتّب کیا۔ جیسا کہ فرہنگ سخن وراں سے ظاہر ہوگا بینی نرائن جہاں کا ذکر کریم الدین کے طبقات الشعراء اور دوسرے تذکروں میں بھی آیا ہے۔ سید محمد ایم۔ اے۔ اور مولانا حامد حسن قادری نے بھی ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔[1]

تذکرے کے آخر میں اس کے اتمام کا سال ۱۸۱۲ع/۱۲۲۷ھ دیا ہوا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"تمام شد بتاریخ سی ام (۳۰) ستمبر ۱۸۱۲ع بتوفیق اللہ۔"[2]

پروفیسر کلیم الدین احمد نے کریم الدین کے حوالے سے دیوانِ جہاں کے تکملے کا سال ۱۸۱۳ع لکھا ہے یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۵۹ع میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے "کرنٹ سٹڈیز" کے خاص نمبر کی حیثیت سے مطبع لیتھو

۱۔ (الف) ارباب نثر اُردو، مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن ۱۹۳۷ع۔
(ب) داستان تاریخ اُردو، مطبوعہ آگرہ، ۱۹۵۷ع، طبع دوم۔

۲۔ دیوانِ جہاں، ص ۲۷۹ تا ۲۸۶، مرتّبہ کلیم الدین احمد، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۹ع۔

پریس پٹنہ سے شائع کر دیا ۔ اس کے متن کی بنا دیوانِ جہاں کے قلمی نسخہ مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ پر رکھی گئی ہے ۔ یہی چھوٹی تقطیع کی کتابی صورت میں دستیاب ہے اور یہی ہمارے پیشِ نظر ہے ۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم نے بھی ایک مضمون میں ''دیوانِ جہاں'' پر روشنی ڈالی ہے اور سالِ تصنیف ۱۸۱۲ع بتایا ہے ۔[1]

تذکرہ اُردو زبان میں ہے اور اس میں آفتاب شاہ عالم سے لے کر انعام اللہ خاں یقین کے ذکر تک ایک سو تئیس شعرا شامل ہیں ۔ شعرا کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی ہے ۔ شعرا کے تراجم کے بعد ''رباعیات'' کے عنوان سے آٹھ صفحوں میں متفرق شعرا کے اشعار ہیں ۔ شعرا کے نام یا تخلص کا ذکر نہیں ہے ۔ بعض اشعار میں تخلص آ گیا ہے اس سے شاعر کا سراغ مل جاتا ہے ۔ رباعیات کے عنوان کے تحت رباعیاں اور قطعے دونوں درج کیے گئے ہیں ۔ اس کے صفحہ ۲۸۷ سے لے کر ۳۳۳ صفحے تک ''مطلعات'' کے عنوان سے مختلف شعرا کے مطلعے درج ہیں ۔ اس کے بعد ''فردیات'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے اور ص ۳۳۴ سے ص ۳۲۷ تک مختلف اشعار لکھے گئے ہیں بعد ازاں ص ۳۳۸ پر یہ عبارت ملتی ہے :

''وے کئی غزلیں طرحی جو پچیسویں ماہ جولائی کو شہر کلکتہ کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں یہ ہیں ۔''

ان میں کاظم علی جوان ، حیدر بخش حیدری ، سید جعفر علی رواںؔ ، افتخار الدین علی خاں شہرت ، مرزا ہاشم علی عیاں ، ابوالقاسم خاں قاسم ، مرزا قاسم علی ممتاز اور مرزا لطف علی ولا کی طرحی غزلوں کے ساتھ ساتھ ایک سطری تراجم بھی شامل ہیں ۔ ان میں جوان ، حیدری ، شہرت ، قاسم اور ولا کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے صرف رواں ، عیاں اور ممتاز کے نام نئے ہیں ۔ اس لحاظ سے اس میں شاعروں کی تعداد ایک سو چھبیس ہو گئی ہے ۔

''دیوانِ جہاں'' حقیقتاً بیاض ہے اسے تذکرہ صرف اس لیے کہہ لیجیے کہ اس میں منتخبات کلام سے پہلے شاعر کا نام اور تخلص دیا ہوا ہے ۔ کسی

۱۔ ''تحقیق کی روشنی میں'' ، ص ۳۳۳ تا ۳۶۴ ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۶۳ع ، طبع اول ۔

جگہ بھی نثری ترجمہ ایک یا نصف سطر سے زیادہ نہیں ہے ۔ جیسا کہ مؤلف کے منظوم دیباچے کے ان اشعار سے واضح ہے :

تلاش و سعی کر کے تب فراواں
جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں
انھوں کے جمع کر اشعار یکسر
سوا ان کے جو تھے نامی سخنور
انھوں کی بھی غزل اور شعر لکھے
بہ ترتیب و بائیں جمع کر کے
خدا کے فضل سے دے اس کو انجام
میں دیوانِ جہاں اس کا رکھا نام

اس لیے سوانحی اور تنقیدی لحاظ سے تو یہ تذکرہ یکسر غیر اہم ہو جاتا ہے ۔ اس کا صرف ایک ہی فائدہ ہے وہ یہ کہ اس کے ذریعے معروف اور غیرمعروف دونوں قسم کے شاعروں کا منتخب کلام دستیاب ہو جاتا ہے ۔ یہ منتخبات چوں کہ خاصے طویل ہیں اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ جن شاعروں کے دیوان مرتّب نہیں ہو سکے یا چھپ کر ہمارے سامنے اب تک نہیں آ سکے ان کے کلام کا ایک حصہ اس میں محفوظ ہو گیا ہے اور اس کے ذریعے ہم اُن شاعروں کے رنگِ سخن کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں ۔ منتخباتِ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روش عام کے مطابق صرف غزل کے اشعار نہیں ہیں بلکہ مخمسات ، رباعیات اور واسوخت وغیرہ بھی شامل ہیں ۔ اس تذکرے سے بعض ایسے اشعار کا بھی سراغ لگ جاتا ہے جو ہیں کسی دوسرے کے اور منسوب و مشہور ہو گئے ہیں کسی اور سے ۔ مثلاً ڈاکٹر مختار الدین احمد نے یہ غزل جس کا مطلع درجِ ذیل ہے :

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز
دیکھ کر جاتا رہا تجھ کو نظر کا امتیاز

مرزا نوشہ اور اسد اللہ خاں غالب سے منسوب کر دی ہے لیکن دیوانِ جہاں سے پتا چلا کہ یہ مرزا نوشہ کی نہیں بلکہ اس تخلص کے دوسرے شاعر نیاز بیگ غالب

کی ہے ۔[۱] بطور مثال دو شاعروں کے تراجم یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

۱۔ اثر تخلص میر محمد نام خواجہ میر درد کے بھائی تھے ۔ (ص ۱۴)

۲۔ یقین تخلص نام انعام اللہ خاں ، اظہر الدین خاں کے بیٹے ، مرزا جانِ جاناں کے شاگرد اور موجدِ ریختہ ۔ دلی کے رہنے والے ۔ (ص ۲۷۸)

☆ ☆ ☆

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کا مضمون "غالب اور غالب تخلص کے اُردو شعرا" ، صحیفہ لاہور ، غالب نمبر ، ۱۹۶۹ع ۔

تذکرۂ بے جگر

مصنف کا پورا نام خیراتی لعل اور تخلص بے جگر ہے۔ "تذکرۂ بے جگر" کا جو واحد مخطوطہ اب تک دستیاب ہوا ہے اس میں دیباچہ ہے نہ خاتمہ اور نہ کسی دوسرے تذکرے میں بے جگر کے حالات ملتے ہیں۔ شعرا کے تراجم کے تحت "ب" کی ردیف میں البتہ بے جگر نے اپنے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس سے ان کی ولدیت، سکونت، خاندان اور تعلیم و تربیت وغیرہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ حد درجہ انکسار کے ساتھ انھوں نے اپنے حالات میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ "میں اپنے نام کو زندہ رکھنے کے شوق میں تذکرہ مرتب کر رہا ہوں۔ اگر اس میں کوئی نقص یا کمزوری ہو تو قارئین اس کی اصلاح کر دیں۔" اصل عبارت کی نوعیت یہ ہے:

"افسردہ طبع پژمردہ خاطر آشفتہ وضع . . . آبلہ پا در میدان دشوار گذار شاعر سرگران افتادہ . . . سخنورے مضطرب الاحوال یکسر بتاسف آشنا بندہ خیراتی لعل بے جگر مؤلف این تذکرۃ الشعرا شخصے است کہ در میدان سخن با وصف بے جگری علم بوالہوسی می ارازد [کذا] . . . می خواست کہ در گروہ نادرالاذکارانِ سخن دان داخل نماید . . . بنا بر آن چند شعر از کلام شکستہ بستہ خود کہ فی الحقیقت ہر یکے را از آنہا پارۂ جگر می تواند گفت درین صحیفۂ سخن نسبت ارقام پذیرفت اگر دقیقہ جویانِ خوردہ جو و باریک بینان سخن گو سقمے و نقصے بہ نظر آرند قلم بہ اصلاحش پردازند۔" (ورق ۲۵ الف و ۲۵ ب)

اس کے بعد تین سو کے قریب اپنے اشعار بطور نمونۂ کلام درج کیے ہیں ان میں سے بعض اشعار حاشیے میں ہیں، بعض قلم زد کر دیے ہیں اور بعض ترمیم و اصلاح شدہ ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے بے جگر کے ترجمے سے ان کی زندگی کے متعلق کوئی مفید اطلاع نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنے کچھ حالات تذکرے

کے دیباچے یا خاتمے میں اس زمانے کے رواجِ عام کے مطابق ضرور لکھے ہوں گے لیکن دستیاب مخطوطہ دیباچہ اور خاتمے سے عاری ہے ۔ تذکرے کے دوسرے تراجم پر نظر ڈالنے سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ وہ ذات کے کائستھ اور سکندر آباد کے باشندے تھے ۔ اس کے ثبوت میں وہ تراجم پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا تعلق بے جگر کے بعض عزیزوں سے ہے ۔ بے جگر نے لالہ کنھیا لعل غبار کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

"لالہ کنھیا لعل غبار سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الرشید لالہ مشتاق رائے کائستھ سکندر آبادی . . . حالانکہ جوان نو مشق است . . . مگر تلاش و فکر مرغوب دارد . . . اگرچہ بمقتضائے خلق نیکو و طبع آشنا پرست بہ خاطر داری دوستان خوگرش افتادہ الا باین فقیر بے مقدار بپاس ہم وطنی و برادریہا زیادہ تر مرتبط اخلاص می باشد ۔"

اس ترجمے کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ خیراتی کا اصل وطن سکندر آباد تھا اور لالہ کنھیا لعل غبار ان کے قریبی عزیزوں میں تھے ۔ لالہ امولک رائے کی موت کا تذکرہ بڑے دردناک لہجے میں اس طرح کیا ہے :

"لالہ امولک رائے کائستھ پھناگر [بھٹناگر] از روسائے قدیم سکندر آباد عزیزان صمیم این احقر العباد بودہ یعنی پدرش والا قدرش ہمپت رائے برادر خالہ زادۂ من است . . . حیف ہزار حیف کہ نہال ریعان عمرش در عین بہار شباب بہ تیشۂ قضا ز بیخ در افتاد . . . ناگاہ ۱۲۳۷ھ . . . آن قرۃ العین سعادت ودیعت حیات بہ قاضی اجل سپرد . . . تاریخ وفات او لالہ ہرگوپاس [ہرگوپال] تفتہ این چنین یافتہ . . . و این غم خوار از جان بیزار قطعہ گفتہ . . . ۔"

اس ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ بے جگر ذات کے بھٹناگر کائستھ تھے ، ان کا تعلق سکندر آباد کے قدیم رئیس خاندان سے تھا اور امولک رائے نامی کے والد ان کے خالہ زاد بھائی تھے ۔ بعض تراجم سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بے جگر کا قیام زیادہ تر اپنے ہی علاقے یعنی بلند شہر اور میرٹھ کے نواح میں رہا ہے اور جن شاعروں کا ذکر انھوں نے اپنے تذکرے میں کیا ہے اُن سے بعض ان کے دوستوں اور ملنے والوں میں تھے ۔ چنانچہ سید قاسم علی قاسم کے ترجمے میں لکھا

ہے کہ :

''بہ تقاضائے دوستی، خود ترجمۂ احوالش مع کلام آبدار نزد این مؤلف خاکسار معرفت لالہ ہرگوپال فرستادہ ۔''

اس کے بعد مؤلف نے قاسم سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور قاسم کی عمر ۲۵ سال بتائی ہے ۔ چوں کہ مؤلف نے قاسم کو اپنا دوست ظاہر کیا ہے اس لیے ممکن ہے تذکرے کی تالیف کے وقت ان کی عمر بھی قاسم کی عمر سے قریب رہی ہو ۔ کم یا زیادہ کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے ۔

تذکرے کے مطالعے سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ بے جگر اُردو فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور عربی سے بھی ناواقف نہ تھے ۔ بعض تراجم میں مؤلف کے کہے ہوئے قطعات تاریخ وفات فارسی بھی ملتے ہیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ وہ فارسی میں شعر گوئی کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن اصل میں وہ اُردو ہی کے شاعر تھے اور اپنے انتخاب کلام میں اُنھوں نے اُردو ہی کے تقریباً تین سو اشعار درج کیے ہیں ۔ اس جگہ ان کی ایک رباعی اور ایک غزل نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہے :

ہاتھ سے قاتل کے کل اک نواجوں مارا گیا
بے جگر شاید نہ ہو دیکھو کہاں مارا گیا

بس کہ جیتے جی وہ خوں پیتا تھا اپنا رات دن
ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا وہ جہاں مارا گیا

تھا یہی قسمت میں اس کی کیا کریں ہم ہائے ہائے
دل لگا کر فتنہ‌گر سے ناگہاں مارا گیا

دیکھ کر آتے ہوئے قاتل کو یوں اٹھا تھا وہ
آہ اس کی ہو گئی دشمن زباں مارا گیا

نعش بھی اس کی نہ پائی آہ مقتل میں کہیں
اس بچارے کا کہاں ایسا نشاں مارا گیا

ان سے جا پوچھا کسی نے کس جگہ اور کون وقت
آپ کے ہاتھوں اجی وہ ناتواں مارا گیا

تو لگے کہنے وہ جھنجلا کر ہمیں کیا یاد ہے
کس جگہ کس وقت کیا جانے کہاں مارا گیا

گھبرائے سے کچھ جو آپ آ بیٹھے ہو
شاید کسی بت سے دل لگا بیٹھے ہو
دینا دل کا بہت برا ہے حضرت
بس ہاتھ اُٹھاؤ بھی کیا بیٹھے ہو

ان اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بے جگر کوئی بلند پایہ شاعر نہ تھے بلکہ شاعری کو اس زمانے کے ایک محبوب مشغلے کے طور پر اپنائے ہوئے تھے ۔ ان کی فارسی نثر میں بھی عالمانہ شان نہیں ہے ہاں رعایت الفاظ کی مدد سے وہ اپنی سادہ نثر کو رنگین بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

"تذکرۂ بے جگر" ہنوز غیر مطبوعہ ہے ، ڈاکٹر وحید قریشی البتہ اسے اشاعت کے لیے مرتّب کر رہے ہیں ۔ اب تک صرف ایک قلمی نسخہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے ۔ یہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے اور اس کے مختصر حوالے بعض مقالوں میں ملتے ہیں ۔ انڈیا آفس کے نسخے کی مائیکرو فلم پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں راقم الحروف نے دیکھی ہے ۔ مخطوطہ اچھی حالت میں ہے اور جلی حروف میں لکھا گیا ہے ۔ لیکن مؤلف بہت بد خط ہے ۔ چوں کہ ہر ورق کے حاشیے کو بھی متن کے لیے استعمال کیا گیا ہے اس لیے مخطوطے کو گھما گھما کر مختلف رخوں سے پڑھنا پڑتا ہے ۔ جگہ جگہ بعض سطریں اور اشعار قلمزد کیے گئے ہیں ، کہیں ان کی اصلاح کی گئی ہے ، کہیں متن کو بالکل بدل دیا گیا ہے ۔ اس کاٹ چھانٹ اور بدخطی کے سبب اس کے متن کا پڑھنا آسان نہیں رہا ، سخت دیدہ ریزی اور جانکاہی کی ضرورت ہے ۔

اس نسخے کی ایک فوٹو سٹیٹ کاپی ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس ہے ۔ اس کا مبیضہ بھی اُنھوں نے تیار کرایا ہے اور مشفق خواجہ کے توسط سے یہی اس وقت میرے سامنے ہے ۔ اس میں نہ دیباچہ ہے ، نہ خاتمہ اور نہ ترقیمہ ۔ مؤلف نے اپنا ذکر بہ حیثیت شاعر کیا ہے لیکن تذکرے کی تاریخ تالیف پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ، اس لیے اس کے سالِ تصنیف کے تعین میں اس سے کوئی مدد نہیں ملتی ۔

نثار احمد فاروقی نے طبقاتِ سخن مؤلفہ غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

''بے جگر نے ایک جگہ منشی مہر چند مہر لاہوری (ساکن لکھنؤ) کی تاریخِ ولادت ۱۱۸۲ھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ان کی عمر ۵۵ سال ہے - اس حساب سے دیکھا جائے تو بے جگر نے اپنا تذکرہ ۱۲۳۷ھ کے آس پاس مرتّب کیا ہے -''[1]

مہر کے بارے میں بے جگر کے اصل الفاظ یہ ہیں :

''مہر چند در سن یک ہزار یک صد و ہشتاد و دو ہجری روز یک شنبہ در کوڑا جہان آباد[2] رو نموده . . . تا حال کہ عمر شریفش بہ پنجاه و پنج سال رسیده بخدمت لائقہ حیات مستعار را می گزراند -''

اس بیان کی روشنی میں نثار احمد فاروقی کا یہ کہنا کہ تذکرۂ بے جگر ۱۲۳۷ھ کے آس پاس مرتّب ہوا ہے کچھ ایسا غلط نہیں ہے لیکن فاروقی صاحب نے غالباً اس تذکرے کے دوسرے تراجم پر نظر نہیں ڈالی ورنہ وہ ۱۲۳۷ھ کے بجائے ۱۲۴۲ھ کے آس پاس لکھتے ، اس لیے کہ ۱۲۴۲ھ تک کے اندراجات کا ثبوت اس کے بعض تراجم سے ملتا ہے - ۱۲۴۰ھ اور ۱۲۴۱ھ کے مندرجات تو کئی جگہ نظر آتے ہیں - چند مثالیں دیکھیے -

سید قاسم علی قاسم کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ ۱۲۳۵ھ میں پنجاب کی طرف گئے ۱۲۳۶ھ میں کول واپس آئے اور ۱۲۴۰ھ میں مؤلف سے ملاقات ہوئی - اصل عبارت یہ ہے :

''بہ تقریبِ رخصت . . . بتاریخ یازدہم جمادی الثانی سن یک ہزار و دو صد

۱- نگار (لکھنؤ) ، ص ۳۵ ، بابت ستمبر ۱۹۵۹ع -

۲- کوڑا جہان آباد ، ضلع فتح پور ہسوہ (یو - پی) کا ایک تاریخی قصبہ ہے - مولانا حسرت موہانی کی ننھال تھی اور اُن کے اس شعر میں اسی قصبے کی طرف اشارہ ہے :

اب تلک موجود ہے کچھ کچھ لگا لائے تھے ہم
وہ جو اِک لپکا کبھی خاکِ جہان آباد سے

و سی و پنج عطف عنان بطرف پنجاب . . . بہرکیف پس از نہ ماہ بتاریخ بستم ربیع الثانی ۱۲۳۶ھ کہ از آنجا عود کردہ در کول رسید . . . راقم الحروف را نیز فی سنہ یک ہزار دو صد و چہل ہجری . . . اتفاق ملاقاتے دست دادہ ۔"

مصحفی کے بارے میں لکھا ہے :

"آخر در لکھنؤ فی سن یک ہزار و دو صد و چہل ہجری نقد حیات بہ
۱۲۴۰ھ
متقاضیانِ اجل سپرد ۔"

منیر کے ترجمے میں ہے کہ :

"منیر دہلوی سلمہ اللہ تعالٰی وجیہہ الدین نام دارد . . . فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل . . . در قصبۂ مراد نگر من توابع نواح ضلع میرٹھ . . . اتفاقِ ملاقات دست داد ۔"

غلام علی راسخ کے ذکر میں لکھا ہے کہ :

"آخرکار فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ازین جہانِ فانی بعالم جاودانی شتافت ۔"

مذکورہ بالا چاروں ترجمے بلاشبہ ۱۲۴۰ھ کے بعد لکھے گئے ہیں ۔ اس لیے بے جگر کے تذکرے کا تکملہ اس کے بعد کسی سن میں ہوا ہوگا ۔ دو ترجمے اور دیکھیے ۔

الٰہی بخش شوق کے بارے میں مؤلف نے لکھا ہے کہ ۱۲۴۱ھ میں انتقال کیا ، اصل الفاظ یہ ہیں :

"شوق ، الٰہی بخش سلمہ اللہ تعالٰی . . . آخرش بعد چندے فی سنہ یک ہزار دو صد و چہل و یک شوق سیاحت باغِ جنان او را از جان برد ۔"

غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی کے ترجمے میں ہے کہ ۱۲۴۱ھ میں وفات پائی ۔ مؤلف کے الفاظ یہ ہیں :

"آخرش فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و یک در شہر رمضان روز پنج شنبہ ازین جہان گزران برفت و در درگاہ حضرت گنج علم واقع بیرون شہر میرٹھ بہ پہلوئے والد بزرگوار خود جا یافت ۔"

یہ دونوں ترجمے یقیناً ۱۲۴۱ھ کے بعد لکھے گئے ہیں - لیکن اس کے بعد کی تاریخیں بھی ملتی ہیں - میر قاسم علی قاسم کے ذکر میں لکھا ہے :

''میر قاسم علی قاسم سلمہ اللہ تعالیٰ . . . فی سن یک ہزار و دو صد و چہل و دو کہ او را بہ تقریبے کہ از متوطن خود اتفاق رسیدن بہ میرٹھ . . . مسوّد مجموعۂ ہذا در خورد -''

اوپر کی عبارت صاف ظاہر کرتی ہے کہ قاسم کا ترجمہ ۱۲۴۲ھ کے بعد تحریر کیا گیا ہے - ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ تذکرۂ بے جگر ۱۲۴۲ھ کے کچھ دنوں بعد مکمل ہوا ہے - تذکرے میں ۱۲۴۲ھ کے بعد کی کوئی تاریخ مجھے نظر نہیں آئی -

اب رہ گیا سالِ آغاز سو اس سلسلے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے - مؤلف نے کہیں اس کا سراغ نہیں دیا - بعض تراجم کی روشنی میں البتہ اس کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے - نظیر اکبر آبادی کے ترجمے میں بے جگر نے لکھا ہے :

''ولی محمد نام عرف میاں نظیر سلمہ اللہ تعالیٰ کہ از روسائے اکبر آباد شخصے است کہ در فنِ خود بے نظیر . . . تاحال کہ عمر شریفش قریب بہ شصت سال رسیدہ باشد بمسلک نظم کشید -''

نظیر کا سالِ پیدائش ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۵ع اور سال وفات ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ع ہے اس لیے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ نظیر کا ترجمہ ان کی وفات ۱۲۴۶ھ سے پہلے لکھا گیا ہے - کب لکھا گیا ہے ؟ اس کا جواب نظیر کے سالِ پیدائش ۱۱۴۷ھ میں ساٹھ جمع کرنے سے مل سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ نظیر کا ترجمہ ۱۲۰۷ھ میں لکھا گیا ہے - اس لحاظ سے تذکرۂ بے جگر کا سالِ آغاز ۱۲۰۷ھ قرار پاتا ہے - لیکن یہ خیال صحیح نہیں - ''بے جگر'' نے نظیر کی عمر کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے - ان کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے زیادہ رہی ہوگی - ۱۲۰۷ھ میں تذکرے کا آغاز ممکن نہیں ہے - اس کے ثبوت میں تذکرے سے بعض داخلی شہادتیں دی جا سکتی ہیں - مثلاً اس تذکرے کے مآخذ میں آغا حسین قلی خاں کا تذکرہ ''نشترِ عشق'' بھی شامل ہے اور اس کا حوالہ مؤلف نے دو چار جگہ نہیں متعدد جگہ دیا ہے - آغا حسین قلی خاں عشقی اگرچہ

عظیم آباد کے رہنے والے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت سکندر آباد میں مقیم تھے اور وہیں بےجگر نے ان سے ملاقات کی تھی - بےجگر نے عاشقی کا ذکر اپنے تذکرے میں خاصی تفصیل سے کیا ہے - چند سطریں دیکھیے :

''او احوال آبا و اجداد خود را مفصل و شرح (مشرّح) در تذکرۂ تالیف خود ''نشترِ عشق'' می نویسد . . . عاشقی در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ رو نمود چنانچہ در تاریخ میلاد خود گوید . . . والحال از مدت ہفدہ سال کف توسل بدامن اولیاے دولت سرکار کمپنی انگریز زدہ بہ تحصیلداری محالات می گزراند راقم الحروف را نیز در ایام مامور بودنش بہ تحصیلداری سکندر آباد وغیرہ محالات بخدمت سراپا افادات او نیازے حاصل آمد . . . اہلِ سخن را بجان عزیز دارد چنانچہ چند کس موزون طبع مثل لالہ گوپال تفتہ تخلص سکندر آبادی و لالہ اندر سین اورنگ آبادی و مولوی حافظ اکبر علی خاں جالندھری رفیق و شریک ترتیب تذکرہ اش بودند . . . -''

اس ترجمے سے خصوصاً اور ''نشترِ عشق'' کے جا بجا حوالوں سے عموماً یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بےجگر نے اپنا تذکرہ ''نشترِ عشق'' کے تکملہ کے بعد شروع کیا ہے - آغا حسین قلی خاں نے ''نشترِ عشق'' کے دیباچے میں اپنا حال تفصیل سے لکھا ہے اور اپنا سالِ پیدائش ۱۱۹۴ھ ظاہر کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۲۱٦ھ میں سرکاری ملازمت شروع کی اور سترہ سال کے بعد یعنی ۱۲۳۳ھ میں جب کہ ان کا قیام سکندر آباد میں تھا اپنا تذکرہ مکمل کیا لیکن اس کا آغاز انھوں نے ۱۲۲۴ھ میں کر دیا تھا ، چنانچہ دیباچے میں خود لکھتے ہیں :

''القصہ در سنہ یک ہزار و دو صد و بست و چہارم ہجری بہ تسوید این روضۂ دلکشا مصروف گردیدہ -''

یعنی ۱۲۲۴ھ سے مؤلف نے تذکرے کی تسوید کا آغاز کر دیا تھا - اس کے بعد خاتمۂ کتاب میں لکھا ہے :

''در سنہ یک ہزار و دو صد و سی و سہ ہنگامِ تحصیلداری چکلہ

سکندر آباد متعلقہ ضلع علی گڑھ صورت اتمام پزیرفت ۔"[1]

ان صراحتوں کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ نشترِ عشق ۱۲۲۴ھ سے شروع ہو کر ۱۲۳۳ھ میں مکمل ہوا ہے ۔ چونکہ "نشترِ عشق" بے جگر کے ماخذ خاص میں رہا ہے اس لیے انھوں نے اپنے تذکرے کا آغاز ۱۲۳۳ھ کے بعد کسی سن میں کیا ہوگا ۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں تذکرۂ بے جگر ۱۲۳۴ھ اور ۱۲۴۲ھ کے درمیان نو سال کی مدت میں تالیف ہوا ہے ۔ لیکن اس کے زیادہ تراجم ۱۲۳۵ھ اور ۱۲۴۱ھ کے درمیان لکھے گئے ہیں ۔

"تذکرۂ بے جگر" کے مؤلف نے اپنے تذکرے کی تالیف میں پچھلے تذکرہ نگاروں سے خاص مدد لی ہے ۔ اُردو شعرا کے تذکروں میں مصحفی اور مبتلا میرٹھی کے تذکروں کے حوالے تو جگہ جگہ ملتے ہیں ۔ بعض تراجم میں صرف مصحفی سے مدد لی گئی ہے بعض میں صرف مبتلا سے اور بعض میں دونوں سے ۔ چند مثالیں دیکھیے :

اشفاق کے ترجمے میں ہے :

"غلام محی الدین عشق در تذکرۂ طبقات سخن نوشتہ ۔"

آشفتہ دہلوی کے ذکر میں ہے :

"غلام ہمدانی مصحفی در تذکرۂ خود می نگارد ۔"

آبرو کے بارے میں لکھا ہے :

"بقول مصحفی میان نجم الدین نام داشت . . . و نیز در تذکرۂ طبقاتِ سخن مرقوم است . . . ۔"

میر اکبر علی کے سلسلے میں لکھا ہے :

"استفادۂ شعر از مصحفی برداشتہ چنانچہ اُو در تذکرۂ خود آوردہ ۔"

مرزا جواد احقر کے ترجمے میں ہے :

"بقول مصحفی جوان حلیم و سلیم بود ۔"

---

۱ - بحوالۂ مقدمۂ دستور الفصاحت ، ص ۶۱ - ۶۲ ، از مولانا امتیاز علی خاں عرشی مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع -

افسر کے سلسلے میں لکھا ہے :

''مصحفی گوید کہ وے الحال بحکم موزونیت طبع فکر مرثیہ و سلام برواج زمانہ می کرد ۔''

شیر علی افسوس کے بارے میں لکھا ہے :

''بقول مصحفی کہ او را در لکھنؤ دیدہ . . . و صاحب طبقاتِ سخن آوردہ . . . ۔''

امین کے متعلق لکھا ہے :

''مصحفی در ایام قیام شاہجہان آباد او را ہمسائیگان خود شریک صحبت مشاعرہ نوشتہ ۔''

غرضکہ مصحفی اور عشق و مبتلا میرٹھی کے تذکروں کا حوالہ اکثر تراجم میں ملتا ہے ۔ دونوں تذکرے شروع سے لے کر آخر تک بے جگر کے سامنے رہے ہیں لیکن ان کے علاوہ اور کئی تذکروں سے انھوں نے اپنے تذکرے کی تالیف میں مدد لی ہے ۔ چند اقتباسات دیکھیے :

سراج الدین علی خاں آرزو کے ترجمے میں لکھا ہے :

''بقول لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی مؤلفِ ''تذکرۂ گل رعنا'' . . . و تذکرۃ الشعراء مسمٰی بہ مجمع النفائس . . . بہم رسانیدہ . . . از عبارت تذکرۂ خزانۂ عامرہ اندوختہ میر غلام علی آزاد بلگرامی مستفاد است . . . آغا حسین قلی خاں عشقی از روے تذکرۂ گلِ رعنا . . . در تذکرۂ خود ''نشترِ عشق'' می نویسد . . . در تذکرۂ خوشگو است ۔

انجام کے بارے میں لکھا ہے :

''بقول صاحبِ تذکرۂ گلِ رعنا بحضور فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ بغایتے تقریب گردید . . . شفیق مؤلفِ 'گلِ رعنا' تاریخ انتقالش بالفاظ یک عدد در نظم آوردہ . . . دیگر آغا حسین قلی خاں عشقی عظیم آبادی صاحب 'تذکرۂ نشترِ عشق' در یافتہ ۔''

ان ترجموں سے پتا چلتا ہے کہ تالیف تذکرہ کے وقت شفیق اورنگ آبادی غلام علی آزاد بلگرامی اور آغا حسین قلی خاں عشقی کے تذکرے بھی مؤلف کے سامنے رہے ہیں ۔

بعض شعرا کے متعلق بے جگر کو علم تھا کہ وہ صاحب تذکرہ ہیں لیکن تذکرہ ان کی نظر سے نہیں گزرا ۔ چنانچہ اعظم الدولہ سرور کے بارے میں لکھا ہے :

''تذکرۂ کثیر الحجم ہندی از تالیفاتِ خود دارد کہ ہنوز بہ نظر راقم آثم نہ رسیدہ ۔''

قائم کے ترجمے میں ہے :

''تذکرۂ ہندی تالیف کردہ مگر ہنوز بہ نظر این خاکپاے شعرا نہ رسیدہ ۔''

خوب چند ذکا کے بارے میں لکھا ہے :

''تذکرۂ ہندی تالیف کردہ مگر ہنوز بہ نظر این خاکسار بے جگر نہ رسیدہ است ۔''

شرف الدین مسرور ابن مبتلا میرٹھی مؤلف طبقات الشعراء کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ وہ صاحب تذکرہ تھے اور اُردو زبان میں ایک ضخیم تذکرہ لکھا تھا ، اصل الفاظ یہ ہے :

''او ہم خود تذکرۃ الشعراء نوشتہ بہ ضخامت ہژدہ و نود جزو کہ عبارت نثرش بزبانِ اُردو است ۔'' (ورق ۱۶)

آگے چل کر میر وزیر علی مسرت کے ترجمے میں بھی مسرور کے تذکرے کا ذکر کیا ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف کی نظر سے مسرور کا تذکرہ گزرا تھا :

''بروایت شرف الدین مسرور مؤلف تذکرہ اُردو او بمرور عرصہ چند سال نزد پدر بزرگوارش غلام محی الدین عشق صاحب طبقاتِ سخن آمدہ بود ۔''

ایک اور جگہ مسرور کے تذکرے کا حوالہ ملتا ہے ۔ مانی کے ذکر میں لکھا ہے کہ :

''خواجہ محمد امین متخلص بہ مانی (قوسین میں معنی لکھا ہے) . . . بقول مسرور صاحب تذکرہ اُردو در کول ماندہ بود و ہمانجا طائر روحش از قفس تن پرواز کرد ۔''

ضمناً فتح علی حسینی کے تذکرے کا ذکر بھی شیخ بقاء الدین بقا کے ترجمے میں آیا ہے ۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کے متعلق بھی مؤلف کو یہ معلوم تھا

کہ وہ صاحب تذکرہ ہیں ، چنانچہ قدرت اللہ قاسم کے ترجمے میں لکھا ہے :

''تذکرۂ ہندی از تالیفات خود دارد ۔''

میر حسن کے ذکر میں لکھا ہے :

''بہ ترتیب مثنوی ہائے متعددہ مع دیوان ضخیمے و یک تذکرۂ ہندی خصوصاً در مثنوی آخر سحر البیان داد شیرین گفتاری ہا دادہ ۔''

ان تراجم سے اتنی بات تو یکسر واضح ہو جاتی ہے کہ خیراتی لعل بے جگر نے بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح اپنے مآخذ پر پردہ نہیں ڈالا بلکہ جہاں سے جو کچھ اور جتنا کچھ لیا ہے اس کا سراغ دے دیا ہے ۔ نتیجۃً ان کا تذکرہ شعرا کے حالات کے سلسلے میں خاصا وقیع اور اہم ہو گیا ہے ۔ بے جگر نے دوسرے تذکروں سے مدد لینے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے بہت کچھ اضافے بھی کیے ہیں ، اس اضافے کا اندازہ شعرا کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے ۔ بے جگر نے اُردو شعرا کے جن تذکروں کے حوالے دیے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس میں دو سو سے زائد شعرا کا ذکر آیا ہو ۔ اس کے برعکس بے جگر کے تذکرے میں چار سو کے قریب شعرا کے تراجم شامل ہیں ۔ خاص بات یہ ہے کہ مؤلف نے شعرا کے تلمذ ، ولدیت ، سکونت ، پیشہ ، قیام ، عمر ، سالِ پیدائش وغیرہ کی نشان دہی بھی اکثر جگہ کر دی ہے ۔ تاریخِ وفات کے اندراج کا اہتمام بھی اکثر جگہ کیا گیا ہے ۔ مثلاً آبرو کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۴۶ھ میں فوت ہوئے ۔ اصل عبارت یہ ہے :

''بہ شب چہارم رجب سن ست و اربعین و مأت و الف در گزشت و قریب مرقد سید حسن رسول نما واقع شاہجہان آباد مدفن یافت ۔ تاریخِ وفاتش ازین رباعی و قطعہ برآوردہ ام . . . و لالہ ہرگوپال تفتہ این قطعہ نوشتہ . . . ۔''

کلب علی خاں فائق رام پوری آبرو کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک میرا علم ہے اُردو کا صرف ایک تذکرۂ شعرا ایسا ہے جس میں یہ سن دیا ہے ۔ یہ خیراتی لعل جگر کا تذکرہ ہے جو عہدِ اکبر ثانی کی تصنیف ہے ۔[۱] اس قسم کی اطلاعات اکثر شعرا کے متعلق دی ہیں ۔ چند مثالیں

۱۔ اوریئنٹل کالج میگزین لاہور ، ص ۹ ، بابت مئی ۱۹۶۰ع ۔

دیکھیے :

سراج الدین علی خاں آرزو ، متوفیٰ ۱۱٦۹ھ :

"بتاریخ بست و سوم ربیع الثانی یک ہزار و یک صد و شصت و نہ چراغ
۱۱٦۹ھ
محفل ملائک شد ۔"

جرأت ، قلندر بخش ، متوفیٰ ۱۲۲۴ھ :

"آخر در سن یک ہزار و دو صد و بست و چہار ہجری رقعۂ قضا تار
۱۲۲۴ھ
زندگانیش را از ہم گسیخت . . . این بے جگر کم استعداد نیز قطعہ نوشتہ ۔"

حاتم ظہور الدین ، متوفیٰ ۱۲۱۰ھ :

"بہ عمرے کہ قریب صد سال رسیدہ باشد در شاہجہان آباد فی سن یک ہزار و دو صد و دہ نقد جان خود را بہ سائلان قضا بخشیدہ ۔"

حیرت اجودھیا پرشاد ، متوفیٰ ۱۲۳۴ھ :

"آخر در عمر سی و پنج سالگی فی سنہ یک ہزار و دو صد و سی و چہار ودیعت حیات مستعار بمتقاضی قضا سپردہ ۔ راقم در تاریخ وفاتش می نگارد . . . گفتہ ہم می آرد . . . ۔"

حسن غلام حسن ، متوفیٰ ۱۲۰۱ھ :

"قصہ مختصر فی سن یک ہزار و دو صد و یک در غرۂ محرم کامش . . . از آب تیغ قضا سیراب گردید ۔ چنانچہ 'شاعر شیرین زبان' مادۂ تاریخش از تلاش مصحفی است ۔ لالہ ہرگوپال تفتہ این تاریخ وفاتش نوشتہ ۔"

حشمت میر محتشم علی ، متوفیٰ ۱۱۶۳ھ :

''آخر در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت وسہ بمرگِ مفاجات در گزشت ۔''

خواجہ میر درد ، متوفیٰ ۱۱۹۹ھ :

''آخر بتاریخ بست و چہارم صفر روز جمعہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و نہ این جہان پردرد را گزاشت برادرش سید محمد مرحوم متخلص بہ اثر در تاریخ انتقالش فرمودہ . . . قطعہٴ ہندی ہدایت اللہ خان نیز از سالِ وفات خبرے دہد . . . لالہ ہرگوپال تفتہ این تاریخ گفتہ . . . راقم السطور حین التالیف مجموعہٴ ہذا بہ ارتحالش این قطعہ موزون کردہ . . . ۔''

محشر ، متوفیٰ ۱۲۰۸ھ :

''چون در سنہ یک ہزار و دو صد و ہشت بہ غرۂ ماہ محرم قابو یافتہ او را بہ بے کسی کشتند . . . عمرش بہ قریب سی سال رسیدہ باشد ۔''

ناصر نواب ناصر جنگ ، متوفیٰ ۱۲۲۰ھ :

''آخری فی سنہ یک ہزار و دو صد و بست کوسِ رحلت بعالم جاودانی نواخت شعراے موزون طبع تاریخ انتقالش بہ نظم آوردند کہ یک دو قطعہ ازان ہا مسطور می شود ۔''

زور آور خاں دل ، متوفیٰ ۱۲۳۵ھ :

''آخرش فی سنہ یک ہزار دو صد و سی و پنج در مولد خود وفات یافت ۔''

نامی لالہ امولک راے ، متوفیٰ ۱۲۳۷ھ :

''حیف ہزار حیف کہ نہال ریعان عمرش در عین بہار شباب بہ تیشہٴ قضا از بیخ در افتاد . . . یعنی ناگاہ بتاریخ بست و چہار شہر شوال روز

یک شنبہ چہار گھڑی روز بر آنکہ کہ سنہ یک ہزار و دو صد و ... و ہفت ہجری . . . بہ قاضی اجل سپرد ۔"

میر تقی میر ، متوفی ۱۲۲۵ھ :

"بعد تقطیعِ مراحل نود و شش سنین در سال یک ہزار و دو صد و بست و پنج ہجری بوصالِ جانانِ حقیقی پیوست مصحفی قطعۂ تاریخش . . . انشا کردہ و لالہ ہرگوپال تفتہ تاریخ وفاتش نوشتہ ۔"

واقعات اور تاریخِ وفات کے سلسلے میں سنین دینے کا یہ اہتمام اکثر جگہ ملتا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح مؤلف نے تذکرہ نگاری کو ادبی تاریخ کے قریب تر لانے کی کوشش کی ہے ۔

اس تذکرے کی تنقیدی حیثیت کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اس کی تاریخی و سوانحی اہمیت مسلّم ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ مؤلف نے اکثر جگہ شعرا کے متعلق ان کے اصل نام ، ولدیت ، سکونت ، تلمّذ ، عمر ، مشغلہ اور سالِ وفات وغیرہ کا سراغ دے دیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے یا تو ذاتی معلومات کی بنا پر لکھا ہے یا دوسرے تذکرہ نگاروں کے حوالے سے لکھا ہے ۔ حوالوں کی تفصیل پچھلی سطور میں آ چکی ہے ، رہی ذاتی معلومات کی بات سو اس کا ثبوت بھی متعدد تراجم سے ملتا ہے ، چند مثالیں دیکھیے :

دیوانہ : مرزا محمد علی خان کے ترجمے میں لکھا ہے :

"در ایامے کہ علاقۂ تحصیلداری سکندر آباد از سرکار صاحبان انگلشیہ مامور بود با راقم الحروف نیز اکثر اتفاق ملاقات دست داد . . . از بس خلیق و یار باش دیدمش ۔ عمر وے چہل سالہ خواہد بود ۔"

میاں امجد علی اصغر کے بارے میں لکھا ہے :

"آثم راقم را بیشتر با پسر کہینش مولوی حیدر علی شاہ در مقام کچورہ معرفت بہ گھاٹم گانون . . . منجملہ علاقہ . . . راجہ بھداوڑ . . . من توابع اکبر آباد اتفاقِ ملاقات دست دادہ . . . دیدمش جوانے بود از بس وجیہہ و یار باش ۔"

وجیہہ الدین منیر کے متعلق لکھا ہے :

"بندہ بسبب علاقہ تھانہ در قصبۂ مراد نگر من توابع ضلع میرٹھ مقیم

بود منیر را بہ عزیمتِ دہلی از میرٹھ در آنجا گزر افتادہ و اتفاق ملاقات دست دادہ تا دیر اشعار خود خواند و این مشتاق را مسرور گردید ۔"

لالہ کنور سین مضطر کے ترجمے میں ہے کہ:

"چون بہ تقریب تلاش روزگار بہ رفاقت مسٹر سوڈا صاحب کلکٹر ضلع بلند شہر بہ میرٹھ گزر افتاد با بندہ ہم ملاقاتے شد ۔"

لالہ ٹھاکر پرشاد مضطر[1] کے سلسلے میں لکھا ہے:

"برادرِ کہینش لالہ گنگا پرشاد رند[2] تخلص و آخِ جوالہ پرشاد آزر[3] خلف بشن چند لکھنوی است ہر سہ برادر از چندے بہ سبب علاقہ روزگار در

۱۔ "پنڈت کشمیری ، مضطر تخلص ، عمرش ہیژدہ سالہ شاگرد طالب" ریاض‌الفصحا ، ص ۳۱۷ ۔

۲۔ رند تخلص ، گنگا پرشاد لکھنوی کشمیری ، از تلامذۂ جرأت است ، گلشن بے خار ، ص ۸۹ ، نصراللہ خاں خویشگی کہتا ہے کہ جرأت کا شاگرد نہ تھا ، نظیرالدین حسن شائق تخلص کا شاگرد تھا ، میرا دوست ہے ۔ اب (قبل تالیف تذکرہ مابین ۱۲۶۰ھ تا ۱۲۷۰ھ) ، سررشتہ دار کلکٹری ضلع بجنور ہے ۔ بریلی ، میرٹھ ، علی گڑھ ، اکبر آباد ، متھرا میں بسلسلۂ ملازمت رہا ہے ۔ مؤلف تذکرۂ بہارِ سخن ، (ص ۱۷۱) نے انتقال ۱۸۵۴ع میں لکھا ہے ۔ (گلشن ہمیشہ بہار ، ص ۱۴۸ ، طبع کراچی) ۔ (ادارہ)

۳۔ بہارِ سخن کے مؤلف نے کہا ہے ، (ص ۲۵ ، بہارِ سخن):

آزر: پنڈت جوالا پرشاد خلف پنڈت دیبی پرشاد . . . اپنے بڑے بھائی گنگا پرشاد رند کے پاس بریلی اور اکبر آباد میں رہے ، پھر محکمۂ پولیس میں ملازم ہو کر متھرا کے کوتوال مقرر ہوئے . . . ۶۵ سال کی عمر پا کر ۱۸۶۲ع میں انتقال فرمایا ۔ مؤلف تذکرۂ شعرائے ہنود (حصہ دوم ، ص ۳) ، نے ولدیت بشن چند صحیح لکھی ہے ۔ مؤلف گلشنِ ہمیشہ بہار ، (تالیف قبل ۱۲۷۰) ، لکھتے ہیں کہ اس کے بھائی رند سے دوستی ہے ۔ اس سے ملاقات نہیں ، اب ناظر نظارت فوجداری ضلع متھرا ہے ، دیکھیے ص ۵۴ ، گلشن ہمیشہ بہار ۔

(ادارہ)

اکبر آباد استقامت دارند راقم الحروف نیز فی سنہ یک ہزار دو صد و چہل و یک با مضطر در خوردم از بس خوش مزاج و یار باش و خوش مقرر و عمدہ معاش یافتہ۔''

عشقی عظیم آبادی کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''راقم‌الحروف را نیز در ایام مامور بودنش بہ تحصیل داری سکندر آباد وغیرہ محالات بخدمت سراپا افادات او نیازے حاصل آمدہ۔''

مرزا نجف علی بیگ بلیغ کے ترجمے میں ہے :

''در ایام مامور بودنش بر علاقہ داری کچورہ معروف بہ گھاٹ کالوار پرمٹ ضلع اکبر آباد راقم‌الحروف را نیز بخدمتش نیازے حاصل آمدہ جوانے دیدم از بس خلیق و خوش وضع۔''

جوالا پرشاد آزر کے متعلق لکھا ہے :

''در بلدۂ میرٹھ ازو ملاقاتے شدہ . . . در اول ملاقات بے تکلف شدے و باخلاق حسنہ پیش آمدے . . . غرض اوقات عمر را بہ خوش مزاجی و ظریف الطبعی بسر می برد۔''

ذاتی واقفیت اور ملاقات کے بارے میں اس طرح کی اطلاعات بہت سے ترجموں میں ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض مؤلف کے عزیز تھے، بعض دوست اور بعض ہمسایہ و ہم شہر اور بعض سے ان کی ذاتی واقفیت اس بنا پر تھی کہ وہ بہ سلسلۂ ملازمت مؤلف کے علاقے میں مقیم تھے۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں میری گنتی کے مطابق ۳۸۶ شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی اور خواتین بھی۔ ان میں متعدد شعرا ایسے ہیں جن کے بارے میں مؤلف کی معلومات بہت محدود ہیں۔ بعض جگہ صرف تخلص اور نام دے کر ایک دو شعر نمونے کے نقل کر دیے ہیں اور صاف لکھ دیا ہے کہ مجھے اس شاعر کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ شعرا کے تراجم ردیف وار بلحاظ حروف تہجی درج کیے گئے ہیں اور ہر تخلص کو ذو معنین بنا کر ابتدائی سطریں رعایت لفظی کے اہتمام کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ چند تراجم کی افتتاحی سطریں دیکھیے یہ (ق) کی ردیف کے شعرا سے متعلق ہیں :

قائم : ''سید قائم علی خان شخصے است کہ قائم الحقیقی از روز ازل دوست دینی و دنیوی بہ قسمتش دادہ۔''

قسمت : ''نواب شمس الدولہ نام سوائے ثروت صوری از معنی قسمتے داشت ۔''

قوت : ''بہ فیضان صحبت میاں قلندر بخش جرأت قوتے بہم رسانیدہ ۔''

قدرت : ''شاہ قدرت اللہ کہ در شعر و شاعری قدرتے کثیر داشت ۔''

قیس : ''احمد علی قیس ، مجنونی عشق جانگزائے این فن او را مانند قیس بباد داد ۔''

قبول : ''کسے از شاعران بودہ کہ کلامش قبول شدہ ۔''

قلندر : ''قلندر بخش کہ بر در سخن . . . قلندری می کند ۔''

قربان : ''حال او را نمی دانم مگر بر کلام مرغوبش بجان و دل قربانم ۔''

تخلص کے ساتھ رعایت الفاظ کا یہ التزام پورے تذکرے میں ملتا ہے ۔

زبان و بیان میں صفائی ہے لیکن القاب و آداب اور صفات کا مسلسل اور بکثرت استعمال بعض جگہ طبیعت پر گراں گزرتا ہے ۔ انتخابِ کلام میں بعض جگہ صرف ایک دو شعر نقل کیے ہیں ، لیکن ممتاز شعرا میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے کئی کئی سو اشعار درج کیے ہیں ۔ انتخابِ کلام کی اسی طوالت نے اس تذکرے کو ضخیم بنا دیا ہے ۔

تذکرے میں لالہ ہرگوپال تفتہ سکندر آبادی کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے ۔ اور تاریخِ وفات کے سلسلے میں اُن کے قطعات بھی متعدد شاعروں کے سلسلے میں درج کیے گئے ہیں ۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس میں لالہ ہرگوپال تفتہ کا ذکر الگ کہیں نہیں آیا ۔ حالاں کہ تذکرے کے آغاز ہی میں شاہ عالم آفتاب کے ذکر میں مؤلف نے بیان کیا ہے کہ آگے ان کا ذکر آئے گا ۔ متعلقہ فقرے یہ ہیں :

''. . . لالہ ہرگوپال سکندر آبادی تفتہ تخلص سلمہ اللہ تعالیٰ کہ بجائے خود مذکور شود و سوائے فکر فارسی کہ بہ لطافت تمام سر انجام دہد مشق تاریخ گوئی ہم بکمال رسانیدہ مادہ ہائے خوب و نادر می تلاشد ۔ چنانچہ دو مصرعہ مصنوع از تواریخ گفتہ اش کہ در ذکر شعرا تذکرۂ نشتر عشق مؤلفہ آغا حسین قلی خاں عشقی عظیم آبادی نوشتہ شدہ ۔''

اس بیان کی روشنی میں لالہ ہرگوپال تفتہ کے ترجمے سے تذکرے کا خالی

ہونا حیرت انگیز ہے - ممکن ہے اصل مسودے ہی میں تفتہ کا ترجمہ نہ ہو یا ضائع ہو گیا ہو -

ایک اور چیز قابلِ توجہ ہے - تذکرۂ بے جگر میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کا ذکر ہے ، لیکن غالب کا ذکر نہیں ہے - حالاں کہ تذکرے کے تکملہ کے وقت تک ان کی شہرت عام ہو چکی تھی - چنانچہ بے جگر کے معاصر تذکرہ نگاروں مثلاً عمدۂ منتخبہ مؤلفہ اعظم الدولہ سرور اور عیار الشعراء مؤلفہ خوب چند ذکا وغیرہ کے یہاں غالب کا ترجمہ ملتا ہے -

زیرِ نظر مسودہ کے مطابق تذکرہ یکایک انشاء اللہ خاں کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے ، لیکن نثری ترجمہ غائب ہے ، صرف اشعار کا انتخاب بارہ صفحوں میں دیا ہوا ہے - دو سو کے قریب اشعار ہوں گے - اس کے بعد شاہ عالم آفتاب اور آصف الدولہ آصف کے تراجم ہیں اور یہ سلسلہ ردیف وار انعام اللہ خاں یقین تک چلا گیا ہے - تذکرہ تین حصوں میں تقسیم ہے : پہلا حصہ انشا و آفتاب سے شروع ہو کر جرأت کے ترجمے اور ان کے کچھ اشعار پر ختم ہوتا ہے - انڈیا آفس کے مخطوطے کے مطابق اس حصے میں ۵۸ صفحے ہیں اور اس کی نقل جو کہ ہمارے پیشِ نظر ہے فل سکیپ سائز کے ۱۲۳ صفحوں پر مشتمل ہے - دوسرا حصہ جرأت کے اشعار سے شروع ہو کر حکیم قدرت اللہ قاسم کے ذکر پر ختم ہوتا ہے - اس میں اصل مخطوطے کے مطابق ۲۰۲ صفحے ہیں اس کا مبیضہ ۲۹۳ صفحے میں تیار ہوا ہے - تیسرا حصہ قاسم علی قاسم کے ترجمے سے انعام اللہ یقین کے ترجمے تک پھیلا ہوا ہے - اصل خطی نسخے میں ۱۲۷ صفحے اور اس کے منقولہ مسودے میں ۱۷۷ صفحات ہیں -[1]

یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ بے جگر کی ترجمہ نگاری کی کیا صورت ہے اور اس کے فراہم کردہ مواد اور زبان و بیان کی کیا نوعیت ہے ہم صرف دو ترجمے اشعار کو محذوف کر کے اس جگہ نقل کرتے ہیں -

آزر : ”لالہ جوالا پرشاد سلمہ اللہ تعالیٰ ولد عزیز لالہ بشن چند کشمیری

۱- مخطوطہ انڈیا آفس لندن (فوٹو سٹیٹ) ، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری و مبیضہ مملوکہ ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ، بتوسط خواجہ مشفق کراچی -

برہمنے است کہ طبعے دارد شگفتہ چون بہار کشمیر ۔ اشہب فکر دل نشینش مانند شعلہ گرم خیز و نہال خیال رنگینش چون شجرۂ آتشین گاریز ۔ راقم الحروف ہم فی سنہ یک ہزار و دو صد و سی و شش ہجری در بلدۂ میرٹھ ازو ملاقاتے شدہ کہ بہ تقریب تلاش معاش ما ہر دو در اینجا رسیدہ بودیم سوائے وجاہت ظاہری کہ مقتضائے شباب است بحسن معنی ہم موصوفیت داشت یعنی با ہر کسے در بے خورد در اول ملاقات بے تکلف شدے و باخلاق حسنہ پیش آمدے غرض اوقات عمر را بہ خوش مزاجی و ظریف الطبعی بسر می برد ۔ بزرگانش از مدتے اگرچہ در لکھنؤ می بودند مگر فی الحال بسبب پابندی علاقہ برادرانش لالہ گنگا پرشاد رند و ٹھاکر پرشاد مضطر کہ بجائے خود مذکور شوند در اکبر آباد سکونت اختیار کردہ این چند اصنام خیال تراشیدۂ طبع آن آزر بت پرست است ۔"

منیر : "منیر دہلوی سلمہ اللہ تعالیٰ ، پرتو افگنی مہر منیر فکرش بزمین سخن حرف سریع اثر دانی بر تاب اقبال می آرد و ظل گستری ماہ مہر تنویر خیالش بر آستانہ این فن داغ طعن قریب الانتقالی در جگر ماہ جہان تاب می گذارد وجیہہ الدین نام دارد از فیض صحبت پدر بزرگوار خود میان نصیر شاہجہان آبادی کہ ذکرش در شجرہ نون بیاید نصرت یاب معرکہ سخن سنجی گردید و علم استیلا درین میدان بر افراشت . . . فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل کہ بندہ بسبب پابندی علاقہ تھانہ در قصبہ مراد نگر من نواح ضلع میرٹھ مقیم بودم منیر را ہم بہ عزیمت دہلی از میرٹھ در آنجا گزر افتادہ و اتفاق ملاقات دست داد ۔ تا دیر اشعار خود خواند و این مشتاق را مسرور نمود ۔"

☆ ☆ ☆

تذکرۂ ابن طوقان

تذکرے کے مصنف کا اصل نام معلوم نہ ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ مصنف نے تذکرے میں اپنا ذکر نہیں کیا۔ بعض تراجم سے یہ ضرور سراغ لگتا ہے کہ مصنف کے والد کا نام امین اللہ طوقان تھا اور اسی لیے اس تذکرے کو ''تذکرۂ ابنِ طوقان'' سے موسوم کیا گیا۔ امین اللہ طوقان کے ذکر میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

''جناب والد ماجد خودم امین اللہ نام و طوقان تخلص دارند بگوش من ارادت نیوش از غزل دو شعر است رنگ تسطیر می ریزم اگرچہ گہ گاہ فکر می فرمایند لیکن سحر حلال می نمایند۔''

اس سے زیادہ امین اللہ طوقان کے حالات نہیں ملتے۔ ''یادگار ضیغم'' مؤلفہ عبداللہ خاں مطبوعہ ۱۳۰۲ھ اور ''آبِ حیات'' مصنفہ آزاد کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ امین اللہ طوقان ناسخ کے دوستوں میں تھے اور ان کے بیٹے کا نام عظیم اللہ رغمی تھا۔ ہو سکتا ہے یہ تذکرہ عظیم اللہ رغمی ہی کا لکھا ہوا ہو لیکن قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ یہ ان کے کسی بھائی کے رشحاتِ قلم سے ہے۔ البتہ قاضی صاحب نے اپنے خیال کے ثبوت میں کوئی استدلال پیش نہیں کیا۔ مصنف کا ایک اور بیان ان کے حالات کے سلسلے میں قابلِ توجہ ہے، لکھتے ہیں:

''مولوی غلام یٰسین خان مد ظلہ' خان تخلص از عمدۂ زو فنونانِ روزگار و سرکردۂ ہنرمندانِ با اعتبار۔ شخص فاضل و مرد کامل . . . از خاک پاک الہ آباد است و استادِ منِ ہیچ کارۂ بے بنیاد۔ فارسی و عربی و ہندی نیکو می داند۔''[1]

۱۔ تذکرۂ شعرا ابنِ طوقان، ص ۱۲، مرتّبہ قاضی عبدالودود، مطبوعہ سلسلۂ مطبوعات ادارۂ تحقیقات اُردو، پٹنہ ۱۹۵۸ع۔

اس عبارت سے پتا چلتا ہے کہ مصنف کے استاد کا نام غلام یٰسین خاں تھا ۔ یٰسین خاں الہ آباد کے متوطن اور قادر الکلام شاعر تھے ۔

تذکرے میں تاریخِ تصنیف کہیں درج نہیں ہے ۔ بعض شعرا کے تراجم سے قاضی عبدالودود صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ ۱۲۴۷ھ اور ۱۲۵۱ھ کے درمیان لکھا گیا ہے ۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ اب تک دریافت ہوا ہے یہ کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں محفوظ ہے ۔ اس میں سولہ صفحے ہیں ۔ لیکن کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے ۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مقدمے اور مفید حواشی کے ساتھ ادارۂ تحقیقات اُردو پٹنہ سے ۱۹۵۴ع میں شائع کر دیا ہے ۔ یہی میرے سامنے ہے ۔ مطبوعہ نسخے میں مع مقدمہ و حواشی ۸۸ صفحے ہیں ، ان میں سے صرف انیس صفحات اصل تذکرے سے تعلق رکھتے ہیں ۔

تذکرہ فارسی میں ہے ، شعرا کے حالاتِ زندگی حد درجہ مختصر ہیں ۔ مثلاً خواجہ میر درد ، میر تقی میر ، مرزا رفیع سودا ، سوز دہلوی ، مصحفی ، انشا جرأت اور ذوق جیسے اساتذۂ فن کے متعلق صرف ایک ایک یا ڈیڑھ سطریں لکھی ہیں ۔ مصنف نے اپنے استاد غلام یٰسین خاں اور اپنے والد کے دوست ناسخ کے حالات میں البتہ چار پانچ سطریں لکھ دی ہیں اور یہی اس تذکرے کے طویل ترین مندرجات ہیں ۔ انتخابِ کلام میں اختصار سے کام لیا گیا ہے ۔ یٰسین خاں اور ناسخ کو چھوڑ کر کہیں بھی انتخابِ کلام پندرہ اشعار سے آگے نہیں بڑھا ۔ عموماً ایک ایک دو دو شعر درج کیے گئے ہیں ۔ یٰسین خاں کے اکیس اور ناسخ کے ستر (۷۰) اشعار منتخب کیے گئے ہیں ۔ کلام پر رائیں نہ ہونے کے برابر ہیں ، مدحیہ کلمات و فقرات سب کے بارے میں قریباً ایک جیسے ہیں ۔

پھر بھی اس مختصر سے تذکرے میں بعض ایسے شعرا کے نام مل جاتے ہیں جو کسی اور جگہ مذکور نہیں ہیں ۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذریعے خواجہ میر درد کے مندرجہ ذیل اشعار ہمارے ہاتھ لگتے ہیں :

ہم یہ کہتے تھے کہ احمق ہے جو دل کو دیوے\
دیکھیں تو چھین لے دل ہم سے وہ کون ایسا ہے\
سو اب اک شخص کے ہے زیر قدم دل اپنا\
سچ کہا ہے کہ بڑے بول کا سر نیچا ہے

دنیا و دیں کو اور خریدار لے چلے
ہم دل کے آئینے میں فقط یار لے چلے
تحقیق کیجے دوزخ و جنّت کو سو غلط
جاویں گے ہم اُدھر کو جدھر یار لے چلے

کل جو گلی میں اس کے میں سر پٹک رہا تھا
پہلو میں میرا دل بھی ساتھ ہی کھٹک رہا تھا
سکتے کا ایک عالم اس طور ہو رہا تھا
چشمِ امید وا تھی اور دم اٹک رہا تھا

قاضی عبدالودود صاحب کا بیان ہے یہ اشعار اس تذکرے کے سوا دیوانِ درد کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں۔ ناسخ کے بارے میں بھی بعض نئی باتیں اس تذکرے سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مرزا محمد رضا برق کے ترجمے میں لکھا ہے کہ:

''از اوائل مشورہ را بہ شیخ امام بخش عبداللہ ناسخ می آرد۔''

اور ناسخ کے ذکر میں ہے کہ:

''در شعر گوئی شاگردی نہ نمودہ۔''

پہلے بیان میں ''امام بخش ناسخ'' کے نام کے ساتھ ''عبداللہ'' بھی ہے یہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن بقول قاضی عبدالودود محض اس بنا پر اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے بیان سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ناسخ فنِ شعر میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ یہ مختصر سا تذکرہ بہر حال اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں علی الترتیب مندرجہ ذیل شاعروں کا ذکر آیا ہے:

۱۔ خواجہ میر درد۔
۲۔ میر تقی میر۔
۳۔ مرزا رفیع سودا۔
۴۔ میر سوز دہلوی۔
۵۔ مصحفی۔
۶۔ انشاء اللہ خاں۔

۷- منتظر -
۸- جرأت -
۹- نصیر دہلوی -
۱۰- ذوق دہلوی -
۱۱- امام بخش ناسخ -
۱۲- خواجہ محمد وزیر -
۱۳- فقیر محمد خاں گویا -
۱۴- مرزا محمد رضا برق -
۱۵- علی اوسط رشک -
۱۶- کلب حسین خاں نادر -
۱۷- حیدر علی آتش -
۱۸- دوست علی خلیل -
۱۹- ہدایت علی جلیل -
۲۰- شاہ محمد علیم الہ آبادی -
۲۱- غلام یٰسین خاں -
۲۲- شاہ محمد اعلیٰ مبرور -
۲۳- مظلوم شاہ -
۲۴- میر زین العابدین بیمار -
۲۵- اعظم علی بیگ اعظم -
۲۶- ذاکر علی -
۲۷- میر عباس عرفان -
۲۸- قادر لکھنوی -
۲۹- محمد صادق اختر -
۳۰- علی حسین خان اندوہ -
۳۱- بحر -
۳۲- مرزا حاجی -
۳۳- سعادت یار خاں رنگین -
۳۴- میر تقی ہوس -

۳۵- انور علی -
۳۶- ناطق -
۳۷- امین اللہ طوفان -
۳۸- میر محمد مہدی ہادی -
۳۹- رضا -
۴۰- محمد بخش شہید -
۴۱- عبداللہ سوزش -

تذکرے کا پہلا اور آخری ترجمہ بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

۱- حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کہ از کملّین زمانہ و در جمیع علوم و فنون یگانہ بود - (ص ۱)

۴۱- عبداللہ سوزش خلف حکیم مرزا حیدر صاحب، اصل مولدش شہر لکھنؤ، از چند سال در بنارس توطن اختیار کردہ - (ص ۱۹)

☆ ☆ ☆

شوکتِ نادری

شوکتِ نادری کے مؤلف مرزا کاب حسین خاں نادر ہیں ۔ نادر کے حالاتِ زندگی "تذکرۂ نادر" کے ذکر میں تفصیل سے لکھ دیے گئے ہیں ۔ جہاں تک شوکت نادری کا تعلق ہے ، اس کا ذکر محسن اور نساخ نے کیا ہے ۔ گارسیں دتاسی نے شوکتِ نادری کے بجائے صولتِ نادری کا ذکر کیا ہے ۔

شوکتِ نادری کے صرف دو نسخوں کا سراغ اب تک ملا ہے ۔ یہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں محفوظ ہیں اور ہنوز غیر مطبوعہ ہیں ۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی دی ہوئی تفصیلات کے مطابق شوکتِ نادری ۱۲۶۷ھ میں لکھا گیا ہے ۔ عرشی صاحب ہی کا بیان ہے کہ کسی مطبوعہ نسخے کا پتا ابھی تک نہیں چل سکا ۔ ہو سکتا ہے کسی وقت چھپا ہو اور بہت سی مطبوعہ کتابوں کی طرح وہ بھی کمیاب یا نایاب ہو گیا ہو ۔[1]

اس تذکرے تک راقم الحروف کی رسائی نہ ہو سکی ۔ مولانا عرشی کی دی ہوئی تفصیلات مشمولہ "تذکرۂ نادر" ہی اس جگہ من و عن نقل کی جا رہی ہیں :

"یہ دراصل الہ آباد کے چند شاعروں کا تذکرہ ہے ، ۱۲۶۷ھ میں لکھا گیا ہے ۔ اس کی بنا ہے ایک مقدمہ ، سات فصلوں اور ایک خاتمے پر ۔ مقدمے میں یہ لکھا گیا ہے کہ شعر و شاعری کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے ، یہ بہت شریف فن ہے اور جو لوگ مخالفت کرتے ہیں اس کا باعث عدمِ مناسبت یا بغض و حسد یا خود پسندی یا کثرت ناتوان بینی یا وفورِ حماقت یا پستیِ حوصلہ یا اظہارِ ورع و تقویٰ ہوا کرتا ہے ۔"

۱۔ بحوالۂ "تذکرۂ نادر" ، ص ۱۰ ، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب ، مطبوعہ کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۷ع ۔

اگلی سات فصلوں میں انہیں اسباب کی تشریح کی ہے - پھر ان اسباب کے تحت مخالفتِ شعر کا جواب بڑی عمدگی اور تفصیل کے ساتھ دیا ہے -

خاتمہ چار مطالب پر مشتمل ہے :

مطلبِ اول : در اقسام امزجہ و طبائع شعرا -

مطلبِ دوم : در بیان امورے کہ از جمعیت شان اطلاق شاعری بر ایشان کردہ شود -

مطلبِ سوم : در بیان نصائح برائے شعرا -

مطلبِ چہارم : در بیان اسامی و پارۂ از حالات شعرائے ساکنین و واردین بلدۂ الہ آباد و بعضے از اشعار آبدار ایشان -

پہلے تین مطالب سات صفحوں میں سما گئے ہیں - چوتھا مطلب ورق ۲۶ ب تا ۷۰ ب پر حاوی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود یہی تھا - ابتدائی تمام مباحث کی حیثیت تمہیدی ہے -

ان شعرا کی تعداد بشمول نادر ۳۷ ہے ، ان میں فارسی گو بھی ہیں اور اُردو گو بھی - اپنے صرف اشعار لکھ دیے ہیں - حالات و شرح تصنیفات کی زحمت گوارا نہیں کی -

اوراق کی تعداد ۷۰ ہے فی صفحہ دس سطریں ہیں - سائز ۲۰×۲۶/۸ ہے - خط معمولی نستعلیق ہے - کتابت کی غلطیاں بہت ہیں -

اس کتاب کا دوسرا نسخہ میں نے کتب خانے کے لیے خریدا ہے - یہ ٹیکا رام کائستھ نے ۲۳- ستمبر ۱۸۷۱ع کو حسب فرمائش مرزا محمد عباس علی خاں عرف مرزا اثر تحصیل دار ساکن مقام گجرات ملک پنجاب نقل کیا تھا - یہ اکاون اوراق پر مشتمل ہے - فی صفحہ چودہ سطریں ہیں ، خط معمولی نستعلیق ہے مگر غلطیاں پہلے نسخے سے کم ہیں -[1]

☆ ☆ ☆

۱- بحوالہ تذکرۂ نادر ، ص ۹ - ۱۰ -

دستورُ الفصاحت

مصنّف کا نام سید احد علی اور تخلص یکتا ہے ، والد کا نام سید احمد علی خاں تھا ۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی ۔ حکیم آغا محمد باقر ابن حکیم صالح خاں کشمیری ان کے استادوں میں سے تھے ۔ لکھنؤ کے رئیس مرزا قمر الدین احمد خان بہادر عرف مرزا حاجی متخلص بہ قمر کے ترجمے میں یکتا نے لکھا ہے کہ :

"بر راقم کمال مہربانی و نوازش می فرماید و از قدیم مالوف بوده بلکہ عاصی از مدت نمک پرورده و دست گرفتۂ خاندان اوست ۔"[1]

اس سے پتا چلتا ہے کہ یکتا کا ذریعۂ معاش مرزا حاجی کے توسط سے قائم تھا ۔ حاجی مرزا کے خاندان کے زوال کے بعد یکتا پر بھی ادبار آیا اور وہ معاشی اُلجھنوں کا شکار رہے ۔

یکتا اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن اپنے معاصرین میں کوئی مرتبہ حاصل نہ تھا اس لیے ان کا ذکر تذکرہ نگاروں نے بھی نہیں کیا ۔ وہ خود بھی اپنے کو قابلِ ذکر شاعر نہ سمجھتے تھے ، غالباً اسی لیے انھوں نے شاعر کی حیثیت سے اپنا ذکر اپنی تالیف میں بھی نہیں کیا ۔ ہاں کتاب میں بطور امثال انھوں نے اپنے اشعار نقل کیے ہیں ۔ مولانا عرشی نے اپنے مقدمے میں حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے اُردو فارسی اشعار بھی نمونۃً دے دیے ہیں ۔[2]

دستور الفصاحت کے اختتام پر یہ قطعۂ تاریخ ملتا ہے :

صد شکر کہ اتمام پذیرفت رسالہ
واضح شد ازان جملہ قوانینِ بلاغت

۱۔ دستور الفصاحت ، ص ۱۲۱ ، مرتبۂ عرشی ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

۲۔ مقدمۂ دستور الفصاحت ، ص ۷ تا ۱۲ ۔

تاریخ تمامیش طلب کردہ چو یکتا
فی الفور خرد گفت کہ "دستورِ فصاحت"

"دستور الفصاحت" اس کتاب کا تاریخی نام ہے ۔ "دستور فصاحت" سے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ع برآمد ہوتے ہیں ۔ گویا اس کا نظر ثانی شدہ آخری مسودہ اسی سال تیار ہوا ہے ۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے شعرا کے تراجم اور بعض دوسری داخلی شہادتوں کی مدد سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دستور الفصاحت ابتداءً انشا کی دریائے لطافت مؤلفہ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ع سے قبل ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ع میں لکھی گئی ۔ اس وقت یہ کسی کے نام سے معنون نہ تھی ، بعد میں نظر ثانی کے بعد مرزا حاجی سے معنون کر دی گئی ۔ مرزا حاجی کے زوال کے بعد مؤلف نے اس پر پھر نظر ڈالی اور ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ع میں اس کا ہر طرح مکمل مسودہ وجود میں آیا ۔

دستور الفصاحت کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں موجود ہے جس کے مقدمہ اور آخری حصے کو یکجا کرکے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے بسیط مقدمے اور نہایت مفید حواشی کے ساتھ ہندوستانی پریس رام پور سے ۱۹۴۳ع میں شائع کر دیا ہے اور یہی اس وقت میرے پیشِ نظر ہے ۔

دستور الفصاحت فارسی زبان میں ایک علمی و ادبی جامع تالیف ہے اور اپنے موضوعات و مباحث کے لحاظ سے انشا کی دریائے لطافت سے ملتی جلتی ہے ۔ اصل کتاب میں مقدمہ و خاتمہ کے علاوہ حسب ذیل پانچ ابواب ہیں : پہلا باب فارسی صرف و نحو سے متعلق ہے ۔ دوسرے باب میں اُردو قواعد سے بحث کی گئی ہے ۔ تیسرے باب میں اُردو نحو کا بیان ہے ۔ چوتھے باب میں علمِ عروض و قافیہ کی بحثیں ہیں ۔ پانچواں باب علمِ بیان و بدیع سے تعلق رکھتا ہے ۔ ہر باب میں کئی کئی فصلیں ہیں ۔ مقدمے میں اُردو کی پیدائش ، ارتقا ، اسالیب اور مراکز کا بیان ہے ۔ آخر میں خاتمہ کے نام سے ان شاعروں کے حالات اور منتخبات کلام درج ہیں جن کے اشعار کا حوالہ کتاب کے مختلف ابواب میں دیا گیا ہے ۔ کتاب کا یہی آخری حصہ تذکرۃ الشعرا کے ضمن میں آتا ہے اور اسی کو عرشی صاحب نے اصل کتاب کے مقدمے اور اپنے مقدمے کے ساتھ دستورالفصاحت ہی کے نام سے شائع کر دیا ہے ۔ گویا عرشی صاحب نے یکتا کی علمی و ادبی تالیف کو مختصر کرکے اُردو شعرا کا تذکرہ بنا دیا ہے ۔

مطبوعہ تذکرے کے ابتدائی ۱۱۸ صفحات میں مولانا عرشی کا گراں قدر مقدمہ ہے۔ اس مقدمے میں مصنّف کے حالاتِ زندگی، قلمی نسخے کی کیفیت اور کتاب کے ماخذ و مصادر کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ ماخذ کے حواشی کے تحت انھوں نے اُردو فارسی کے متعدد مطبوعہ و قلمی تذکروں پر نہایت مفید نوٹ دیے ہیں۔ اسی کے ساتھ جن شاعروں کا ذکر دستورالفصاحت میں آیا ہے ان سب کے دوسرے ماخذ کا سراغ بھی دے دیا ہے یعنی ہر شاعر کے ذکر کے ساتھ ہی حاشیے میں عرشی صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس کا ذکر اور کن کن تذکروں میں آیا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ دستور الفصاحت کے متن کی تصحیح اس کی ترتیب اور حواشی کی تعلیقات میں عرشی صاحب نے ایسی دقتِ نظر اور جانکاہی سے کام لیا ہے کہ یہ کتاب ان کے مقدمے کی بدولت اعلیٰ درجے کا تحقیقی صحیفہ بن گئی ہے۔ مقدمے کے بعد اصل کتاب کے متن کے لیے صفحات کے نمبر از سرِ نو ڈالے گئے ہیں۔ اس میں ۱۲۵ صفحات ہیں باقی ۱۲۷ سے لے کر ۱۵۲ تک اشاریہ اور صحت نامہ ہے۔

یکتا نے دستور الفصاحت میں دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح عام خاص سب کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف گنے چُنے اساتذۂ فن پر ان کی نگاہِ انتخاب پڑی ہے۔ چنانچہ اس تذکرے میں صرف چھتیس شعرا مذکور ہیں۔ ان شعرا کو مصنّف نے بقول عرشی صاحب اثنا عشری ہونے کے سبب بارہ بارہ شاعروں کے تین طبقوں، طبقۂ اول، طبقۂ دوم اور طبقۂ سوم میں تقسیم کر دیا ہے۔ طبقۂ اول میں حاتم کے بعد بارھویں نمبر کا شاعر چونکہ اصل مسودے میں نقل کرنے سے رہ گیا ہے اس لیے مطبوعہ میں بھی نہیں ہے۔

طبقۂ اول میں دورِ اول کے منتخب اساتذہ مثلاً سودا، میر، درد، قائم، سوز، اثر، تاباں، عشق، فغاں، یقین اور حاتم کا ذکر آیا ہے۔[1] لیکن

۱۔ طبقۂ دوم میں حسرت، بیدار، فدوی، تجلیؔ، حیران، بقا، بیان، حسن، نثار، منت، مصحفی اور رنگین کا ذکر ہے۔ طبقۂ سوم میں جرأت، افسوس، انشا، نوا، پروانہ، تسکین، نصیر، منتظر، رقت، غضنفر، غیور اور قمر کا ذکر آیا ہے۔

مظہر جان جاناں کا ذکر نہیں ہے ۔ گمان ہو سکتا ہے بارھویں نمبر پر جو نام محذوف ہو گیا ہے شاید وہاں مظہر کا ذکر ہو لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے ۔ مظہر کو مصنّف نے اپنے تذکرے میں دانستہ جگہ نہیں دی ۔ عدم شمولیت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مرزا مظہر بنیادی طور پر فارسی کے شاعر ہیں اور اُردو میں انھوں نے بہت کم کہا ہے ۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں خود لکھتے ہیں :

''و شعر مرزا جان جاناں کہ درین مقام نوشتہ نشدند بیش اینست کہ آن آفتاب چرخِ فصاحت و نیّر اعظم فلکِ بلاغت بہ بیشتر فارسی می گفت و ریختہ ہمی قدر کہ برائے اصلاح بعضے از شاگردان او بکار آید یا بکدام خیالے دیگر بعلت می فرمود ۔''[1]

کتاب کے آخری حصے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یکتا نے چونکہ ایک مستند علمی و ادبی کتاب تالیف کی تھی اس لیے انھوں نے شعرا کے ذکر اور ان کے اشعار کے حوالے دونوں میں خاص اصولوں کو سامنے رکھا ہے ۔ چنانچہ اپنے انتخاب کے جواز میں رقم طراز ہیں کہ :

''بدانکہ اسامی چند کس از شعرا کہ درین رسالہ ضبط شدہ بعضے بہ منزلہ اصل اند چہ بنائے صحت محاورۂ اُردوے معلٰی بر مقولہ اینہا متحقق گشتہ یعنی مثل مرزا محمد رفیع و میر محمد تقی و مرزا جان جاناں مظہر تخلص و میر درد و قائم و سوز و باقی بزرگاں کہ مسطور اند بنا بر فصاحت کلام خود ہا و شہرہ و اعتبار کہ ایشان درین فن حاصل شدہ است و دوست و دشمن مقر بہ کمال گردیدہ ۔ آنہا فرع و الّا در ہر قصبہ و بلدہ و قریہ موزونان بسیار پیدا شدہ اند و می شوند و موافق معلومات خویش و طبیعت مدام در زبان خود ہاہمہ شعرہا می گویند و گفتہ اند لیکن چون مدار ریختہ بر زبان خاص شاہجہان آباد است بہ ہمین جہت اشعار و کلام ہمان اشخاص کہ در دہلی یا در لکھنؤ نشو و نما یافتہ و محاورہ و زبان در صحبت شعرائے مذکور تخلیق نمودہ بپایۂ اعتبار رسیدہ اند مقبول و معتبر است و بس ۔ ہر چند شعرائے قصبات فاضل و عالمِ فن باشند اما کلام

۱۔ دستور الفصاحت ، ص ۱۲۳ - ۱۲۴ ۔

ایشان مطلق مقبول نیست و برائے دیگر ہرگز سند نہ تواند شد چہ زبان دان و صاحب محاورہ نیستند ۔"[۱]

اوپر کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مظہر جان جاناں کو بھی ان اساتذۂ فن میں شمار کرتے ہیں جن کے کمال کے دوست و دشمن سبھی مقر تھے ۔ پھر صرف اس وجہ سے کہ وہ اُردو میں کم کہتے ہیں ، انھیں شعرا کی فہرست سے خارج کر دینا عجیب سی بات ہے ۔ مصنّف کے نزدیک صرف شاہجہان آباد اور لکھنؤ میں نشو و نما یافتہ شعرا ریختہ کے سلسلے میں مستند حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس لحاظ سے بھی مظہر جان جاناں کا ذکر ضروری تھا ، اس لیے کہ ان کی زبان کا تعلق بہر طور دہلی کے محاورۂ خاص سے تھا ۔

دستور الفصاحت میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں جن شاعروں کا ذکر آیا ہے قدرے تفصیل سے آیا ہے ۔ بیاض کے انداز پر حالاتِ زندگی ایک دو سطروں میں نہیں بلکہ وضاحت سے لکھے گئے ہیں ۔ شاعر کا اصل نام کیا ہے ، کیا تخلص کرتا ہے ، کس کا شاگرد یا استاد ہے ؟ عمر کیا ہے ، کہاں کا رہنے والا ہے ؟ کن کن زبانوں میں شعر کہتا ہے ، پیشہ کیا ہے ؟ علمی و ادبی رتبہ کیا ہے ؟ مزاجاً کیسا واقع ہوا ہے ؟ اس کے عہد کی ادبی فضا کیا تھی ؟ کلام میں کیا خاص بات ہے ؟ شخصیت میں کیا کیا خوبیاں اور کمزوریاں ہیں ؟ کلام کی کیا نوعیت ہے ، کس صنف سخن سے دلچسپی ہے اور کلام کا رنگ کیا ہے ؟ کس کا رنگ کس اُردو یا فارسی شاعر سے ملتا ہے ؟ معاصرین میں سے کس سے قربت یا تعلق رکھتا ہے ؟ اس قسم کے سوالوں کے جوابات اس کتاب میں اکثر جگہ مل جاتے ہیں اور اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سوانح اور تنقید دونوں لحاظ سے یہ تذکرہ اپنے عہد کے تذکروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔

مقدمے کے بعد تذکرے کا آغاز مندرجہ ذیل سطور سے اس طور پر ہوتا ہے :

"خاتمہ در تذکرۃ الشعرا یعنی در بیان اسامی و قدرے احوال بعضے از شعرا کہ بتقریب مثال کلامِ فصاحت نظام این بزرگواران درین رسالہ مندمج گردیدہ تا مطالعہ کنندہ را از حالت و قوت مرتبۂ ہر یک فی الجملہ وقوف

۱۔ دستور الفصاحت ، ص ۱۲۳ تا ۱۲۴ ۔

و آگاہی بودہ باشد و ایشان بہ اعتبار فن و قوتِ طبع و چستی تالیف و شیرینی کلام و شہرت خلق سہ طبقہ می شوند و اکنوں شروع می رود بذکر صاحبانِ طبقۂ اولیٰ ۔''[1]

اس کے بعد شعرا کا حال سودا کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور حاجی مرزا قمر پر ختم ہوتا ہے ۔ سب سے آخر میں خود مصنّف کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ ہے ۔ یہ قطعہ عہدِ تصنیف کے تحت پہلے ہی نقل کیا جا چکا ہے ۔ اس جگہ سودا کا ترجمہ بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے :

''سودا : اول از طبقۂ اولیٰ ، چمن آرائے حدیقۂ فصاحت ، نخل پیرائے گلشن بلاغت ، آب و رنگ بوستان سخندانی ، بلبل خوش لہجۂ گلزار معانی ، امیر فصحا ، سر حلقۂ ظرفا و بلغا ، ملک الشعرا مرزا محمد رفیع المتخلص بہ سودا ست غفر اللہ لہ ، کہ آوازۂ سخنوری او عالم را فرا گرفتہ و شہرۂ اوستادی او از قاف تا بہ قاف در رفتہ ۔ شاعرے بود مسلم الثبوت بہ ہر قسمے از کلام کہ دست انداز شدہ چنانچہ باید و شاید از عہدۂ آن بیرون آمدہ بلکہ آن کلام را بہ مرتبۂ رسانیدہ کہ قوت ہیچ موزونی باداے آن نمی رسد ۔ غزل را بہ آن پاکیزگی و ملاحت ادا نمودہ کہ اگر می بود صائب خود داد آن می داد ۔ و رتبۂ قصیدہ بہ آں متانت و علو رسانیدہ کہ عرفی اگر می خواند تلمیذانہ سر ادب بپایش می نہاد ۔ در اداے حق مدح و منقبت اگر گویم گوئے مسابقت از سلمان و ظہوری ربودہ و در ذکرِ ہجو و مذمت اگر بر شمارم صد ہا دریچۂ استہزا و سخریہ بر روئے ہزلیاتِ انوری و شفائی کشودہ کلامش بالتمام تبصرہ و سند است جہت جمیع شعر او تالیفش سراسر آئین و دستور است پیش ہمہ بلغا ۔ غرض ہرچہ گفتہ است چنان گفتہ کہ کسے نمی تواند گفت قید ریختہ کہ فقط بر محاورۂ اُردوے معلیٰ منضبط ساختہ و بہ نظم قصیدہ درین زبان بطرز فارسیان کہ نخست پرداختہ ہمین صاحب کمال بود احسان این صفت و حق این صنعت برگردن جمیع شاعران و فصحاے ہند مدام ازو باقی است ۔

۱- دستورالفصاحت ، ص ۱۴ ۔

معہٰذا دیگر اوصاف و کمالات آن بے عدیل کہ با نفس شریفِ خود جمع داشت چہ گویم ۔ از آدابِ صحبتِ ملوک و سلاطین و آگاہی بہ علمِ موسیقی و طرح نہادن بر سلام و مرثیہ ہائے گفتۂ خود و تہذیبِ اخلاق و تالیف قلوب و علمِ مجلس وغیرہ چہ ہنرہا کہ در ذاتِ کامل الصفاتِ او نمودند ۔ مدام بہ صحبت امرا و وزرا گزرانیدہ ہمیشہ بخلاع ثمین و جائز ہائے سنگین از خدمت این ہا سرافراز بودہ ۔ مدتست کہ در لکھنؤ شربتِ ناگزیر اجل چشیدہ ، زندگانی بے اعتبار را جواب داد و کلیاتِ ضخیم کہ مملو بہ ہمہ قسمہائے سخن است مثل داغِ مہاجرت خویش بر صفحۂ روزگار یادگار گزاشت ۔ مدفنش در امام باڑۂ آغا باقر مرحوم و تاریخ وفاتش این است ۔ مصحفی می گوید تاریخ :

مرزا رفیع آن کہ ز اشعار ہندیش
ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان غلو
ناگہ چو در نوشت بساطِ حیاتِ او
گردید مدفنش ز قضا خاکِ لکھنؤ
تاریخ رحلتش بدر آورد مصحفی
سودا کجا و آن سخن دلفریب او

چند شعر از کلام آن مغفور تبرکاً درین مقام ہم ایراد ہم یابد فقط ۔''[۱]

☆ ☆ ☆

۱ - دستور الفصاحت ، ص ۱۴ - ۱۸ ، مرتبّہ مولانا عرشی ۔

گلشنِ بے خار

محمد مصطفیٰ خاں نام تھا ، فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے - ان کے والد عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ رئیسِ جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) اور ہوڈل پلول (متصل دہلی) اپنے زمانے کے ایک مقتدر اور بارسوخ نواب تھے اور حکومت برطانیہ کی طرف سے انھیں ''عظیم الدولہ سرفراز الملک مظفر جنگ'' کا خطاب ملا تھا -

شیفتہ ۱۸۰۹ع کے آخری مہینوں میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ع میں وفات پائی - شیفتہ عربی ، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہنے کی استعداد رکھتے تھے - شاعری میں مومن کے شاگرد تھے - ان کے مفصل خاندانی حالات کلیات شیفتہ کے مقدمے میں مل جاتے ہیں -[۱] ان کی تصانیف میں گلشن بے خار کے علاوہ دیوان اُردو شیفتہ ، سفر نامۂ حجاز (فارسی) دیوان فارسی اور رقعات فارسی یادگار ہیں -

گلشن بے خار کی تاریخِ تصنیف کے سلسلے میں شیفتہ نے دیباچے میں خود لکھ دیا ہے کہ ''ابتدائے این کارنامہ در ابتدائے سال ہزار و دو صد و چہل و ہشت از ہجرت بودہ و انتہائے ہزار و دو صد و پنجاہ -''

یعنی ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ع میں شروع کرکے ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ع میں تذکرے کو مکمل کر لیا - اس وقت ان کی عمر چھبیس سال کی تھی -

پہلی بار یہ تذکرہ تالیف کے تین سال بعد ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ع میں مطبع دہلی اُردو اخبار مولوی محمد باقر کے زیر اہتمام شائع ہوا - اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری

۱- ملاحظہ ہو مقدمۂ ''کلیاتِ شیفتہ'' ، ص ۱۶ ، مرتبہ کاب علی خاں فائق رام پوری ، مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب لاہور ۱۹۶۵ع -

رام پور میں موجود ہے - ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ع میں اس کا دوسرا ایڈیشن پنڈت موتی لال کے زیر اہتمام اسی مطبع سے شائع ہوا - یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اُردو سیکشن اور رضا اکیڈمی رام پور میں موجود ہے -[۱]

بعد ازاں نول کشور پریس لکھنؤ سے رمضان ۱۲۹۴ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ع میں گلشن بےخار شائع ہوا - اس میں ۲۷۲ صفحات ہیں - اصل تذکرہ ۲۴۴ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے - آخری اٹھائیس صفحات میں قطعات تاریخِ تصنیف اور تقریظیں درج ہیں - یہی عام طور پر کتب خانوں میں ملتا ہے - اس کا ایک نسخہ مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس وقت میرے پیشِ نظر ہے -

۱۹۶۲ع میں اس کا اُردو ترجمہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سے شائع ہوا ہے - یہ ترجمہ محمد احسان الحق فاروقی نے کیا ہے اور اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے - ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کے تعارف کو ملا کر اس میں ۵۴۶ صفحے ہیں اور یہ ہر جگہ دستیاب ہے -

گلشن بےخار کے قلمی نسخوں کا بھی سراغ ملتا ہے - چنانچہ ایک قلمی نسخہ جس کی کتابت ۲ - شوال ۱۲۵۴ھ میں ہوئی ہے پنجاب پبلک لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے - فہرست مخطوطات میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ نسخہ مصنّف کے مطالعہ میں رہا ہے اور اس کا اصلاح شدہ ہے - مولانا عرشی نے بھی مقدمۂ دستور الفصاحت میں ایک قلمی نسخے کی خبر دی ہے لیکن یہ مطبوعہ نسخے کی نقل ہے -

نواب مصطفٰی خاں شیفتہ اپنے زمانے کے ایک باشعور ادیب و شاعر تھے - ان کے علم و فضل اور پاکیزہ ذوق سخن کی بنا پر سبھی ان کا احترام کرتے تھے - دلی میں ان کا گھر علمی و ادبی مرکز تھا اور صاحبان کمال کی محفلیں جما کرتی تھیں - شیفتہ کی اس خوش ذوقی اور ادبی شعور کا ثبوت ان کے تذکرے سے بھی ملتا ہے - انھوں نے اپنے تذکرے کو رطب و یابس سے پُر کرکے ضخیم بنانے کی

۱- مقدمۂ دستور الفصاحت ، مرتبۂ عرشی ، ص ۹۴ ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع و رسالۂ تذکرات مصنّفہ گارسیں دتاسی مترجمہ مولانا ذکاء اللہ ، مرتبۂ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ص ۶۰ ، مطبوعہ دلی -

کوشش نہیں کی بلکہ صرف چھ سو منتخب شاعروں کے حالات زندگی و اشعار جمع کیے ہیں - تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور بلحاظ حروف تہجی مرتب کیا گیا ہے - شعرا میں قدما سے لے کو شیفتہ کے معاصرین تک شامل ہیں گویا ''گلشن بے خار'' قدیم دکنی شعرا سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک شعری تاریخ پر محیط ہے اور اُردو شاعری کے دو سو سالہ سرمائے کو اختصار کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے - شعرا کے حالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن جو کچھ ہیں ، قابلِ اعتبار ہیں - خاص طور پر شیفتہ نے اپنے معاصرین خصوصاً غالب ، مومن ، ذوق ، آزردہ اور شاہ نصیر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخی اور ادبی دونوں لحاظ سے اہم خیال کیے جانے کے لائق ہے - اس کے ذریعے معاصرین کے متعلق بعض ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں - مثلاً مومن اور امت الفاطمہ صاحب جی کے معاشقے کا ثبوت ہمیں اسی سے ملتا ہے - خود شیفتہ کی محبوبہ کا حال ، جس کا ذکر انھوں نے نزاکت تخلص کے ساتھ کیا ہے ، اس تذکرے میں موجود ہے - اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شیفتہ نے صرف انتخابِ کلام ہی کو سب کچھ نہیں سمجھا بلکہ ہر شاعر کے کلام پر ناقدانہ رائیں بھی دی ہیں - یہ رائیں آج جب کہ تنقید کی روش اور اس کا معیار کچھ سے کچھ ہو گیا ہے زیادہ وقیع نہ ہوں لیکن اُردو شعرا کے تذکروں کی روشنی میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ مصطفیٰ خاں شیفتہ ایک با شعور تذکرہ نگار ہیں - ان کے تذکرے سے ایک طرف ان کے تنقیدی شعور اور اُردو تنقید کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ، دوسری طرف بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک کی شعری و ادبی فضا کو ذہن نشین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے - ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب نے اپنے ایک مضمون مشمولہ ''تحقیق کی روشنی میں'' شیفتہ کے تنقیدی شعور سے انکار کیا ہے لیکن ان کے انکار و اختلاف کے دلائل بہت کمزور ہیں - شیفتہ کی تنقید کو آج کی تنقید کی روشنی میں نہیں بلکہ اُس زمانے کی فضا میں دیکھنا چاہیے جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے اور تذکرہ لکھ رہے تھے - یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس زمانے میں تذکرہ نگاری کی روش کیا تھی اور شیفتہ نے اس روش سے کس حد تک انحراف کیا ہے اور اس انحراف کی نوعیت کیا ہے - شادانی صاحب مرحوم نے شیفتہ پر قلم اٹھاتے وقت بھی وہی منفی اور تنقیدی انداز اختیار کیا ہے جو انھوں نے اُردو کے ممتاز

غزل گو شعرا اور بعض دوسرے ادیبوں پر رائے دیتے ہوئے برتا ہے۔ ورنہ شیفتہ کے معاصرین سے لے کر اس وقت تک اُردو کا شاید ہی کوئی باخبر و باشعور نقاد یا ادیب ہو جس نے تذکرہ نگاری کی روشنی میں شیفتہ کو قدیم طرز کا باشعور ناقد تسلیم نہ کیا ہو۔ سید عابد علی عابد نے بہت اچھا کیا کہ شادانی صاحب کے مضمون کے فوراً بعد ایک گراں قدر مقالہ بروقت شائع کر دیا۔[۱] ورنہ ممکن تھا کہ شادانی صاحب کے مضمون سے شیفتہ کے متعلق بعض لوگ مغالطے کا شکار ہو جاتے۔ تذکرہ آبرو کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور یوسف کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے۔ اس جگہ مرزا نوشہ غالب کا ترجمہ بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

"غالب تخلص، اسم شریفش اسد اللہ خان المشتہر بہ مرزا نوشہ از خاندانِ فخیم است و از رؤسای قدیم۔ سابقاً مستقر الخلافت اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود، اکنون دارالخلافہ شاہجہان آباد بدین نسبت غیرت افزائے صفاہان و شیراز۔ طوطی بلند پروازِ چمنِ معانی است و بلبلِ نغمہ پردازِ گلشنِ شیوا بیانی۔ پیش بلندی خیالش اوجِ فلک پستیِ زمین است و در جنبِ تہ نشینیِ غورش سرفرازیِ قارون کرسی نشین۔ شاہینِ فکرش جز بشکارِ عنقا نہ پردازد و اشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد۔ اگر امروز بتلاشِ متاع نفیس شتابی جز بہ کانش در نیابی۔ سالہا است کہ پا بدائرۂ شاعری نہادہ، در اوائل حال بتقاضائے طبع دشوار پسند بہ طرز مرزا عبد القادر بیدل سخن می گفت و دقت آفرینی ہا میکرد۔ آخرالامر ازاں طریقہ اعراض کردہ اندازِ دیگر مطبوع ابداع نمودہ دیوانش را بعد ترتیب و تکمیل دیگر نگریست فراوان ابیات ازان حذف و ساقط کردہ، قدر قلیلے انتخاب زدہ۔ مدتہا ست کہ بنظمِ ریختہ سرے ندارد در زبان فارسی نیز دستگاہی بلند و مایۂ وافر بہم رسانیدہ، پایہ اش از فحولِ اُستادان کم نیست۔ غزلش چون غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چون قصیدۂ عرفی دل پذیر، مضامین شعری را کما ہو حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پے می برد و این فضیلتی است کہ مخصوص بعض اہلِ سخن

۱۔ ملاحظہ ہو "صحیفہ" لاہور، بابت اپریل ۱۹۶۳ء۔

است اگر طبع سخن شناس داری باین نکته میرسی - چه خوش فکر اگرچه کمیاب است اما خوش فهم کمیاب تر ، خوشا حال شخصی که از هر دو شربے یافته و حظی ربوده بالجمله چنین نکته سنج نغز گفتار کمتر مرئی شد - دیدنش ہر چند گاه گاه صورت می بندد اما پیوند معنی مستحکم است دیوانش بنظر رسید و این ابیات ازان منتخب گردید -"[۱]

☆ ☆ ☆

۱- "گلشن بے خار" نواب مصطفٰی خاں شیفته ، ص ۱۳۹ تا ۱۴۳ ، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ع -

مدایح الشعراء

مصنّف کا نام عنایت حسین خاں تخلص مہجور ہے۔ گارسیں دتاسی نے لکھا ہے:

"نواب اقبال الدولہ عنایت حسین خان بہادر بنارس کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد نواب نصیر الدولہ نصیر الدین خان بہادر صمصام جنگ نصیر اور ان کے دادا نواب امیر الدولہ عزیز الملک علی ابراہیم خان بہادر نصیر جنگ خلیل تھے۔ انھوں نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جس سے چند اشعار محسن نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں۔"[1]

محسن نے سراپا سخن میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ:

"نواب اقبال الدولہ عنایت حسین خاں بہادر خلف نواب نصیر الدولہ نصیر الدین خان بہادر صمصام جنگ نصیر ابن نواب امین الدولہ عزیز الملک علی ابراہیم خان بہادر نصیر جنگ خلیل باشندۂ بنارس ایک دیوان ایک تذکرہ اُن کا ہے۔"[2]

افسوس کہ اس سے زیادہ تفصیل کسی اور تذکرے میں نہیں ملتی۔ مؤلف نے اپنے والد نصیر الدولہ کا ذکر تو کیا ہے لیکن خود اپنا حال بطور شاعر نہیں لکھا۔ دیباچے سے بھی ان کے حالاتِ زندگی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ علی خان لائبریری پٹنہ میں مہجور کی جو بیاض محفوظ ہے اس میں البتہ ان کے حالات قدرے تفصیل سے درج ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس بیاض کا تعارف

۱۔ تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ) قلمی، ص ۳۸۵، جلد دوم، مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

۲۔ سراپا سخن، ص ۹۸، مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۷۰ع۔

شائع کر دیا ہے۔[1] اس بیاض میں مہجور نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۲۰۲ھ بتائی ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ مادۂ تاریخ ''بہار بوستان دوست آمد'' سے ۱۲۱۲ھ نکلتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈائری کا جو ورق ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۷۲ھ کو لکھا گیا ہے اس میں انھوں نے اپنی عمر کا ستانواں سال بتایا ہے۔ اس ڈائری میں دوسرے خاندانی حالات بھی منظوم درج کیے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے بارے میں لکھا ہے:

بنارس کے تھے حاکم اس کے دادا
بحدِ شان و شوکت حکم فرما
ہوئے والد مرے بعد ان کے حاکم
رہے برسوں ہی اس عہدے پہ قائم

یہاں دادا سے مراد علی ابراہیم خان خلیل متوفی ۱۲۰۸ھ اور والد سے مراد نصیر الدین علی خان ہیں۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ:

حقیقی تھے ہم تین بھائی غریب
مگر مبتلائے ستم بے نصیب
علی محمد تھا منجھلے کا نام
غلام علی چھوٹا تھا نیک نام
بڑا سب سے ہے یہ عنایت حسین
زمانے کے ہاتھوں سے پایا نہ چین
پدر ایک تھا اور مادر تھی ایک
عداوت نہایت تھی آپس میں لیک
چل و پنج سالہ تھے وہ خوش نہاد
حسد ان کے دل میں تھے سب سے زیاد
نشانہ حسد کا تھا پر یہ حقیر
تھا چھوٹوں کا چھوٹا یہ تھا گو کہ پیر

۱- ملاحظہ ہو ''نوائے ادب'' بمبئی، شمارہ نمبر ۱، جلد ۱۱، بابت جنوری ۱۹۶۰ء ص ۵ تا ۲۰۔

اپنی تعلیم و تربیت کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے :

فراغ حاصل ہوا تحصیل سے جب
ہوا ذوقِ طبابت بندے کو تب
سدیدی اور نفیسی اور قانون
کتابیں سب پڑھیں از فضل قیوم (کذا)

ہوا پھر شعر گوئی کا وہ کچھ شوق
کہ جملہ ذوق پر اس کو ہوا فوق
کہے تا آنکہ دو بندے نے دیوان
بہم پہنچا غزل گوئی کا سامان

لکھا پھر اک مجلاً ؟ مثنوی کا
کہ لکھی مثنوی ہیں اس میں صدہا
ہوا سو مثنوی ہے اس میں مرقوم
کہ ان کا حال ہو دیکھے سے معلوم

لکھا اک تذکرہ ہے شاعروں کا
خود اس کے طرز کا موجد ہے بندہ
کلام و شعر گو ہر ایک کے بس
مثلّث اور مربّع اور مخمّس

کیا اس تذکرے میں میں نے داخل
ہوا یہ طرز تازہ تر ہے حاصل
مطوّل اک قیامت نامہ صادق
حدیث و نصِ قرآن کے مطالب

لکھا بندے نے زاد الآخرت ہے
بلا شک اس میں میری مغفرت ہے
لکھا افسانہ اک رنگیں بصد طول
ہوا اہلِ طبائع کو وہ مقبول

اسی ڈائری میں مؤلف نے اپنی والدہ اور ایک بھائی علی محمد دونوں کا سالِ وفات واضح طور پر ۱۲۷۱ھ لکھا ہے لیکن والدہ کی وفات سے متعلق قطعۂ تاریخ

سے صرف ۱۲۶۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔

تذکرے میں بھی مہجور نے اپنے والد کا ذکر اس طور پر کیا ہے:

"نصیر، اسم جلیل آن چمن آرائے گلستان خلیل و نام با احترام آن بہار پیرائے بوستان خلیل یعنی والد ماجد ابن مترنم نغمہ خارج از آہنگ نواب نصیر الدولہ نصیر الدین علی خان بہادر صمصام جنگ مرحوم۔"

رام جس محیط کے ترجمے میں لکھا ہے:

"منشی رام جس محیط تخلص، والا مقامے اصل شریفش از خطۂ جنت نظیر کاشمیر بود وارد دارالخلافہ شاہجہان آباد دہلی گردیدہ و از آنجا در بلدۂ کاشی بنارس تشریف آوردند۔ بالجملہ علیٰ مناسبت المقام غزل استاد خود را زیب این تذکرۂ جلیلہ می نماید بہ تخمیس آن می پردازد۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی رام جس محیط شاعری میں مہجور کے استاد تھے۔ محیط کے مندرجہ ذیل مطلع کی غزل پر خمسہ کہا گیا ہے۔ صرف چار بند ہیں:

رات جاتی نہیں ہے کیا کیجے　　　نیند آتی نہیں ہے کیا کیجے

مؤلف نے تذکرے کے آغاز یا اختتام کی تاریخ کا واضح سراغ نہیں دیا۔ نہ تذکرے کا نام تاریخی ہے، نہ دیباچے میں کوئی قطعۂ تاریخ ہے اور نہ خاتمے پر تکملے کے متعلق کوئی ترقیمہ ہے۔ دیباچے سے یہ پتا چلتا ہے کہ مؤلف نے یہ تذکرہ اس وقت لکھا ہے جب کہ دہلی میں اکبر بادشاہ ثانی، لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر اور انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ حکمرانی کر رہے تھے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"الحمد للہ کہ در زمانِ سعادت توامانِ بادشاہت سلطان ہندوستان حضرت ... محمد اکبر بادشاہ غازی ولی عہد اعلیٰ حضرت جنت آرام گاہ شاہ عالم بادشاہ غازی ... کہ ہنگامِ ارقام این اوراق بر تخت جہان بانی جلوہ افروز مکارم سلطانی بودند در سنہ یک ہزار دو صد و شصت ۱۲۶۰ھ ... انتقال فرمود و حضرت ظل اللہ جہاں پناہ میرزا محمد سلیم بہادر بر تخت جہان افروزی متمکن گشتند ... و باوان ... وزیر الممالک نواب نصیر الدین حیدر خان بہادر کہ این عالی جناب نیز بعد مرور سنین چند

از تحریر این تذکرۂ دلپسند بعالمِ بقا شتافت و بعدہ عمویش و بعد عمویش فرزندش ثریا جاہ بہادر بر مسند وزارت لکھنؤ رونق (افروز) گشت . . . و در زمانِ حکومت کوئن وکٹوریہ بہ تسوید این مجموعہ ندرت جاوید اتفاق افتاد ۔''

چونکہ اکبر شاہ ثانی کا انتقال ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ع میں اور نصیر الدین حیدر کا انتقال ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ع میں چند ماہ کے فرق سے ہوا ہے اور ملکۂ وکٹوریہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ع میں تخت نشین ہوئی ہیں ، اس لیے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مدایح الشعرا ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ع سے چند سال قبل کار ترتیب انجام کو پہنچا اور ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ع میں ثریا جاہ کی تخت نشینی کے بعد اس کا دیباچہ لکھا گیا ۔[۱] لیکن شاہ افضل ابن شاہ محمد اجمل کے ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں ۱۲۶۰ھ تک اضافے ہوتے رہے ہیں ۔ افضل شاہ کے ترجمے میں لکھا ہے :

''در سنہ ۱۲۶۰ھ بعارضہ دق ازین وقت سرائے فانی راحت آباد . . . انتقال نمود ۔''

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے سہواً افضل شاہ کے ترجمے کو اجمل شاہ کا ترجمہ قرار دیا ہے ۔ ہر چند کہ اس میں اجمل شاہ کا ذکر بھی موجود ہے لیکن مذکورہ بالا عبارت ان سے نہیں بلکہ ان کے بیٹے کے ترجمے سے تعلق رکھتی ہے ۔

''مدایح الشعرا'' ہنوز غیر مطبوعہ ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رام پور میں موجود ہے ۔ سب سے پہلے اس کا تعارف مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے قلم سے مقدمۂ دستور الفصاحت کے ذریعے منظر عام پر آیا ۔ بعد ازاں محترمی اکبر علی خاں سے اس کی بعض تفصیلات اور فہرست شعرا منگوا کر راقم الحروف نے نگار ۱۹۶۴ھ کے سالنامے میں شائع کی ۔ اب اس نسخے کا مبیضہ میرے سامنے ہے ۔[۲] اصل مخطوطے کے متعلق مولانا عرشی صاحب کا یہ خیال ہے کہ یہ مولوی

۱۔ دیباچہ دستورالفصاحت ، ص ۹۶ ، مطبوعہ رام پور ، ۱۹۴۳ع ۔

۲۔ ملاحظہ ہو ''مبیّضہ'' مملوکہ خواجہ مشفق ، کراچی ۔

محسن علی مؤلف سراپا سخن کے ہاتھ کا ہے اور زیر نظر مبیضہ کے سرورق پر اکبر علی خاں نے یہ اطلاع دی ہے :

''سنا ہے کہ اس تذکرے کا ایک نسخہ پٹنے میں بھی ہے مگر کہاں ہے ، یہ علم نہیں ۔''

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں ۶۸ شعرا کا ذکر آیا ہے ۔ رام پور کے مخطوطے کے متعلق عرشی صاحب کا کہنا ہے کہ :

''خطِ نستعلیق بد نما ، غلطیوں سے پُر اور کاغذ چند ابتدائی اوراق تک انگریزی اور بقیہ دیسی ساخت کا ہے ۔''

مخطوطے میں صفحے کا آخری نمبر ۴۸ الف ہے گویا اس میں ۹۵ صفحات ہیں ۔ اس کا زیرِ نظر مبیضہ بھی اتنے ہی صفحات پر مشتمل ہے ۔

حمد و نعمت کے بعد مؤلف نے سبب تالیف کے عنوان سے بتایا ہے کہ اس سے پہلے وہ پانچ دیوان ، دو خیالی افسانے ، ایک مجموعۂ مثنویات اور ایک مجموعۂ ادعیہ و نقوش و نسخہ جات لکھ چکے تھے ۔ اب دوستوں کے اصرار سے بعض شعرائے نادرہ کار کے کلام کو مخمس ، مسدس ، مثلث اور مربع کی شکل میں تضمین کر کے پیش کر رہے ہیں ۔ اصل عبارت دیکھیے :

''ذرۂ بے مقدار خاک پائے سخن سنجان . . . عنایت حسین خان مہجور . . . بعد فراغ تدوین پنج عدد دیوان رنگین و دو مجلد افسانۂ خیالی بزبان اُردوئے معلیٰ مطوی (کذا) بر یک صد و نود و پنج جز ہشت ورق و جلد مثنویات مطولہ کہ یک صد و یک مثنوی دوران اندراج یافتہ و مجلد تعویذات و نقوش و ادعیات و نسخہ جات من المجربات کہ اخواصیہ (کذا) و ترکیبش بسط نظم در آمدہ مطابق ارشاد بعضے دوستان یک دل و یک رو موزون طبعان ریختہ گو بہ خاطر و تردد ذخائر آوردہ کہ برخے از کلام بلاغت التزام شاعران رنگین بیان را مخمس و مسدس و مثلث و مربع نمودہ زیب اوراق بیاض نماید ۔

آنرا ذخیرہ ساختم و بتذکرۂ مدایح الشعرا موسوم گردانیدم بالجملہ چون بہ سبب سکونت این دیار بسیار از بسیار تحریر اشعار تذکیر اطوار شعرائے سخن رس بنارس مخطوط و منظور بود لہٰذا تذکرہ مختصر شد ۔''

"مدائح الشعرا" اپنی نوعیت کا منفرد تذکرہ ہے ۔ اس میں شعرا کے تراجم تو ہیں لیکن انتخابِ کلام کی صورت دوسرے تذکروں سے مختلف ہے ۔ مؤلف نے ۶۸ شاعروں کے چند اشعار اپنی پسند کے لے لیے ہیں اور ان کی تضمین خود کر کے مخمس و مسدس یا مربع و مثلث کی شکل دے دی ہے ۔ سب سے پہلے آصف الدولہ آصف کے مندرجہ ذیل دو مطلعوں پر خمسہ کہا ہے :

کیا کرتا ہے دل مذکور تو شام و سحر کس کا
تصور تجھ کو رہتا ہے بتا آٹھوں پہر کس کا

جب کبھی کروٹ لی پہلے آہ کی
شکر ہے درگاہ میں اللہ کی

آخر میں انعام اللہ خاں یقین کا دو سطری ذکر اس طور پر ملتا ہے :

"نام آن شاعر بلند مقام انعام اللہ خان خلف الصدق اظہر الدین خان بخانوادۂ شیخ مجدد الف ثانی مشہور منظورِ نظر میرزا مظہر جان جانان شاعر مذکور سودائے [سوادے ؟] نداشت مرزا مظہر اشعارِ خود نامزد او می فرمود ۔"

اس کے بعد ان کے دو شعروں پر تین بند کا خمسہ کہا ہے ۔ پورے تذکرے میں خمسہ ہی کی تعداد زیادہ ہے ۔ صفِ اول کے شعرا مثلاً انشا ، درد ، آتش ، میر حسن ، مصحفی ، میر تقی میر وغیرہ کی غزلوں پر خمسہ ہی ملتے ہیں ۔ ان شعرا کی جن غزلوں پر خمسے کہے گئے ہیں ان کے مطلعے یہ ہیں :

بندگی تو اپنے دل سے ہم نے ٹھانی آپ کی
خیر آگے بندہ پرور قدردانی آپ کی (انشا)

روندے ہے اک جہان سمجھ نقش پا مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے (درد)

حصے میں ہمارے بھی کبھی آؤ گے صاحب
یا یوں ہی الگ بچ کے چلے جاؤ گے صاحب (مصحفی)

اک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا
کیا جانیے کہ میر زمانے کو کیا ہوا (میر)

گستاخ دست گردنِ جاناں میں خم ہوا
حدِ ادب سے شوق کا باہر قدم ہوا (آتش)

شب جو تم ہم سے خفا ہو کر سحر کو اٹھ گئے
شمع ساں رو رو کے ہم دل اور جگر کو اٹھ گئے (میر حسن)

مربع کی مثالیں صرف سلامت علی سلامت اور میر کلّو شور کے ترجمے میں ، مثلث کی مثالیں ، منتہی ''وصل'' اعلیٰ عظیم آبادی ، امداد علی امداد ، مرزا مغل جمیل ، میرزا کیخسرو ، ذاکر علی ذاکر ، محمد علی شوکت ، موزون ، شوق ، لطف علی لطف ، ماہ بھوپ سنگھ اور مذنب کے یہاں اور مسدس کی مثالیں صرف بو علی خاں مرزا اور شیخ مومن علی کے یہاں ملتی ہیں ۔

اس تذکرے کے نثری تراجم بہت مختصر ہیں ۔ ان سے کسی شاعر کے بارے میں بھی کوئی کارآمد بات نہیں معلوم ہوتی ۔ مؤلف کا مقصود دراصل صرف بعض شعرا کے کلام کی تضمین کرنا تھا ۔ چنانچہ تضمین کے بعد ہر شاعر کے متعلق چند سطریں لکھ دی گئی ہیں ۔ صرف یہ کہ ایک دو غیر معروف شاعروں کا نام یا کلام اس تذکرے کے ذریعے ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔ شعرا کے تراجم تخلص کے اعتبار سے بلحاظ حروف تہجی ترتیب دیے گئے ہیں ، اس جگہ دو ترجمے بطور مثال نقل کیے جاتے ہیں ۔ ایک کا تعلق مشہور شاعر سے ہے اور ایک کا غیر معروف و غیر معلوم شاعر سے :

انشا : ''اسم شریفش انشاء اللہ خان بہادر ولد حکیم ما شاء اللہ خان مغفور مصدر تخلص از زیور ظواہر و بواطن آراستہ و بجواہر زواہر علم و ہنر پیراستۂ نواب سعادت علی خان بہادر ۔''

شوق : ہم اسم و ہم از مولدش و منشایش آگاہی دست نہ دادہ و نیز حال تلمذش معلوم نہ گشتہ اماّ در مشاعرۂ معینۂ غریب خانۂ حقیر چون اکثرے می آید لہٰذا غزلش در این جا قلمی شود ازوست ۔''

☆ ☆ ☆

تاریخِ ادبِ ہندوستانی

تاریخ ادب ہندوستانی کے مصنف گارسیں دتاسی ہیں۔ گارسیں دتاسی ایک ممتاز مستشرق ہیں، اُردو کی خدمت کے سلسلے میں ان کے کارنامے ایک دو نہیں درجنوں ہیں۔ وہ ۲۰۔ جنوری ۱۷۹۴ع میں بمقام مارسیلیز (فرانس) میں پیدا ہوئے۔ پیرس میں عربی، فارسی اور ترکی سیکھی۔ اُردو کی تعلیم انھوں نے انگلستان میں حاصل کی۔ ۱۸۲۸ع میں ان کی کوششوں سے پیرس کے ادارۂ السنۂ شرقیہ میں اُردو کا شعبہ قائم ہوا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسی سے منسلک ہو گئے۔ گارسیں دتاسی کبھی ہندوستان نہیں آئے بلکہ علمی اداروں اور انجمنوں سے خط و کتابت کے ذریعے کتب و رسائل اور اخبارات و جراید منگاتے تھے اور اپنے سالانہ خطبوں میں اُردو کی رفتار ترقی کا جائزہ لیتے تھے۔ خطبات اور تاریخ ادب ہندوستانی کے علاوہ گل بکاؤلی، باغ و بہار، بوستانِ سعدی، آثار الصنادید اور ہیر رانجھا وغیرہ کے اُردو ترجمے اور خلاصے بھی انھوں نے مرتّب کیے تھے۔ قاضی عبدالودود[1]، ڈاکٹر زور[2] اور مولوی عبدالحق[3] نے گارسیں دتاسی کے حالات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ تاریخِ ادب ہندوستانی کے مترجم مکستان

۱۔ ملاحظہ ہو معاصر پٹنہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۷ع، جلد ۱۱، ص ۳۶ تا ۱۳۵۔

۲۔ ملاحظہ ہو گارسیں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اُردو، مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ ۱۹۴۱ع طبع ثانی، ۱۹۳۱ع، طبع اول۔

۳۔ مقدمۂ خطبات گارسیں دتاسی از مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۵ع۔

لیلیان نذرو بھی[1] مقدمے میں گارسیں دتاسی کے حالات تفصیل سے لکھ چکی ہیں۔ شعبہ اُردو علی گڑھ کی استاد ڈاکٹر ثریا سلطانہ (حال بیگم حسین) گارسیں دتاسی کی زندگی اور علمی کارناموں کا جائزہ لے کر چند سال پہلے پیرس یونیورسٹی سے ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر ثریا سلطانہ کا مقالہ فرانسیسی زبان میں ہے۔ اُن کا ایک مضمون گارسیں دتاسی کی زندگی سے متعلق رسالہ اُردو ادب علی گڑھ میں شائع ہو چکا ہے۔[2] ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بھی گارسیں کی حیات و خدمات کا اپنے ایک مقالے میں جائزہ لیا ہے۔ یہ مقالہ دراصل خطبات گارسیں کی نئی اشاعت کا دیباچہ ہے اور قومی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔[3]

تاریخ ادب ہندوستانی فرانسیسی زبان میں ہے اور تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد پہلے پہل ۱۸۳۹ع میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی اور ملکہ وکٹوریہ کے نام معنون کی گئی۔ دوسری جلد ۱۸۴۷ع میں منظر عام پر آئی۔ گارسیں نے کام جاری رکھا اور ان جلدوں کے مواد میں برابر اضافے کرتا رہا، یہاں تک کہ ۱۸۷۰ع اور ۱۸۷۱ع کے درمیان اس نے اپنی تاریخ کا دوسرا ایڈیشن تین جلدوں میں شائع کیا۔ پہلی دو جلدیں ۱۸۷۰ع میں اور تیسری جلد ۱۸۷۱ع میں پیرس سے طبع ہو کر عوام کے سامنے آئی۔ ہر جلد میں تقریباً چھ سو صفحات ہیں۔ یہ جلدیں پنجاب پبلک لائبریری کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

۱۸۳۹ع میں جب تاریخ ادب ہندوستانی کی پہلی جلد شائع ہوئی تو مولوی کریم الدین اور فیلن صاحب کی مشترک کوششوں سے ۱۸۴۸ع میں دہلی سے اس کا ترجمہ ''طبقات الشعرا'' کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے، بلکہ کریم الدین اور فیلن نے اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا ذکر علیحدہ کیا جائے گا۔

۱۔ اُردو ترجمہ (قلمی) تاریخ ادب ہندوستانی از لیلیان نذرو مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کراچی۔

۲۔ اُردو ادب علی گڑھ شمارہ نمبر ۱ - ص ۵۱ تا ۶۳، ۱۹۶۴ع -

۳۔ قومی زبان کراچی، ص ۷ تا ۱۴ بابت جنوری ۱۹۶۴ع -

گارسیں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستانی کی تینوں جلدیں اُردو میں منتقل کی جا چکی ہیں - فرانسیسی خاتون سکستان لیلیان نذرو نے اس کا اُردو میں براہِ راست فرانسیسی سے ترجمہ کیا اور تنقیدی حواشی و مقدمہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ع میں پی ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کی - اس کا ٹائپ شدہ ایک نسخہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے ذاتی کتب خانے میں اور ایک نسخہ کراچی یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے -

اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے اور اس میں مصنّفین و شعرا کا ذکر بلحاظ حروف تہجی کیا گیا ہے - ڈاکٹر سکستان لیلیان نذرو نے بھی اپنے اُردو ترجمے میں شعرائے اُردو کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے - اصل کتاب میں تقریباً تین ہزار سے زاید شعرا و مصنّفین کا ذکر آیا ہے - جس میں سے دو ہزار آٹھ سو مصنّفین و شعرا اُردو سے تعلق رکھتے ہیں اور سکستان لیلیان نذرو نے انھیں کا اُردو ترجمہ کیا ہے -

گارسیں دتاسی نے تاریخ ادب کے مقدمے میں اُردو کی پیدائش ، ساخت ، مزاج اور رسم الخط کے مسائل پر گفتگو کی ہے - اصناف سخن اور علم بیان و بدیع کی بحثیں چھیڑی ہیں - اُردو کی مقبولیت ، اس کی ترقی کے امکانات اور اس کی وسعت بیان کا جائزہ لیا ہے - مسعود سعد سلمان سے لے کر غالب کے عہد تک کی آٹھ سو سالہ ثقافتی و ادبی رفتار پر تاریخی نظر ڈالی ہے - اُردو میں مستعمل تلمیحات اور شاعرانہ رموز و علائم کی تشریح کی ہے - قدیم تذکروں کی نوعیت و حیثیت پر تبصرہ کیا ہے اور سب سے آخر میں اس نے تذکرہ نگاری کے طرز پر شعرا و مصنّفین کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام درج کیا ہے - گارسیں کی علمی و ادبی بحثوں میں بہت سی کمزوریاں بھی ہیں اور ایک محقق یا نقاد کو اس کے بعض مباحث پر اعتراض کرنے کی بڑی گنجائش ہے - اس کے باوجود اس تذکرے کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے - ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر جس جگہ اور جس زمانے میں یہ تذکرہ مرتّب کیا گیا ہے اس جگہ اور اس وقت اس سے بہتر تالیف کی صورت آسان نہ تھی - گارسیں نے پیرس میں رہ کر اپنے تذکرے کے ذریعے ہمیں سیکڑوں تصانیف ، اخبارات ، تالیفات ، تراجم ، مجموعہ ہائے کلام ، رسائل ، مخطوطات ، کلّیات ، دواوین ، منتخبات اور شعرا کے حالات و افکار کا سراغ دیا ہے - اگر یہ تذکرہ موجود نہ ہوتا تو اُردو زبان و ادب کی تاریخ کا بہت سا

قیمتی مواد اور بہت سے اہم ماخذ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے - حق بات یہ ہے کہ اس تذکرے نے اُردو میں ادبی تاریخ و تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے اور پاک و ہند سے باہر اُردو کو روشناس کرانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے - خاص طور پر اُردو کی مقبولیت اس کے رسم الخط اور تذکرہ نگاری کے فن کے متعلق گارسیں دتاسی کے یہاں بعض ایسے بیانات ملتے ہیں جو اس کی وسیع النظری اور اُردو سے غیر معمولی لگاؤ کا واضح ثبوت ہیں - اُردو کے متعلق گارسیں کی رائے ہے کہ :

''ہندوستان کی عام بولیوں میں ہندوستانی (اُردو) سب سے زیادہ وسیع البیان اور لچک‌دار زبان ہے اور اس کا جاننا سب سے زیادہ سود مند ہے - وجہ یہ ہے کہ یہاں عموماً یہی زبان استعمال ہوتی ہے - شمالی ہند اور شمالی علاقے کی عدالتوں اور دفتروں میں جب سے فارسی کی جگہ اُردو استعمال ہونے لگی ہے اس نے اور زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے -''[۱]

آج جو لوگ اُردو رسم الخط کو مشکل بتا کر اسے آسان بنانے یا رومن اور دیوناگری میں اسے منتقل کرنے کی سفارش کرتے ہیں انہیں یہ جاننا چاہیے کہ یہ بحث نئی نہیں ہے بلکہ اُردو کے مقابلے میں ہندی کو لانے کے لیے اس بحث کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا - گارسیں دتاسی کا اس سلسلے میں بیان ہے کہ :

''گزشتہ کئی برسوں سے ہندوستان میں وہی رجحان پیدا ہو گیا ہے جو یورپ میں قومیت کے نام پر پیدا ہوا تھا - ہندوؤں نے اُردو پر حملے شروع کر دیے ہیں - ان کا دعویٰ ہے کہ ملک کی عام زبان اُردو نہیں ہندی ہے - لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اُردو ایک دلکش ادبی سرمایہ رکھتی ہے ، اس کے برعکس ہندی ادبی حیثیت سے تقریباً ختم ہو چکی ہے - یہ مسئلہ ادبی نوعیت کا ہے جیسے فرانس میں تنگ نظر قوم پرستوں نے صوبائی بولیوں کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش میں اٹھایا تھا - ہندو ، فارسی رسم الخط کے مخالف ہیں اور دیو ناگری کو ترجیح دیتے ہیں - لیکن ایسا کرنا آنکھ سے اندھے ہو جانے

۱- اُردو ترجمہ (قلمی) جلد اول ، ص ۵ -

کے مترادف ہے ۔ بہرحال مسلمانوں نے بڑی حوصلہ مندی سے ان کے حملوں کا مقابلہ کیا اور ایسی قوی دلیلیں پیش کیں کہ میرے نقطۂ نظر سے وہ کامیاب رہے ۔ یہ اختلاف در اصل نسل و مذہب کے اختلاف سے پیدا ہوا ہے ، کون جانے کہ انگریزی حکومت رومن حروف تہجی کو رواج دے کر اس اختلافی مسئلے کو ختم کر دے گی یا باقی رکھے گی لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ علمی و ادبی حیثیت سے ایک افسوس ناک واقعہ ہوگا ۔''[۱]

اسی طرح اُردو شعرا کے قدیم تذکروں کے متعلق بھی گارسیں نے بہت صحیح رائے دی ہے ان کے لفظوں میں :

''اکثر نے صرف چند شعرا کے نام اور ان کے دو ایک شعر بطور نمونہ نقل کر دیے ہیں ۔ طویل سے طویل تبصرے میں بھی مصنّف کی تاریخ پیدائش ، تاریخ وفات ، ان کے حالاتِ زندگی ، ان کی تصانیف اور ان کے موضوعات کا ذکر نہیں ملتا ۔ ان کے نزدیک صرف یہ بات اہم ہے کہ شعرا نے اپنا دیوان مرتّب کیا ہے یا نہیں ۔ کیونکہ جس شاعر نے اپنا دیوان مرتّب کر لیا وہ صاحب دیوان ہونے کی حیثیت سے بڑا ممتاز شاعر خیال کیا جاتا ہے ۔''

گارسیں دتاسی کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے ۔ گارسیں سے پہلے کے تذکروں کا تقریباً یہی حال ہے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تذکرے میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ جن خامیوں کا ذکر انھوں نے اوپر کیا ہے ان سے ان کا تذکرہ پاک رہے اور اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ان کا تذکرہ اپنی کمزوریوں کے باوصف ادبی تاریخ اور سوانح کے بہت سے مفید عناصر اپنے اندر رکھتا ہے ۔ شعرا کی مروّجہ اصنافِ نظم و نثر ان کے اجزا اور اصطلاحی الفاظ کی تعریفیں بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کوشش میں ان سے بعض جگہ لغزشیں بھی ہوئی ہیں ، پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنے مقدمے میں بند ، بیت ، بیاض ، قصیدہ ، قوالی ، چیستان ، دیوان ، کلیات ، فرد ، غزل ، ہزلیات ، انشاء ،

۱۔ اُردو ترجمہ (قلمی) ، ص ۴ ۔

خیال ، شعر ، مدح ، منقبت ، مرثیہ ، مثنوی ، مولود ، معمہ ، مقطعات ، مسمط ، مستزاد ، نعت ، لطیفہ ، قطعہ ، ریختہ ، رسالہ ، رباعی ، سلام ، سالگرہ ، سہرہ ، ساقی نامہ ، سرود ، شکار نامہ ، سوز ، تقریظ ، ترانہ ، تاریخ ، تشبیب ، تذکرہ ، تضمین ، واسوخت ، زٹلیات ، ہجو ، حمد اور ریختی سب کی تعریفیں کی ہیں - یہ ایک ایسی علمی و ادبی کوشش ہے جو اس سے پہلے کسی اور تذکرے یا تالیف میں نظر نہیں آتی -

الغرض گارسیں دتاسی کا تذکرہ اُردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے - اگر یہ ماخذ موجود نہ ہوتا تو ہم اُردو کے بہت سے قدیم شعرا و مصنفین اور ان کی تالیفات و سوانح حیات سے بے خبر رہتے - لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ گارسیں دتاسی کا تذکرہ خامیوں سے یکسر پاک ہے - اس میں یقیناً بہت سی خامیاں ہیں - چند مثالیں دیکھیے یہ صرف مقدمے سے تعلق رکھتی ہیں :

۱- کسی مسلمان نے ہندی میں شعر نہیں کہے لیکن ہندوؤں نے اکثر اُردو یا دکنی میں شعر کہے ہیں - (ص ۹ ہ)

۲- ریختہ : یہ اُردو شاعری کا دوسرا نام ہے اور آخر آخر غزل کے لیے مخصوص ہو گیا ہے - اس کی تانیث میں ریختی کا لفظ آتا ہے - (ص ۳۰)

۳- تقریظ : مبالغہ آمیز مدحیہ نظم کو کہتے ہیں - (ص ۳۱)

۴- زٹلیات : اس نظم میں نصف حصہ ہندوستانی اور نصف حصہ فارسی ہوتا ہے - (ص ۳۱)

۵- نعت : یہ نظم خداوند تعالٰی کی تعریف میں کہی جاتی ہے - کبھی کبھی خلیفہ اور امام کی تعریف بھی اس میں کی جاتی ہے - (ص ۲۹)

۶- مستزاد : یہ ایک قسم کی غزل ہے جس کے ہر مصرعے کے آخر میں اسی وزن کا ایک رکن زائد کر دیتے ہیں - (ص ۲۹)

۷- غزل : یہ ایک قسم کی نظم ہے جو قصیدے کی سی شکل رکھتی ہے - لیکن اس سے مختصر ہوتی ہے اور اس میں ۱۲ اشعار سے زیادہ نہیں ہوتے - (ص ۲۷)

ظاہر ہے کہ گارسیں کے مندرجہ بالا بیانات درست نہیں ہیں - مقدمے کے

علاوہ اس طرح کی سیکڑوں کمزوریاں شعرا کے تراجم اور دوسری تفصیلات میں بھی نظر آتی ہیں - چند مثالیں دیکھیے :

۱- احسان میر غلام علی حیدر آبادی - ایک ہم عصر شاعر ہیں - شیفتہ نے ان کا ذکر کیا ہے - (ص ۹۹)

۲- اشرف خاں : حکیم شرف خاں فروغ دہلوی کے بیٹے اور محسن کے شاگرد تھے - شیفتہ نے ان کا ذکر کیا ہے - (ص ۱۵۱)

۳- امجد میر حسین علی خاں : وہ دکن کے ایک ہندوستانی شاعر ہیں - شیفتہ نے ان کا ذکر کیا ہے - (ص ۲۰۵)

۴- زیرک : وہ ذات کے کائستھ تھے اور بریلی میں خزانچی تھے - وہ عہدِ حاضر کے شاعر ہیں - شیفتہ نے ان کا ذکر کیا ہے - (ص ۵۳۶)

ان چاروں تراجم میں گارسیں نے شیفتہ کے تذکرے کا حوالہ دیا ہے لیکن گلشن بےخار میں ان کا ذکر نہیں ہے - اس طرح سیکڑوں حوالے غلط درج کیے گئے ہیں - گارسیں کے تذکرے کی مترجم سکستان لیلیان نذرو نے اس قسم کی اکثر غلطیوں کی اصلاح اپنے حواشی میں کی ہے لیکن ضرورت اس پر نظر ثانی کرنے اور تفصیلی حواشی لکھنے کی ہے -

گارسیں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ) آباد سے شروع ہو کر یونس کے ذکر پر ختم ہوتی ہے - اس جگہ شروع اور آخر کے چند تراجم نقل کیے جاتے ہیں -

۱- آباد مہدی حسن خاں :

پسر غلام جعفر خاں ، وطن لکھنؤ ، ایک ممتاز ہندوستانی شاعر ہیں - شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے اور غزل و واسوخت ان سے یادگار ہیں - ''بہارستانِ سخن'' کے نام سے ۱۸۴۷ع میں لکھنؤ سے جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں آتش اور ناسخ کے ساتھ ساتھ ان کا کچھ کلام بھی شامل ہے جو ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے - اس کا ذکر ۱۸۵۴ع کے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی جلد نمبر ۷ صفحہ نمبر ۲۶۴ میں کیا گیا ہے جس کا عنوان انگریزی میں "The Poems of Nasikh, Atish and Abad" ہے ان کے بعض اشعار مجموعۂ واسوخت مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ع میں بھی شائع ہوئے تھے -

آباد کے دیوان کا نام نگارستان عشق ہے یہ دیوان ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶-۳۷ع میں مرتّب ہوا - اس میں ۲۳۲ غزلیں ہیں اور ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ع میں موسوی پریس لکھنؤ سے پتھر کے چھاپے میں شائع ہوا - یہ ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے میں چھوٹی تقطیع پر صرف پانچ پانچ مصرعے ہیں - خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دیوان اس مجموعے سے الگ ہے جس میں ان کی وہ غزلیں ہیں جو مختلف عربی بحروں میں ہیں اور جو ہندوستانی یا مسلمانوں کی دوسری مشرقی زبانوں میں استعمال ہوتی ہیں -[1]

۲- خوب چند ذکا دہلوی :

وہ کائستھ ذات کے ہندو ہیں وہ اُردو میں شعر کہتے ہیں - منو لال نے ان کی متصوفانہ اور عشقیہ غزل نقل کی ہے جو مشرقی شعرا کا محبوب ترین موضوع ہے - اگرچہ اس کے استعارات ہمارے ذوق سے ماورا نہیں ہیں پھر بھی ان میں اس قدر مبالغہ آمیزی ہے کہ ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے - وہ دورِ حاضر کے ایک شاعر ہیں جو شاہ ناصر [نصیر] کے شاگرد ہیں - انھوں نے ایک دیوان مرتّب کیا جس کے کچھ حصے سرور اور شیفتہ نے اپنے تذکروں میں نقل کیے - انھوں نے ہندوستانی شعرا کا ایک تذکرہ ''عیار الشعرا'' نامی کے علاوہ بڑی دلکش نثر بھی لکھی ہے - انھوں نے اپنے استاد میر نصیر الدین ناصر معروف بہ میر کلّو کی درخواست پر یہ تذکرہ لکھا تھا - اس تذکرے کی ترتیب میں وہ ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳-۹۴ع سے لے کر ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱-۳۲ع تک تقریباً ۴۰ سال مصروف رہے - یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً ۱۵۰۰ شعرا کے حالات ان کے انتخابِ کلام کے ساتھ دیے گئے ہیں - یہ چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰۰ صفحات پر ہے اور ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں - ڈاکٹر اشپرنگر کا بیان ہے کہ اس میں تنقیدی عنصر نہیں ہے اور تکرار کے علاوہ اکثر غیر مصدقہ واقعات درج ہیں - لیکن ساتھ میں ان کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ تذکرہ بڑی اہم معلومات فراہم کرتا ہے - بد قسمتی سے اس کا نسخہ یورپ میں موجود نہیں - اس پہلو سے قطع نظر ، ذکا ، ریاضی اور انشا

۱- تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ قلمی) ، ص ۸۲ ، جلد اول -

میں بھی غیر معمولی مہارت رکھتے تھے - دورِ حاضر کے ایک شاعر نسیم میسوری ہیں ان کی ایک غزل پر مخمس کہا ہے جو کہ ۱۹- جنوری ۱۸۶۷ع کے اودھ اخبار میں شائع ہوئی :

"ذکا کے پوتے کے حوالے سے ڈاکٹر اشپرنگر نے ان کی وفات کا سال ۱۸۴۶ع لکھا ہے -"[1]

۳- شاہ کمال الدین حسین :

وہ ایک ممتاز ہندوستانی شاعر ہیں - ان کے آبا و اجداد الہ آباد کے صوبے میں مانکپور کے رہنے والے تھے اور بعد میں بہار چلے گئے تھے جہاں وہ مغلیہ حکومت کے اہم عہدوں پر مامور رہے - کمال جوان ہوتے ہی درویشوں کی صحبت میں رکھے گئے اور خود بھی درویش ہوگئے - اس کے بعد وہ بنگال اور پھر لکھنؤ چلے گئے - جس وقت مصحفی اپنا تذکرہ مرتب کر رہے تھے کمال ، راجہ بلاس رائے کے یہاں ملازم تھے -

ان کو اُردو میں شعر کہنے کا شوق شروع ہی سے تھا اس لیے انھوں نے اُردو کے قدیم اور جدید شعرا کے تقریباً ۳۰ دیوان جمع کئے تھے اور ان کتابوں کے مطالعہ اور ادبی حلقوں کی صحبت میں ان کے اندازِ بیان میں قوت پیدا ہوئی - پہلے وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے لیکن بعد میں قلندر بخش جرأت کے شاگرد ہوگئے - ہمیں یہ تفصیلات مصحفی سے ملتی ہیں جنھوں نے اُن کے اشعار ایک صفحے میں نقل کیے ہیں - یہاں ایک غزل دی جاتی ہے جو "دیوان جہان" سے لی گئی ہے -"[2]

۴- یوسف نواب امجد علی :

وہ فتح پور ھسوہ کے قریب دیوئی مئی میں پیدا ہوئے - ان کے والد سید فیض علی خاں تھے اور ان کے استاد کا نام احمد علی کامل تھا - باطن اور محسن نے ان کا ذکر کیا ہے - محسن نے ان کی چھ غزلیں بھی نقل کی ہیں -[3]

۱- تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ قلمی) ، ص ۴۵۶ ، جلد اول -

۲- تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ قلمی) ، ص ۲۳۳ ، جلد دوم -

۳- تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ قلمی) ، ص ۵۱۳ ، جلد دوم -

۵- یکرنگ مصطفیٰ قلی خاں ، دہلوی :

قاسم اُنھیں غلام مصطفیٰ کہتے ہیں - وہ خان جہان خاں لودھی کے پوتے تھے جو محمد شاہ کے یہاں ایک اچھے منصب پر مامور تھے - وہ ایک خوش حال گھرانے کے فرد تھے اور ایک باوقار زندگی بسر کرتے تھے - ان کا شمار دہلی کے ممتاز شعرا میں کیا جاتا ہے - ان کا کلام استعارات سے مالا مال ہے اور انداز بیان دوسرے ہمعصر شعرا پروانہ ، مضمون اور آبرو سے ملتا جلتا ہے - بعض کا کہنا ہے کہ وہ آرزو کے شاگرد تھے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میاں آبرو کی شاگردی میں تھے - خود ان کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ وہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے - انھوں نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے ، جس میں تقریباً ۵۰۰ اشعار ہوں گے - اُردو فارسی اور ترکی زبانوں کے دواوین کی طرح اس میں متصوفانہ اور عاشقانہ کلام ہے - عام لوگوں کے لیے اس میں عشق حقیقی اور مجازی کے دونوں پہلو شامل ہیں ، لیکن تصوف پسندوں کے لیے ان میں سے عشق حقیقی کا رنگ نمایاں ہے -

لطف کا بیان ہے کہ ان کا انتقال . . . میں ہوا لیکن انھوں نے سنہ نہیں لکھا - ہندوستانی تذکرہ نگاروں نے ان کے اشعار بڑی تعداد میں نقل کیے ہیں - میر نے ان کے ایک مرثیے کا اقتباس دیا ہے جو حضرت امام حسین کے متعلق ہے -[1]

☆ ☆ ☆

۱- تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ قلمی) ، ص ۵۱۲ ، جلد دوم -

انتخاب دواوین

"انتخاب دواوین" کے مؤلف امام بخش صہبائی ہیں - صہبائی دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر اور غالب ، مومن ، ذوق اور سر سید کے ہم عصر تھے - فارسی کے بڑے عالموں اور محققوں میں ان کا شمار ہوتا تھا - فارسی کی بعض نہایت ادق کتب درسیہ "سہ نثر ظہوری" وغیرہ کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں - مولوی محمد حسین آزاد اور پیارے لال آشوب ان کے شاگردوں میں تھے - سرسید احمد خاں سے صہبائی کے تعلقات خاص تھے - آثارالصنادید کی تیاری میں خاص مدد کی تھی اور کتاب کے پہلے اڈیشن کے مسودے کی ترتیب و تزئین کا کام بھی صہبائی ہی نے کیا تھا -[1]

رام بابو سکسینہ کا بیان ہے کہ صہبائی بہت روشن خیال اور اخلاقی جرأت کے آدمی تھے - طلبہ میں بہت ہر دل عزیز تھے اور ان کی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پر بڑا اثر ہوتا تھا - فن شعر میں استاد مشہور تھے اور قلعے کے اکثر شہزادے اور متوسلین ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے -[2] صہبائی کے شاگرد مرزا قادر بخش نے ان کے حسب و نسب اور علم و فضل کا ذکر تفصیل سے کیا ہے -[3]

کریم الدین نے بھی "طبقات الشعرائے ہند" مؤلفہ ۱۸۴۷ع کے طبقۂ چہارم میں صہبائی کے حالاتِ زندگی تفصیل سے لکھ دیے ہیں - کریم الدین خود دلی کالج

۱- داستان تاریخ اُردو ، ص ۱۸۵ ، از مولانا حامد حسن قادری ، مطبوعہ آگرہ ، طبع دوم ، ۱۹۵۷ع -

۲- تاریخ ادب اُردو ، ص ۸۰ ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، طبع سوم -

۳- گلستان سخن ، ص ۱۳۷ ، جلد دوم ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ع -

میں طالب علم رہ چکے تھے اور انھوں نے صہبائی کو بہت قریب سے دیکھا تھا ۔ چنانچہ انھوں نے کریم الدین کے حلیے ، شخصیت ، تصنیفی و تالیفی شغف علمی قابلیت ، دلی کالج میں صہبائی کے تقرر ، ان کی تصانیف اور ان کے تراجم کا حال تفصیل سے لکھا ہے ۔[۱]

مولوی عبدالحق صاحب نے بھی ان کے حالات پر روشنی ڈالی ہے ۔[۲] اور پروفیسر جاوید وششٹ نے بھی ایک بسیط مقالہ صہبائی کے حالات میں سپرد قلم کیا ہے ۔[۳] امداد صابری نے بھی اُن کے حالات و کلام پر مفصل تبصرہ کیا ہے ۔[۴]

صہبائی کا آبائی وطن تھانیسر تھا لیکن وہ دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش کا سراغ نہ لگ سکا ۔ صہبائی ۱۸۴۰ع میں دلی کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے اور کریم الدین کا بیان ہے کہ :

عمر ان کی بالفعل اس سال یعنی ۱۲۶۱ع میں قریب چالیس برس ہوگی ۔

اس لحاظ سے ۱۲۲۱ع میں پیدا ہوئے ہوں گے ۔ ۱۸۵۷ع کے غدر میں ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے ، قتل کر دیے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا ۔ صدر الدین آزردہ کا یہ شعر ان کے واقعۂ قتل کی یادگار ہے :

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی کی دو کتابیں اُردو زبان و ادب میں خاص طور پر یادگار ہیں ۔ ایک شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا اُردو ترجمہ ، دوسرے زیر بحث تذکرۂ انتخاب دواوین ۔ خود صہبائی کا بیان ہے کہ انھوں نے حدائق البلاغت کا اُردو ترجمہ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ع میں دہلی کالج کے پرنسپل بوترس کی فرمائش پر

۱۔ طبقات الشعرائے ہند ، مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ع ، طبع اول مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

۲۔ مرحوم دلی کالج ، ص ۱۵۳ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۴۵ع ۔

۳۔ دلی کالج میگزین ''قدیم دلی کالج نمبر'' مرتبہ ڈاکٹر احمد فاروق ، ۱۹۵۳ع ۔

۴۔ ۱۸۵۷ع کے مجاہد شعرا ، ص ۲۶۰ ، مطبوعہ مکتبہ شاہراہ دلی ، طبع اول ۱۹۵۹ع ۔

کیا تھا ۔[1] کریم الدین نے اطلاع دی ہے کہ یہ ترجمہ سب سے پہلے سید عبدالغفور کے زیر اہتمام ۱۸۴۳ع میں سید الاخبار دہلی سے چھپا بعد ازاں خود کریم الدین نے اسے اپنے مطبع رفاہ عام واقع حوض قاضی دہلی سے ۱۸۴۴ع میں شائع کیا ۔ حدائق البلاغت کے اُردو ترجمے کے متعلق مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ :

''صہبائی نے ۱۸۴۲ع/۱۲۵۸ھ میں منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف (فارسی) حدائق البلاغت (مصنفہ ۱۷۵۵ع/۱۱۶۸ھ) کا اُردو ترجمہ مرتب کیا لیکن صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اُردو میں منتقل کیا ہے ۔ اُردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستقل کتاب ہے ۔''[2]

دہلی کالج کے پرنسپل بوترس کی فرمائش پر ۱۸۴۲ع/۱۲۵۸ھ میں صہبائی نے اُردو کے معروف و مشہور شعرا کا یہ انتخاب کیا تھا جو گارسیں دتاسی اور کریم الدین کے بیان کے مطابق ۱۸۴۴ع/۱۲۶۰ھ میں شائع ہوا ۔ اس کے مطبوعہ نسخے بہت کمیاب ہیں ۔ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے لیکن اس کا سرورق غائب ہے ۔ ایک مطبوعہ نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں اور ایک انڈیا آفس لندن میں بھی ہے ۔ اس کا ایک ناقص قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے عربی سیکشن میں محفوظ ہے ۔[3] لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں اس کا ایک اور نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ذخیرے کے ذریعے آ گیا ہے ۔

تذکرہ اُردو زبان میں ہے اور اس میں صرف ۱۲ ممتاز و منتخب اُردو شعرا کا ذکر مع انتخاب کلام آیا ہے ۔ اردو شعرا کا یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں کلیات و دواوین کو سامنے رکھ کر ممتاز شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے ۔ اشعار کا انتخاب

۱۔ دیباچہ حدائق البلاغت اُردو ترجمہ ، مطبوعہ مطبع رفاہ عام دلی ۱۸۴۴ع ، مملوکہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی ۔

۲۔ داستان تاریخ اُردو ، ص ۱۸۷ ۔

۳۔ رسالہ تذکرات از گارسیں دتاسی ، ترجمہ مولوی ذکاء اللہ ، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ص ۶۳ ، مطبوعہ دلی ۔

پاکیزہ ہے اور مؤلف کے ذوق سلیم پر دلالت کرتا ہے - ولی سے لے کر معاصرین تک کا انتخاب مؤلف نے جانفشانی سے کیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ غزل کے ساتھ دوسرے اصناف سخن پر بھی نظر رکھی ہے - چنانچہ تذکروں کی عام روش کے مطابق اس میں صرف غزل کے اشعار نہیں ہیں بلکہ اس صنف کا انتخاب بھی دیا ہے جس میں کوئی خاص شاعر خصوصیت رکھتا ہے - کسی شاعر کے کلام کا انتخاب دس بارہ صفحات سے کم میں نہیں ہے ، ہر صفحے میں ۲۰ اشعار ہیں - شعرا کے حالات بھی درج ہیں لیکن مختصر ، نصف صفحہ سے زاید کسی کے متعلق نہیں لکھا - معاصر شعرا مثلاً غالب ، ذوق اور مومن جن سے صہبائی بخوبی واقف تھے ، ان کے متعلق بھی صرف چند سطریں لکھی ہیں - اس لیے کہ ان کی تالیف کا اصل مقصد ، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے ، شعرا کا تذکرہ نہیں ، ممتاز شعرا کے کلام کا انتخاب تھا اور یہ انتخاب انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل بوترس کے ایما پر غالباً تدریسی ضرورتوں کے لیے کیا تھا -

انتخاب کلام اور حالاتِ زندگی سے قطع نظر اس کتاب کا جو حصہ نہایت بیش قیمت ہے وہ اس کا دیباچہ ہے - یہ دیباچہ اُردو میں ہے اور اس میں صہبائی نے شعر کی تعریف ، تاریخ ، وزن ، قافیہ ، ردیف ، عروض اور اصناف سخن پر اجمالاً لیکن عالمانہ روشنی ڈالی ہے - اصناف شعر پر خصوصیت سے بحث کی گئی ہے - ہر صنف کے مخصوص و مفید اوزان کی نشان دہی کی گئی ہے اور مشہور شعرا کے کلام سے نمونے دیے گئے ہیں - ان امور پر اس سے پہلے گارسیں دتاسی کے سوا کسی اور تذکرہ نگار نے روشنی نہیں ڈالی - ہاں بعد کے تذکروں مثلاً کریم الدین کے "طبقات الشعراے ہند" اور "گلدستۂ نازنیناں" میں یا صابر کے "گلستانِ سخن" اور صفا کے "شمیم سخن" میں زبان و ادب کے متعلق اس نوع کے مقدمات شامل ہیں -

صہبائی کے "انتخاب دواوین" نے تذکرے کی حیثیت سے بعد کے اکثر تذکرہ نگاروں کی رہنمائی کی ہے - بعض نے اس کا اعتراف کیا ہے ، بعض نے نہیں کیا ، لیکن اس تذکرے نے بعد کے لکھنے والوں میں جو ترغیب پیدا کی اس کے ثبوت میں کریم الدین کا تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" پیش کیا جا سکتا ہے - یہ "انتخاب دواوین" ہی کی اساس پر اور اسی کے بعض تراجم کے اخذ و اقتباس سے

مرتب کیا گیا ہے - ہم نے گلدستۂ نازنیناں کے ضمن میں اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے -

مقدمے کے بعد ''انتخاب دواوین'' کا آغاز ولی کے ذکر سے اور اختتام مومن کے ترجمے پر ہوتا ہے - اس میں صرف ولی ، درد ، سودا ، میر جرات ، میر حسن ، شاہ نصیر ، ممنون ، ناسخ ، منشی مول چند ، ذوق اور مومن کا ذکر آیا ہے - ہم اس جگہ انتخاب کلام کو نظر انداز کرکے صرف ولی کا ترجمہ بطور مثال نقل کر رہے ہیں :

ولی : شمس ولی اللہ گجراتی نہایت مشہور شعرائے دکن سے ہے - اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالم گیر اورنگ زیب میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والا جاہ نے اس کی قدر دانی کرکے پرورش فرمائی - یہ شخص اول شعرائے دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھنی میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا یہ بھی مذہب ہے کہ زبان اُردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا -"

☆ ☆ ☆

گلدستۂ نازنیناں

مصنّف کا نام کریم الدین اور ان کے والد کا نام شیخ سراج الدین تھا۔ کریم الدین نے اپنا سال پیدائش ۱۸۲۱ع مطابق ۱۲۳۷ھ بتایا ہے۔ دلی کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور درس و تدریس کو ذریعۂ معاش بنا کر ساری عمر تالیف و تصنیف میں گزار دی۔ کریم الدین نے اپنا حال تفصیل سے طبقات الشعرائے ہند کے حصۂ چہارم میں لکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''نام بندے کا کریم الدین اور والد بزرگوار کا شیخ سراج الدین ساکن پانی پت . . . ہے جدِ بزرگوار پیلی بھیت کی پیدائش رکھتے تھے۔ انھوں نے اکثر بلاد کی سیاحی کی، پانی پت میں آ کر مقیم ہوئے۔ چونکہ بادشاہی جاگیر کی آمدنی رکھتے تھے وجہ معیشت سے بےفکر تھے۔ ملکوں کی سیاحی کرتے رہتے تھے۔ جب میرے قبلہ گاہ سراج الدین پانی پت میں پیدا ہوئے انھوں نے بھی اقامت پانی پت میں اختیار کی۔ نادر شاہ کے وقت میں ہمارا بہت اسباب اور مال لٹ کر برباد ہو گیا تھا، اس وقت سے پھر اسلوب گھر کا درست نہ ہوا . . . میں نے جب، ہوش سنبھالا اور سنِ تمیز کو پہنچا اور میں نے فارسی کی دو چار کتابیں پڑھ کر عربی کو پڑھنا شروع کیا، علم صرف و نحو پانی پت میں پڑھ کر شاہجہان آباد میں آیا۔ اس جا سے پھر کر صرف و نحو، معانی و منطق اور فلسفہ اور طب اور فقہ اور اصول اور کچھ حدیث تحصیل کی۔ ان ایام میں اپنے ہاتھ سے کتابت کرتا اس کی مزدوری پر گزران کرتا، یہاں تک درمیان ۱۸۱۲ع کے جناب مستطاب طامسن صاحب لفٹننٹ گورنر بہادر نے بندوبست مدرسۂ دہلی کا بخوبی کیا اور نئے طالب علم تلاش کرکے اس میں واسطے تحصیل کے رکھے گئے۔ چنانچہ میں بھی اٹھارہ برس کی عمر میں اس میں داخل ہوا۔

میری تنخواہ سولہ روپیہ ہوئی ۔ اس جانے میں نے علم منطق اور فلسفہ اور ہندسہ اور حساب اور ہیئت اور پیمائش اور مناظر اور مرایا اور جبر و مقابلہ اور کتب تواریخ اور علم ادب عربی زبان میں اور علم فقہ پڑھا ۔ بعد ازاں جب کتبِ انگریزی کا ترجمہ اُردو زبان میں سوسائٹی اُردو نے کروا کے چھپوا کر مشہور کرنا شروع کیا ، میں نے بھی ہر ایک کتاب کو جو ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہوئی بشوق تمام پڑھی اور آج کے دن تک یہ التزام کر رکھا کہ جو ترجمہ سوسائٹی کرواتی ہے میں بالضرور اس کو تمام پڑھ لیتا ہوں بعد ازاں بوترس صاحب پرنسپل مدرسہٗ دہلی کے حکم سے قوانین دیوانی اور فوجداری اور اصول قوانین اور پولیٹکل اکونامی یعنی سیاست مدنی اور علم ریاضی انگریزی یہ سب تحصیل کیا ۔ بعد فراغت اس تحصیل کے اس شہر میں میں نے اپنا نکاح کیا اور اسی جا رہنا اختیار کیا اور ایک چھاپہ خانہ واسطے چھپوانے ترجموں کے بنوایا ۔ میرا ارادہ تھا کہ . . . عوام ہندوستانیوں کو جو علوم سے بےبہرہ ہیں بیش قیمت پر وہ کتابیں بیچ کر علوم اور کتبِ غیر مشہورہ کو مشہور کروں ۔ مگر اس ارادے کو توڑنے والے بھی مہیا ہو گئے یعنی دو چار جاہلوں نے اس مطبع میں میرے شریک ہو کر مجھ سے فریب کر کے وہ مطبع چھین لیا . . . پیدائش میری ماہ عید الفطر ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ع بتاریخ یکم روز عید بوقت نماز صبح بلدۂ پانی پت میں افغانوں کے محلہ میں متصل مسجد لشکر خاں کے ہوئی ۔ اب میری عمر چھبیس برس کی درمیان ۱۸۴۷ع کے ہے ۔''[1]

کریم الدین نے اُوپر لکھا ہے کہ ''ٹامسن صاحب نے ۱۸۱۲ع میں مدرسہٗ دہلی کا بخوبی بندوبست کیا اور میں اٹھارہ برس کی عمر میں اس میں داخل ہوا ۔ ۱۸۱۲ع کا سن درست نہیں معلوم ہوتا ۔ مدرسہٗ غازی الدین حسن کی بنیاد

۱۔ طبقات الشعرائے ہند ، ص ۴۰۷ ، مطبع العلوم ، مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ع ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی ۔

۱۷۹۲ء میں پڑی تھی اور ۱۹۲۵ء میں وہ قدیم دلی کالج میں تبدیل ہوا تھا۔[1] کریم الدین نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۸۲۱ء اور کالج میں داخلے کے وقت اپنی عمر اٹھارہ سال بتائی ہے۔ اس لحاظ سے دلی کالج میں ان کا داخلہ ۱۸۳۹ - ۴۰ء میں ہوا ہوگا۔

کریم الدین نے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ اپنی تالیفات کی فہرست بھی دی ہے اور اس کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۸۴۸ء تک تیرہ کتابیں تعلیم النسا، گلستان ہند، تذکرۂ شعرائے ہند، گلدستۂ نازنینان، عجالۃ العلالہ، رسالۂ فرائض، روض الاجرام، فوائد الدہر، تذکرۃ النسا ترجمہ ابوالفدا، تاریخ شعرائے عرب، محط الحمی اور ترجمہ کتاب ڈاکٹری لکھ چکے تھے۔ ان سب کے موضوعات پر مؤلف نے روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں کہربائی باللمس، قواعد المبتدی، تشہیر ظہوری، کریم اللغات، خط تقدیر، قصۂ پنجاب سنگھ، تکریم ظہوری، اشارات التعلیم، تاریخ ہندوستان ملقب بہ واقعات ہند، سنین اسلام، جامع القواعد فارسی اور اس طرح کی دوسری متعدد علمی و ادبی تالیفات بھی ان سے یادگار ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے خط تقدیر کے مقدمے میں ان کی کتابوں کی تعداد ۷۴ بتائی ہے۔[2] یہ کتابیں ۱۸۴۸ء اور ان کی وفات ۱۸۷۹ء کی درمیانی مدت میں لکھی گئی ہیں۔[3] قاضی عبدالودود نے گارسیں کے حوالے سے کریم الدین کی ۳۵ کتابوں کی نشان دہی کی ہے۔[4]

کریم الدین ۱۸۵۰ء کے قریب آگرہ کالج سے منسلک ہوئے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک مدرس اول اردو کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ محکمۂ تعلیمات پنجاب میں بہ حیثیت سرشتہ دار ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۱ - ۶۲ء کے قریب ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر پہنچ گئے۔ غالباً اسی عہدے سے سبکدوش ہو کر ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔

۱۔ دلی کالج میگزین ص ۲۵۵، قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء، مرتّبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔

۲۔ خطّ تقدیر، مرتّبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، مطبوعہ دانش محل لکھنؤ۔

۳۔ صحیفہ، ص ۱۴، بابت جولائی ۱۹۶۷ء۔

۴۔ دلی کالج میگزین (قدیم دلی کالج نمبر)، ص ۹۶، مطبوعہ دلی ۱۹۵۳ء۔

کریم الدین کو علمی و ادبی کاموں سے گہری دلچسپی تھی - جب تک حیات رہے ان کا قلم چلتا رہا - شاعری سے انھیں کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی اور شاید وہ شاعری کو زندگی میں کچھ ایسی اہمیت بھی نہ دیتے تھے - اپنے احوال میں لکھتے ہیں :

''شوق اشعار اُردو کہنے کا مجھ کو مطلق نہیں ہے بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں کیوں کہ اہلِ علم کا یہ پیشہ نہیں ہے - وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کا انھوں نے یہ طور اختیار کر لیا ہے -''[1]

شاعر اور شاعری دونوں کے متعلق ایسی خراب رائے رکھنے کے باوجود تعجب یہ ہے کہ انھوں نے اُردو شعرا کے دو تذکرے ''طبقات الشعرائے ہند'' اور ''گلدستۂ نازنیناں'' مرتّب کیے - شعرا کے اشعار جمع کیے حتیٰ کہ اپنے گھر باقاعدہ مشاعرے کی محفلیں منعقد کرائیں اور ان کی روئیداد کی اشاعت کا انتظام کیا - یہ روئیداد ''پرچہ مشاعرہ'' کے نام سے شائع ہوتی تھی اس میں منتخب کلام ہوتا تھا - ''پرچہ مشاعرہ'' پانچ چھ ماہ تک شائع ہوا - یہ سلسلہ کریم الدین کے پریس قائم کرنے کے بعد شروع ہوا تھا اور انھیں کے پریس سے چھپتا تھا -[2، 3]

ہر چند کہ کریم الدین ایک کثیر التصانیف مصنّف ہیں لیکن ان کی شہرت تاریخ ادب میں ان کے دو تذکروں گلدستۂ نازنیناں اور طبقات الشعرائے ہند کی بدولت قائم ہے - طبقات کا ذکر تفصیل سے اگلے صفحات میں آئے گا -

کریم الدین نے دیباچے میں لکھا ہے کہ :

''ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۸۴۴ع میں تمام ہوا در ماہ صفر ۱۲۶۱ھ مطابق فروری ۱۸۴۵ع میں چھپنا شروع ہو گیا اور نام اس کا گلدستۂ نازنیناں رکھا گیا -''

۱- طبقات الشعرائے ہند ، طبقۂ چہارم ، ص ۴۷ ، مطبوعہ ۱۹۴۸ع ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی -

۲- ملاحظہ ہو رسالۂ معاصر پٹنہ نمبر ۱۹ ، بابت مئی ۱۹۶۷ع -

۳- بازیافت ، ص ۳۷ ، مطبوعہ دانش محل لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۶۵ع -

چونکہ کتاب میں دو ایک جگہ ۱۸۶۱ع کو "فی زمانہ" ظاہر کیا گیا ہے، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ چھپتے وقت تک اضافے ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح ناسخ متوفی ۱۲۵۴ھ کے ترجمے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تالیف کا آغاز ۱۲۶۰ھ سے قبل ہو گیا ہو۔ لیکن وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔۱ سالِ طباعت بہر طور ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ع ہے۔ خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے:

"تمام (ہوا) بتاریخ بست و سوم ماہ رجب المرجب ۱۲۶۱ھ مطابق بست و نہم شہر جولائی ۱۸۴۵ع کو تالیف مولوی کریم الدین صاحب سے۔"

کتاب کے آخر میں حکیم مومن خاں مومن اور زین العابدین عارف کے جو قطعات تاریخ شامل ہیں ان سے بھی اس کے اتمام اور اشاعت کا سال ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ع ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چھ مہینے کے اندر چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہے۔ یہ پہلی بار ۱۲۶۱ھ میں مطبع رفاہ عام سے شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں ہے یہ بھی لیاقت نیشنل لائبریری میں آ گیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔ دوسری جگہوں پر بھی اس کے مطبوعہ نسخے ہوں گے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے "دستور الفصاحت" میں اور قاضی عبدالودود نے "یادداشت" کے زیرِ عنوان اس کے مطبوعہ نسخوں کا ذکر کیا ہے۔۲

تذکرہ اُردو میں ہے اور اس میں صرف ۳۷ شعرا کا ذکر آیا ہے۔ مؤلف نے اس کی نوعیت کے بارے میں صفحہ اول پر خود لکھا ہے کہ:

"ان دنوں اس عاجز نے ایک انتخاب شعرائے اُردو کا جمع کیا ہے کہ اکثر شعرائے متقدمین و متاخرین کے اشعار اس میں درج کیے ہیں۔"

اس بیان میں "اکثر شعرا" کہنا محض مبالغہ ہے۔ اس میں صرف ۳۷ شعرا اور شاعرات کے تراجم شامل ہیں۔ آغاز کتاب سے پہلے شاہ ظفر، ان کے ولیعہد اور رمز کا انتخاب کلام ہے اور ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے دیباچے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے اس تذکرے کو عروض و قواعد کے اہم مباحث

۱۔ مقدمۂ دستور الفصاحت، ص ۹۸، مرتبۂ مولانا عرشی مطبوعہ رامپور، ۱۹۴۳ع۔
۲۔ معاصر نمبر ۱۷، ص ۸۸، بابت جولائی ۱۹۶۰ع، مملوکہ راقم الحروف۔

اور تاریخ شعر و اصناف کا تذکرہ کر کے ہر طرح جامع بنانے کی کوشش کی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مؤلف نے ایسا ہی کیا ہے ۔ ابتدائی چھ صفحوں میں انھوں نے تاریخ شعر پر روشنی ڈالی ہے لیکن بہت سرسری ۔ دوسرے مسائل یعنی علم بیان و عروض کا کوئی ذکر انھوں نے کہیں نہیں چھیڑا ۔ شعرا کے مختصر حالات کے ساتھ طویل منتخبات البتہ درج کر دیے ہیں ۔

کریم الدین نے اس طرف اشارہ تو نہیں کیا لیکن تقابلی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ''گلدستۂ نازنیناں'' کو انھوں نے صہبائی کے انتخاب دواوین کے طرز پر مرتب کیا تھا ۔ غالباً صہبائی ہی کی تقلید میں انھوں نے شعرا کے حالات و انتخابات کلام کے ساتھ علم عروض و قواعد سے بحث کرنے کا ارادہ کیا تھا ، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے ۔ آغاز شاعری سے متعلق بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ انتخاب دواوین سے ماخوذ ہے ۔ یہی نہیں بعض شعرا کے تراجم کا بیشتر حصہ حرف بہ حرف صہبائی کے تذکرے سے لیا گیا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ صہبائی نے صرف ۱۲ ممتاز شاعروں کا انتخاب کلام دیا ہے اور کریم الدین نے چند شعرا و شاعرات کا اضافہ کر کے ان کی تعداد ۳۷ کر دی ہے ۔[1] میں نے یہ رائے نگار ۱۹۶۴ع کے تذکروں کا تذکرہ نمبر میں ظاہر کی تھی ۔ اس کے حوالے سے پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی لکھتے ہیں کہ :

''فرمان فتح پوری کا یہ انکشاف کہ یہ (گلدستۂ نازنیناں) سراسر انتخاب دواوین سے ماخوذ ہے ، ناقابلِ اعتبار ہے ۔''[2]

میں نے ''سراسر'' کہیں نہیں لکھا یہ عطا کاکوی نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے ۔ باقی باتیں میں نے دونوں تذکروں کے تقابلی مطالعے کے بعد کہی تھیں ، اور ایک مضمون بھی تذکرہ نمبر سے پہلے نگار میں ان دونوں کے سلسلے میں بہ عنوان ''سرقہ یا توارد'' شائع کر چکا تھا ۔[3] اگر یہ مضمون موصوف کی نظر سے گزر جاتا تو شاید وہ میری رائے کو قبول کر لیتے ۔ بہرحال صہبائی اور

۱۔ نگار نمبر ۱۹۶۴ع ، ص ۱۷۵ (تذکروں کا تذکرہ نمبر) ، مرتبہ راقم الحروف ۔
۲۔ معاصر نمبر ۶ (پٹنہ) ، بابت جولائی ۱۹۶۷ع ۔
۳۔ نگار ، ص ۲۰ بابت نومبر ۱۹۶۳ع ۔

کریم الدین کے تذکروں میں مشترک شعرا کے تراجم اور مقدمات میں عجیب و غریب مشابہت ہے - قرائن یہ بتاتے ہیں کہ کریم الدین نے صہبائی سے فائدہ اٹھایا ہے - صہبائی نے اپنا تذکرہ دلی کالج کے پرنسپل کے ایما پر ۱۸۴۲ع میں مرتب کیا اور یہ ۱۸۴۴ع میں شائع ہوگیا - اس کے برعکس کریم الدین نے اپنا تذکرہ دو سال بعد ۱۸۴۴ع میں مرتب کیا اور یہ ۱۸۴۵ع میں شائع ہوا - اس وقت امام بخش صہبائی دلی کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے اور کریم الدین کی عمر صہبائی کی تالیف کے آغاز کے وقت ۲۱ سال رہی ہوگی ، کیونکہ خود کریم الدین نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۸۲۱ع اور دلی کالج میں داخلے کے وقت اپنی عمر ۱۸ سال بتائی ہے - ظاہر ہے کہ وہ صہبائی کے نام اور کام سے خوب واقف رہے ہوں گے - یہ بھی ممکن ہے کہ صہبائی ہی کے تذکرے کو دیکھ کر ان میں تذکرے کی تالیف کا شوق پیدا ہوا ہو - بہرحال صہبائی سے فائدہ اٹھانے کا جواز ہر طرح موجود ہے - داخلی شہادتوں کے علاوہ گلدستۂ نازنیناں کے سر ورق پر یہ فقرہ بھی ہے :

"الحمد للہ کہ کتاب انتخاب دواوین مطبع رفاہ عام دہلی میں مطبوع ہوا -"

اس فقرے سے پتا چلتا ہے کہ کریم الدین نے بھی اپنے تذکرے کو انتخاب دواوین کہا ہے ، لیکن دیباچے میں سبب تالیف کے زیر عنوان اس کا نام گلدستۂ نازنیناں قرار دیا ہے - طبقات الشعرائے ہند کے دیباچے میں بھی دواوین کے انتخاب کے سلسلے میں انھوں نے "انتخاب دواوین" کا نام لیا ہے -[۱] اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ گلدستۂ نازنیناں صہبائی کے "انتخاب دواوین" سے مستفید ہے اور اس حد تک کہ بعض اساتذہ کے ترجمے کے سلسلے میں کریم الدین پر سرقے کا گمان ہوتا ہے - کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند میں صہبائی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی صاف پتا چلتا ہے کہ وہ صہبائی کے کاموں سے باخبر تھے -

انتخاب دواوین اور گلدستۂ نازنیناں میں کس درجہ مشابہت ہے اور کریم الدین نے صہبائی سے بعض جگہ کس نوعیت کا فائدہ اُٹھایا ہے اس کا اندازہ

۱- طبقات الشعرائے ہند ، ص ۳ ، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ع -

کرنے کے لیے یہاں دونوں تذکروں کی چند سطریں بطورِ مثال ایک دوسرے کے مقابل نقل کی جاتی ہیں -

''انتخاب دواوین''

شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعراے دکن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالم گیر اورنگ زیب میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والا جاہ نے اس کی قدردانی کر کے پرورش فرمائی یہ شخص اول شعراے دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھن میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا یہ بھی مذہب ہے کہ زبان اُردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے -'' (ص ۲۹)

''درد تخلص خواجہ میر صاحب . . . فرزند لئیق خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص کے تھے - مذہب ان کا حنفی . . . علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھی دست قدرت رکھتے تھے اور . . . ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے یہاں منعقد ہوا کرتی تھی چنانچہ ان کے خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ میاں ناصر احمد ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو بین بجاتے ہیں اور کچھ گاتے ہیں . . . غرض خواجہ علیہ الرحمۃ نے گیارہ سو ننانوے ہجری میں اس دنیائے دوں سے رحلت فرمائی

''گلدستۂ نازنیناں''

شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعراے دکن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالم گیر اورنگ زیب میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والا جاہ نے اس کی قدردانی کر کے پرورش فرمائی یہ شخص اول شعراے دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھن میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا یہ بھی مذہب ہے کہ زبان اُردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے -'' (ص ۲۸۹)

''درد تخلص خواجہ میر صاحب . . . فرزند لئیق خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص کے تھے - مذہب ان کا حنفی . . . علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھی دست قدرت رکھتے تھے اور . . . ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے یہاں منعقد ہوا کرتی - چنانچہ ان کے خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ میاں ناصر احمد ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو بین بجاتے ہیں اور کچھ گاتے ہیں . . . غرض خواجہ علیہ الرحمۃ نے گیارہ سو ننانوے ہجری میں اس دنیائے دوں سے رحلت فرمائی

اشعار ان کے دیوان سے بطور یادگار کے انتخاب ہوئے۔" (ص ۱۵)	اشعار ان کے دیوان سے بطور یادگار کے انتخاب ہوئے۔" (ص ۴۰)

یہی نوعیت اَوروں کے حالات کی ہے لیکن عبارتیں نقل کر کے مضمون کو بے سبب طول دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا اس لیے شاعر کے نام کے ساتھ تذکروں کے ایسے صفحات کے حوالے درج کیے جاتے ہیں جن کے مضامین لفظاً و معناً ہر طرح یکساں ہیں۔

	انتخاب دواوین	گلدستۂ نازنینان
سودا	ص ۶۷	ص ۶۵
جرأت	ص ۱۲۵	ص ۱۴۷
شاہ نصیر	ص ۱۶۵	ص ۲۸۱
ممنون	ص ۲۶۷	ص ۱۷۸
ناسخ	ص ۱۹۷	ص ۲۵۲
ذوق	ص ۱۳۲	ص ۱۱۸

ان حقائق کی روشنی میں یہی کہا جائے گا کہ کریم الدین نے صہبائی کے تذکرے سے بعض جگہ نقل کی حد تک استفادہ کیا ہے۔ لیکن صہبائی کا نام نہیں لیا۔

لیکن اس غیر اخلاقی اقدام سے گلدستۂ نازنینان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں کریم الدین نے شعراء کے ساتھ کئی شاعرات کا ذکر آخر میں یک جا شامل کر دیا ہے، اس سے پہلے کے تذکروں میں یہ بات نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اس میں غزل کے طویل انتخابات کے ساتھ ساتھ "انتخاب دواوین" کی طرح مثنویات، قصائد اور رباعیات کے منتخبات بھی شامل ہیں، اس لیے اس زمانے کے شعرا کو سمجھنے سمجھانے میں یہ تذکرہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ تذکرہ دو وجوہ سے غالب کے سلسلے میں بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اول اس لیے کہ اس سے پہلے کسی اور تذکرے میں غالب کا ایسا انتخاب جس میں گیارہ بارہ غزلیں نقل کی گئی ہوں نہیں ملتا۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ اس تذکرے کے ذریعے غالب کی ایک ایسی غزل کا سراغ لگتا ہے جو ان کے کسی مطبوعہ دیوان حتیٰ کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی

شامل نہیں ہے۔ غزل کا مطلع یہ ہے :

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں

الٰہی بخش معروف نے غالب کی اس غزل پر خمسہ کہا ہے اور یہ خمسہ گلدستہ نازنیناں میں معروف کے ترجمے کے ذیل میں درج کیا گیا ہے اور معروف کے دیوان میں بھی موجود ہے۔[1] ہر چند کہ معنی اور اسلوب دونوں لحاظ سے یہ غزل غالب کے رنگ سے بہت مختلف ہے اور اس کا ثبوت بھی کسی اور ذریعے سے نہیں ملتا پھر بھی نسخۂ عرشی[2] اور نسخۂ مالک رام[3] دونوں میں یہ غزل شامل کر لی گئی ہے۔ اشعار کو محذوف کر کے ہم غالب کا ترجمہ اس جگہ بطورِ نمونہ نقل کر رہے ہیں :

''اسد تخلص، اسم شریف ان کا نواب اسداللہ خان بہادر معروف بمرزا نوشہ خاندان فخیم اور رؤسائے قدیم اکبر آباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں۔ ادیب و لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی ان کی کے حضیضِ جہل کا مبتلا مشہور، سخن فہم و سخن دان اس پائے پر کہ متنبی و کعب باوجود منتہا اور بلند پایگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے ان کے حضور۔ اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہِ دیوانِ نظیری۔ مرجز بیباکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہِ عباراتِ ظہوری۔ خوانِ یغما اس کے سے انوری ایک ادنٰی زلہ ربا خاقانی بجاروب کشی مستعد بسرو پا۔ فیض سے کیوں کر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اس کے ایک ادنٰی شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں۔ مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اُردو کا ترک کیا۔ مگر

۱۔ دیوان معروف، ص ۱۶۱، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۵ع۔

۲۔ دیوان غالب اردو، نسخۂ عرشی، ص ۲۹۸، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند، طبع اول ۱۹۵۸ع۔

۳۔ ''دیوانِ غالب''، ص ۲۸۳، مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۷ع۔

ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصانیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا - اسی سے چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستۂ ہذا کے کیے گئے - مگر چونکہ نواب ممدوح حالتِ صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں - چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آ چکا ہے - اس لیے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے -"[۱]

☆ ☆ ☆

۱- گلدستۂ نازنیناں ، کریم الدین ، ص ۲۱۵ تا ۲۲۲ مطبع سلطانی دہلی ۱۸۴۵ع -

خوش معرکۂ زیبا

''خوش معرکۂ زیبا'' کے مصنف سعادت خاں ناصر ہیں - مؤلف نے تذکرے میں اپنا ذکر صرف اس قدر کیا ہے :

'ناصر ''مؤلف تذکرہ' بندۂ پریشان خاطر ، سعادت خان تخلص ناصر دعائے خیر کا طالب شاگرد محمد حسن المذنب ، صاحب پنج دیوان کہ ہر اک قصائد و مثنوی سے مالا مال اور معمور اور مثنوی مسمیٰ بہ مظہر معجزات اخبار میں حضرت حضرات کے اور مثنوی مختار نامہ اور قصہ اگرگل اور قصہ مسمیٰ بہ گلشن سرور زبان اُردو میں تصنیف کیا ہوا اس کا نیز بدستور ہے - یہ چند شعر جن کے وسیلے سے شریک تذکرۂ سخنوراں ہو لکھے جاتے ہیں -''

''خوش معرکۂ زیبا''[1] نسخۂ پٹنہ اور نسخۂ انجمن ترقی اُردو[2] میں ایک آدھ لفظی تبدیلی کے ساتھ یہی مختصر عبارت ملتی ہے - بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے ناصر کا حال لکھا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مختصر - مصحفی نے صرف نام اور تخلص و تلمذ اس طور پر دیا ہے :

''سعادت خان ناصر تخلص شاگرد مذنب است -''[3]

۱- تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' ، ص ۵۱ ، مرتبہ عطا کاکوی ، مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ، اکتوبر ۱۹۶۸ع -

۲- خوش معرکۂ زیبا ، ص ۱۷ ، مرتبہ مشفق خواجہ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ع -

۳- ''ریاض الفصحا'' ، ص ۳۲۴ ، مرتبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۴ع -

محسن نے ان کے وطن ولدیت ، دواوین اور تذکرے کا سراغ بھی دے دیا ہے - ان کا بیان ہے :

''سعادت خاں خلف رسالت خاں متوطن نگینہ مقیم لکھنؤ ، پانچ دیوان ایک تذکرہ ان کا ہے شاگرد مرزا محمد حسن مذنب -''[۱]

عبدالغفور نساخ نے سخنِ شعرا میں تقریباً اوپر ہی کی عبارت کو دہرا دیا ہے - لکھتے ہیں :

''ناصر تخلص سعادت خاں خلف رسالت خاں متوطن نگینہ مقیمِ لکھنؤ شاگرد محمد حسن مذنب مرثیہ گو ، ایک تذکرہ اور پانچ دیوان ان سے یادگار ہیں -''[۲]

عبدالحی صفا بدایونی نے صرف اس قدر لکھا ہے :

''ناصر تخلص ، سعادت خاں ولد رسالت خاں متوطن نگینہ ضلع بجنور مرزا محمد حسن مذنب کے شاگرد تھے ، بمقام لکھنؤ فوت ہوئے - ایک تذکرہ پانچ دیوان اُن سے یادگار ہیں -''[۳]

اوپر کی سطروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صفا بدایونی کا بیان ، ناصر کے باب میں سراسر نسّاخ کے بیان سے ماخوذ ہے -

گارسیں دتاسی کا بیان ہے کہ :

''ناصر سعادت خاں نگینہ میں پیدا ہوئے - لکھنؤ میں رہتے تھے - ان کے والد مرثیہ گو مرزا محمد احسن مذنب سودا کے شاگرد تھے اور بعد میں اپنے بیٹے ناصر کے استاد ہو گئے - ناصر نے ایک تذکرہ اور پانچ دیوان یادگار چھوڑے ہیں جن کی چھ غزلیں محسن نے اپنے تذکرے میں درج

۱- ''سراپا سخن'' کی مختلف ردیفوں کی غزلوں میں ناصر کا ذکر کئی جگہ ہے لیکن تفصیل اس سے زیادہ کسی جگہ نہیں ہے - ملاحظہ ہو سراپا سخن ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ع -

۲- سخن شعرا ، ص ۴۹۷ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع -

۳- شمیمِ سخن ، حصۂ اول ، ص ۲۳۰ ، مطبوعہ امداد الہند و عین الاخبار مراد آباد مملوکہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی -

کی ہیں ۔''۱

ان تراجم سے ناصر کے تخلص ، نام ، ولدیت ، وطن ، تلمذ ، بعض تصانیف ، دواوین ، جائے قیام اور جائے وفات کا محض نشان مل جاتا ہے تفصیل کا پتا نہیں چلتا ۔ مشفق خواجہ صاحب نے خوش معرکۂ زیبا کے بعض تراجم کی مدد سے ناصر کے بارے میں اور کئی مفید باتوں کا کھوج لگایا ہے ۔

ان کی دی ہوئی تفصیلات کے مطابق نواب مہدی علی خاں حسن اور مرزا امیر علی خاں شوق ، ناصر کے شاگرد تھے ۔ کرامت علی اظہر ، مرزا علی حسین اوج ، آغا علی رضا خاں عالی ، ناسخ ، مہدی حسن آباد ، میر علی اوسط رشک ، مرزا خانی نوازش ، مرزا علی اکبر مضطر ، مصحفی ، میر ہدایت علی جلیل ، نواب عاشور علی خاں ، لالہ فتح چند شائق اور محمد علی مسیحا میں سے بعض کے ساتھ ناصر کے دوستانہ مراسم تھے اور بعض سے ملاقاتیں تھیں ۔ ناصر بدیہہ گو شاعر تھے ۔ مجلسوں اور مشاعروں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے ۔ شاعری میں وہ غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، مرثیہ ، واسوخت سبھی کچھ کہتے تھے ۔ بعض فارسی تصانیف مثلاً ''حیات القلوب'' مؤلفہ مُلاّ محمد باقر مجلسی اصفہانی اور ''روضۃ السیر'' نامی کتاب کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا تھا ۔ ناصر اپنے ایک شاگرد نواب مہدی علی خاں حسن کے ملازم تھے ۔ غالباً واجد علی شاہ اختر اور بیسواڑہ کے ناظم سید احمد علی خاں کی ملازمت میں بھی رہے ہیں ۔ ان کی تاریخ پیدائش و وفات کا سراغ نہیں ملتا ۔ لیکن مصحفی اور صفا کے بیان کی روشنی میں کہا جا

۱۔ اس بیان میں مذنب کو ناصر کا والد کہا گیا ۔ یہ غلط ہے ۔ مذنب ان کے استاد تھے ۔ باپ کا نام رسالت خاں تھا ۔ (ناصر کے اُستاد مذنب تھے اور مذنب اپنے والد احسن کے شاگرد تھے ، ناصر کے اس فقرے سے گارسیں دتاسی کو دھوکا ہوا ۔ ''والد ماجد اس نقیر کے استاد تھے'' ۔ ترجمہ احسن ، مرزا احسن علی ، ص ۵۸ ، خوش معرکۂ زیبا ، جلد اول ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔ [ادارہ]

۲۔ تاریخ ادب ہندوستانی اُردو ترجمہ (ٹائپ شدہ مسودہ) جلد دوم ، ص ۳۰۷ ، مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔

سکتا ہے کہ وہ ۱۲۲۰-۱۲۲۱ھ کے قریب پیدا ہوئے اور ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۷ع اور ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ع کے درمیان کسی سن میں انتقال کیا۔[1]

سعادت خاں ناصر نے تذکرے کے خاتمے پر لکھا ہے:

''الحمد للہ والمنت کہ انجام اس کا حسب دلخواہ اور ہر طرف سے شور واہ واہ . . . چند مدت اس کے انتظام کے واسطے محنت شاقہ کھینچی اور کیا کیا پریشانی میں بسر کی۔ چار تذکرے فراہم کیے، دو میاں مصحفی کے تیسرا تذکرہ مسمیٰ بہ چار باغ[2] تصنیف کیا ہوا مصطفیٰ خاں شیفتہ کا، چوتھا تذکرہ مسمیٰ بہ باغ و بہار[3] مؤلف اس کا اعظم الدولہ سرور ہے۔ ان میں سے تحقیق انساب کیا اور کلام دور دستوں کا معرفت میر محمود علی اور میر محسن علی صاحب کانپور سے ڈاک کی طرح آیا کیا دو برس کے عرصے میں خاتمہ بالخیر ہوا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ناصر نے اسے ۱۲۶۰ھ میں شروع کر کے ۱۲۶۲ھ میں مکمل کیا ہے۔ اس لیے کہ خاتمے پر میر محمود علی شائق، میر علی اوسط رشک، میر مظفر علی اسیر، اصغر علی نسیم اور کرامت علی اظہر اور خود مؤلف کے کہے ہوئے جو قطعات تاریخی اس تذکرے کے تکملے کے سلسلے میں درج ہیں ان سے ۱۲۶۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ چنانچہ شائق نے ع

''تالیفِ کلام شعرائے ہندی''

سے، نسیم نے ع

''تازہ سخن چمن کیا ہے''

سے، اظہر نے ع

''زبان شاعران ہند اینست''

۱۔ مقدمۂ خوش معرکۂ زیبا، مرتّبہ مشفق خواجہ، مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب، لاہور ۱۹۷۰ع۔

۲۔ چار باغ کی جگہ گلشن بے خار چاہیے۔

۳۔ باغ و بہار کی جگہ عمدۂ منتخبہ ہونا چاہیے۔

سے ، امیر نے ع

"کلامِ انتخاب اہلِ زباں کا"

سے ، اور خود مؤلف نے ع

"یادگارِ سخنورانِ جہاں"

سے اس تذکرے کی تاریخ تصنیف ۱۲۶۲ھ نکالی ہے ۔ مؤلف نے خاتمے پر یہ بھی لکھا ہے کہ تذکرے کا نام پہلے صرف "خوش معرکہ" تھا ۔ جب میر علی اوسط رشک نے "خوش معرکہ" میں "زیبا" کا اضافہ کرکے اس مصرع سے :

"تاریخ یہی پائی خوش معرکۂ زیبا"

تاریخ تصنیف ۱۲۶۲ھ نکالی تو اس کا نام "خوش معرکۂ زیبا" رکھ دیا گیا ۔ گویا خوش معرکۂ زیبا تذکرے کا نام بھی ہے اور سال اختتام بھی لیکن اس میں اضافے مؤلف نے آخر تک کیے ہیں ۔

تاریخ تصنیف کے سلسلے کی یہ تفصیلات مع فہرست شعرا ، ہم نے نگار ۱۹۶۴ع کے سالنامے میں بھی شائع کر دی تھیں ۔ اس وقت تک خوش معرکۂ زیبا مخطوطے کی صورت میں تھا ، اب یہ طبع ہو چکا ہے اور اس کے چار مخطوطوں کا سراغ اب تک لگا ہے :

۱۔ ایک مخطوطہ جو ۱۲۶۳ھ میں لکھا گیا ہے ، اس کے کاتب کا نام کالکا پرشاد ہے اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے ۔ پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے مختصر مقدمے کے ساتھ اس کے نثری تراجم اشعار محذوف کرکے شائع کر دیے ہیں[1] اور اس نسخے کی تفصیلات بھی مقدمے میں دے دی ہیں ۔

۲۔ ایک ناقص الطرفین نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے ۔

۳۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی اس تذکرے کا ایک مخطوطہ مرقومہ ۱۲۷۶ھ ہے ۔ اس کا تفصیلی تعارف ڈاکٹر محمد حسن شائع کر چکے ہیں ۔[2] اسے سید محمد شمیم پی ایچ ۔ ڈی ۔ کے لیے مرتب

۱۔ ملاحظہ ہو تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۸ع ۔

۲۔ رسالہ اُردو ، بابت اکتوبر ۱۹۵۲ع ۔

کر رہے ہیں ۔[1]

۴۔ ایک خطی نسخہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں ہے ۔ مشفق خواجہ نے نسخۂ پٹنہ اور نسخۂ انجمن دونوں کے متن کی مدد سے اسے تین جلدوں میں بسیط مقدمے اور تفصیلی حواشی کے ساتھ مرتّب کیا ہے ۔ دو جلدیں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہو چکی ہیں ۔[2] تیسری جلد تعلیقات کی ہوگی ۔''

مشفق خواجہ نے خوش معرکۂ زیبا کی ترتیب و تدوین میں نسخۂ لکھنؤ اور نسخۂ علی گڑھ سے بھی خاطر خواہ مدد لی ہے ۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں ان چاروں مخطوطوں کی ضروری تفصیلات دے دی ہیں اور ان کے متون و شعرا کی تعداد میں جو فرق ہے اسے بھی واضح کر دیا ہے ۔ ساتھ ہی حواشی میں ہر شاعر کے متعلق یہ بتا دیا گیا ہے کہ اس کا ذکر اور کن کن تذکروں میں آیا ہے ۔ مشفق خواجہ کی دی ہوئی تفصیلات کے مطابق پٹنہ اور علی گڑھ کے نسخے مصنّف کے اصل یا قدیم متن کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ کراچی اور لکھنؤ کے نسخے مصنّف کا ترمیم شدہ متن پیش کرتے ہیں ۔ پٹنہ اور انجمن ترقی اُردو کراچی کے نسخوں میں شعرا کے تراجم کی تعداد ۳۳۷ ہے ، لکھنؤ کے نسخے میں ۲۷۷ اور علی گڑھ کے نسخے میں ۶۸۸ ہے ۔ ان چاروں نسخوں کی روشنی میں خوش معرکۂ زیبا کے تراجمِ شعرا کی کل تعداد ۸۲۴ ہوتی ہے ۔[3]

خوش معرکۂ زیبا اردو زبان میں ہے ، اس سے قبل اُردو میں صرف چار تذکرے ملتے ہیں :

۱۔ گلشن ہند ، مرقومہ ۱۲۱۵ھ ، مؤلفۂ مرزا علی لطف ۔

۲۔ گلشن ہند ، مشمولۂ گلدستۂ حیدری ، مرقوعہ ۱۲۱۴ھ مولفۂ حیدری ۔

۳۔ انتخاب دواوین ، مرقوعہ ۱۲۶۰ھ ، مؤلفۂ امام بخش صہبائی ۔

۱۔ آج کل دہلی (اُردو تحقیق نمبر) ، ص ۸۷ ، بابت اگست ۱۹۶۷ع ۔

۲۔ ملاحظہ ہو خوش معرکۂ زیبا ، جلد اول ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ع ۔ جلد دوم ، مطبوعہ ۱۹۷۲ع ۔

۳۔ مقدمۂ خوش معرکۂ زیبا مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ع ۔

۴۔ گلدستۂ نازنیناں ، مرقومہ ۱۲۶۱ھ ، مؤلفۂ کریم الدین ۔

پہلے دونوں تذکرے اصلاً گلزار ابراہیم کے ترجمے ہیں ۔ یہ ضرور ہے ان کے مؤلفین نے اپنی طرف سے بھی بہت سے اضافے کیے ہیں ۔ انتخاب دواوین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حقیقتاً تذکرہ نہیں بلکہ چند مشہور شعرا کے کلام کا انتخاب ہے ۔ مختصر سوانح کی شمولیت سے اس کا شمار تذکروں میں ہوتا ہے ۔ گلدستۂ نازنیناں کا زیادہ حصہ لفظاً و معناً ''انتخاب دواوین'' سے ماخوذ ہے ، اسے ''انتخاب'' سے الگ چیز خیال کرنا مناسب نہیں ۔ ایسی صورت میں صرف ''خوش معرکۂ زیبا'' رہ جاتا ہے جو اصلاً قدیم تذکروں کے طرز پر لکھا گیا ہے ۔ قطب الدین باطن کا تذکرہ البتہ ۱۲۶۱ھ میں لکھا گیا ہے ۔ اسی زمانے میں ناصر کا تذکرہ بھی زیر ترتیب تھا اور ۱۲۶۲ھ میں مکمل ہوا ہے ۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ باطن اور ناصر کے تذکرے ساتھ ساتھ لکھے گئے ہیں ۔ لیکن ''خوش معرکۂ زیبا'' کی تالیف میں ایک ایسی خصوصیت نظر آتی ہے جو اسے اُردو فارسی کے سارے شعرا سے ممتاز کر دیتی ہے ۔ اس میں شعرا کا ذکر بلحاظ حروف تہجی یا بلحاظ ابجد ردیف وار نہیں آیا ، بلکہ مصنّف نے ہر شاعر کے ساتھ اس کے شاگردوں کا ذکر بھی ضروری خیال کیا ہے اور پورے تذکرے کو اسی نہج پر مرتّب کیا ہے ۔ دیباچے میں مصنّف نے خود لکھا ہے کہ :

''ایک مدت سے یہ خیال تھا کہ تذکرہ شعرائے ہند کا ترتیب دے مگر بہ سبب عدم دریافت احوال قدما ارادہ صورت پذیر نہ ہوتا تھا ۔ ان روزوں تذکرہ تالیف کیا ہوا میاں مصحفی کا دستیاب ہوا ۔ تقاضائے شوق نے ہمت کو کام فرمایا اور برخلاف میاں صاحب کہ ان کا تذکرہ عبارتِ فارسی میں ہے ، فقیر نے ہندی میں لکھا ۔ دو رنگی سے یکرنگی بہتر اور قید حروف تہجی اس لیے نہ رکھی کہ جس استاد کا جو شاگرد ہو نام اس کا پائے نام اس کے لکھا جائے کہ عبارت ہندی اور طرز اسامی شعرا ایجاد میرا ہوا اور وہ شاعر جن کی استادی اور شاگردی نامعلوم اور نام و نشان غیرمفہوم ہو خاتمہ ان پر کیا جائے ۔ شروع اس کا مرزا سودا سے کرتا ہوں کہ اول تو وہ بزرگ موجد ریختہ گوئی کا ہے دوسرے سلسلہ اس ہیچمدان کی شاگردی کا اس سے ملتا ہے ۔''

تاریخی اعتبار سے یہ تو صحیح نہیں ہے کہ اُردو زبان میں تذکرہ لکھنے کی بنا ناصر نے ڈالی ہے ، اس لیے کہ ان سے پہلے کئی تذکرے اُردو میں لکھے جا چکے تھے - ممکن ہے کہ وہ تذکرے ناصر کی نظر سے نہ گزرے ہوں - لیکن ایک شاعر کے ترجمے کے ساتھ اس کے شاگردوں کا ذکر اور پھر اسی کے ذیل میں شاگرد کے شاگرد کا ذکر کرنا اور اس طرح ایک سلسلے کے سارے شاعروں کو ایک ہی لڑی میں پرو دینا فی الواقع ناصر کی ایجاد ہے - اُردو فارسی میں اس نوعیت کا کوئی دوسرا تذکرہ نظر نہیں آتا - بلحاظ ترتیب تراجم ''خوش معرکۂ زیبا'' چار خاص منزلوں سے گزرتا ہے - پہلے ایک شاعر کا ذکر ہے پھر اس کے شاگرد اور شاگرد کے شاگردوں کا - بعد ازاں ان شعرا کے تراجم ہیں جن کی شاگردی و استادی نامعلوم ہے اور سب سے آخر میں چند شاعرات کا ذکر آیا ہے -

اس تذکرے کی تالیف میں سعادت خاں ناصر نے بعض دوسرے تذکروں کے علاوہ خط و کتابت کے ذریعے بعض دوستوں کی معرفت بھی مواد حاصل کیا ہے - چنانچہ تذکرے کے خاتمے پر مؤلف نے خود لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرے کی تالیف کے سلسلے میں مصحفی کے دونوں تذکروں ، شیفتہ کے ''گلشنِ بے خار'' اور اعظم الدولہ سرور کے ''عمدۂ منتخبہ'' سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ دور دراز کے شعرا کے حالات اور انتخابِ کلام ڈاک کے ذریعے بھی منگائے ہیں - اس سلسلے میں میر محمود علی اور میر محسن علی نے ان کی خاص مدد کی تھی - لیکن مذکورہ بالا چار تذکروں کے علاوہ بعض دوسرے تذکروں سے بھی سعادت خاں ناصر نے مدد لی ہے - نسخۂ لکھنؤ کے دیباچے میں ماخذ کے طور پر شاہ حقیقت کے ''تذکرۂ احیا'' کے ساتھ ایک اور تذکرے کا نام بھی مؤلف نے دیا ہے جو سہوِ کاتب سے درج ہونے سے رہ گیا ہے - مشفق خواجہ نے مختلف قرائن اور دلائل سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس جگہ ''سراپا سخن'' کا نام رہا ہوگا اور لکھنؤ کے نسخے میں ۱۷ شاعر جن کا ذکر کسی اور نسخے میں نہیں ہے ، ''سراپا سخن'' ہی سے اضافہ کیے گئے ہیں - دیباچے سے قطع نظر تذکرے کے اندر مختلف تراجم میں میر ، قائم ، میر حسن اور قاضی محمد صادق اختر کے تذکروں کے حوالے بھی آئے ہیں لیکن یہ حوالے ثانوی ہیں - سعادت خاں ناصر کی نظر سے یہ تذکرے نہیں گزرے -

سعادت خاں ناصر نے یوں تو قدما سے لے کر اپنے عہد تک کے شعرا کا حال لکھا ہے لیکن ان کی توجہ زیادہ تر اپنے معاصرین اور اپنے عہد سے قریب تر شاعروں کے حالات و منتخبات پر رہی ہے ۔ معاصرین میں چونکہ بہتوں سے ان کی ملاقات اور دوستانہ مراسم تھے اس لیے ناصر کے بیانات ان کے سلسلے میں عینی شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ناصر کا ایک وصف میر تقی میر کی طرح یہ ہے کہ وہ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے ۔ ہر شاعر کے بارے میں بےخوفی سے تبصرہ کرتے ہیں اور طعن و تعریض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ متعدد تراجم میں ان کا لہجہ سخت اور بعض مقامات پر بیان مبتذل ہو گیا ہے ۔ غالباً اسی بےاعتدالی کے سبب ان کے بعض معاصرین انہیں پسند نہ کرتے تھے اور ناصر اس کے ردعمل میں ان کو اپنا حاسد تصور کرتے تھے ۔ اس کا ثبوت شعرا کے بعض تراجم اور مؤلف کے ان قطعات سے ملتا ہے جو تذکرے کے خاتمے پر دیے ہوئے ہیں ۔ شعرا کے تراجم کہیں کہیں بہت سرسری اور مختصر ہیں ۔ بعض جگہ مؤلف نے واقعات و حالات کے اندراج میں صحت کی پروا کیے بغیر جو کچھ معلوم ہوا ہے یا جو کچھ دوسرے تذکروں میں لکھا ہے اسے کہیں من و عن اور کہیں کچھ کمی بیشی کر کے پیش کر دیا ہے ۔ لیکن باہم نزاع اور معاصرانہ چشمک کے واقعات و لطائف اور حکایات کا حال ، جہاں کہیں موقع ملا ہے ، چٹخارہ لے کر تفصیل سے بیان کیا ہے ، ایسی تفصیل سے کہ اس زمانے کی شاعرانہ فضا اور سماجی و معاشرتی زندگی کی تصویر قاری کے سامنے آ جاتی ہے ۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ محض شعرا اور شاعری کے بارے میں اطلاعات بہم نہیں پہنچاتا بلکہ شعرا کے گرد و پیش اور محرکات کو سمجھنے سمجھانے میں بھی مدد دیتا ہے ۔ سودا ، میر ، مصحفی ، میر حسن ، انیس ، شہید ، انشا اور پروانہ وغیرہ کے حالات اتنی تفصیل سے لکھے گئے ہیں کہ ان کے متعلق اس سے زیادہ معلومات کسی اور قدیم تذکرے سے حاصل نہیں ہوتیں ۔ یہ معلومات کہیں ذاتی واقفیت کا نتیجہ ہوتی ہیں ، کہیں دوسروں سے سن کر یا تذکروں میں دیکھ کر پورے پس منظر کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں ۔ اس لیے ناصر کی گفتگو صحت واقعات سے اگر دور بھی ہو تو بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی ۔ ان کی رنگین مزاجی اور خوش طبعی عبارت میں ادبی چاشنی بہر حال پیدا کر دیتی ہے ۔

غرض کہ ''خوش معرکۂ زیبا'' انیسویں صدی عیسوی کے وسط کا ایک اہم تاریخی ماخذ ہے - اس میں بعض ممتاز شعرا کے بارے میں سوانح اور سماجی زندگی کی نئی تفصیلات ہی نہیں ملتیں بلکہ ایسے متعدد شاعر ہیں جن کے نام اور کام سے ہم صرف اس تذکرے کے ذریعے متعارف ہوتے ہیں - معاصرین خصوصاً لکھنؤ میں مقیم اور علاقۂ اودھ کے شعرا کے سلسلے میں یہ تذکرہ بہت معلومات افزا ہے - چنانچہ اس تذکرے میں امانت کی اندر سبھا ، ناسخ کی امرد پرستی ، مصحفی اور انشا کی معرکہ آرائی ، ضمیر و دبیر کی باہم ناراضی ، مثنوی میر حسن کے سبب تالیف ، میر تقی میر کی بددماغی اور مصحفی کے تنخواہ بند ہونے کا واقعہ ایسی باتیں ہیں جو ''خوش معرکۂ زیبا'' کے ذریعے پہلی بار ہمارے علم میں آئی ہیں - اس زمانے کی ادبی محفلوں کے چٹکلے مشاعروں میں شعرا کے درمیان علمی و ادبی نوک جھونک ، دو معاصر شاعروں کے مابین مناقشت و معرکہ آرائی اور ان کے شاگردوں کے درمیان انتزاع کے واقعات تو اس تذکرے میں اتنی کثرت اور اتنے اہتمام سے بیان کیے گئے ہیں کہ کسی اور تذکرے میں اس کی مثال نہیں ملتی - مشفق خواجہ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ :

''ناصر نے تذکرے کا نام خوش معرکہ محض اسی بنا پر لکھا تھا کہ اس میں شعرا کی معرکہ آرائیوں کی تفصیلات درج ہیں -''[۱]

بعد کے تذکرہ نگاروں میں محسن اور محمد حسین آزاد نے ناصر کے تذکرے سے فائدہ اٹھایا ہے - آبِ حیات کے ذکر میں اس کی تفصیل آئے گی -

رہا اس تذکرے کا تنقیدی پہلو سو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے ناصر کی خصوصیت کہا جا سکے - میر تقی میر کی سی بے باکی تو ان کے یہاں ملتی ہے لیکن تنقید میں میر تقی میر اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کی اصابت رائے نظر نہیں آتی - پھر بھی وہ لفظی تنقید جس کا تعلق شعر کی ظاہری اصلاح سے ہے اور جس کی مثالیں اکثر تذکروں میں نظر آتی ہیں ان کے یہاں بھی ملتی ہے - کہیں کہیں وہ شاعر اور اس کے فن کے بارے میں جچی تلی رائیں بھی دے جاتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی تنقیدی رایوں میں مزاح کے ساتھ طعن و تعریض کا عنصر غالب رہتا ہے -

---

۱- مقدمہ ''خوش معرکۂ زیبا''، جلد اول ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ع -

جہاں تک انتخاب اشعار کا تعلق ہے اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ عموماً منتخبات بہت مختصر ہیں ۔ بہت سے شعرا ایسے ہیں جن کے صرف ایک یا دو شعر نقل کیے گئے ہیں ۔ سب سے طویل انتخاب کلام ، ناسخ کا اور اس کے بعد خود مؤلف کا ہے ۔ مؤلف نے ناسخ کے ۹۹ اور اپنے ۹۰ شعر نمونۂ کلام میں دیے ہیں ۔ نمونۂ کلام میں زیادہ تر غزل کے اشعار دیے گئے ہیں ۔ کہیں کہیں دوسری اصناف کے منتخبات بھی ملتے ہیں اور دو تین جگہ نثری ٹکڑے بھی بطور نمونہ درج کیے گئے ہیں ۔

تذکرے کا آغاز سودا کے ترجمے سے ہوتا ہے اور میر عباس شاد کے ترجمے پر وہ شعرا ختم ہو جاتے ہیں جن کے ذکر کے ساتھ ان کے شاگردوں کے ذکر کا بھی التزام کیا گیا ہے ۔ شاد کا ترجمہ صرف اس قدر ہے :

''صاحب تمیز و قیاس میر عباس تخلص شاد شاگرد بحر ۔'' (۲۰ شعر)

اس کے بعد ان شعرا کا ذکر بلحاظ حروف تہجی کیا گیا ہے جن کی استادی و شاگردی بقول مؤلف نامعلوم اور بعض کا نام و نشان غیر مفہوم ہے ۔ اس حصے میں سب سے پہلے آفتاب کا اور سب سے آخر میں میر احمد یار کا ذکر ہے اور صرف اتنا کہ :

آفتاب : ''کلام میں ان کے گوہر کی آب و تاب عالی گوہر شاہ عالم تخلص آفتاب ۔'' (دو شعر)

یار : ''میر احمد تخلص یار ۔'' (ایک شعر)

سب سے آخر میں شاعرات کے تراجم ہیں ۔ یہ تراجم شمع کے ذکر سے شروع ہو کر شیریں کے ذکر پر اس طور پر ختم ہوتے ہیں :

شمع : شاہجہان آباد میں کسی محل کی مسماۃ شمع محلدار تھی ۔ چونکہ یہ طائفہ چست و چالاک ہوتا ہے کسی موزون الطبع نے اس کی خدمت میں کہا :

سر سے پاؤں تک سفیدی آ گئی اس پر یہ حال
شمع سا معشوق دنیا میں نہیں دیکھا چھنال

اس شوخ دیدہ نے یہ جواب دیا :

پردۂ فانوس میں جلتی ہے عصمت کو سنبھال
کاٹیے اس کی زباں جو شمع کو بولیں چھنال

شیریں : بیگا طوائف تخلص شیریں میر محمدی سپہر نے مدت میں اسے سخن آشنا کیا - میاں بحر نے باتوں باتوں میں اسے حلقۂ بیعت میں کھینچا - یہ قصہ بعینہٖ قصۂ پرویز و فرہاد ہے کہ ادھر واہ واہ اور اُدھر داد بیداد ہے - (۹ شعر)

ہم اس جگہ میر حسن اور میر تقی میر کے تراجم اس تذکرے سے بطور نمونہ یہاں نقل کرتے ہیں - ان سے سعادت کے اسلوب نثر اور ترجموں کی عام کیفیات کا صحیح اندازہ ہو سکے گا :

میر حسن : شیریں سخن کامل ہنر و فن سید والا نژاد میر حسن ولد میر غلام حسین ضاحک - ہمت اس کی شعر و سخن میں وسیع شاگرد رشید مرزا رفیع دوازدہ سالگی میں شاہجہان آباد سے لکھنؤ میں آیا - نواب سالار جنگ کے بیٹے سردار جنگ تھے ان کی سرکار میں معزز اور محترم رہا - بہ سبب تقاضائے جوانی محل کی ایک عورت سے محبت اور موانست ہوئی - چونکہ طبیعت موزوں تھی بہ پاسِ خاطر مشعوقہ مثنوی بے نظیر تصنیف کی - یہ تلازم کہ مثنوی میں ہے ، شنیدہ نہیں دیدہ ہے - الحق مثنوی نہیں کارنامہ اور شاعری پر حجت ہے - اس قدر اس کی زمانے میں شہرت کہ ہر وضیع و شریف کو اشعار اس کے یادگار - نواب قاسم علی خاں نے جب مثنوی ان سے سنی فرمایا کہ مجھے دو کہ میں تمھاری طرف سے حضور میں نواب آصف الدولہ بہادر کے لے جاؤں - مصنّف نے بہ خیال اس کے مبادا اور کسی نام سے حضور میں گزرے مثنوی دینے میں انکار کیا - بعد چندے میر حسن صاحب مع مثنوی اور کسی کی تقریب سے حضور میں پہنچے - نواب سابق الذکر کہ افسانۂ رفتہ سے آزردگی رکھتے تھے نواب صاحب کی تعریف میں بول اٹھے یہ جو کہتے ہیں :

''کہ اک دن دو شالے دیے سات سے'' (۲۰)

حضور نے تو ہزارہا دو شالے آن واحد میں بخش دیے ہیں - شاعری میں مبالغہ ہوتا ہے ، یہاں بیانِ واقعہ میں بھی کمی - نواب نامدار کا (دل) اس کے سننے سے اچاٹ ہوا - یہ فقط کم نصیبی میر موصوف

کی تھی کہ ایسے حاتم دوران کی سخاوت سے ناکام اور محروم رہا ۔ یہ بھی کیا لطیفہ ہے کہ جب مرزا رفیع سودا نے وہ مثنوی سنی نہایت خوش ہوئے اور عین بشاشت میں فرمایا تم نے یہ مثنوی ایسی کہی ہے کہ میر غلام حسین کے بیٹے نہیں معلوم ہوتے ۔ یعنی فخر ان کے ہو اس مثنوی کے سوا اور بھی ایک مثنوی مسمٰی بہ رموز العارفین ہے اور تیسری مثنوی چھڑیوں کے احوال میں ۔ چنانچہ یہ شعر اس کا ہے :

مدار اس قافلے کا تھا چھڑی پر
چلے ہم واں سے چھڑیوں ساتھ مل کر

جب میر حسن شاگرد مرزا رفیع سودا کے ہوئے جو مزخرفات ان کے والد (کے متعلق) تھا دھو ڈالا ، اس سے وہ مشہور نہ ہوا ۔ میاں مصحفی صاحب نے تاریخ ان کے انتقال کی یہ کہی :

چون حسن آن بلبلِ خوش داستان
رو ازیں گلزارِ رنگ و بُو بتافت
بس کہ شیریں بود طبعش مصحفی
"شاعر شیرین زبان" تاریخ یافت (۲۶ شعر)

نوٹ : (۱) شاہ عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر کے یہاں مشاعرہ تھا "دلبر اپنا" اس کی طرح (میں) جب میر حسن نے یہ مطلع پڑھا :

دھیان رہتا ہے جو اس کوچے میں اکثر اپنا
گھر میں ہم رہتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں گھر اپنا

حضرت نے بار بار اس کی ایسی تعریف کی کہ کمر اس آزادہ کی بارِ تسلیم سے خم ہو گئی اور اس مطلع کو شیخ ناسخ بھی اکثر پڑھتے تھے اور وجد کرتے تھے ۔

(۲) اکثر اس بزرگ کی غزلوں میں قطعے خوب ہوتے ہیں ۔ (۲۳ شعر)

میر تقی میر :

استاد استادان ، امام شرع سخنوران ، عدیم المثال و بے نظیر محمد تقی متخلص بہ میر ، پسر رشید عبداللہ ساکن اکبر آباد ہمشیرہ زادۂ سراج الدین علی خان آرزو ۔ غالب یہ ہے کہ تربیت یافتہ بھی اسی کے ہوں ۔ یہ نقل خود فرماتے تھے

کہ عنفوان جوانی میں جوش وحشت اور استیلائے سودا طبیعت پر غالب ہوا اور زبان و کام ہرزہ گوئی پر راغب - ترک ننگ و نام بلکہ رسوائی خاص و عام پسند آئی - ہر کسی کو دشنام دینا شعار اور سنگ زنی کاروبار تھا - خان آرزو نے کہا کہ اے عزیز دشنام موزوں دعائے ناسوزوں سے بہتر اور رخت کے پارہ کرنے سے تقطیعِ شعر خوشتر ہے - چونکہ موزونی طبیعت جوہر ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی مصرع یا بیت ہو گئی - بعد اصلاح دماغ و دل کے مزہ شعر گوئی کا طبیعت پر رہا - کبھی کبھی دو چار شعر جو خان آرزو کی خدمت میں پڑھے پسند فرمائے اور تاکید شعر و سخن کی زیادہ سے زیادہ کی - ایک دن خان آرزو نے کہا کہ آج مرزا رفیع آئے اور یہ مطلع نہایت مباہات کے ساتھ پڑھ گئے :

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا

میر صاحب نے اس کو سن کر بدیہتہً یہ مطلع پڑھا :

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خان آرزو فرط خوشی سے اچھل پڑے اور کہا خدا چشم بد سے محفوظ رکھے - اب سنیے کہ جب اکبر آباد سے میر صاحب پورب کی طرف چلے حسبِ اتفاق ایک بنیے کے ساتھ گاڑی پر سوار ہوئے مگر وقت سواری کے کچھ رات باقی تھی - جب روز روشن ہوا اور اس کی صورت دیکھی منہ اپنا ادھر سے پھیر لیا اور لکھنؤ تک اس کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھے - سبحان اللہ کیا عالی دماغ لوگ تھے کہ ضرورت میں بھی ناگوار کو گوارا نہ کرتے تھے -

مرزا مغل سبقت نقل کرتے تھے کہ جب میر صاحب لکھنؤ میں تشریف لائے بندہ ان کی شرف ملازمت کو گیا - خبر ہونے کے بعد دیر میں تشریف لائے - میں نے دولت دست بوسی حاصل کی - بعد قیل و قال کے ملتمس ہوا کچھ اپنے کلام سے مستفید فرمائیے - بتساہل فرمایا کہ تمہارے بشرے سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی ، سخن کے ضائع کرنے سے حاصل ؟

انسان کو اتنی بھی خود پسندی زیبا نہیں کہ مثلِ من دیگرے نیست ۔ فضلنا بعضکم علی بعض ۔ مرزا مغل اچھے شاعر تھے بلکہ اوروں پر سبقت رکھتے ۔

ایک دن شاہ قدرت اللہ قدرت تخلص اور میر صاحب کشتی پر سوار تھے ۔ قدرت نے چند غزل اپنے دیوان کی پڑھیں (کذا) میر صاحب نے کچھ نہ کہا ۔ آخر وہ ملتمس ہوا کہ آپ نے کچھ نہ فرمایا ۔ میر صاحب نے کہا صواب دید یہ ہے کہ دیوان کو اپنے دریا میں ڈال دو ۔

اور ایک نقل ہے کہ عماد الملک نواب غازی الدین خان لبِ دریا بیٹھے ہوئے تھے اور مرغان آبی و سرخاب دریا میں واسطے سیر و تماشا کے چھوٹے ہوئے تھے ۔ اتفاقاً میر صاحب ادھر سے آ نکلے ۔ نواب صاحب نے چند قصیدے اپنے میر صاحب کے روبرو پڑھے اور داد طلب ہوئے ۔ میر صاحب نے فرمایا میری تعریف کی کیا احتیاج ہے ۔ ہر بط کو صاحب کے اشعار پر حالت وجد و سماع ہے ۔ نواب صاحب کو یہ سخن نہایت ناگوار گزرا ۔ دوسرے روز میر صاحب کو پھر طلب فرمایا اور ایک کرسی پر بیٹھے اور زمین پر سوائے خاک کچھ فرش نہ بچھوایا ۔ میر صاحب نے لمحے کا لمحہ انتظار چوکی اور مونڈھے کا کیا بعد ازاں دوپٹا اپنا دوتا کر کے بچھایا اور بیٹھ گئے ۔ نواب صاحب نے کہا کہ عنایت فرمائیے ۔ یعنی اپنے کلام سے مستفید کیجیے ۔ میر صاحب نے یہ قطعہ پڑھا :

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا الخ

جب سرکارِ نواب آصف الدولہ بہادر میں میر صاحب صیغۂ شاعری میں نوکر ہوئے ، ایک دن وہ آصف جاہ کتاب خانے میں جلوہ گر تھا اور دواوین زیر و بالا رکھے ہوئے تھے ۔ ایک جلد نواب نامدار کے ہاتھ سے دور تر تھی اور میر صاحب سے نزدیک ۔ فرمایا مجھے اٹھا دیجیے ۔ میر صاحب نے ایک خدم (خادم) سے کہا سنو تمھارے آقا کیا فرماتے ہیں ۔ نواب صاحب نے راست ہو کر اس کو اٹھا لیا مگر یہ مرزائی نہایت ناگوار خاطر ہوئی ۔ بعد یک لمحہ کے فرمایا کیوں میر صاحب ،

مرزا رفیع السودا کیسا شاعر مسلّم الثبوت تھا ۔ میر صاحب نے کہا کہ ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است ۔ حضور پرنور نے کہا ہم عیب پسند ہیں ، یک نہ شد دو شد ۔ اس میں میر محمد سوز صاحب کہ استاد جناب عالی کے تھے ، واسطے مجرے کے حاضر ہوئے ۔ حضور نے فرمایا کچھ اپنے شعر پڑھو ۔ حسب الحکم میر سوز نے دو تین غزلیں اپنے دیوان میں سے پڑھیں ۔ نواب فلک جناب نے تعریف میں ان کی مبالغہ فرمایا ۔ میر صاحب کو دلیری میر سوز کی اور تعریف نواب صاحب کی بہت ناگوار گزری ۔ میر سوز سے کہا تمھیں اس دلیری پر شرم نہ آئی ۔ میر سوز نے کہا صاحبِ بندہ کیا میں شاہجہان آباد میں بھاڑ جھونکتا تھا . . . کہا بزرگی اور شرافت میں تمھاری کیا تامل مگر رتبہ‌ٔ شعر میں میرے کسی کو ہمسری نہیں ۔ موقع اور محل تمھاری شعر خوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈکلیاں پکتی ہوں نہ کہ میر تقی کے سامنے ۔ میر سوز سے تو یہ کہا اور وہ شقہ کہ جو میر کی طلب کو حضور پرنور نے لکھا تھا جیب سے نکال کر حضور کے آگے رکھ دیا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے خانہ آباد دولت زیادہ ۔ نواب نامدار نے فرمایا خدا حافظ ۔ دو تین مہینے کے بعد خواجہ تحسین علی خاں نے ذکر اس کی عسرت اور غریب الوطنی کا تقریباً حضور میں گزارش کیا ۔ اس حاتم زماں نے اول شکایت ان کی بے اعتنائی کی بہت سی کی ، بعدہ‌‘ شفاعت خواجہ سرا کی قبول فرمائی ۔ خواجہ سرا خوش خوش میر صاحب کے پاس آیا اور وہ ذکر سنایا ۔ میر صاحب نے حاضر ہونا دربار میں اس کی معرفت ننگ مردی سمجھ کر انکار کیا ۔ ایک دن وہ جوہر شناسِ ہنر منداں عتیق اللہ کے امام باڑے کی طرف آیا اور تحسین کو اشارہ کیا کہ میر صاحب کو لے آ ۔[۱] خواجہ سرا نے میر صاحب سے کہا چلو تمھارے لینے کو حضور آئے ہیں ۔ سبحان اللہ کیا قدر شناسی تھی کہ اپنے نوکر کی رئیسوں کو یہ خاطر تھی ۔

۱۔ اصل نسخے میں ”لے آیا“ ، ”ع“ :

آخر میر صاحب کو ولولۂ عشق پیدا ہوا اور صحت کسی کی آئینۂ خورشید میں معائنہ ہونے لگی - پیرِ جواں ہمت ایسوں کو کہتے ہیں - کسی نے پوچھا اس پیرانہ سالی میں کد خدا ہونے کا کیا باعث ہوا - فرمایا فقط اس واسطے کہ سسرال والے کہیں لڑکا آیا - جب مرض الموت سے بیمار ہوئے وصیت کی میرے جنازے کے اٹھانے میں تعجیل نہ کرنا - جو سنے گا کہ میر نے رحلت کی خواہ مخواہ نقد اور سامان معقول بھیجے گا - بموجب وصیت کے صبح سے شام ہوئی کسی نے کچھ نہ بھیجا - آخر شیخ امام بخش ناسخ کی اعانت زادِ آخرت ہوئی - میاں مصحفی نے تاریخ ان کے مرنے کی ''موا نظیری آج'' کہی ہے اور ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ یہ ہے :

شد ز جہان میر محمد تقی　　داغ ز بے مہری اہلِ جہان
ناسخ تاریخِ وفاتش نوشت　　واویلا مُرد شہِ شاعران

(۶۹ شعر)

میر کا ایک شعر ہے :

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کے میر
سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

اس پر استادنا حضرت مذنب مغفور فرماتے تھے کہ میں نے یہ مقطع میر سے سن کر یہ شعر فارسی کا پڑھا :

ز فرطِ نشہ چو وا گشت طرۂ دستار
سمندِ نازِ ترا تازیانہ دیگر شد

میر صاحب نے کہا یہ دل و دماغ اور فرصت و فراغ کسے ہے کہ آوروں کا کلام دیکھے -

☆ ☆ ☆

بہار بے خزاں

احمد حسین نام تخلص سحر - پہلے آشفتہ تخلص کرتے تھے - غلام مینا ساحر سے تلمذ کے بعد سحر کو اپنا لیا - سحر نے اپنا ذکر تذکرے میں اس طور پر کیا ہے:

''سحر تخلص کاتب الحروف احمد حسین - از ابتداے سن تمیز تا این دم بہ تلاش کلام موزون عمرے بسر کردہ و با اکثرے از شعراے فی زماننا سرگرم اتحاد پرستی ہا بودہ و از سخن پردازیِ ہر یک بہرہ برداشتہ تذکرہ ہاے مبسوط در زبان فارسی و ریختہ زائد از پنجاہ جلد دیدہ - آنچہ از طبع نا رسا بہ انتخاب در آمد نقلش برداشتہ و از شاعرے کہ ملاقات دست دادہ از زبانش آن چہ سامعہ نواز گردیدہ بہ حکم مکتبہ از کتابے و ذرہ [از] آفتابے بہ تالیف این تذکرہ پس از مدت دراز پرداخت و نمی خواست کہ بہ ملک منتسبان و منتظمان این معنی خود را بہ اتہام شعر گوئی شہرہ دہد و چون اتفاق موزون کردن اشعار شاذ و نادر افتادہ بہ مقتضاے النادر کالمعدوم نیز مناسب نہ می دانست کہ شعرے از موزون کردۂ خود داخلِ تذکرہ کند - لیکن بعض یاران طریقت کہ از فکرِ ناقصِ این ننگِ خلائق آگاہی داشتند نگذاشتند کہ ازین معرکہ دست کشیدہ پا بیرون گزاردہ لاجرم محض بہ تحریر یک غزل کہ سراسر ہزل است اکتفا کردہ گویا براے تصدیق قول خویش شاہدے آوردہ است - ازین پیش آشفتہ تخلص می کرد ، اکنون بہ نظر این کہ خوشہ چینِ خرمنِ استفادۂ استادی غلام مینا ساحر ہستم سحر تخلص پسندیدہ ام -''[1]

۱- بہار بے خزاں ، ص ٦٧ ، مطبوعہ علمی مجلس دلی ١٩٦٨ع -

اس کے بعد چودہ اشعار کی غزل ہے ، صرف مطلع اور مقطع یہاں درج کیا جاتا ہے :

ہے نگاہِ آتشیں ، برقِ شرر افشاں نہیں
شعلۂ بے دود ہے رخسارۂ تاباں نہیں
سحر ایسا کون سا ہے جو ترے جوہر کو دیکھ
مثلِ آئینہ وہ از سر تا بہ پا حیراں نہیں

غزل بہت معمولی درجے کی ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اچھے نہ تھے ۔ ہاں شاعری سے ایسی طبعی مناسبت تھی کہ اساتذہ کے سیکڑوں اشعار انھیں از بر ہو گئے تھے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے اُردو فارسی کے پچاس سے زائد تذکروں کا مطالعہ بھی کیا تھا ۔ یہی مطالعہ اور ذوقِ شعری تذکروں کی تالیف کا محرک بنا ۔ چنانچہ انھوں نے ''طور معنی'' کے نام سے پہلے ایرانی شعرا کا تذکرہ لکھا بعد میں بہارِ بےخزاں کے نام سے اُردو شعرا کا تذکرہ مرتّب کیا ۔ دیباچے میں خود لکھتے ہیں کہ :

''احمد حسین متخلص بہ سحر در مذاق شعر طبع پریشان ساختہ و خاطر شگفتہ و خندان بہ حسن پرستی ہائے گل رخانِ معنیِ تازہ افروختہ اکثر در ایام عمر ضائع رفتہ بہ تلاش معنی ہائے لطیف پرداخت و از فکر با مزہ معنی سنجان نادرہ فہم سروکارے داشتہ اشعار دل پذیر ایشان بہ سینہ سپرد ۔ اکنون کہ جرعہ کشی ہائے صہبائے این مذاق منضبطہ دل گرم کردہ سرمستی آورد می خواست کہ کتابے بہ طور تذکرۂ شعرائے ریختہ گویان ترتیب دادہ دلے خالی کند فرصت وقت دست نہ می داد و بہ تالیف تذکرۂ فارسی ہمت مصروف داشت چون صورت اختتامش حسب دل خواہ جلوہ گر شد این تذکرۂ لطیف را کہ ہمچو اشعار رنگین خود روکش بہار است ''بہارِ بےخزان'' نام نہادہ بہ تالیفش پرداخت و ہر قدر اشعار شعرا کہ دم تحریر تذکرہ بہ یاد داشت داخل تذکرہ ساخت و فصلے جداگانہ در خاتمۂ کتاب برائے ذکر اشعار شعرائے باقی ماندگان کہ نام و تخلص ایشان بلا ترتیب حروف تہجی باشد افزود ۔ از تماشائیان این گلستان بہار فریب و از نظارگیان این مہوشان

غارت گر قرار و شکیب توقعے دارم کہ بہ چشم انصاف و دیدۂ حقیقت بین و نظر دشوار پسند بہ ترتیب این تذکرہ نگاہے کردہ ام خالی از لطف فکر تازہ نہ بودہ اند شعرے بےکار نوشتن چہ معنی است ۔ لفظے کہ در شعر دل چسپ نہ دیدہ ام و بندش شعر رکیک دانستہ ام ، از شعر در گزشتہ تحریرش درین اوراق کہ ہر ورقش بہ رنگ ورق گل و معنی رنگین چون بو در گل است گوارا نہ کردہ برعکس تذکرہ ہاے مبسوط دیگر شعرا کہ طوالت و بسط بہ جمیع کلام رطب و یابس محض بہ اظہار سخن طرازیِ خود و بیان پُرگوئی شعرا پسندیدہ افسانہ خوانی کردہ اند ۔ این طرز مطبوع خود پنداشتہ بلکہ غایت از تالیف تذکرہ اظہار نغز گوئی شعرا و جمع اشعار دل پذیر براے تفریح خاطر قدر شناسان سخن انگاشتہ براے تصدیق قول من ہر شعر مؤلفہ این کتاب دیدنی دارد ۔"

یہ تذکرہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ع میں مکمل ہوا ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر اور لکھنؤ میں امجد علی شاہ حکمران تھے اور معاصر تذکرہ نگاروں میں مولوی امام بخش صہبائی ، عنایت حسین خاں مہجور ، کریم الدین ، قطب الدین باطن اور سعادت خاں ناصر وغیرہ ابنے اپنے تذکرے مکمل کر رہے تھے ۔ اس تذکرے کا صرف ایک قلمی نسخہ اب تک دستیاب ہوا ہے ، یہ نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ پہلے یہ مولوی عبدالحئی مؤلف "گلِ رعنا" کی ملکیت تھا بعد میں ان کے بیٹے مولانا عبدالعلی ندوی نے اسے کتب خانے کو دے دیا ۔ فہرست کتب میں اس کا نمبر ۳۳۴ ہے اور اس کے ساتھ مصنّف کا دوسرا تذکرہ طور معنی بھی مجلد ہے ۔ اس نسخے کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی پہنچ گئی ہے ۔

بہار بے خزاں کے مخطوطے میں $8\frac{1}{2} \times 6\frac{1}{2}$ سائز کے ۹۴ صفحات ہیں خط اچھا نہیں ہے ۔ بعض جگہ پڑھنے میں خاصی دقت ہوتی ہے ۔ شروع کے ۴ اور آخر کے ۱۴ صفحات دوسرے کاغذ پر ہیں لیکن پورے مخطوطے کا خط ایک ہی ہے ۔ کاتب کا نام اور سنِ کتابت البتہ درج نہیں ہے ۔ مخطوطے کے ایک حاشیے پر کفایت علی کافی کا یہ تاریخی قطعہ درج ہے :

جب ہوا یہ تذکرہ تالیف رشک گلستاں
یادگارِ شاعرانِ کشورِ ہندوستاں

فکر کافی سے ہوئی تاریخ اس کی آشکار
یہ عجب گلزار زیبا ہے بہار بے خزاں

آخری مصرعے سے ۱۲۶۱ برآمد ہوتے ہیں -

اس قلمی تذکرے کی تفصیلات مع فہرست شعرا راقم الحروف نے سب سے پہلے ۱۹۶۴ء کے سالنامہ' نگار میں شائع کی تھیں اور یہ تفصیلات مجھے محمد اسحٰق صدیقی صاحب نے لکھنؤ سے بھیجی تھیں - اس وقت تک یہ تذکرہ غیر مطبوعہ تھا اور اس کے مندرجات سے عام طور پر لوگ بے خبر تھے -

۱۹۶۸ء میں اسے ڈاکٹر نعیم احمد نے ترتیب دیا اور علمی مجلس دلی نے شائع کر دیا - مطبوعہ نسخے میں ۱۴۰ صفحات ہیں - شروع میں سات صفحے کا مقدمہ ہے جس میں ڈاکٹر نعیم احمد نے تذکرے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے -

تذکرہ فارسی زبان میں ہے شعرا کے حالات زندگی بہت مختصر اور کلام کے منتخبات خاصے طویل ہیں - مؤلف کا اصل مقصد چونکہ اساتذہ کے اچھے اشعار کو یک جا کر کے اپنے ذوق کی تسکین اور دوسروں کے آسودگی ذوق کا سامان فراہم کرنا تھا اس لیے زیادہ توجہ اشعار کے انتخاب ہی پر صرف ہوئی ہے - تذکرے میں صرف منتخب شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور ان کے معیاری اشعار بطور نمونہ نقل کیے گئے ہیں - اشعار کا انتخاب مؤلف کے ذوق شعری اور تنقیدی شعور کا ثبوت فراہم کرتا ہے - تحریر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مؤلف کو فارسی زبان پر کامل عبور اور فارسی انشا پردازی پر پوری قدرت حاصل ہے - تذکرہ آتش کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور یاس کے ذکر پر ختم ہوتا ہے - اس میں ۱۱۶ شاعروں کا ذکر آیا ہے - انتخاب کلام میں سب سے طویل انتخاب آتش کا ہے - میر ، ناسخ ، غالب اور مصحفی کے منتخبات بھی خاصے طویل ہیں - سحر نے کلام کے بارے میں تنقیدی رائیں بھی دی ہیں - یہ رائیں ایک دو تعریفی کلمات سے آگے نہیں بڑھیں - تذکرے کے مطالعے سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ مؤلف نہایت پاکیزہ ادبی ذوق کا مالک ہے - چنانچہ اس زمانے کی تنقیدی روش کے برخلاف مؤلف نے غالب اور مومن کو ذوق پر ترجیح دی ہے - تینوں شاعروں کے اصل تراجم دیکھتے چلیے :

"ذوق تخلص شیخ محمد ابراہیم نام دہلوی ملقب بہ خاقانی ہند شاعر والا رتبہ

بلند پایگاہ کہنہ مشق است ۔ بہ استادیٔ بادشاہ دہلی سرمایۂ اعزاز حاصل کردہ استاد فن و عالی طبع است ۔''[1]

''مرزا نوشہ اسد اللہ خان اسد تخلص از خاندان عالی است پیشتر [تخلص] غالب می کردہ و حالا اسد کردہ ۔[2] درین زمان بہ دارالخلافہ شاہ جہان آباد سکہ بہ نامش می زنند ۔ در اوائل بہ مقتضاے طبع دشوار پسند بہ طرز بیدل دقّت آفرینی ہا در شعر می کردہ و آخر بران طریقہ پشت پا زدہ ہم چو نظیری طرز خاص ایجاد کردہ دیوانے مختصر بعد از ترتیب و تکمیل مرتّب ساختہ اشعار قابل انتخاب منتخب کردہ بہ حضور والا بس نزاکت بندان زانوے ادب تہہ می کنند ۔ درین زمانہ قدر سخن چون آب گوہر ریختہ ۔ از مغتنمات است ۔''[3]

''مومن تخلص مومن خان ۔ امروز بہ شاہ جہان آباد جملہ سخن سنجان از گل چینان بہارِ معنیِ او بودہ ۔ صفحۂ نظمِ خویش بہ یمنِ آبیاریِ لطافت طبعش رشک گلزار می کند ۔ از گل افشانی ہاے جامۂ بہارین رقمش مشام جان معنی آشنایان عطر بیز است و توصیف سخن آفرینی ہاے لطافت زایش مداحان سخن طراز گہر ریز ۔ مردم دہلی بہ استادیش افتخار ہا دارند و درحقیقت مومن خان باعث مباہات شہر و شہریان است ۔''[4]

اس طرح شیفتہ کے برعکس نظیر اکبر آبادی کو سحر نے بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے ، اصل ترجمہ یہ ہے :

''نظیر تخلص شیخ ولی محمد اکبر آبادی شاعر معنی یاب بودہ ۔ چند سال است کہ ازین خاک دان بہ روضۂ رضوان شتافت ۔ اشعار بسیار دارد ۔''[5]

میر تقی میر کے معاشقے کا سراغ بھی ہمارے محققین کو اسی تذکرے سے

۱- بہارِ بے خزاں ، ص ۵۵ -

۲- پیشتر اسد می کردہ و حالا غالب ہونا چاہیے -

۳- بہارِ بے خزاں ، ص ۲۱ -

۴- ایضاً ، ص ۸۹ -

۵- ایضاً ، ص ۱۲۲ -

ملا ہے - میر کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"میر تخلص محمد تقی نام از اہل اکبر آباد خواہر زادۂ سراج الدین علی خان آرزو ہم دوش مہ وشان پری جلوۂ نکتہ دانی و ہم آغوش دوشیزگان شوخ ادائے معانی است - دیوانۂ طرز دلکش و دل آویز ، آشفتۂ مضمون عاشقانہ و درد انگیز ، مجنون بہار حسن لیلائے دل فریبی ، فرہاد تلخ کام شیرین ادایان مجنون برشتہ جگر شمع رویان ہم بستر ناکامی و ہم یاس و حرمان بودہ - کلام شور انگیزش لخت دل و پارۂ جگر تفتہ درونان معنی آشنا در آتش انداختہ و روزمرہ گفتگوے بے ساختۂ او لطف حسن بندش دیگران از دل ہا برداشتہ - مشہور است کہ بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشتہ - آخر عشق او خاصۂ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بہ چارسوئے رسوائی بہ شکند و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری درآید از ننگ افشانیے راز و طعن اقربا با دلے بغل پروردہ حسرت و حرمان و با خاطر ناشاد دست و گریبان قطع رشتۂ حب وطن ساختہ - از اکبر آباد بعد از خانہ براندازی ہا بہ شہر لکھنؤ رسید و سنگ شکیبائی بہ رشتہ زدہ از آوارہ گردی ہا آرمید و ہمین جا بہ صد حسرت جان کاہ جلا وطنی و حرمان نصیبی از دیدار یار و دیار جان بہ جہان آفرین داد - تا مقید رشتۂ حیات بود طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پا داشت - از کلام عاشقانہ و درد انگیزش (پیداست) کہ صد آرزو بہ خاک برد - چند مثنوی ہا و شش دیوان ریختہ دارد و بہ فارسی ہم سلیقہ داشتہ - القصہ تاثیر کلام قیامت زایش تاثیرے دارد کہ ہمچو خدنگ خارا شگاف از سینہ برون می جہد -"[۱]

☆ ☆ ☆

۱- بہار بے خزاں ، ص ۹۹ -

گلستانِ بے خزاں[1]

گلستان بے خزاں کے مصنّف حکیم قطب الدین باطن ہیں ۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے ۔ پیشہ طبابت تھا اور مشغلہ شاعری ۔ باطن نے تذکرے میں دو جگہ اپنا حال لکھا ہے ۔ ایک دیباچے میں دوسرے اپنے ترجمے میں ۔ ان کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ غلام نصیر الدین عرف کالے میاں کے مریدوں میں تھے ۔ کالے میاں تذکرے کی تالیف کے وقت حیات تھے اور شاہجہان آباد میں رہتے تھے ۔ باطن نے کتب درسیہ کی تعلیم نظیر اکبر آبادی سے حاصل کی تھی ، شاعری میں بھی انھیں کے شاگرد تھے ۔ چنانچہ انھیں اپنا استاد بتایا ہے ۔[2] باطن کے والد کا نام حکیم میر مہدی ظاہر اور دادا کا نام سید واجد علی تھا ۔ واجد علی اکبر آبادی مولانا فخر الدین کے خلیفہ تھے ۔ ۱۲۸۶ھ میں باطن کی عمر ۶۰ سال تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ۱۲۲۶ھ کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے ۔ پینتیس چھتیس سال کی عمر میں انھوں نے اپنا تذکرہ "گلستان بے خزاں" لکھا ۔ اس کے علاوہ چار دیوان اور مثنوی میر حسن کا خمسہ موسوم بہ اعجاز رقم ان سے یادگار ہے ۔[3]

تراجم شعرا کے خاتمے پر مؤلف نے لکھا ہے کہ :

"بتاریخ دوم ربیع الاول یوم دو شنبہ ۱۲۶۵ھ میں تذکرۂ گلستان بے خزاں نے اختتام پایا ۔"[4]

۱۔ اس تذکرے کا تاریخی نام "نغمۂ عندلیب" بھی ہے ۔
۲۔ دیباچۂ گلستان بے خزاں ، ص ۴ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ع ۔
۳۔ داستان تاریخ اُردو ص ، ۳۲۴ ، از مولانا حامد حسن قادری ، مطبوعہ آگرہ طبع دوم ۱۹۵۷ع
۴۔ گلستان بے خزاں ، ص ۲۸۹ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ع ۔

اس کے بعد غلام محمد رہا ، میر اعظم اعلی میر ، میر مدد علی تپش اور خود مؤلف کے کہے ہوئے تاریخی قطعات میں ان سب کے مادہ ہائے تاریخ سے تکملہ کا سال ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے - لیکن تذکرے کے عین آغاز میں مؤلف کے یہ اشعار ملتے ہیں :

خامے نے جب دیا جوابِ سوال
روبرو رکھ کے گلشنِ بے خار
منصفانِ زمانہ کہنے لگے
ہے گلستانِ بے خزاں میں بہار
بلبلِ فکر پھر تو اے باطن
چہچہایا یہ کھول کر منقار
نام تاریخی اس شگوفے کا
''نغمۂ عندلیب'' کہہ اے یار

''نغمۂ عندلیب'' اس تذکرے کا تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نام آغاز کار ہی کے وقت رکھ لیا گیا ہے اور تذکرہ ۱۲۶۱ھ میں شروع ہو کر ۱۲۶۵ھ میں مکمل ہوا ہے - آخر میں دیے ہوئے اس شعر سے :

سالِ آغاز اس مرقع کا
ہے ''گلستان بے خزاں یہ دیکھ''
۱۲۶۱ھ

بھی اس کا سال آغاز ۱۲۶۱ھ قرار پاتا ہے -

''خاتمۃ الطبع'' کے زیر عنوان دی ہوئی صراحت کے مطابق یہ تذکرہ مؤلف کی فرمائش پر مطبع نول کشور لکھنؤ سے جمادی الاول ۱۲۹۲ھ مطابق جون ۱۸۷۵ع میں پہلی بار شائع ہوا - یہ مطبوعہ نسخہ اگرچہ کمیاب ہے پھر بھی دستیاب ہے - انجمن ترقی اُردو کراچی میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے - اس مطبوعہ نسخے میں ۲۹۶ صفحات ہیں - آخر میں ۱۲ صفحے کی فہرستِ شعرا ان کے علاوہ ہے - شروع میں چار صفحے کا دیباچہ ہے - اس کے بعد ۲۸۹ صفحے تک شعرا کے تراجم ہیں - بقیہ آٹھ صفحے قطعات تاریخی ، تقریظ اور خاتمۃ الطبع کے لیے مخصوص ہیں - آخر میں ۱۳ صفحات کی فہرست اسامیِ شعرا ہے -

تذکرہ اُردو میں ہے اور اس میں ۸۳۵ شاعروں کا ذکر آیا ہے - دو چار مقامات کو چھوڑ کر ، تراجم اور منتخبات ، عام طور پر دونوں سرسری اور مختصر ہیں - دیباچے میں مؤلف نے لکھا ہے کہ :

''گلشن بے خار تالیف نواب مصطفٰی خاں شیفتہ جو اول سے آخر تک دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں نوابی پر فریفتہ سب کو حقارت سے یاد کیا ، اپنی اوقات کو برباد کیا - بجز سات شخصوں کے ہر ایک کی نسبت عبارت ہجو آمیز ہے . . . اور عبارت تذکرہ کی وہ مثل کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر - تذکرہ اُردو ، عبارت فارسی ، اون کی اور اون کے استاد کی عقل کا پھیر . . . ایسی ایسی بے انصافیاں جب نظر آئیں تو عاصی حکیم سید قطب الدین متخلص بہ باطن نے . . . ایک تذکرہ بہ جوابِ ''گلشن بے خار'' میں بعبارت اُردو زبان جمع کیا جس کا نام رکھا ''گلستان بے خزاں -''[۱]

قطب الدین باطن کا رویہ شیفتہ کے ساتھ بہت سخت ہے اور گلشن بے خار میں ایسی ناہمواریاں نہیں ہیں جیسی کہ باطن نے بیان کی ہیں - بہر حال اس سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ ''گلستان بے خزاں'' شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا ہے - شیفتہ سے باطن کی ناراضی کا اصل سبب یہ تھا کہ شیفتہ نے باطن کے استاد نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو پایۂ اعتبار سے گری ہوئی بتایا تھا - ان کے اصل الفاظ یہ ہیں :

''اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاری است و نظر بر آن ابیات در اعدادِ شعرا نشایدش شمرد -''

باطن کو اپنے استاد کے بارے میں شیفتہ کی یہ رائے سخت ناگوار گزری اور انھوں نے اس کے جواب میں ایک تذکرہ لکھ ڈالا اس میں باطن نے ''گلشن بے خار'' کا انتقام لیا اور شیفتہ کے احباب ، استاد اور ممدوحین کو جی بھر کے گالیاں دیں - شیفتہ نے مومن اور آزردہ کی بڑی تعریفیں کی تھیں ، اس لیے ان دونوں کے کلام میں باطن نے کیڑے نکالے اور آزردہ کے کلام پر اصلاحیں دیں - اس انتقامی

۱- گلستان بے خزاں - صفحات ۴ ، ۵ - طبع ۱۸۷۵ع -

جذبے کا یہ نتیجہ ہوا کہ گلستان بے خزاں کی تحریر میں اعتدال و توازن باقی نہ رہا ۔ تذکرہ مخالفین کی ہجو اور موافقین کی مدح بن گیا ۔ آزردہ کا ترجمہ دو صفحوں میں ہے لیکن صرف اعتراضات کا مجموعہ ہے ، نہ ان کے حالاتِ زندگی ہیں نہ منتخب اشعار (ص ۲۲) ۔ شیفتہ کا ذکر تین صفحوں میں ہے لیکن اس میں کوئی کام کی بات نہیں ہے صرف لعنت ملامت کی گئی ہے اور انتخاب کلام میں غالباً تلاش کر کے بے کیف اشعار درج کیے ہیں (ص ۱۳۰) ۔ غالب کے حالات و انتخابِ کلام میں دو صفحے ہیں لیکن چھینٹوں سے خالی نہیں ہیں ۔ چودہ اشعار بطور نمونہ دیے ہیں (ص ۱۷۱) ۔ مومن چونکہ شیفتہ کے استاد تھے اس لیے انھیں خاص طور پر بُرا بھلا کہا ہے ۔ نمونۂ کلام میں معمولی قسم کے تیرہ اشعار دیے ہیں (صفحات ۲۲۳ تا ۲۲۶) ۔ اس کے بر عکس اپنے دوست سید گلزار علی اسیر کے مبالغہ آمیز تعریف کے ساتھ تفصیل سے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور ۵۶ اشعار انتخاب میں دیے ہیں (صفحات ۲۶ تا ۳۰) ۔ خود اپنا ترجمہ چھ صفحوں میں لکھا ہے اور ایک سو سے زاید اشعار نمونۂ کلام میں دیے ہیں (صفحات ۴۲ تا ۴۸) ۔ اپنے استاد نظیر اکبر آبادی کی حد درجے تعریف کی ہے اور بیس صفحے ان کی نذر کیے ہیں ۔ یہ اس تذکرے کا سب سے طویل ترجمہ ہے اور تین سو کے قریب اشعار درج کیے ہیں (صفحات ۲۵۷ تا ۲۷۷) ۔ ہر چند کہ باطن نے نظیر اکبر آبادی کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے تاہم اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ نظیر اکبر آبادی رفتہ رفتہ منظر عام پر آگئے ۔ فکر کی بلندی نہ سہی لیکن سماجی زندگی کی ترجمانی اور مقامی آب و رنگ کی عکاسی کے اعتبار سے واقعی اُردو کا کوئی شاعر ان کا ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ شیفتہ نے نظیر کے ساتھ واقعی زیادتی کی تھی اور یہ شیفتہ ہی کی تنقیدی رائے کا اثر تھا کہ نظیر بہت دنوں تک گوشۂ گمنامی میں رہے ۔ باطن نے انھیں بہت اچھالا اور اس انداز سے کہ عام و خاص کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا ۔ اس لیے ہمارے نزدیک "گلستان بے خزاں" کا بڑا حاصل یہ ہے کہ اس کی بدولت ایک بڑے شاعر کو تاریخ ادب میں اپنی جگہ مل گئی ۔ ورنہ اس تذکرے کے تراجم بہ حیثیت مجموعی بے جان ہیں ۔ عبارت کی صناعی اور بے جا تعریف و تنقیص کے طومار میں سوانحی و تاریخی پہلو یکسر گم ہوگئے ہیں ۔ یہ تذکرہ گلشن بے خار کے جواب میں لکھا گیا ہے لیکن اس کی گرد کو نہیں پہنچتا ۔

مولانا حامد حسن قادری نے بہت صحیح لکھا ہے کہ انتخاب کلام حالات اور تنقید میں حکیم باطن کا ''گلستان بے خزاں'' یا ''نغمۂ عندلیب'' بالکل ہیچ پوچ ہے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں بہترین اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ باطن کا انتخاب نہایت معمولی ہے، وہ سخن سنجی سے عاری معلوم ہوتے ہیں۔[1]

تذکرہ دیباچے کے بعد ردیف وار تخلص کے ساتھ احمد کے ذکر سے شروع ہو کر یوسف کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں ترجمے بطور مثال نقل کیے جاتے ہیں:

احمد : احمد تخلص احمد بیگ نام۔ گروہ قزلباش سے تھے۔ حسن صبیح رکھتے تھے اور فنِ سپہ‌گری میں جوہر ذاتی پائی۔ چنانچہ ان کی تیغ زبان کی آبداری نے سپر کاغذ پر یہ گل رنگیں مثل گل زخم کھلائے:

غضب سے ہاتھ میں جب تو نے تیغِ کیں پکڑی
نہ اوٹھ سکا ترے بسمل نے یہ زمیں پکڑی (ص ۵)

یوسف : یوسف تخلص نواب امجد علی خاں نام رئیس قصبہ دیوئی علاقہ فتح پور ہنسوہ، مؤلف قصہ افسانۂ رنگین یوسفِ مضمون کو چاہِ طبع سے اہلِ کاروانِ فکر نکال کر لائے۔ پیش قافلہ سالار سامعین قصہ مضمون طبع یوسف زلیخایان شائق کو فسانہ خواب راحت ہے۔ داستان فکرِ سخن مشتاق جمال لعبت نظم کو رنگین عبارت ہے:

کون ہے نازک بدن تجھ ماہرو سا دوسرا
پھول کی بدھی جو پہنی درد شانہ ہوگیا
کب جھپکتی ہے پلک یوسف فراق یار میں
قبر سے بھی ہے زیادہ کنجِ ہجراں ان دنوں

باطن نے چونکہ ''گلشن بے خار'' کے مصنّف شیفتہ اور بعض دوسرے دہلوی شعرا پر لعن طعن کی تھی اس لیے دہلی کے شاعروں کی طرف سے اس کا جواب ''ارمغان'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ ''ارمغان'' کے مصنّف منشی کنھیا لال وحشی ہیں اور یہ بھی ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں یعنی 'گلستان بے خزاں' کی اشاعت کے ساتھ

۱۔ داستان تاریخ اُردو، ص ۳۲۵، مطبوعۂ آگرہ ۱۹۵۷ء طبع دوم۔

مطبع فوق کاشی دہلی سے شائع ہوا ہے - اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے :

''سنجانب شعراے دہلی بخدمت حکیم میر قطب الدین صاحب باطن اکبر آبادی جن کا تذکرہ مسمی بہ گلستان بے خزاں اپریل ۱۸۷۵ع میں چھپ کر شائع ہوا ہے یعنی حکیم صاحب ممدوح نے جو نغمۂ عندلیب بجواب طلسمات سخن (۱۲۵۰ھ) معروف بہ گلشن بے خار لحن داؤدی سے گایا ہے ، اس کا مختصر جواب الجواب مطبع فوق کاشی واقع دہلی بہ اہتمام منشی انبا پرشاد چھپ کر مرسل ہے -''[1]

☆ ☆ ☆

۱- رسالۂ تذکرات ، ص ۹۲ ، مؤلفۂ گارسیں دتاسی ، مترجمہ مولانا ذکاء اللہ ، مرتبۂ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، دہلی ۱۹۶۹ع -

طبقات الشعرائے ہند

"طبقات الشعرائے ہند" کے مصنّف کریم الدین ابن شیخ سراج الدین ہیں۔ ان کے حالاتِ زندگی "گلدستۂ نازنیناں" کے ذیل میں تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں اس لیے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ "طبقات الشعرائے ہند" کے سرورق پر کریم الدین اور مسٹر ایف۔ فیلن دونوں کے نام آئے ہیں[1] اس لیے طبقات الشعرائے ہند کی تالیف کے سلسلے میں یہ بات بھی زیر بحث آنی چاہیے کہ اس کے مصنّف صرف کریم الدین ہیں یا کریم الدین اور مسٹر ایف۔ فیلن دونوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ "طبقات الشعرائے ہند" کے مطبوعہ نسخے کے سرورق پر دونوں کے نام بہ حیثیت مؤلف درج ہیں اور یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ یہ گارسیں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستانی کا اُردو ترجمہ ہے۔ لیکن اس کا وضاحتی مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تذکرہ گارسیں کی تاریخ کے ترجمے پر مبنی ہونے کے باوصف گارسین کا نرا ترجمہ نہیں ہے بلکہ کریم الدین نے کچھ تو شیفتہ کے گلشن بے خار اور قدرت اللہ قاسم کے مجموعۂ نغز کی مدد سے اور کچھ اپنی ذاتی کوششوں کے ذریعے اسے گارسیں کی تاریخ سے الگ ایک جداگانہ تصنیف بنا دیا ہے۔ گارسیں کی تاریخ چونکہ فرانسیسی زبان میں تھی اس لیے جب ڈاکٹر اشپرنگر کے حکم پر کریم الدین نے اسے اُردو میں منتقل کرنا چاہا تو انہیں مسٹر ایف فیلن کو اس کام میں شریک کرنا پڑا۔ چنانچہ اس تذکرے کا جو مواد گارسیں کی تاریخ سے ماخوذ ہے وہ فیلن صاحب کے ترجمے اور تلخیص ہی کے ذریعے کریم الدین کے ہاتھ آیا ہے اور غالباً اسی لیے انھوں نے مترجمین میں اپنے نام

۱۔ ملاحظہ ہو "طبقات الشعرائے ہند" مطبوعۂ مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۴۸ء مخزونہ انجمن ترقی اُردو، کراچی۔

کے ساتھ فیلن کا نام بھی شامل کر لیا ہے - لیکن جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے طبقات الشعرا کا مواد گارسیں کے ترجمے و تلخیص سے بہت آگے بڑھ گیا ہے - تدوین و ترتیب سے قطع نظر اس میں کریم الدین نے اتنے اضافے اور ایسی کاٹ چھانٹ کی ہے کہ اس نے بہ حیثیت مجموعی الگ تالیف کی صورت اختیار کر لی ہے - اس لیے شاید کریم الدین نے سرورق کے سوا تذکرے میں کہیں فیلن صاحب کی اعانت کا ذکر نہیں کیا - خاتمہ کتاب پر صرف اپنا نام بہ حیثیت مؤلف لکھا ہے اور اس کا مقدمہ واحد متکلم کی صورت میں اس انداز سے لکھا ہے گویا یہ انھی کی تنہا تصنیف ہے - خود گارسیں دتاسی جس کی تاریخ کی اساس پر یہ تذکرہ قائم ہے اس کے معترف ہیں کہ ''طبقات الشعرائے ہند'' میں اتنے اضافے ہوئے ہیں کہ وہ ایک جداگانہ تصنیف بن گیا ہے - چنانچہ گارسیں نے جب اپنی تاریخ کے دوسرے اڈیشن کا اہتمام کیا تو اس میں کریم الدین کے مواد سے بھی فائدہ اٹھایا - اس کا اعتراف انھوں نے خطبات کے علاوہ اپنی تاریخ ادب میں بھی کیا ہے -

تذکرے کے آخری صفحے پر لکھا ہے :

''تمام ہوا تذکرہ طبقات الشعرائے ہند مؤلفہ کریم الدین ۱۸۴۷ع/ ۱۲۶۳ھ -''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۴۷ع/۱۲۶۳ھ میں مکمل ہوا ہے - یہ تذکرہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے میر اشرف علی کے زیر اہتمام ۱۸۴۸ع/۱۲۶۴ھ میں بڑی سائز پر شائع ہوا - اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے :

''تاریخ شعرا کا مسٹر فلین صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے گارسیں دتاسی کی تاریخ سے ۱۸۴۸ عیسوی میں ترجمہ کیا اور نو سو چونسٹھ شاعروں اُردو گو کے اشعار اور حال بھی دواوین مختلفہ میں سے منتخب کر کے اس میں مندرج کیا گیا -''

اُردو سے پہلے انگریزی میں بھی یہی لکھا ہے - عبارت کے پہلے ٹکڑے سے اشتباہ ہوتا ہے کہ تذکرے کے تکملے کا سال ۱۸۴۸ع ہے لیکن ایسا نہیں ہے - اندرونی اندراجات سے پتا چلتا ہے کہ کریم الدین نے اسے ۱۸۴۷ع کے آخری ایام میں مکمل کیا اور اگلے سال ۱۸۴۸ع میں یہ چھپنا شروع ہو گیا - اس طرح

۱۸۴۷ع کو اس کا سالِ تصنیف اور ۱۸۴۸ع کو سالِ طباعت خیال کرنا چاہیے۔ انجمن ترقی اُردو کراچی اور ترقی اردو بورڈ کراچی میں اس کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ رام پور، پٹنہ، لاہور اور دوسری جگہوں پر بھی اس کے مطبوعہ نسخے دستیاب ہیں۔ اس میں کل ۵۰۴ صفحے ہیں۔ مقدمے کے بعد بلحاظ حروف تہجی شعرا کے تراجم ہیں۔ یہ تراجم صفحہ ۵۰۱ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ آخری صفحوں میں خاتمہ کے عنوان سے اُردو شاعری کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے اور طبقات الشعراے ہند کے بعد ایک اور تذکرے لکھنے کا ارادہ اس طور پر ظاہر کیا ہے:

”جس طرح پر میں نے اس تذکرہ کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ مگر بعد اس کے چھپنے کے پھر میں سعی اس امر میں بہت کروں گا اور ایک تذکرہ جمع کروں گا جس میں تحقیق ہر ایک شاعر کے حال کی بخوبی کر کے یادداشت اپنی انشاء اللہ تعالیٰ صفحۂ روزگار پر چھوڑوں گا۔“

لیکن کریم الدین کا یہ ارادہ شاید عملی جامہ نہ پہن سکا۔ اس لیے کہ اب تک ان کے اس تذکرے کا سراغ نہیں ملا۔

عطاء الرحمٰن کاکوی نے طبقات الشعراے ہند کے طبقۂ سوم اور چہارم کو اشعار حذف کرکے شائع کر دیا ہے۔[۱] بعد میں دونوں حصے معاصر سے الگ کرکے کتابچوں کی صورت میں جدا جدا چھاپ دیے گئے ہیں۔ ان میں تین تین چار چار صفحوں کے مختصر مقدمات بھی شامل ہیں۔

تذکرہ اُردو میں ہے اور سرورق کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ یہ گارسیں کی تاریخ جلد اول کا اُردو ترجمہ ہے اور اس میں صرف نو سو چونسٹھ شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اشعار کے انتخاب اور اپنے معاصرین کے حالات میں انھوں نے بہت سے اضافے کیے ہیں۔ شعرا کی تعداد خدا جانے کیوں ۹۶۴ لکھی ہے۔ حالانکہ مطبوعہ نسخے میں تراجم کی تعداد ایک ہزار سے بھی زائد ہے۔ اس میں شاعروں کے ساتھ ساتھ کچھ نثر نگار بھی شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے

۱- معاصر پٹنہ شمارہ نمبر ۲۱ اور شمارہ نمبر ۳ مملوکہ راقم الحروف۔

کہ نثر نگاروں کو چھوڑ کر صرف شاعروں کی تعداد ۹۶۸ لکھی گئی ہو۔ تراجم سے پہلے ایک بسیط مقدمہ ہے، اس میں کریم الدین نے اُردو کے مآخذ تذکرہ نگاری اور تاریخ کے فرق، تذکرہ نگاروں کی عام روش اور تذکروں کی اقسام پر روشنی ڈالی ہے۔ کریم الدین کا مقدمہ در اصل گارسیں دتاسی کے مقدمے سے ماخوذ ہے۔ اس کے مباحث تقریباً ایک سے ہیں اور بعض مقامات پر لفظی ترجمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یا ایں ہمہ بقول ڈاکٹر محمود الٰہی مقدمۂ طبقات کے یہ الفاظ جو وقیع اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں کریم الدین کے ہیں، دتاسی کے نہیں[۱]:

"کتبِ تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں اس لیے اکثر اہل علم و فضل نے بہ لحاظ تکمیل فن تواریخ کے اس فن کی کتابیں . . . تصنیف کی ہیں . . . مگر افسوس کہ کسی نے اس شاخ کو شاخِ تاریخ نہ رکھا۔ واضح ہو کہ تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں واقعات یا حالات زمانہ اس طور پر لکھے جائیں کہ اس سے معلوم ہو سکے کہ فلاں زمانے میں یہ حادثہ یا واقعہ گزرا۔ بخلاف تذکرے کے کہ اس میں خاص ایک قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے مثلاً تذکرۃ الشعرا یا تذکرۂ انبیا یا تذکرۂ اولیا وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام کہ وہ تذکروں کو بھی مشتمل ہوتی ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرہ ایک قسم کی تاریخ ہے، بشرطے کہ اس میں ہر ایک شخص کے زمانے کا بھی حوالہ ہو اور اگر صرف حال ہو اور تاریخ کسی کی دریافت نہ ہو سکتی ہو اور نہ مصنف کے بیان سے واضح ہو کہ کس زمانے کا یہ حال بیان کرتا ہے تو اس صورت میں داخل تاریخ نہ ہوگا بلکہ ایک قسم علیٰحدہ مقابل تاریخ کے ہوگی۔ اس صورت میں نسبت تضاد کی ہوگی۔ غرض کہ تاریخ میں بحث واقعاتِ زمانہ سے ہوتی ہے اور تذکرے میں اشخاص کا بیان ہوتا ہے۔"

مقدمے کے بعد کریم الدین نے تذکرے کے اصل مواد کو دو حصوں میں

۱۔ "بازیافت"، ص ۵۳، مطبوعہ دانش لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۵ع۔

تقسیم کیا ہے اور اس کی تفصیل اس طور پر دی ہے :

قسم اول : ''اس میں حال متقدمین کا ہے جو اکثر ہندی کے مصنّف'' گزرے ہیں ۔ قسم اول چار طبقوں پر مشتمل ہے :

طبقۂ اول : ''اس میں ان شعرا کا ذکر ہے جو بانی اُردو کے تھے اور انھوں نے اس زبان اُردو کے شیوع میں کوشش بلیغ کی ۔

طبقۂ دوم : اس میں ان کا ذکر ہے ''جو مصلح اُردو اور مروج اس زبان کے تھے اور انھوں نے الفاظ کریہہ کا استعمال یک قلم زبانِ ریختہ سے موقوف کیا ۔

طبقۂ سوم : اس میں وہ شاعر ہیں جو طبقۂ دوم کے شاگرد تھے ، ان کو الفاظ صحیح اور محاورات دلچسپ کے استعمال کرنے کا بہت شوق تھا ۔

طبقۂ چہارم : اس طبقے میں وہ شاعر ہیں جو ہم عصر اس بندے کے ہیں اور ان سے ملاقات بندہ کی ہے یا اکثر جا بہ ان کو دیکھا ہے یا ان کا حال سنا ہے اور ملاقات نہیں ہوئی ۔
طبقۂ چہارم خود مؤلفِ تذکرہ کے حالات پر ختم ہوتا ہے اس کے بعد تکملہ کے عنوان سے ان شعرا کا ذکر ہے جن کی تاریخ وفات یا حیات معلوم نہیں ہو سکی ۔ ایسے شعرا کی تعداد ۱۴۶ ہے ۔ سب سے آخر میں امید حیدر آبادی کا ایک سطری ذکر ہے اور صرف ایک شعر درج ہے ۔
بعد ازاں ''خاتمہ'' کے عنوان سے اُردو شاعری کی تاریخ کا اجمالی ذکر ہے اور ہر طبقے کے نامور شعرا کے نام و کام کی دوبارہ نشان دہی کی ہے ۔

کریم الدین نے شعرا کی یہ درجہ بندی تو کر دی ہے اور مقدمے میں تراجم کو تاریخی صحت کے ساتھ لکھنے کا ادعا بھی کیا ہے لیکن وہ اس میں بہت کم کامیاب ہوئے ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح لکھا ہے کہ ''دیباچے میں انھوں

نے جن اصول و قواعد کا اعلان کیا ہے ان پر پورا پورا عمل نہیں ہو سکا۔[۱] واقعات کے سنین کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ ان سے شعرا کی طبقاتی تقسیم میں بھی جا بجا لغزشیں ہوئی ہیں۔ جن شعرا کے نام بلحاظ زمانہ طبقۂ دوم میں ہونے چاہیے تھے، وہ سوم میں، اور سوم کے چہارم میں درج کیے گئے ہیں۔ بعض شعرا کا ذکر مختلف تخلصوں کے ساتھ دو جگہ آ گیا ہے۔ اس تکرار میں بعض جگہ عجب التباس ہوا ہے کہ چندا بائی ماہ لقا کا ذکر پہلے طبقۂ دوم میں مرد شاعر کی حیثیت سے ہوا ہے اور پھر طبقۂ چہارم میں عورت کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس قسم کی لغزشوں کی نشان دہی اپنے مضمون میں کر دی ہے۔[۲] ان کمزوریوں کے باوجود طبقات کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اُردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تاریخ و تذکرہ کے تعلق پر بحث کی گئی ہے، ان کے فرق کو سمجھا گیا ہے اور واقعات و حالات کے اندراج میں تاریخ نگاری کے عناصر کا شعوری لحاظ رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

> "کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند کو جس نہج پر تقسیم کیا ہے وہ تذکرہ نگاری کی قدیم روش سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ یہ تقسیم ایک مؤرخ کا نتیجۂ فکر ہو سکتا ہے، ایک روایتی طرز کے تذکرہ نگار کا نہیں۔ ان کے . . . الفاظ محمد حسین آزاد کے ان جملوں کے ابتدائی نقوش معلوم ہوتے ہیں جو آبِ حیات کے ہر دور کی تمہید میں استعمال کیے ہیں۔
> یہ صحیح ہے کہ دتاسی کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں طبقات میں شامل کر لیا گیا اور یہ بھی صحیح ہے کہ دتاسی کی ادبی تاریخ کا مجوزہ خاکہ کریم الدین کی نظر سے گزر چکا تھا لیکن ادبی تاریخ کے موضوع پر ان کا ذہن زیادہ صاف تھا۔ اُنھوں نے دتاسی کے مقدمۂ تاریخ کو بھی طبقات میں شامل کر لیا تھا۔ اس مقدمے پر اُنھوں

۱۔ شعرائے اُردو کے تذکرے، ص ۶۹، مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۵۲ع۔

۲۔ "طبقات الشعرائے ہند اور مولوی کریم الدین (مشمولہ صحیفہ لاہور) ۔ شمارہ نمبر ۳۰، بابت جولائی ۱۹۶۷ع۔

نے جو اضافہ کیا ہے وہ اُردو میں اپنے طرز کی پہلی آواز ہے جو تذکرہ نگاری کی مروجہ روش کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے اور ایک نئے انداز کی تذکرہ نگاری کے لیے دعوت فکر و نظر بھی۔"[1]

مختصر یہ کہ "طبقات الشعرائے ہند" اُنیسویں صدی کے وسط کا ایک اہم تذکرہ اور ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم مآخذ ہے۔ اس کا سوانحی اور تنقیدی لب و لہجہ عام تذکروں سے مختلف ہے۔ اس میں سیاسی و معاشرتی ماحول کی تصویریں بھی ہیں اور مصنفین و شعرا کے متعلق بے لاگ رائیں بھی۔ اس میں مبالغہ و تصنع یا پاس داری و لعن و طعن کا وہ انداز نظر نہیں آتا جو قدیم تذکروں کی خصوصیت ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں، حتیٰ کہ خود گارسیں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی کے تکملے کے وقت اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب "آب حیات" کا تو یہ ماخذ خاص ہے۔ قاضی عبدالودود نے "آبِ حیات اور طبقات الشعرا" کے عنوان سے دونوں کے مماثل پہلوؤں کی نشان دہی تفصیل کے ساتھ کر دی ہے۔[2]

طبقۂ سوم سے میر محمد حیات حسرت دہلوی اور طبقۂ چہارم سے صاحب کا ترجمہ اس جگہ دیا جا رہا ہے۔ صاحب کے ۶ شعر درج کیے ہیں، وہ یہاں محذوف کر دیے گئے ہیں۔

حسرت : محمد حیات حسرت دہلوی مشہور بنام ہیبت قلی خاں نواب شوکت جنگ پسر نواب صولت جنگ جو کہ صوبہ دار پورنیہ کا بنگال میں تھا نواب سراج الدولہ صوبہ دار بنگال کی خدمت میں بھی وہ رہا تھا۔ درمیان ۱۱۹۵ھ کے نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں صوبۂ بنگال کے افسر (افسروں) میں سے تھا ۱۲۱۵ھ میں فوت ہوا۔ بسبب ظرافت اور دقیقہ رسی کے مشہور ہے۔ بدیہہ گو اور حاضر جواب بھی بہت تھا۔ وہ مرزا جان جاناں مظہر کے شاگردوں میں سے تھا۔ اس کے دیوان میں دو ہزار شعر ہیں۔ اسی شاعر کی قصہ طوطی نامہ تصنیف سے

۱- "بازیافت، ص ۵۲ - مطبوعہ دانش محل لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۵ع -

۲- معاصر، شمارہ ۴، ص ۱۵۵، بابت دسمبر ۱۹۵۲ع -

ہے ۔ شعر اس کے میرے ہاتھ نہیں آئے ۔''

صاحب : ''تخلص ایک عورت مسماۃ امۃ الفاطمہ بیگم کا ہے ۔ اس کو صاحب جی بھی کہتے ہیں ۔ درمیان شاہجہان آباد کے حکیم مومن خاں سے ملاقات اس کی بہ تقریب علاج کے ہوئی تھی ۔ مدت تک آشنائی رہی ۔ کئی سال گزرے کہ اب لکھنؤ چلی گئی ہے ۔ وہ ایک خانگی تھی ۔ مثنوی ''قول غمیں'' مومن خاں کی اسی محبوبہ کے حق میں ہے ۔ بہ فیض صحبت مومن خاں صاحب کے وہ بھی شعر کہنے لگی تھی ۔''

☆ ☆ ☆

''یادگارِ شعرا''

''یادگار شعرا'' کے مصنّف و مرتّب یورپ کے مشہور مستشرق ڈاکٹر اشپرنگر ہیں ۔ ان کا پورا نام الواس اشپرنگر (Alios Spreger) تھا اور جرمنی کے رہنے والے تھے ۔ ۳ ۔ ستمبر ۱۸۱۳ع میں پیدا ہوئے ۔ یورپ کی کئی یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ۱۸۴۱ع میں لائڈن یونی ورسٹی سوئٹزرلینڈ سے ایم ۔ ڈی کی سند حاصل کی ۔ ۱۸۴۳ع میں برطانیہ کے شہری حقوق حاصل کیے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر ۱۸۴۳ع ہی میں کلکتہ پہنچ گئے ۔ وہاں دو سال تک فوج میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔

۱۸۴۵ع میں دلی کالج کے پرنسپل فلک بوترو (Flex Boutros) بیمار پڑے اور دو سال کی رخصت پر چلے گئے ۔ ڈاکٹر اشپرنگر کو ان کی جگہ کالج کا پرنسپل بنا دیا ۔ دو سال بعد ۶ ۔ دسمبر ۱۸۴۷ع میں انھیں اکسٹرا ریذیڈنٹ بنا کر لکھنؤ بھیج دیا گیا ۔ لکھنؤ میں ان کے سپرد یہ کام ہوا تھا کہ وہ شاہان اودھ کے کتب خانوں کی فہرست کتب مرتّب کریں اور شاہی کتب خانوں کے علاوہ ذاتی کتب خانوں کے نوادر کا بھی جائزہ لیں ۔ اس کام کے سلسلے میں ڈاکٹر اشپرنگر تقریباً دو سال لکھنؤ میں رہے ۔ یکم جنوری ۱۹۵۰ع میں اپنے کام کی پہلی جلد مکمل کر کے دلی واپس پہنچ گئے ۔ لیکن چند دن بعد ہی انھیں کلکتے کے مدرسۂ عالیہ کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا ۔ اس عہدے پر وہ چھ سال مامور رہے ۔ ۱۸۵۷ع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر یورپ چلے گئے ۔ وہاں برن یونی ورسٹی سوئٹزر لینڈ اور ہائڈل برگ یونی ورسٹی جرمنی میں پروفیسر رہے ، ۱۹ ۔ دسمبر ۱۸۹۳ع میں ان کا انتقال ہو گیا ۔[1]

۱۔ ''ڈاکٹر اشپرنگر'' از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، ص ۱۲۲ تا ۱۲۷ ، مشمولہ دلی کالج اُردو میگزین ، ''قدیم دلی کالج نمبر'' ۱۹۵۳ع ۔

ڈاکٹر اشپرنگر حقیقی معنوں میں عالم تھے - وہ مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں سے واقف تھے اور علوم و فنون سے گہری دلچسپی رکھتے تھے - خصوصاً مشرق اور مشرقیات سے انھیں ایسا لگاؤ تھا کہ دوسرے مستشرقین میں کم نظر آتا ہے - مولوی عبدالحق مرحوم ڈاکٹر اشپرنگر کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

''ڈاکٹر اشپرنگر عربی زبان و ادب کے عالم تھے اور اس لیے دلی کے مسلمان شرفا اور اہلِ علم میں انھوں نے جلد اثر پیدا کر لیا اور شہر میں وہ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے - دوسرے دہلی ورناکیولر سوسائٹی جس نے اُردو زبان کے ذریعے مغربی علوم کی اشاعت میں بڑا کام کیا تھا اور مغربی شعبے کے طلبہ کی تعلیم اور تشویق علم میں بڑی مدد دی تھی ، اس کے وہ روح رواں تھے - نصاب تعلیم میں خاص کر مشرق شعبے کے نصاب میں معقول اصلاحیں کیں - چنانچہ نصاب کی خاطر تاریخ یمینی کو ایڈٹ کیا اور چھپوایا - حماسہ اور متنبّی کے نسخے بہم پہنچائے اور عربی ادب کے نصاب میں شریک کرائے - انتظامی حالات بھی ان کے زمانے میں بہت اچھے رہے - علاوہ اس کے وہ ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سکریٹری بھی تھے -''[1]

مختصر یہ کہ اُردو زبان و ادب کے سلسلے میں ڈاکٹر اشپرنگر کی خدمات بہت اہم ہیں - ان کی کوششوں سے اُردو کو سرکاری دفتروں اور اعلیٰ تعلیم کے امتحانوں میں خاصی وقعت حاصل ہو گئی تھی - انھیں تصنیف و تالیف کا خاص سلیقہ تھا - چنانچہ انھوں نے ایک دو نہیں درجنوں بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں - ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم[2] ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی[3] اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ[4] نے اشپرنگر کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے تراجم تصانیف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے -

---

۱- مرحوم دہلی کالج ، ص ۱۴۷ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۴۵ع -
۲- مرحوم دہلی کالج ، ص ۱۴۷ ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۴۵ع -
۳- دلی کالج اُردو میگزین ، ص ۱۲۲ تا ۱۲۷ ، مطبوعہ ۱۹۵۳ع -
۴- دلی کالج اُردو میگزین ، ص ۹۹ تا ۱۰۲ ، مطبوعہ ۱۹۵۳ع -

لیکن اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر اشپرنگر کا نام در اصل اس فہرست کتب کی بدولت زندہ ہے جو ۱۸۵۰ء میں انھوں نے شاہان اودھ کے کتب خانوں کی مدد سے مرتّب کی تھی - یہ فہرست اُردو فارسی کی کتابوں سے متعلق ہے اور صرف تین ابواب پر مشتمل ہے - ڈاکٹر اشپرنگر نے کئی جلدوں میں کتابوں کی مکمل فہرست تیار کرنے کا پروگرام بنایا تھا - لیکن وہ ابھی صرف تین ابواب پورے کر پائے تھے کہ انھیں دلی واپس بلا لیا گیا - چنانچہ یہی تین ابواب جلد اول کی حیثیت سے ۱۸۵۴ء میں کلکتے سے شائع کر دیے گئے - اشپرنگر نے یہ فہرست کتب ضروری شذرات کے ساتھ انگریزی میں مرتّب کی تھی اور اس کا اصل نام A catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani Manuscripts, Persian and Hindustani Poetry Vol. I ہے - لیکن اس میں عربی کتب کا تذکرہ نہیں ہے - پہلے باب میں اُردو اور فارسی شعرا اور ان کے تذکروں کا ذکر ہے - دوسرے اور تیسرے باب میں فارسی اور اُردو شعرا کی تصانیف ہیں - آخر میں پانچ فارسی تذکروں کا ذکر باب اول کے ضمیمے کے طور پر شامل ہے - اس فہرست کی اشاعت پر کلکتہ ریویو کی ۲۳ ویں جلد میں جو تبصرہ ملتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اشپرنگر کا کام کس نوعیت کا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے - کلکتہ ریویو نے لکھا تھا کہ :

> ''ڈاکٹر اشپرنگر ہندوستان کے قدیم لٹریچر پر وہی احسان کر رہے ہیں جو جیمس پرنسپ (Jame Princep) نے قدیم تاریخ پر کیا ہے - جن کتابوں کا ذکر اس فہرست میں کیا گیا ہے ، ان کی تاریخی اور لسانیاتی اہمیت سے قطع نظر ، ان کا ایک اور افادی پہلو بھی ہے - ان کی وجہ سے ہم پر یہ راز کھلتا ہے کہ ہندوستانی زبان اگر قصے کہانیوں یا تفریح و تفنن کے مضامین کو کامیابی کے ساتھ ادا کر سکتی ہے تو اس کے ذریعے یوروپی علم و دانش و سائنس کی تعلیم بھی دی جا سکتی ہے -

جب ہم اس دماغی کاوش اور محنت کا ذکر کرتے ہیں جو ڈاکٹر اشپرنگر کو دس ہزار مشرقی کتب کی چھان بین کرتے وقت کرنا پڑی ہوگی تو ہمیں اُردو زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے جس سے کئی فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں - سامی لٹریچر سے جان پہچان کی بنا پر ایشیا بھر میں ڈاکٹر اشپرنگر ایسے واحد شخص ہیں جو اس کام کو سر انجام دے سکتے

ہیں - یہ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ خرابی صحت کی وجہ سے یہ کام عارضی طور پر رکا رہا -

مرحوم سر ایچ ایلیٹ (H. Elliot) نے جو ہندوستان کے قدیم مؤرخوں پر اپنی تحقیق کرنے میں زندگی بھر مصروف رہے ڈاکٹر اشپرنگر کی حوصلہ افزائی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی - وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی روح کو سمجھنے کے لیے ہندوستانی ادب کا مطالعہ بہت ضروری ہے -

ڈاکٹر اشپرنگر نے اس کتاب میں ۱۴۰۰ اُردو شاعروں کے نام گنوائے ہیں - فارسی کی ہر کتاب کا اصل نام مع مختصر مضمون کے دیا گیا ہے اور ہر مصنّف کا تھوڑا بہت احوال بھی درج ہے -

ہندوستانی علم و تعلیم کے حق میں حکومت جو کام کر سکتی ہے ایسی فہرستوں کا چھپوانا اس کا ایک اہم حصہ ہے - اسے دیکھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مقامی لوگ کیا کر رہے ہیں اور ان کے ٹھوس اور زندہ ادب سے ہم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں - اس فہرست کی آئندہ شائع ہونے والی جلدیں اور بھی دلچسپ ہوں گی . . .

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے لوگوں کو ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا بہت کم علم ہے - ہمارا یقین ہے کہ اس کتاب کے چھپنے سے یہ کمی پوری ہو جائے گی اور لوگوں کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس اس قدر بیش قیمت سرمایہ ہے جسے اگر کوشش کر کے کھنگالا جائے تو بہت کارآمد ثابت ہوگا -"[1]

ڈاکٹر اشپرنگر نے ، جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے ، شاہان اودھ کے کتب خانوں کی فہرست ۱۸۵۰ع میں مکمل کی تھی - اس فہرست کا ایک مطبوعہ نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے - ایک نسخہ امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ میں ہے - ڈاکٹر محمد اکبر حیدری کاشمیری کا مقالہ اس فہرست کے سلسلے میں قابل مطالعہ ہے -[2] چونکہ زیرِ نظر تذکرہ اسی فہرست مطبوعہ

۱- بحوالہ دلی کالج اُردو میگزین ، ص ۱۰۱ ، ۱۰۲ ، قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ع -

۲- صحیفہ ، ص ۱۴ تا ۶۶ ، بابت اکتوبر ۱۹۶۸ع -

۱۸۵۴ع کے باب اول کا ترجمہ ہے اس لیے اس کا سال تصنیف بھی ۱۸۵۰ع ہی قرار پاتا ہے۔ طفیل احمد نے خان بہادر سید ابو محمد ایم۔ اے ممبر کونسل ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے ایما پر اسے ۱۹۳۲ع میں اُردو میں منتقل کیا۔ یہ اُردو ترجمہ "یادگار شعرا" کے نام سے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی تقریظ کے ساتھ کتابی صورت میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد سے ۱۹۴۳ع میں شائع کر دیا گیا۔ یہی دستیاب ہے اور یہی اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

گارسیں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستانی کے بعد یہ دوسرا تذکرہ ہے جو ایک یوروپین مستشرق کی کوشش سے وجود میں آیا ہے۔ گارسیں کا تذکرہ فرانسیسی زبان میں تھا ڈاکٹر اشپرنگر نے اسے انگریزی زبان میں انگریزی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ مرتّب کیا ہے۔ بعد میں طفیل احمد نے اسے انگریزی سے اُردو میں منتقل کر کے اسے یادگار شعرا کا نام دیا۔

ڈاکٹر اشپرنگر کے تذکرے میں جن شاعروں کا ذکر آیا ہے وہ خود اس کی دی ہوئی تفصیل کے مطابق تذکرۂ ریختہ گویان (حسینی)، نکات الشعرا، مخزن نکات، گلزار ابراہیم، تذکرۂ شورش، تذکرۂ ہندی (مصحفی)، دیوان جہان، گلدستۂ نشاط، گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، انتخاب دواوین، گلدستۂ نازنیناں، تذکرۂ شعرائے ہند (کریم الدین) اور چمن بے نظیر سے ماخوذ ہیں۔

ان تذکروں کی تفصیل دینے کے بعد اشپرنگر نے ان تمام شعرا کا ذکر فرداً فرداً کیا ہے جن کا ذکر مذکورہ بالا تذکروں میں آیا ہے۔ ہر شاعر کے حالات کے ساتھ ان تذکروں کے حوالے بھی دے دیے گئے ہیں جن سے یہ حالات ماخوذ ہیں۔ ماخذات میں اوپر دی ہوئی بیس کتابوں میں سے صرف چودہ کے حوالے اصل کتاب میں ملتے ہیں۔ چھ کتابوں یعنی "دیوان جہاں"، "گلدستۂ نشاط"، "انتخاب دواوین"، "چمن بے نظیر"، "گلدستۂ نازنینان" اور "طبقات الشعرائے ہند" (کریم الدین) کا حوالہ نظر نہیں آتا۔ اصل کتاب میں ماخذ کے حوالوں کے ساتھ اشپرنگر نے تذکروں کے نام کے بجائے ان کے نشانات دیے تھے۔ فاضل مترجم نے ان نشانات کی جگہ اصل تذکروں کے نام دے دیے ہیں۔ اس طرح یہ تذکرہ تحقیقی مطالعے کے لیے زیادہ آسان اور مفید تر ہو گیا ہے۔

اس میں ۱۵۱۹ شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ گویا دتاسی کے تذکرے کو چھوڑ

کر یہ ۱۸۵۰ء تک لکھے جانے والے سارے تذکروں سے ضخیم ہے۔ یہ اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے جس میں جگہ جگہ ہر شاعر کے سلسلے میں ماخذ کا سراغ دیا گیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ تذکرہ، ماخذوں کا مجموعہ ہے۔ گویا تحقیقی نقطۂ نظر سے تذکروں کے سلسلے میں ماخذ کی نشان دہی کا سلسلہ ڈاکٹر اشپرنگر سے شروع ہوتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ رواج نہ تھا بلکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے تو اپنے ماخذ کا سراغ دینے سے بھی پرہیز کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تراجم کو ایک دوسرے سے مقدم یا مؤخر ثابت کرنے میں خاصی دشواری پیدا ہو گئی۔ یادگار شعرا، شعرا کا تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر شعرا اور تذکرہ نگاروں کے سلسلے میں فرہنگ کا بھی کام کرتا ہے۔ یعنی اس کے دیکھنے سے یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ کسی خاص تذکرے یا شاعر کا ذکر اور کن کن تذکروں میں آیا ہے۔ اس خصوصیت نے اس تذکرے کو تحقیق کا ایک اہم ماخذ بنا دیا ہے اور تذکرہ نگاری پر کام کرنے والوں کے لیے یہ خاصا مفید ثابت ہوا ہے۔ ایک خاص بات اس تذکرے میں یہ ہے کہ اس میں صرف شعرا کے نثری تراجم ہیں۔ یہ پہلا تذکرہ ہے جو اشعار کے منتخبات سے عاری ہے اور بیاض شعر کے بجائے سوانح شعرا کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔

تذکرے کا اُردو ترجمہ، اُردو حروف تہجی کے لحاظ سے مرتّب کیا گیا ہے اور اس میں آبرو سے لے کر یونس تک ۱۵۱۹ شعرا کا ذکر آیا ہے۔ دونوں کے تراجم یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

آبرو : نجم الدین علی خاں معروف بہ شاہ مبارک۔ یہ محمد غوث ساکن گوالیار کی نسل سے تھے۔ آرزو کے قریبی رشتہ دار تھے جو ان کے اشعار پر نظرثانی کیا کرتے تھے۔ ان کا مولد گوالیار تھا۔ اوائل عمر میں دہلی آ گئے تھے۔ کچھ عرصہ یہ نارنول میں گردیزی کے والد کی صحبت میں رہے۔ ان کے ایک آنکھ نہیں تھی۔ یہ تقریباً ۵۵ سال کی عمر میں

۱۔ یادگار شعرا، ص ۱۲، مرتّبہ طفیل احمد، مطبوعۂ ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد ۱۹۴۳ء۔

۱۱۶۱ھ سے پیشتر انتقال کر گئے - (تذکرہ جات میر و قائم و گردیزی و گلشن ہند، ص ۱۳) -

یونس : حکیم یونس ظاہر اکبر کے زمانے میں تھے (علی ابراہیم و شورش) زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے (ذکا) -[۱]

☆ ☆ ☆

۱- یادگار شعرا، ص ۲۲۴، مرتبہ طفیل احمد، مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۴۳ء -

"مخزنِ شعرا"

مصنف کا پورا نام تھا قاضی نور الدین حسین خاں رضوی - فائق تخلص کرتے تھے - باپ کا نام سید احمد حسین رضوی تھا - فائق بھڑوچ (گجرات) کے رہنے والے تھے - ان کا خاندان علم و فضل کے لیے خاص شہرت رکھتا تھا - وہ خود بھی عالم و فاضل اور شاعر تھے اُردو فارسی دونوں میں کہتے تھے - مرزا نوشہ غالب کے ہم عصر تھے - چنانچہ غالب کی وفات کے ایک سال بعد ۱۲۸۶ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے - غالب سے ان کی خط و کتابت بھی تھی - غالب کا ایک خط ان کے تذکرے کے آخری صفحات میں شامل ہے ، اس سے پتا چلتا ہے کہ فائق نے غالب کو اپنے تذکرے کا مسودہ بغرض اصلاح بھیجا تھا - غالب کا خط تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں نقل کیا جاتا ہے :

مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نور الدین حسین خان بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار مرزا شہاب الدین خان بہادر نے یہ اجزا مجھ کو دیے ، نظم سے میں نے بالکل قطع نظر کی - کامل صاحب کی نثر جو آغاز میں ہے اس کو بھی نہیں دیکھا - صرف آپ کی نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست کر دیا - بعض موقع پر منشائے اصلاح بھی لکھ دیا ہے - مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں بفحوائے الامر فوق الادب حکم بجا لایا ہوں - مرحبا آفرین ، بخدا خوب نثر لکھی ہے - اللہ سبحانہ' آپ کو مدارج اعلٰی کو

۱- مخزن شعرا ، ص ۱۱۰ - ۱۱۱ - مرتبہ مولوی عبدالحق ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۳ع -

پہنچاوے اور سلامت رکھے ۔

(مرقومہ دو شنبہ، ۱۴ جولائی ۱۸۶۲ عیسوی
خوشنودی احباب کا طالب غالب)

اس تذکرے کے تکملے کا سال ۱۲۶۸ھ ہے۔ تذکرے کے آخر میں مصنّف کے علاوہ میاں سمجو صاحب، شیخ نجم الدین مشتاق اور میر عباس علی شوق کے قطعات تاریخی درج ہیں۔ مصنّف کا قطع تاریخ درج ذیل ہے:

چونکہ فائق تمام این مخزن
ہست مملو ز لولوئے لالا
ملہم غیب گفت تاریخش
خوش کتاب است "مخزن شعرا"

"مخزن شعرا" کے ٹکڑے سے ۱۲۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں، گویا تذکرے کا نام تاریخی ہے۔

اس تذکرے کے دو قلمی نسخے مولوی عبدالحق صاحب کے مطالعے میں رہے ہیں۔ ایک نسخہ مصنّف کے پوتے اور انھیں کے ہم نام قاضی نور الدین حسین ساکن بھڑوچ کے پاس تھا دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی میں۔ ان دونوں کی مدد سے مولوی صاحب نے اسے مرتّب کیا اور اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۳ع میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے شائع کر دیا۔ یہ مطبوعہ نسخہ بڑے کتب خانوں میں موجود ہے اور یہی پیشِ نظر ہے۔

تذکرے کی زبان فارسی ہے اور شعرا کے ناموں کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی ہے۔ اس تذکرے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق اُردو کے عام شعرا کے بجائے خاص گجرات کے شاعروں سے ہے۔ شاعروں کی تعداد ایک سو آٹھ ہے۔ شعرا کے حالاتِ زندگی بھی اکثر تذکروں کی نسبت تفصیلی ہیں اور منتخباب کلام بھی طویل ہیں۔ شروع میں کمال الدین حسین متخلص بہ کامل کی تقریظ ہے، اس کے بعد مصنف کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد شعرا کے تراجم ہیں۔ ولی کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

"ولی تخلص محمد ولی نام۔ مولدش احمد آباد و مدفنش ہم ہمان بلدۂ خجستہ بنیاد . . . خطا کرد میر تقی میر کہ در تذکرۂ خود او را از اورنگ آباد نوشت شاید برین شعر او را از دکھن خیال کرد۔"

غالباً یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں ولی کے اورنگ آبادی یا گجراتی ہونے کی باقاعدہ بحث چھیڑی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ''دکنی'' سے مراد گجراتی بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت سارا جنوبی ہند ، دکن سے موسوم تھا ۔ علاوہ ازیں یہ تذکرہ اُردو کے ایک قدیم ترین مرکز کا سراغ دیتا ہے اور اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ اُردو اور اُردو شاعری کو نہ صرف لکھنؤ اور دہلی کے نواح میں بلکہ ہر علاقے میں قبول عام حاصل رہا ہے ۔ تذکرہ احسن کے ذکر سے شروع ہو کر یعقوب کے ذکر پر ختم ہوتا ہے ۔ اس جگہ دونوں تراجم نقل کیے جاتے ہیں :

۱۔ احسن تخلص ۔ محمد حسن نجیب آبادی الاصل ۔ مد تیست کہ در سرکار نواب حسام الدین حسین خاں ملازم شدہ ۔ مردیست نجیب و کہن سال شاعر خوش کلام ، شیریں مقال از عمدہ سخن طرازانِ این حوالی می باشد بلکہ احسن شعراست کہ اکثر مضامین را باحسن الوجہ می بندد و صاحب دیوان است آنچہ اشعار ایشان در رتبۂ عالی واقع شدہ ، عالی تراند ، از این عذوبت لسان اوست کہ لب خامہ اکنون بدان آشنا می شود ۔ (ص ۱۱)

۲۔ یعقوب الموسوم بہ یعقوب علی خان خلف محمد علی خان از طائفۂ افاغنہ پدرش از بلدۂ رام پور آمد در سرکار گائیکواڑ متعلق گردیدہ بحفاظت و حراست قصبۂ دھیوی مامور شد ، وے درین نواح تولد و نشو و نما یافتہ ، بعد فوت پدرش ، والی بروده خدمتے کہ برائے والدش بود بر او مسلّم داشت در فارسی و گجراتی مہارت شائستہ دارد خصوص در موسیقی بلند آوازہ و از راقم تعارف جاری است ، من کلامہ ۔ (ص ۱۱٦)

☆ ☆ ☆

سراپا سخن

مصنّف کا نام سید محسن علی اور تخلص محسن ہے ۔ دوسری تصانیف کے علاوہ محسن سے اُردو شعرا کے دو تذکرے ایک "سراپا سخن" دوسرے "مخزن نکات" [ترجمہ] (اُردو) یادگار ہیں ۔ مخزن نکات کا ذکر اسی کتاب میں دوسری جگہ ملے گا ۔

محسن کے والد شاہ حسین حقیقت اپنے زمانے کے ممتاز بزرگ اور شاعر تھے ۔ ان کا ذکر متعدد تذکروں میں ملتا ہے ۔ محسن نے سراپا سخن میں اپنا ذکر شاعر کی حیثیت سے بھی کیا ہے اور دیباچے میں بھی اپنے حالات پر روشنی ڈالی ہے ۔ شاعر کی حیثیت سے اپنا ذکر صرف اس قدر کیا ہے :

"محسن مؤلف تذکرہ سید محسن علی ولد سید شاہ حسین حقیقت وطن بزرگوں کا خوست توابع غور پھر دہلی ، مولد و مسکن مؤلف لکھنؤ ، کم ترین تلامذۂ خواجہ وزیر اور میر علی اوسط اشک ۔"

لیکن دیباچے میں خاندانی حالات قدرے تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں ۔ گزشتہ چند برسوں میں چونکہ ان کے تفصیلی حالات منظر عام پر آ گئے ہیں[1] اس لیے اس جگہ ان کا دہرانا لا حاصل ہے ۔

دیباچے میں محسن نے سراپا سخن کا سال تصنیف ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ - ۵۳ء ظاہر کیا ہے ۔ لیکن چونکہ یہ تذکرہ خود انھیں کے بیان کے مطابق دس سال میں

۱۔ ملاحظہ ہو (الف) صحیفہ لاہور ، شمارہ ۴۲ ، ص ۲۱ تا ۴۰ ، بابت جنوری ۱۹۶۸ء (مضمون ڈاکٹر اقتدا حسن) ۔

(ب) "تذکرۂ سراپا سخن" تلخیص و ترتیب ، ڈاکٹر اقتدا حسن ، مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۷۰ء ۔

(ج) "تلخیص تذکرۂ سراپا سخن" ، مرتبہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین ، مطبوعہ نایاب بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۷ء ۔

مکمل ہوا ہے اس لیے اس کا آغاز ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ع کے قریب ہوا ہوگا۔ تذکرے کے آخر میں محسن کے علاوہ افضل الہ آبادی ، مرزا حاتم علی بیگ مہر ، مرزا علی حسین کیواں اور کئی دوسرے شاعروں کے قطعات تاریخ درج ہیں۔

محسن کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر یہ ہے :

لکھی تاریخ یہ مؤلف نے
''نغمۂ طوطیان ہند ہے یہ''

دوسرے مصرعے سے ۱۲۶۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ مسودے کے تکملے کا سال ہے لیکن اضافے اس کے بعد تک ہوتے رہے ہیں۔

''سراپا سخن'' پہلی بار سال تصنیف کے آٹھ سال بعد ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰-۶۱ع میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مطبع نول کشور لکھنؤ سے اس کے اور اڈیشن نکلے۔ ۱۲۹۲ھ اور ۱۳۱۵ھ کے مطبوعہ نسخے عام طور پر بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ع کا ایک نسخہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے کتب خانے میں بھی ہے اور یہی اس وقت میرے سامنے ہے۔ مطبوعہ نسخوں کے آخر میں سال طباعت کے متعلق محسن کے علاوہ متعدد شعرا کے قطعات تاریخ درج ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب ، ضامن علی جلال ، مظفر علی خاں اسیر ، اصغر علی خاں نسیم دہلوی اور حاتم علی بیگ مہر جیسے ممتاز اساتذہ بھی قطعہ نگاروں میں شامل ہیں۔ غالب کا یہ قعطہ بہت دنوں لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ راقم الحروف نے ''غالب کا ایک گمنام قطعہ'' کے عنوان سے ، ''افکار نو'' لاہور بابت فروری ۱۹۶۱ع میں اس کا تعارف کرایا تھا۔ چونکہ یہ قطعہ کمیاب ہے اور اس میں تاریخ طباعت بھی ایک نئے انداز سے نکالی گئی ہے اور غالب کی جدت طبع کا نمونہ پیش کرتی ہے اس لیے اُسے یہاں درج کیا جاتا ہے :

اس کتاب طرب نصاب نے جب — آب و تاب انطباع کی پائی
فکر تاریخ سال میں مجھ کو — ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو — دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا — با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم — بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو — ہے جداگانہ کارفرمائی

سات اور سات ہوتے ہیں چودہ   بہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم   جس سے چشمِ جہاں کو بینائی
اور بارہ امام ہیں بارہ   جس سے ایماں کو ہے توانائی
ان کو غالب یہ سال اچھا ہے   جو آئمہ کے ہیں تولائی

اس قطعے کے تیسرے اور چوتھے شعر میں "سراپا سخن" اولین کی سال طباعت ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ع واضح طور پر موجود ہے - ۱۹۶۷ع میں ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اشعار خارج کر کے صرف شعرا کے تراجم کے ساتھ اسے شائع کیا اور اس پر تعارفی مقدمہ بھی لکھا - قدیم مطبوعہ نسخوں میں شعرا کے ناموں کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی نہ تھی اس لیے کسی شاعر کا حال معلوم کرنے میں پوری کتاب کی ورق گردانی کرنی پڑتی تھی - مرتّب نے شعرا کے ناموں کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے کر اس خامی کو دور کر دیا ہے - ڈاکٹر سلیمان کے مرتّبہ نسخے میں ۳۳۷ شاعروں کا ذکر آیا ہے -[1]

جنوری ۱۹۷۰ع میں ڈاکٹر اقتدا حسن نے بھی اس کی تلخیص کی ہے یعنی اشعار نکال کر صرف تراجم پر مشتمل "سراپا سخن" کو اپنے مقدمہ اور اختتامیہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے - اس میں ۳۱۷ شاعروں کے تراجم بلحاظ حروف تہجی شامل ہیں -[2] ڈاکٹر اقتدا حسن اور ڈاکٹر سلیمان کے مرتّب کردہ نسخوں میں شعرا کی تعداد میں دو کا فرق یوں پڑ گیا ہے کہ ڈاکٹر سلیمان نے غلطی سے فضل علی نیاز کو میر افضل علی نثار سے اور سجاد دہلوی کو سجاد اکبر آبادی سے الگ شخصیت سمجھ لیا ہے - "سراپا سخن" کے ایک ناقص قلمی نسخے کا سراغ بھی ڈاکٹر اقتدا حسن کے مرتّبہ سراپا سخن سے لگتا ہے - یہ نسخہ ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن بارکر (مانٹریال - کینیڈا) کے پاس ہے - اس میں ۳۰۸ صفحے ہیں اور آخر کے کئی صفحات غائب ہیں - ترقیمہ بھی نہیں ہے اس لیے سال کتاب کا پتا نہیں چلتا - مرتّب "سراپا سخن" کا خیال ہے کہ یہ تذکرے کا ابتدائی نامکمل نسخہ ہے - اس نسخے

۱- ملاحظہ ہو "تلخیص تذکرۂ سراپا سخن"، مطبوعہ نایاب بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۷ع -

۲- ملاحظہ ہو "تذکرۂ سراپا سخن"، مطبوعہ اظہار سنز، لاہور ۱۹۷۰ع -

سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ محسن نے اپنے تذکرے کا نام پہلے ''سحر البیان'' رکھا تھا بعد کو ''سراپا سخن'' کر دیا ۔ ایک فرق یہ ہے کہ مخطوطے کے دیباچے میں تکملے کا سال آغاز ۱۲۶۸ھ بتایا گیا ہے جب کہ مطبوعہ نسخوں میں ''آغاز ۱۲۶۹ھ'' ہے ۔

سراپا سخن اُردو میں ہے اور اُردو فارسی کے سارے تذکروں میں عجیب و غریب تذکرہ ہے ۔ اُردو شعرا کے تذکروں میں صرف ''ارمغانِ گوکل پرشاد'' ایسا تذکرہ ہے جو ''سراپا سخن'' کا ہم رنگ اور ہم موضوع ہے ۔ ڈاکٹر سلیمان اور ڈاکٹر اقتدا میں سے کسی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ سراپا سخن کے ساتھ اس کا ذکر ضروری تھا ۔ ہم نے ارمغان کی تفصیلات و خصوصیات اسی کتاب میں الگ دے دی ہیں ۔ ''سراپا سخن'' میں شعرا کے حالات زندگی یا انتخاب کلام کو یک جا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ مصنف کا اصل مقصود سارے اعضائے جسمانی کے ردیفوں پر مختلف شعرا کی غزلوں کو جمع کرنا تھا ۔ دیباچے میں سبب تالیف کے طور پر محسن نے خود لکھا ہے کہ جس زمانے میں وہ بسلسلۂ تجارت کانپور میں مقیم تھے ان کی ملاقات شیخ الٰہی بخش عشقی سے ہوئی ۔ ایک دن ہر سبیل تذکرہ ناسخ کا یہ مصرعہ سامنے آیا ۔ ع

''جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں''

اور خیال ہوا کہ اگر اسی انداز سے سارے اعضائے جسمانی پر ناسخ کی غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان سراپا کے نام سے مرتّب کر دیا جائے ۔ لیکن ناسخ کی عمر نے وفا نہ کی اور محسن نے مختلف شعرا کے کلام کی مدد سے اس کام کو مکمل کیا ۔ اس کام میں انھیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ، ان کا اندازہ دیباچے کی ان سطور سے کیا جا سکتا ہے :

''بہر کیف ان کے (عشقی کے) پاس خاطر سے اس محنت عظیم کو گوارا کیا ، فہرست اعضا کی تیاری پر مائل و راغب ہوا . . . بعد ازاں بموجب کہ :

''عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا''

جو کوہ کنی پیش آئی . . . ایک ثمر اس کا یہ ہے کہ پندرہ تذکرے اور صدہا دواوین اور بیاضیں بڑی جستجو سے بہم پہنچائیں جب شعرائے ماضی کا کلام دستیاب ہوا اور ہر ناظم دور و دیار کی خدمت میں آپ اور احباب دل سوز سے خطوط لکھوا کر بھیجے ، حتٰی کہ چار مطبع (کذا)

اخبار میں یہ خبر چھپوائی . . . اور شعرائے معاصرین کی خدمت میں مکرر حاضر ہو کے غزلیں لایا اور جن کی کوئی غزل اس قید کی نہ تھی ان سے کہوائی بلکہ مشاعروں میں اسی طرح کی طرحیں کیں ۔ غرض کہ اس تلاش سے سات سو (سے زیادہ) شعرا کا کلام فراہم کیا ۔"

چنانچہ "سراپا سخن" میں اعضائے جسمانی سے متعلق صدہا غزلیں شامل ہیں اور سر سے لے کر پاؤں بلکہ تلووں تک کی ردیف کے ہزاروں اشعار یکجا ہو گئے ہیں ۔ اعضا کی ردیفیں بالترتیب اس طور پر آئی ہیں :

"سر ، دماغ ، بال ، چوٹی ، زلف ، کاکل ، جبیں ، ابرو ، آنکھیں ، پلکیں ، ناک ، عارض ، لب ، دندان ، زبان ، دہن ، ذقن ، کان ، کان کی لو ، منہ ، گلا ، گردن ، دوش ، ہاتھ ، بازو ، کہنیاں ، کلائی ، پہونچا ، ہتھیلیاں ، انگلیاں ، گھائیاں ، پوریں ، ناخن ، سینہ ، چھاتیاں ، بغل ، پہلو ، دل ، روح ، پیٹ ، ناف ، پشت ، کمر ، کولھے ، سرین ، رانیں ، زانو ، ساق ، پاؤں ، ایڑیاں ، تلوے ۔"

شعرا کے حالات بہت مختصر ہیں ۔ دو چار سطروں سے زیادہ کسی کے متعلق نہیں ملتیں ۔ لیکن شاعر کے نام ، تخلص ، ولدیت ، سکونت اور تلمذ کا ذکر اس میں جگہ جگہ کیا گیا ہے ۔ یہ تذکرہ دنیائے ادب میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے لاجواب ہے اور لکھنوی مذاق سخن کی پوری نمائندگی کرتا ہے ۔

تذکرہ آباد کے ذکر سے شروع ہو کر یوسف کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے ۔ آباد سترہ ردیفوں یعنی زلف ، گیسو ، جبیں ، آنکھ ، پلکیں ، عارض ، دہن ، ذقن ، دوش ، ہاتھ ، کلائی ، پہلو ، دل ، روح ، پشت ، کمر اور "پا" میں شریک ہیں اور یوسف کا ذکر صرف دو ردیفوں ، آنکھ اور پاؤں کے ساتھ ہے ۔ ہم اس جگہ دونوں کے صرف نثری تراجم بطور نمونہ نقل کر رہے ہیں ۔

آباد : مہدی حسن خاں ولد غلام جعفر خاں ۔ عزیزوں میں تجمل حسین خاں کے ۔ باشندۂ لکھنؤ ، ہر بحر میں غزل کے ان کا ایک دیوان ہے ۔ شاگرد شیخ امام بخش ناسخ ۔ (ص ۸ ہم تذکرۂ سراپا سخن) ۔

یوسف : یوسف خاں ولد رحمت خاں غوری باشندۂ لکھنؤ شاگرد خواجہ حیدر علی آتش ۔

☆ ☆ ☆

گلشنِ ہمیشہ بہار

''گلشنِ ہمیشہ بہار'' کے مصنف نصراللہ خاں خیشگی ہیں ، خورجہ کے رہنے والے تھے اور قمر تخلص کرتے تھے ۔ اپنا ذکر انھوں نے اس تذکرے میں دو جگہ کیا ہے ، ایک دیباچے میں دوسرے قمر تخلص کے تحت ۔ نصراللہ خاں خیشگی خورجوی کے والد کا نام حکیم عمر خاں اور دادا کا نام ملک داد خاں تھا ۔ فیض اللہ خاں اور نجیب اللہ خاں ، مؤلفِ گلشنِ ہمیشہ بہار کے حقیقی بھائی تھے ۔ رمق تخلص کے تحت نجیب اللہ خاں کا ذکر گلشن ہمیشہ بہار میں موجود ہے ۔ نصراللہ خاں خیشگی کا انتقال بہ عمر ۷۲ سال ۱۲۹۹ھ میں ہوا ، اس لحاظ سے ان کا سال پیدائش ۱۲۲۷ھ قرار پاتا ہے ۔ چونکہ باپ کا انتقال نصراللہ خاں کی صغر سنی میں ہو گیا تھا اس لیے ان کی تعلیم و تربیت ان کے ماموں مولوی فتح خاں کی نگرانی میں ہوئی ۔ علوم متداولہ میں مولوی چراغ علی اور مولانا احمد علی چریا کوٹی بھی ان کے استاد تھے ۔ ان دونوں استادوں کے زیرِ اثر علم و ادب سے ایسا گھرا لگاؤ پیدا ہو گیا کہ خود نصراللہ خاں کا شمار صاحبانِ کمال میں ہونے لگا ۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے بھائی مولوی علی احمد نے بھی بعض علوم کی تعلیم نصراللہ خاں سے حاصل کی تھی ۔

نصراللہ خاں عربی فارسی کے فاضل تھے اور کئی دوسری زبانیں بھی جانتے تھے ۔ سرکاری ملازم تھے اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے ۔ بسلسلۂ ملازمت ان کا قیام مختلف مقامات پر رہا۔ ۱۸۵۷ع کے ہنگامے کے بعد سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی ۔ کچھ دنوں کپورتھلہ میں رہے پھر حیدر آباد چلے گئے ۔ وہاں ان کی خاطر خواہ قدردانی ہوئی ۔ آخر عمر میں اپنے آبائی وطن خورجہ میں آ کر مقیم رہے اور وہیں وفات پائی ۔ نصراللہ کے علمی و ادبی شغف کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان سے متعدد تصانیف یادگار ہیں ۔ یہ تصانیف

اُردو ، فارسی ، عربی اور ترکی چاروں زبانوں میں ہیں ۔ ان میں زیرِ نظر تذکرہ ''گلشن ہمیشہ بہار'' اور ''تاریخ دکن'' خاص طور پر شہرت رکھتی ہیں ۔[1]

''گلشن ہمیشہ بہار'' کا صرف ایک قدیم مطبوعہ نسخہ بعض کتب خانوں میں ملتا ہے ۔ یہ پہلی بار رجب ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع میں باہتمام محمد عثمان خان خیشگی خورجوی مطبع فتح الاخبار کول سے شائع ہوا ۔ بہت کمیاب ہے ، انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں البتہ موجود ہے لیکن جیسا کہ اس کے سرورق اور خاتمے سے ظاہر ہے سال تصنیف کی صراحت کہیں نہیں کی گئی ۔ تذکرے کا نام بھی تاریخی نہیں ہے ۔ ممکن ہے اس کا تکملہ اس کے سال اشاعت یعنی ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع میں یا اس کے لگ بھگ ہوا ہو لیکن اس کا آغاز ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع سے پہلے ہو چکا تھا ۔ ذوق کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

''از منتخبات زمان و مغتنمات دوران است ۔'' (ص ۱۴۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوق کا ترجمہ ان کی وفات ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ع سے پہلے لکھا گیا ہے ۔ کتنے پہلے لکھا گیا ہے اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ ناسخ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

''در سن یک ہزار دو صد و پنجاہ و چہار (۱۲۵۴ھ) چون بالہ آباد رسیدم خبر وفاتش شنیدم تابوتش بسرزمین لکھنؤ آسود ۔'' (ص ۳۱۲)

اس کا ایک مفہوم یہ ہوتا ہے کہ الہ آباد پہنچ کر مؤلف تذکرہ نے ناسخ کے متعلق سنا کہ ان کی وفات ۱۲۵۴ھ میں ہوئی اور دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ۱۲۵۴ھ میں جب کہ مؤلف الہ آباد میں تھا اسے ناسخ متوفی

۱۔ نصراللہ خاں خیشگی کے حالات کے لیے دیکھیے :

(ا) گلشن ہمیشہ بہار ، مؤلفہٗ نصراللہ خاں خیشگی ، مطبوعہ فتح الاخبار کول ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع ، مخزونہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

(ب) ''مقدمہٗ گلشن ہمیشہ بہار'' ، مرتبہٗ ڈاکٹر اسلم فرخی ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۶۷ع ۔

(ج) تاریخ دکن از نصراللہ خاں خیشگی ، مطبوعہ مطبع نول کشور ۱۲۸۶ھ/۱۸۷۰ع ، مخزونہ کتب خانہٗ خاص انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

۱۲۵۴ھ کی خبر موصول ہوئی - پہلی صورت میں ناسخ کا ترجمہ ۱۲۵۴ھ کے بعد اور دوسری صورت میں اسی سال یعنی ۱۲۵۴ھ میں لکھا گیا - پہلی صورت ہی معنوی اعتبار سے قرین قیاس ہے - اسی طرح ممنون کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''از دودمان سیادت است . . . طرز گفتارش دل چسپ و دل نشین -''
(ص ۲۹۲)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ممنون کا ترجمہ ان کی وفات ۱۲٦۰ھ سے پہلے لکھا گیا ہے - آتش کے ترجمے سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ ان کا حال ان کے سال وفات ۱۲٦۳ھ سے قبل شامل تذکرہ کیا گیا ہے - مومن خاں متوفی ۱۲٦۸ھ/۱۸۵۲ع کے ترجمے سے بھی یہی مترشح ہے کہ جس وقت ان کا حال ترجمے میں داخل کیا گیا ہے وہ بقید حیات تھے - یعنی مومن کا ترجمہ ۱۲٦۸ھ/۱۸۵۲ع سے قبل لکھا گیا ہے - ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ نصراللہ خاں نے تذکرے کا آغاز ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع سے بہت پہلے کر دیا تھا - آغاز کا سال کونسا ہے اس کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا - تذکرے کے دیباچے میں مؤلف نے یہ ضرور لکھا ہے کہ :

''بہ عمر سی سال بتقریب سیاحت وارد قصبۂ بجنور کہ حصۂ شمالی است از مراد آباد شدہ بود کہ بمطالعۂ این ننگ بنی آدم تذکرۂ ''گلشن بے خار'' کہ از گل تراشی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ است در آمد و دل بسیر خیابانش مائل شد و ہر یک گلشن را بہ نظرِ تحقیق دید و صفایش را بہ ہزار تدقیق ملاحظہ نمود - سبحان اللہ باین ہمہ محن و مشقتِ موجد گلے کم یافت کہ بے خار باشد و روشے ندید کہ صاف از خاشاک بود پس بر عرق ریزی آن مساعی خیز رحم آمد کمر بہ تصفیہ اش بستہ و بہ گلبن ہاے بے خار و بنونہالان ہندی و فارسی دیگر گلستانے جداگانہ آراستہ کہ خار را در آن دخلے نیست و خزاں را بران تصرفے نہ - لہٰذا بہ ''گلشن ہمیشہ بہار'' نام یافت -''

اس عبارت کی روشنی میں اگر یہ مان لیا جائے کہ نصراللہ خاں نے فی الواقع تیس سال کی عمر میں تذکرے کا آغاز کیا تو ۱۲۵۷ھ اور ۱۲٦۵ھ کے قریب تذکرے کا آغاز ہونا چاہیے - اس لیے کہ نصراللہ خاں ۱۲۲۷ھ کے لگ بھگ پیدا

ہوئے ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ تیرہ سال کے عرصے میں ۱۲۵۷ھ و ۱۲۷۰ھ کے درمیان مکمل ہوا ہے ۔ انجمن ترقی اُردو کراچی نے ۱۲۶۷ھ میں اسے دوبارہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا اور یہی دستیاب ہے ۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں قدما سے لے کر ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع تک کے اُردو فارسی شعرا کا ذکر آیا ہے ۔ زیادہ تعداد اُردو شاعروں کی ہے ۔ شعرا کے تخلص حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں ۔ شعرا کے نثری تراجم مختصر اور منتخبات کلام طویل ہیں ۔ تنقیدی عنصر کم سے کم ہے ، عموماً ہر شاعر کو داد و تحسین سے نوازا گیا ہے ۔ بڑوں کے لیے زندگی کی اور چھوٹوں کے لیے کامیابی کی دعائیں کی گئی ہیں ۔ پھر بھی معاصر شعرا کے سلسلے میں یہ تذکرہ سوانحی مواد فراہم کرنے میں مدد دیتا ہے ۔[1]

جیسا کہ دیباچے میں خود نصراللہ خاں نے صراحت کر دی ہے ، انھیں ایک تازہ تذکرہ مرتّب کرنے کا خیال شیفتہ کے ''گلشن بے خار'' کے مطالعے کے بعد آیا ہے ۔ ہم اس سلسلے کی عبارت آغاز تذکرہ کی بحث میں درج کر چکے ہیں ۔ اس عبارت سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ نصراللہ خاں کو شیفتہ کی بعض باتوں سے اختلاف تھا لیکن ان کے کسی بیان سے یہ پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے اپنا تذکرہ شیفتہ کی باتوں کا جواب دینے کی غرض سے لکھا ہے ۔ اس لیے ''گلشن ہمیشہ بہار'' کو ''قطب الدین باطن'' کے ''گلستان بے خزاں'' کے انداز کا تذکرہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں ۔ باطن کا تذکرہ واقعی گلشن بے خار کا جواب ہے ۔ شیفتہ نے چونکہ باطن کے استاد نظیر آبادی کے متعلق یہ سخت رائے ظاہر کی تھی کہ :

''ان کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں ۔ ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں ۔''

اس لیے باطن نے اپنے تذکرے میں شیفتہ سے ہر طرح انتقام لیا ۔ دیباچے میں شیفتہ پر لعن طعن کی اور شیفتہ کے ساتھ ساتھ ان کے استاد اور ممدوحین کو بھی جی بھر کے برا بھلا کہا ۔ شیفتہ نے مومن اور آزردہ کی بڑی تعریفیں کی تھیں ۔ باطن نے دونوں کے کلام میں کیڑے نکالے اور آزردہ کے کلام میں اصلاحیں تک دیں ۔

۱۔ نگار سال نامہ ۱۹۶۴ع ، تذکروں کا تذکرہ نمبر ، ص ۲۴۳ ، مرتّبہ راقم الحروف ۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ باطن کا رویہ شیفتہ کے ساتھ معاندانہ اور منتقانہ تھا ۔ اس عناد و انتقام کے سبب باطن کا لب و لہجہ بعض جگہ حد درجہ پست اور غیر ادبی ہوگیا ہے ۔ نصراللہ خاں کے ''گلشن ہمیشہ بہار'' کی نوعیت باطن کے تذکرے سے بہت مختلف ہے ۔ ان کا لب و لجہہ ہر جگہ سنجیدہ اور ادیبانہ ہے ۔ شیفتہ کی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود انھوں نے شیفتہ یا ان کے احباب و استاد کو بے سبب برا بھلا نہیں کہا بلکہ ان کے علم و فضل اور کمال شاعرانہ کی منصفانہ داد دی ہے ۔ باطن نے موسن اور آزردہ کو شیفتہ سے انتقام لینے کی غرض سے گالیاں دی تھیں لیکن نصراللہ خاں خورجوی نے ان دونوں کے بارے میں بہت اچھی رائیں دی ہیں ۔ شیفتہ کے بارے میں بھی انھوں نے کوئی بات ان کے منصب سے گری ہوئی نہیں کہی ، بلکہ ان کی نکتہ سنجی اور جودتِ طبع کی دل کھول کر داد دی ہے ۔ گلشن بے خار کی تعریف کرتے کرتے یہ فقرہ

''فامّا خالی از خار نیست''

ضرور لکھ دیا ہے ۔ لیکن اس کے فوراً بعد یہ تاویل بھی کر دی ہے کہ گلشن و خار لازم و ملزوم ہیں ۔

مختصر یہ کہ رائے کی سنجیدگی اور بیان میں اعتدال کے سبب گلشن ہمیشہ بہار کے تراجم شعرا کے احوال و کمالات کے سلسلے میں ''گلستان بے خزاں'' کے مقابلے میں زیادہ صحت کے قریب اور قابل اعتماد ہیں ۔

قدیم مطبوعہ نسخے کی فہرست شعرا میں شاعروں کی تعداد ۴۲۰ ظاہر کی گئی ہے ، لیکن شیخ محمد سمیع افصح اور شاہ محمد حسن اشرف کے درمیان میں ۵۳ نمبر خالی ہے ۔ اس لحاظ سے واقعتہً اس میں صرف ۴۱۹ شاعروں کے تراجم شامل ہیں ۔ مؤلف نے تذکرے کا آغاز اپنے ماموں اسد خاں مشہور بہ فتح خاں متخلص بہ اسد کے ذکر سے کیا ہے ۔ سب سے آخر میں میر یوسف علی خاں یوسف کا ترجمہ ہے ۔ اس جگہ آزردہ اور موسن خاں موسن کے ترجمے بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں ۔

آزردہ : آزردہ تخلص صدر الدین خاں نام ، خلعت صدر الصدوریِ دہلی بر قامتش زیبا ست ۔ بالاے والایش صدر صدارت را زیب افزا ، صاحب طبع فصیح و بہ نمک قابلیت ملیح ، حق جل و علی وجودِ باجودِ او را چشمہٗ فیض

آفریده و عالمے از خوانِ احسانش مایدۂ فایده برگزیده ۔ در فصاحت و بلاغت سحبان زمان و در حکمت و معانی ارسطاطالیس دوران ، حاکمے با عدل و داد است و در فضائل و محاسن شخصے است بے مثل و آزاد ۔ اگرچہ بہ صحبتش نہ رسیدہ ام ، فاما اوصاف گرامی او را از زبان عوام و خواص بسیار از بسیار شنیده ام اعلی اللہ درجاتہ فی الدارین از فکر عالی اوست ۔''[۱]

مومن : ''مومن تخلص مومن خان مومن از دودمان گرامی و از خاندان نامی است ۔ از روز ولادت الٰی آن بسبب موافقت جہان آباد و اہل آن بہ سمتے حرکت نہ کرده و بوصل شاهدان شیرین و وصال یاران رنگین بلبان نوشین کام و زبان حلاوت آگیں نکتہ دان شیرین بیان سخنگوے بروش نیکوے ، در طب طبیبے آزموده و در ہر علم نصیبے کافی ربوده دیوانش مملو از اصناف سخن و بشهرۂ مثنویات او بہ اکناف زمن امروز جنس سخن را در بازارِ سخنوران از او رواجے و بزمرۂ عشق بازانِ این دیار عالی مزاجے است اگرچہ باو بر نہ خورده ام فاما تیر محبتش بر دل خورده ام ازوست ۔''[۲]

☆ ☆ ☆

۱۔ گلشن ہمیشہ بہار ، ص ۵۳ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۷ع ۔
۲۔ گلشن ہمیشہ بہار ، ص ۲۰۵ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۷ع ۔

نسخۂ دلکشا

''نسخۂ دلکشا'' کے مصنّف راجہ جنم جی متر ہیں - ان کے حالات زندگی قدیم تذکروں میں نظر نہیں آتے ، صرف عبدالغفور نسّاخ نے اس قدر لکھا ہے :

''ارمان تخلص راجہ جنم جی متر نبیرۂ راجہ پتمبر متر شاگرد حافظ اکرام احمد ضیغم حوالی شہر کلکتہ میں سونڑی میں رہتے ہیں - راقم سے ان سے ملاقات ہے - ان کا ایک تذکرۂ شعرائے اُردو نظر سے گزرا -''[1]

نسّاخ نے تذکرے کا نام نہیں دیا اور ملاقات کے باوجود ارمان کے متعلق کوئی مفید معلومات بہم نہیں پہنچائی - لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید نے البتہ قدرے تفصیل سے لکھا ہے :

''راجہ جنم جی متر کلکتہ کے ایک مشہور امیر خاندان کے رکن تھے اور باوجودیکہ اُردو فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی مگر اس پر بھی دونوں زبانوں کے قابل انشا پرداز اور بالخصوص شعر و سخن کے دلدادہ تھے - شعرائے ریختہ کا ایک مختصر تذکرہ جس کا نام دلکشا ہے ان سے یادگار ہے - حافظ اکرام احمد صاحب ضیغم سے مشورہ فرمایا کرتے تھے - ان کے صاحبزادے ڈاکٹر راجہ راجندر لال متر ہندوستان کے مشہور ترین محقّقِ آثار قدیمہ اور بڑے زبردست فاضل و ادیب تھے - ہندوستان میں آرکیا لوجی (فن تحقیق آثار قدیمہ) کا اتنا بڑا محقّق گزشتہ صدی میں ایسا کوئی نہیں گزرا - تبرکاً چند شعر درج کیے جاتے ہیں -''[2]

۱- ''سخن شعرا'' ، ص ۲۱ ، مطبوعہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع نول کشور لکھنؤ ، طبع اول -

۲- خمخانۂ جاوید ، ص ۲۸۲ ، جلد اول ، مطبوعہ ۱۹۰۸ع ، مخزونہ کتب خانۂ خاص ، انجمن ترقی اُردو کراچی -

جنم جی متر ارمان نے نسخۂ دلکشا میں حافظ اکرام احمد ضیغم کا ذکر اس طور کیا ہے :

''ضیغم تخلص نام اکرام احمد پیرزادے سرہندی ، باشندے رام پور کے حال کلکتے میں رہتے ہیں ۔ شاگرد میاں رافت کے ، اشعار فارسی اُردو خوب لکھتے ہیں ۔ ریختی اور ہزلیات میں مسہان تخلص ہے ۔ اکثر ملکوں میں سیاحی کی ہے اور بہت زبانوں سے واقف ہیں ۔''

لیکن اس ترجمے میں ارمان نے یہ نہیں ظاہر کیا کہ ضیغم ان کے استاد تھے ۔

ارمان نے الف کی ردیف میں بطور شاعر اپنا ذکر بھی کیا ہے لیکن دو سطر میں ، بہت مختصر ۔ ذاتی حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ۔ اصل الفاظ یہ ہیں :

''ارمان تخلص نام جنم جی متر مؤلف اس نسخے کا نبیرہ بیکنٹھ باشی راجہ پتامبر متر بہادر کلکتہ کے باشندے ۔ اگرچہ اشعار اس ہیچمدان کے اس قابل نہیں کہ شاعروں کے زمرے میں داخل ہوں ، مگر بپاسِ خاطر بعضے دوستوں کے ناچار مندرج کیے ۔'' (۲۹ اشعار)

مذکورہ بالا تراجم کے سوا ارمان کے بارے میں مزید تفصیل کسی قدیم تذکرے میں نہیں ملتی ۔ بنگال کے ایک ہندو ادیب شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے البتہ ۱۹۶۳ع میں ایک کتاب بہ عنوان ''بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات'' شائع کی ہے ۔ اس میں ارمان کے حالات زندگی اور ادبی کارنامے بھی زیر بحث آئے ہیں ۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے بیان کے مطابق نسخۂ دلکشا کے مصنّف راجہ جنم جی متر ۵۔ اکتوبر ۱۷۹۶ع میں پیدا ہوئے اور ۲۵۔ اگست ۱۸۶۹ع کو وفات پائی ۔ اس لحاظ سے وہ اسد اللہ خاں غالب کے ہم عہد اور ہم عمر ہیں ۔ ارمان کے دادا پتمبر متر ، شاہِ دہلی بہادر شاہ اول[۱] کے نواب وزیر تھے ۔ ۱۷۸۷-۸۸ع

۱۔ عہد بہادر شاہ اول از ۱۷۰۷ع تا ۱۸ فروری ۱۷۱۲ع ہوتا ہے ۔ (دیکھیے مفتاح التواریخ ص ۲۹۸ ، مؤلفہ طامس ولیم بیل ، مطبع نول کشور ، کان پور ۱۸۶۷ع ، و سلسلۃ الملوک ، مؤلفہ سرسید احمد خاں ، ص ۶۴-۶۵ ، مطبوعہ مطبع شرف المطابع دہلی ۱۸۵۲ع) ۔ [ادارہ]

میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر کلکتے واپس آئے اور وہیں ۱۸۰۶ع میں ان کا انتقال ہوا - راجا پتمبر کے اکلوتے بیٹے راجا بندرا بن متر بھی شاہ دہلی کے ملازم تھے ، جنم جی متر ارسان انھیں کے بیٹے ہیں -

ارسان کئی زبانوں میں عبور رکھتے تھے اور بنگلہ ، اُردو ، فارسی اور برج بھاشا سب میں شعر کہتے تھے - اُردو شاعری سے خصوصی لگاؤ تھا اور اُردو شعرا کے ہزاروں اشعار انھیں یاد تھے - اس زمانے کے مشہور و مقبول شاعر حافظ اکرام احمد ضیغم سے مشورۂ سخن کرتے تھے -[1] ارمان نے نسخۂ دلکشا میں اپنے اُردو اشعار بطور نمونہ دیے ہیں - ایک غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :

کام اپنا نہ کبھی تجھ سے مری جاں نکلا
تن سے جاں نکلی مگر دل کا نہ ارماں نکلا
ہو گئی آتشِ عشق و رخِ جاناں روشن
دودِ دل صورتِ کاکل ہی پریشاں نکلا
چشم پہلو نے مری چشم سے کی ہم چشمی
جو کہ خنداں نظر آتا تھا وہ گریاں نکلا
گل کو بھی صورت یوسف ترا شیدا پایا
چاک داماں تھا وہ یہ چاک گریباں نکلا
نقد جاں جس کو دیا دوست سمجھ کر میں نے
خوبیِ بخت سے دشمن وہی ارماں نکلا

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری میں ارمان کا پایہ بہت بلند نہ تھا اس لیے ان کی شہرت نہ ہو سکی - لیکن اُردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام "نسخۂ دلکشا" کی بدولت آج بھی زندہ ہے - یہ تذکرہ ارمان کے لائق بیٹے بابو راجندر لال متر کی توجہ سے محفوظ رہ گیا اور برسوں کے بعد منظرِ عام پر آ گیا ورنہ بہت ممکن تھا کہ ضائع ہو جاتا اور آج ہم ان کا نام بھی نہ جانتے -

نسخۂ دلکشا کا ایک حصہ مطبوعہ ہے اور ایک حصہ ہنوز غیر مطبوعہ -

---

۱- "بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات" ، ص ۱۶۸ تا ۱۷۶ ، مطبوعہ ہندوستانی آرٹ پریس کلکتہ ۱۹۶۳ع -

اس کے دیباچے اور قرائن سے پتا چلتا ہے کہ ''نسخۂ دلکشا'' ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ع سے لے کر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ع کے درمیان مکمل ہوا اور ۱۸۵۴ع ہی میں پریس بھیج دیا گیا۔ اس خیال کو یوں تقویت پہنچتی ہے کہ اس تذکرے میں مومن کو متوفی ظاہر کیا گیا ہے۔ مومن کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ع میں ہوا ہے۔ اس لیے ان کا ترجمہ اس کے بعد ہی لکھایا ہوگا۔ مؤلف نے خود بھی دیباچے میں لکھا ہے کہ اس میں ۱۲۶۸ھ تک کے شعرا کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ع کو تکملے کا سال ہونا چاہیے۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ:

''نسخۂ دلکشا مطبع میں تھا اور اس کا کافی حصہ چھپ چکا تھا کہ وہ (ارمان) بیمار پڑ گئے اور طباعت کا کام رک گیا۔ مطبوعہ حصہ اس انتظار میں پڑا رہا کہ ان کی صحت بحال ہو تو کتاب کا بقیہ حصہ بھی چھاپ کر اسے مکمل کر دیا جائے۔ بد قسمتی سے یہ نہ ہو سکا اور اگست ۱۸۶۹ع میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس پر ان کے صاحب زادے بابو راجندر لال متر نے مطبوعہ حصے کو جلد اول کی شکل میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب ۲۹۰ صفحات پر مشتمل ہے اور کلکتے سے ٹائپ میں چھپی ہے، مطبع کا نام یقین سے معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ شائع شدہ حصے کا جو سرورق انگریزی میں طبع ہوا (۱۸۷۰ع) اس پر گنیش پریس کا نام ملتا ہے۔''[1]

مطبوعہ حصے کے شروع میں انگریزی زبان میں ایک مختصر سا تعارف ہے جس میں لکھا ہے:

''مندرجہ ذیل صفحات ۱۸۵۴ع/۱۲۷۱ھ میں چھپے تھے۔ طویل علالت نے مصنف کو اجازت نہ دی کہ وہ اس کے آخری حصے کی طباعت کی نگرانی کر سکتے۔ پچھلے دنوں ان کی وفات ہوگئی۔ چوں کہ اب اس کام کی تکمیل کا امکان غیر یقینی ہوگیا ہے لہٰذا غیر مکمل حصہ جلد اول کے

۱- ''تحریر'' سہ ماہی، ص ۱۷۸، شمارہ ۱۰، جلد ۳ بابت اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۶۹ع دلی۔

طور پر شائع کیا جا رہا ہے ۔ پوری کتاب میں اُردو کے ۱۷۷ شاعروں اور ۲۳ شاعرات کے نام (اور مختصر حالات) اور ان کے کلام کا انتخاب ہے ۔ یہ حصہ جو (مطبوعہ شکل میں) قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اس میں ۲۸۰ شعرا کے حالات ہیں ۔"

اس عبارت کے آخر میں ۱۴۔ مارچ ۱۹۷۰ع کی تاریخ ثبت ہے ۔ مالک رام نے لکھا ہے کہ یہ تعارف ارمان کے بیٹے بابو راجندر لال متر کا لکھا ہے ۔ اس حصے کی اشاعت کے بعد اس خیال سے کہ بقیہ حصہ نہ چھپ سکے گا اور ضائع ہو جائے گا، ارمان کے بیٹے راجندر لال نے بقیہ قلمی مسودے کو گارسیں دتاسی کو پیرس بھیج دیا ۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "نسخۂ دلکشا" کے اس وقت دو حصے ہیں ۔ دونوں حصے ایک مکمل تذکرے کی صورت میں ۱۸۵۴ع میں بغرض طباعت پریس بھیجے گئے ، لیکن مؤلف کی علالت کے سبب طباعت التوا میں پڑ گئی ۔ صرف ایک حصہ ۱۸۷۰ع میں چھپ سکا ، باقی حصہ غیر مطبوعہ پڑا رہ گیا اور گارسیں کو بھیج دیا گیا ۔ چنانچہ دونوں حصے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ یورپ میں محفوظ ہیں ۔ مطبوعہ حصے کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اور غیر مطبوعہ حصے کا واحد مخطوطہ پیرس کے کتب خانۂ ملی میں محفوظ ہے ۔ دونوں حصوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مبیضے اور فوٹو سٹیٹ ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس موجود ہیں اور وہ اسے طباعت کے لیے مرتّب کر رہے ہیں ۔

جنم جی متر ارمان کے "نسخۂ دلکشا" کا اولیں سراغ مشہور فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستان کی تیسری جلد مطبوعہ ۱۸۷۰ع میں ملتا ہے ۔ دتاسی نے تیسری جلد کے دیباچے میں لکھا ہے :

"بابو جنم جی متر کا نیا تذکرہ جس کا نام "نسخۂ دلکشا" ہے عنقریب شائع ہونے والا تھا لیکن مصنّف کے بے وقت انتقال کی وجہ سے اس کی طباعت کا کام روک لیا گیا ۔ بابو صاحب مشہور فاضل راجندر لال متر کے والد تھے ۔ اس تذکرے میں ہندوستانی شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں ۱۷۷ شاعروں اور ان ۲۳ شاعرات کا حال قلم بند کیا گیا ہے جو ۱۱۷۳ھ سے شروع ہو کر ۱۲۶۸ھ تک گزرے ہیں ۔ ہر ایک کے کلام

کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔"[1]

گارسیں کی یہ عبارت "نسخۂ دلکشا" حصہ دوم غیر مطبوعہ کے بارے میں ہے۔ اس میں راقم الحروف کی گنتی کے مطابق ۱۷۷ نہیں ۲۱۰ شاعروں اور ۲۳ شاعرات کا ذکر ہے۔ مطبوعہ حصے کے متعلق گارسیں نے تیسری جلد کے ضمیمے میں لکھا ہے کہ:

"یہ کتاب کلکتے سے ۱۸۷۰ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں ۵۸۷ اُردو زبان کے لکھنے والوں کے حالات درج ہیں، کل صفحات ۲۱۰ ہیں، ہر صفحہ ۱۲ سطروں کا ہے۔"

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب مؤلفہ ۱۹۳۱ء میں کتب خانۂ دتاسی کا جائزہ لیتے ہوئے دوسرے حصے کے قلمی مسودے کے بارے میں لکھا ہے:

"نسخہ دلکشا۔ یہ کتاب بابو راجندر لال متر کے تذکرۂ شعرا کا دوسرا حصہ ہے۔ پہلا حصہ کلکتے میں ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔ ۲۱۰ صفحات ہیں جس میں ہندوستانی مصنّفین پر ۵۸۷ مضامین ہیں۔ یہ دوسرا حصہ ان شعرا سے متعلق ہے جن کے نام حرف "ک" سے شروع ہوتے ہیں۔ بہت ہی خُوش خط مخطوطہ ہے۔"[2]

قاضی عبدالودود صاحب نے "نسخۂ دلکشا" کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

"اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ گارسیں دتاسی کی غیر فانی کتاب "تاریخ ادبیات ہندوستانی" کی دو جلدیں اس سے قبل شائع ہو چکی تھیں اور آخری جلد بھی مطبع کو بھیج دی گئی تھی۔۔۔ بہرحال دتاسی نے اتنا ضرور کیا کہ بطور ضمیمہ ان تمام شعرا کی فہرست جن کا حال اس تذکرے میں ہے داخلِ کتاب کر دیے۔ یہ فہرست

۱۔ بحوالہ "بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات"، ص ۱۷۱۔

۲۔ گارساں دتاسی از ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۴۴-۴۵، مطبوعہ اعظم سٹیم پریس، حیدرآباد دکن، طبع ثانی ۱۹۴۱ء۔

ص ۳۵۵ سے ص ۳۷۶ تک پھیلی ہوئی ہے ۔ تاریخ ادبیات ہندوستانی کی آخری جلد شائع ہونے پائی تھی کہ ارمان کا انتقال ہو گیا ۔ بابو راجندر لال متر . . . نے ارمان کی دوسری جلد کا غیر مطبوعہ نسخہ دتاسی کے پاس بھیج دیا جس کا تعارف دتاسی نے اپنی کتاب کی جلد ثالث کے دیباچے میں کیا ہے ۔''[1]

ڈاکٹر آغا افتخار حسین کے بیان کے مطابق :

''تیسری جلد میں پہلے آٹھ صفحے کے پیش لفظ میں دتاسی نے لکھا ہے کہ اس اثنا میں ایک نہایت کارآمد تذکرہ موسوم بہ ''نسخہ' دلکشا'' کے دوسرے حصے کا مخطوطہ مل گیا جس میں ان شعرا کے حالات ہیں ۔ جن کے نام ''ک'' اور اس کے بعد کے حروف تہجی سے شروع ہوتے ہیں ۔ اس کے بعد دتاسی نے ان شعرا اور شاعرات کے ناموں کی فہرست دی ہے جن کا تذکرہ نسخہ' دلکشا میں کیا گیا ہے ۔''[2]

مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ :

''انھوں نے (بابو راجندر لال متر نے) غیر مطبوعہ حصے کا مسودہ دتاسی کے پاس بھیج دیا اس زمانے میں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی (فرانسیسی) زیر طبع تھی ۔ اب اس کے لیے یہ نیا مواد اپنی کتاب میں ٹھیک مقام پر شامل کرنا دشوار تھا ۔ لہذا اس نے اپنی تصنیف کی تیسری جلد کے شروع میں اس کا ذکر کیا کہ کتاب تکمیل کے مراحل میں تھی کہ بابو راجندر لال متر نے میرے پاس نسخہ' دلکشا کا دوسرا غیر مطبوعہ حصہ بھیجا ۔ پھر اسی جلد کے ضمیمے میں اس نے پہلی جلد کے شعرا کی فہرست بھی دے دی ۔''[3]

۱- ''نسخہ' دلکشا اور دتاسی'' ، مطبوعہ جدید اُردو ۱۹۴۱ع بحوالہ بنگال میں اُردو ، ص ۲۴۵ ، از وفا راشدی ، مطبوعہ حیدر آباد (سندھ) ۱۹۵۵ع ۔

۲- ''یورپ میں اُردو'' ، ص ۱۱۳ ، مطبوعہ مرکزی اُردو بورڈ ؛ لاہور اپریل ۱۹۶۸ع ۔

۳- ''تحریر'' ، ص ۱۷۹ ، مطبوعہ علمی مجلس دہلی ، بابت اکتوبر ، دسمبر ۱۹۶۹ع ۔

ان اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ نسخۂ دلکشا کا اولیں تعارف گارسیں دتاسی نے کرایا ۔ چونکہ نسخۂ دلکشا اسے بہت تاخیر سے ملا اس لیے وہ اس تعارف کو اپنی ''تاریخ ادبیات ہندوستانی'' میں مناسب جگہ پر نہ چھاپ سکا ۔ لیکن آخری جلد کے دیباچے اور اس کے ضمیمے میں نسخۂ دلکشا کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں حصوں کے متعلق ضروری تفصیلات شائع کر دیں ۔

قدیم اُردو تذکروں میں صرف عبدالغفور نسّاخ نے اتنا سراغ دیا کہ ارمان نے اُردو شعرا کا ایک تذکرہ لکھا تھا ، تذکرے کا نام نہیں بتایا ۔ بعد ازاں ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم اور قاضی عبدالودود صاحب نے گارسیں کے حوالے سے نسخۂ دلکشا کے مختصر تعارفات شائع کیے ۔ اس کے بعد شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی تصنیف ''بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات'' مطبوعہ ۱۹۶۳ع میں ارمان اور ان کی تالیفات پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی ۔ اکتوبر ۱۹۶۴ع میں راقم الحروف نے ڈاکٹر آغا افتخار حسین کا ایک مضمون ''نسخۂ دلکشا'' کی فہرست شعرا کے ساتھ شائع کیا[1] اس کے بعد ''نسخۂ دلکشا'' کے بارے میں آغا صاحب کے دو مختصر تعارفی نوٹ اور شائع ہوئے ۔[2] ۱۹۶۹ع میں مالک رام کا ایک مضمون ''نسخۂ دلکشا'' حصہ دوم یعنی خطی نسخے کے متعلق چھپا جس میں اشعار محذوف کر کے شعرا کے تراجم بھی دے دیے گئے ۔[3]

''نسخۂ دلکشا'' ایک ضخیم تذکرہ ہے اور اُردو زبان میں ہے ۔ اس کا ایک حصہ ۱۸۷۰ع میں کلکتے سے شائع ہوا ۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں ، ایک پنجاب یونی ورسٹی میں اور ایک ایشیاٹک سوسائیٹی کلکتہ میں محفوظ ہے ۔ اس مطبوعہ نسخے سے خوش خط نقل کیا ہوا مسودہ میرے سامنے ہے ۔ اس میں دو صفحے کا دیباچہ ہے ۔ اس میں حمد کے بعد مؤلف نے تذکرے کی افادیت ، سببِ تالیف اور اس کی ترتیب پر روشنی ڈالی ہے ۔ پورا دیباچہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

''حمد بے حد اس مالک ذوالجلال خداوند لایزال کو سزاوار ہے جس

۱۔ نگار پاکستان ، ص ۲۰ ، بابت اکتوبر ۱۹۶۴ع ۔
۲۔ ملاحظہ ہو مخطوطات پیرس ، ص ۲۹۰ ، مطبوعہ ترقی اُردو بورڈ کراچی اور ''یورپ میں اُردو'' ، ص ۱۱۳ ، مطبوعہ اُردو مرکز بورڈ ، لاہور ۱۹۶۱ع ۔
۳۔ تحریر ، ص ۱۷۷ ، مطبوعہ علمی مجلس ، دہلی ، بابت اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۶۹ع ۔

نے دریاے سخن کو اپنے ابرِ کرم سے گوہر معنی عطا فرمایا - اسی کے جود و فیض سے غواص طبع انسان نے اس بحر بے پایاں سے جواہرات مضامین کنارۂ لب تک لا کے مطلب دلی پایا اور طوطی خوش بیان زبان انسان کو وہ گویائی بخشی جس کے روبرو لال مرغان چمن ہوئے فانوس دل عشق منزل کو اپنی شمع ظہور کے ایک ذرۂ نور سے ایسا منور کیا کہ چودہ طبق زمین و آسمان اس پر روشن ہوئے - بیت

گھس جائے چلتے چلتے قلم سر سے تا بپا
تو بھی نہ ہووے شمۂ حمد خدا ادا

شایقان فن سخن و طالبان مضامین تازہ و کہن ناظران غزل و اشعہ فرحت انگیز و سامان رباعیات و مخمسات لطافت و ظرافت آمیز کی خدمت فیض درجت میں گزارش یہ ہے کہ یہ عاصی پُر معاصی اپنے غنچۂ دل پژمردہ کی تر و تازگی کی خاطر سیر چمنستان پر بہار دیوان ہاے اُردو فارسی میں کبھی کبھی مصروف رہا کرتا تھا اور جو ابیات و اشعار دل چسپ پاتا ان کو پارۂ کاغذ پر لکھ کر جی بہلاتا - رفتہ رفتہ چند عرصے میں ایک دفتر ہو گیا مگر جب کبھی کسی شعر کا مضمون یاد آتا اور دل شوق منزل اسی شعر کی تلاش پر مائل ہوتا تو بسبب عدمِ ترتیب اشعار کے جلد دستیاب ہوتا مشکل ہوتا - لہٰذا اس خوشہ چین خرمن مضامین کا دل نیاز آئین اس پر متوجہ ہوا کہ یہ اشعار پُر بہار مع نام و تخلص اور مختصر احوال مصنّفان خجستہ آثار کے کہ یہ بھی اعلی مطالب طالبان سخن سے ہے ، بترتیب حروف تہجی مرتّب کیے جاویں تا کہ متلاشی جلد اسے پاویں اور ان کے مذاق سے لطف اُٹھاویں اور نام اس بیاضِ رشک ریاض کا ''نسخۂ دلکشا'' رکھا -

اگرچہ انسان کی وحشت طبیعت و کدورت مزاج کے لیے عقلائے زمان و حکمائے دوران نے نوع بنوع و طرح بطرح کے قصے کہانی و افسانے بھی لکھے ہیں لیکن جب تک ان کو ابتدا سے تا انتہا نہ پڑھیے تب تک دل مضمحل کو تسکین کامل حاصل نہیں ہوتی - مگر اشعار جس کی ایک بیت کے پڑھنے سے وہ لطف فی الحال ملتا ہے اور صاحبان نازک مزاج

تفریح طلب کی خاطر عاطر میں گراں معلوم نہیں ہوتا ۔ اس قیاس پر امید ہے کہ ناظرین اس مجموعے کے بھی اپنے دل پُر ملال کو فرحت فی الحال بخشیں اور جو خطا پاویں قلم عطا سے درست فرماویں ۔

یہ تذکرہ دو ترتیب پر مرتّب ہوا : ترتیب اول میں ذکر شعرائے ہند کا ، احوال مختصر کے ساتھ اور تخلص ان کا بترتیب حروف تہجی رقم کر کے قدرے ان کے کلام دلپذیر سے مندرج کیا اور ترتیب دوم میں اشعار عورتوں کے اور وہ ابیات کہ دلچسپ ہیں مگر جن کے مصنفوں کے نام و تخلص معلوم نہ ہوئے اور ابتدائے عہد سلطان ابوالظفر جلال الدین محمد حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی (۱۱۷۳ھ) سے تا سلطنت حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ (۱۲۶۸ھ) کے شعرا کا احوال اکثر درج کیا اور ان سے متقدمین شعرا کو کم رکھا ہے اور احقر نے تیمناً و تبرکاً آغاز اس کتاب کا ساتھ اسم مبارک ایسے دو سلطنت آرا و کشور کشائے دہلی کے کیا جس سے مرتبہ اس بیاض کا دوبالا ہو گیا ۔"

یہ دیباچہ مکمل "نسخۂ دلکشا" یعنی مطبوعہ و غیر مطبوعہ سے متعلق ہے مکمل نسخے کی ترتیب کی صورت جیسا کہ خود مؤلف نے دیباچے کے آخر میں ظاہر کیا ہے ، یہ ہے کہ مؤلف نے پہلے حروف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار شعرا کے حالات لکھے ہیں اس کے بعد شاعرات کے تراجم اور وہ اشعار درج کیے ہیں جن کے مصنّفوں کے نام و تخلص معلوم نہ ہو سکے تھے ۔ مؤلف نے شعرا کے تراجم کو ترتیب اول اور شاعرات کے تراجم و اشعار کو ترتیب دوم کا نام دیا ہے ۔ راقم الحروف کے شمار کے مطابق ترتیب اول میں مہدی حسین آباد لکھنوی سے لے کر حکیم یونس تک ۷۹۱ شعرا اور ترتیب دوم میں ۲۳ شاعرات کے تراجم شامل ہیں ۔ شاعرات کے تراجم کے بعد ۱۴ متفرق اشعار اور تین رباعیاں ایسی درج کی گئی ہیں جن کے مصنّفین کے نام مؤلف کو نہیں معلوم ۔ اس طرح پورے تذکرے میں شعرا و شاعرات ملا کر تراجم کی تعداد آٹھ سو چودہ ہوتی ہے ۔

ردیف وار تراجم کے آغاز سے پہلے اور دیباچے کے بعد یہ عبارت ملتی ہے :

"آغاز کتاب کا از راہ ادب کے جو ساتھ نام حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی اور حضرت صاحبقران جناب ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ

بادشاہ غازی تخت نشین دہلی کے ہو اس کو احقر نے فخر اپنا سمجھ کر ترتیب حروف تہجی کو دخل یہاں نہ دیا اور نام نواب آصف الدولہ بہادر کا بھی بعد ذکر ممدوحین کے ثبت کیا۔''

اس کے بعد شاہ عالم آفتاب، بہادر شاہ ظفر اور آصف الدولہ آصف کے تراجم اور منتخبات ہیں۔ ان تینوں شاعروں کے نام، ان کے نام کی ردیف میں بھی آئے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ ان کے تراجم آغاز تذکرہ میں لکھے جا چکے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات مکمل نسخے یعنی مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں سے متعلق ہیں۔ صرف مطبوعہ حصے کی کیفیت یہ ہے کہ دیباچے سمیت آباد کے ذکر سے شروع ہو کر کفایت کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں تراجم بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں۔ تراجم کی تعداد ۵۸۱ ہے۔

آباد : آباد تخلص، نام مہدی حسین خان خلف حاجی محمد حسین خاں باشندے لکھنؤ کے۔ ایک دیوان چھوٹی بحروں میں لکھا ہے خواجہ آتش کے دیوان کے مقابلے میں اور ان کو تلمذ شیخ ناسخ سے ہے (۱۵ اشعار)۔

کفایت : کفایت تخلص۔ نام نواب کفایت اللہ خاں مرحوم نواب زادے رام پور کے، اکثر غزلیں ان کی گائی جاتی ہیں۔

غیر مطبوعہ حصہ جس کا واحد قلمی نسخہ پیرس کے "کتب خانۂ ملی" میں ہے نہایت خوشخط مخطوطہ ہے، اس کا فوٹو سٹیٹ ہمارے سامنے ہے۔ کلیم کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے۔ ردیف وار شعرا کے تراجم حکیم یونس کے ذکر پر ختم ہو جاتے ہیں۔ یونس کے بعد امیر خسرو کا ترجمہ ہے۔ اس جگہ ترتیب اول ختم ہو جاتی ہے اور ترتیب دوم کا آغاز ایک شاعرہ متخاص بہ آبادی سے شروع ہو کر نورن کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں ۲۱ متفرق اشعار اور تین رباعیاں درج ہیں۔ ان کے شعرا کے نام نہیں دیے گئے۔ اس غیر مطبوعہ حصے میں شعرا کی تعداد ۲۱۰ اور شاعرات کی ۲۳ ہے۔ گویا غیر مطبوعہ حصے میں تراجم کی مجموعی تعداد ۲۳۳ ہے۔ مالک رام نے اس حصے کی تلخیص یعنی اشعار محذوف کر کے صرف شعرا و شاعرات کے تراجم شائع کر دیے ہیں۔ اس حصے کا بھی پہلا اور آخری ترجمہ اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔

کلیم : ''محمد حسین بدر حاجی تجلی دہلوی ، دہ مجلس و رسالہ عروض و قافیہ وغیرہ ہندی کتابیں جن کی تصنیف ہیں - دلی میں فوت کی تھی اور وہ دور احمد شاہ کا تھا -''[۱] (۴ شعر)

نورن : ''نور جہان - میراسن (کذا) فرخ آباد کی رہنے والی -''[۲] (۳ شعر)

''نسخۂ دلکشا'' میں شعرا کے تراجم بہت مختصر ہیں - ایک دو سطریں ہر شاعر کے بارے میں لکھی گئی ہیں - ہر چند کہ مؤلف نے اس میں زیادہ تر ۱۱۷۳ھ سے لے کر ۱۲۶۸ھ تک کے شاعروں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے بہتیرے مؤلف کے ہم عصر اور اپنے عہد کے ممتاز ترین شاعر تھے ، لیکن مؤلف نے ان کے حالاتِ زندگی کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی - اپنے دور کے مشاہیر مثلاً ذوق ، غالب اور مومن کے بارے میں بھی ان کے بیانات یک دو سطری اور بہت سرسری ہیں - ان کے تراجم دیکھیے :

ذوق : ذوق تخلص نام ابراہیم المخاطب بہ خاقانی ہند - شاہجہان آباد کے اُستادوں میں سے ہیں اور حضور بادشاہ دہلی کے -

مومن : حکیم مومن خاں دہلوی نامی اُستادوں میں تھے ، فارسی شعر بھی عالی مضمون لکھتے تھے -

غالب : نواب اسد اللہ خاں بہادر المخاطب بہ مرزا نوشہ دہلوی - نواب مہتاب جنگ کے عہد میں مرشد آباد اور کلکتے میں آئے تھے - فارسی اور ریختہ شعر خوب فرماتے ہیں اور ان کے اشعار اسد تخلص کے ہمراہ بھی لکھے گئے ہیں -''

لیکن اسد تخلص کے ساتھ غالب کا ذکر اس سے بھی مختصر کیا ہے - اصل ترجمہ یہ ہے :

اسد : ''اسد تخلص نام اسد اللہ خاں غالب مشہور بہ مرزا نوشہ ، باشندے

۱- فوٹو سٹیٹ (مخطوطہ نسخۂ دلکشا حصّہ دوم مخزونہ کتب خانۂ ملی پیرس) ص ۴ ، مملوکہ ڈاکٹر وحید قریشی -

۲- فوٹو سٹیٹ (مخطوطہ نسخۂ دلکشا حصّہ دوم مخزونہ کتب خانۂ ملی پیرس) ص ۵۸ ، مملوکہ ڈاکٹر وحید قریشی -

شاہجہان آباد کے اور غالب بھی ان کا تخلص ہے ۔"

یہی کیفیت سارے تراجم کی ہے ۔ درجنوں شاعر ایسے ہیں جن کا صرف تخلص اور نام یا صرف تخلص ملتا ہے ۔ مثلاً آفاق ، اکبر ، اکرام ، اشواق ، امداد امی ، اندوہ ، انصاف ، ایمان ، بسمل ، بلھار ، بیدار ، بیمار ، بے نوا ، پنچھا ، تحسین ، تنہا ، جنوں ، جوہر ، چرکین ، حاجی ، حسینی ، خفی ، خاشاک ، دلبر ، ذوق ، راسخ ، رسائی ، رشید ، رضا ، رفیق ، رنگ ، رنگین ، رونق ، سلیمان ، شجاعت ، شادمان ، شمیم ، شوریدہ ، شوکت ، شیفتہ ، صاحب ، شہید ، صدق ، صفا ، صفدری ، صیفی ، ضمیر ، طور ، عاشق ، عاصی ، عالی ، عالی جان ، عشاق ، عشقی ، نازی ، غریب ، غواص ، فدا ، فدوی ، فقیہ ، قابل ، قاق ، قیصر ، لطف ، کمترین ، مسافر ، محشر ، محقق ، مستان ، مسیح ، نادر ، نگین ، وحشت ، ہمدم ، ہادی اور اُن کے علاوہ بھی متعدد شعرا ایسے ہیں جن کے نام سے بھی مؤلف واقف نہیں ہے ، صرف تخلص کے ساتھ ایک آدھ شعر نقل کر دیے گئے ہیں ۔

ان میں سے بہت سے شاعروں کے نام اور حالات مؤلف کو معلوم ہو سکتے تھے لیکن چونکہ اُنھوں نے نہ ذاتی کوشش اور تجسّس سے حالات فراہم کیے اور نہ اُردو شعرا کے دوسرے تذکروں سے ہی مدد لی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تذکرے کا سوانحی حصہ بہت تشنہ رہ گیا ۔ پھر بھی اس کا ایک پہلو کچھ کارآمد ہے وہ یہ کہ تراجم میں حد درجہ اختصار برتنے کے باوجود مؤلف نے کہیں کہیں اہم واقعات کے سنین کی نشان دہی کر دی ہے ۔ مثلاً

ظفر ۔ بہادر شاہ : "۱۲۴۳ھ[1] سے زینت بخش سلطنت کے ہیں ۔"

آصف ۔ آصف الدولہ : "بماہ ستمبر ۱۱۹۷ھ[2] میں رحلت فرمائی ۔"

۱۔ ۱۲۵۳ھ : بعد وفات پدر بہ تاریخ بست و ہشتم جمادی الثانی سال یک ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ ہجری (۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ع) بر تخت نشست ، ص ۳۹۴ ۔ مفتاح التواریخ ۔ [ادارہ]

۲۔ ستمبر ۱۷۹۷ع : نواب آصف الدولہ بتاریخ بست و ہشتم ماہ ربیع الاول سنہ یک ہزار و دو صد و دوازدہ ہجری . . . مطابق بست و یکم ماہ ستمبر ، ص ۳۶۵ مفتاح التواریخ ۔ [ادارہ]

اجمل شاہ محمد اجمل : "۱۱۶۹ھ[1] میں بنارس میں تھے -"

رانا فضل علی : "بعد ۱۱۹۴ھ لباس فقیری اختیار کر کے بنگالہ میں پھرتے تھے -"

سوز سید محمد میر : "۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ میں رہتے تھے -"

فدوی مرزا بھچو : "۱۱۹۴ھ میں پٹنے میں تھے -"

قدرت اللہ قدرت : "۱۱۹۶ھ میں مرشد آباد میں آ رہے تھے -"

مغموم رام جس : "۱۱۹۹ھ میں بنارس میں [آئے] تھے -"

مجذوب غلام حیدر : "۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ میں رہتے تھے -"

فرصت[2] مرزا الف بیگ : "۱۱۹۶ھ میں الہ آباد میں رہتے اور پیشہ سپاہ گری کا کرتے تھے -"

حسن میر حسن : "۱۲۰۱ھ میں وفات کی -"

آرزو سراج الدین علی خاں : "۱۱۶۹ھ میں وفات کی -"

منتخبات کلام میں متفرق اشعار کے ساتھ ساتھ بعض شعرا کی پوری غزلیں اور کہیں کہیں رباعیاں ، مخمس ، شہر آشوب ، واسوخت اور ریختی وغیرہ کے بھی نمونے دیے گئے ہیں - یہاں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے - زیادہ تر ایک دو شعر نقل کیے گئے ہیں - بہت کم ایسے شعرا ہیں جن کے منتخب اشعار کی تعداد دس سے آگے بڑھتی ہے - چند شعرا ایسے ہیں جن کے نمونۂ کلام میں

۱- الحال کہ سال یک ہزار یک صد و نود و شش ہجری ست ، بیتے چند کہ از الہ آباد فرستادۂ ایشان بہ بنارس نزد راقم آثم رسیدہ بود - دیکھیے ص ۴۰ ، گلزار ابراہیم مع تذکرۂ گلشن ہند - [ادارہ]

۲- فرحت الہ آبادی مرزا الف بیگ مشارٌالیہ جوانے ست فہمیدہ بہ سپاہ گری معاش می کند - الحال کہ ۱۱۹۶ ہجری است اشعار خود را از الہ آباد در بنارس بہ راقم حقیر فرستادہ - ص ۱۸۸ - گلزار ابراہیم مع گلشن ہند - [ادارہ]

پچیس تیس اشعار یا اس سے زاید دیے گئے ہیں، لیکن اشعار کے انتخاب میں مؤلف نے خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے - عموماً اچھے اشعار منتخب کیے گئے ہیں - جیسا کہ خود مؤلف نے دیباچے میں بیان کیا ہے، انھیں دراصل انتخاب اشعار کا شوق تھا اور وہ اپنے پسند کے اشعار برسوں سے جمع کر رہے تھے - آخر میں انھوں نے شعرا کے مختصر حالات شامل کر کے اسے تذکرے کی شکل دے دی -

☆ ☆ ☆

منتخب التذکرہ

جنم جی متر ارمان کا یہ دوسرا تذکرہ ہے - ارمان کے حالات زندگی نسخۂ دلکشا کے ذکر میں لکھے جا چکے ہیں -

اس تذکرے کا سراغ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی کتاب "بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات" میں دیا ہے، سالِ تاریخ پر روشنی نہیں ڈالی - چونکہ نسخۂ دلکشا میں کہیں اس کا ذکر نہیں آیا اور جنم جی متر نے اپنے حالات میں بھی اس طرف اشارہ نہیں کیا، اس لیے ہو سکتا ہے یہ "نسخۂ دلکشا" مؤلفہ ۱۸۵۴ء کے بعد کی تالیف ہو - لیکن میرا خیال ہے کہ یہ الگ کوئی تذکرہ نہیں ہے بلکہ "نسخۂ دلکشا" ہی کا کوئی دوسرا مسودہ ہے - اس خیال کی وجہ آگے بیان ہوگی -

منتخب التذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور ارمان کے پرپوتے شری دلیپ کمار متر (کلکتہ) کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے -

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اس تذکرے کی مختصر تفصیل شائع کر دی ہے اور یہی تفصیل اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر ہے - منتخب التذکرہ کے سلسلے میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ لکھتے ہیں کہ :

> "دلیپ کمار متر کے یہاں نسخۂ دلکشا کی کئی جلدوں کے علاوہ جو سب سے قیمتی چیز ہے وہ ہے ارمان کا قلمی تذکرہ "منتخب التذکرہ" یعنی ریختہ گویانِ ہند ہے . . . -"[1]

اس قلمی تذکرے کا سائز ۶" × ۹" (انچ) ہے، کاغذ کا رنگ آسمانی اور جملہ صفحات ۱۶۲ ہیں - اس کے علاوہ کئی صفحات ایسے ہیں جن میں دیگر کاغذ کے ٹکڑوں میں غزلیں لکھ کر ان صفحات کے ساتھ چسپاں

۱- "بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات"، ص ۱۶۹ -

کر دی گئی ہیں ۔ یہ ٹکڑے سفید رنگ کے ہیں ۔ اس قلمی تذکرے میں ۳۳۳ شعرائے اُردو کا حال مع نمونۂ کلام شامل ہے ۔''[۱]

ارمان کے تذکرہ ''نسخۂ دلکشا'' سے یہ پتا نہیں چلتا کہ شعرا کے حالات کی فراہمی میں کن ماخذوں سے مدد لی گئی ہے ۔ لیکن بقول شانتی رنجن ''منتخب التذکرہ'' کے دیباچے میں مؤلف نے خود بیان کیا ہے کہ :

''تذکرۂ مصحفی اور تذکرۂ فتح علی حسینی اور تذکرۂ میر حسن اور دیوان جہاں اور دیگر دواوین جو کہ دستیاب ہوئے ہیں ان سے شاعروں کے نام اور احوال اور غزلیات و رباعیات و منفردات و مخمسات جسے دلچسپ پایا اسے چن لیا اور پھیکے شعروں کو نکال ڈالا تا کہ اس نسخے کے ہر صفحے میں ایک گلِ تازہ شگفتہ ہووے اور تمام غزل یا مخمس پڑھنے کا دردِ سر نہ اٹھاویں ۔''

تذکرے میں کس عہد کے شاعروں کا ذکر ہے اور اس ذکر کی کیا نوعیت ہے ، اس کا جواب بھی دیباچے میں مؤلف نے اس طور پر دیا ہے :

''منتخب التذکرہ یعنی ریختہ گوئے ہند کے شاعروں کا نام بقید حروف تہجی کے اور ان کی غزلیات و رباعیات و فردیات و مخمسات جس میں شہد و شکر بھرا پایا ، قدرے چن کر لکھا فردوس آرام گاہ سے تا زمان حال ۔''

جنم جی متر ارمان ، غالب و شیفتہ کے ہم عصر ہیں ، اس لیے ''تا زمانِ حال'' کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ منتخب التذکرہ میں ارمان کے سال وفات ۱۸۶۹ع تک کے شعرا کا ذکر آیا ہے ۔ یہ تذکرہ انعام اللہ خاں یقین کے ذکر پر ختم ہوتا ہے اور آخری صفحے میں ان کے یہ اشعار ملتے ہیں :

مت خدا کے واسطے کر دلبراں سے اختلاط

کفر ہے حق میں مسلماں کے بتاں سے اختلاط

۱- ''بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات'' ، ص ۱۷۶ ۔

خال گورے مونہہ کا لیتا ہے میرا دل چرا
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پھرتے ہیں چور
ہاتھ مت پھیلا کہ اے پیاری کہ نازک قد ترا
بوجھ میں پھولوں کے جاتا ہے لچک، جوں شاخِ گل
تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت
نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانہ سے کیا نسبت
ارے دل دلبروں سے مت توقع رکھ ترحم کی
لہو پیتے ہیں جو شخص ان کو غم کھانے سے کیا نسبت
گرا میں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا
مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا
کسی کا تو کبھی راکھا کرو دل تم کو لازم ہے
وگرنہ دل رباؤں کا لقب دل دار کیوں ہوتا
وصل میں بھی دردمندوں کو نہیں راحت ذرا
دیکھ لیجے شمع کے جلنے سے پروانے کا حال
نہ رکھیو یار سے ہرگز توقع مہربانی کی
یقیں اس قوم میں ہم نے نہیں دیکھا وفا مطلق
باغباں در کو بند کر کہ دگر
ہم کہاں تم کہاں بہار کہاں
مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
جی ہی آخر لے کے چھوڑے گی یہ بیاری مجھے
کب ہوس ہے مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کریں
کھینچے لے جاتی ہے اُس کوچے میں لاچاری مجھے
دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے
نہ رکھ اے دل تو اُمیدِ وفا ان بیوفاؤں سے
خدا سے ہے وہ بیگانہ جو بُت کو آشنا سمجھے
بڑھاپے میں یقیں کی جامِ مے سے دست گیری کر
شرابِ کہنہ ہے اس دورِ پیری کی دوا ساقی

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں
کہ میرے بے مزا کہنے میں کچھ مزا بھی ہے

یوں دیا خوباں کی خاطر خانماں اپنا بہا
ایسی آنکھوں کی یقیں کیوں کر نہ تحسیں کیجیے

یہ آرزو ہے مجھے دورِ چرخ سے پسِ مرگ
کہ میری خاک خمِ مے ہو جامِ صہبا ہو

شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں
بندوں کے تئیں خدا کی شکایت روا نہیں

ناداں ہے جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاوے[1]
لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہے تصویریں

یہ سب اشعار اس ترتیب کے ساتھ ''نسخۂ دلکشا'' میں بھی یقین کے ترجمے میں موجود ہیں ۔[2] نسخۂ دلکشا میں یقین کا جو انتخاب کلام دیا ہے اس میں سب سے پہلے اس غزل کے :

سریرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

پانچ شعر ہیں ۔ بعد ازاں اس غزل کے :

اگرچہ عشق میں آفت بھی ہے بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

چار اشعار ہیں ۔ اس کے بعد ایک غزل کے تین اور ایک کے دو شعر ہیں ۔ آخر میں ''فرد'' کے عنوان سے متفرق اشعار ہیں ۔ آخر کے اشعار وہی ہیں جو ''منتخب التذکرہ'' کے آخری صفحے میں ملتے ہیں ۔ دونوں تذکروں میں اشعار کی ترتیب بھی یکساں ہے ۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ منتخب التذکرہ نسخۂ دلکشا ہی کے انتخاب کا مبیضہ ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ ارمان نے ''نسخۂ دلکشا'' کو

۱۔ یہ مصرع شانتی بھٹا چاریہ کے دیے ہوئے صفحے میں نہیں ہے ، میں نے نسخۂ دلکشا کے انتخاب سے شعر مکمل کر دیا ہے ۔

۲۔ فوٹو سٹیٹ ، ص ۳۵ (قلمی مخطوطہ نسخۂ دلکشا حصہ دوم) ۔

قدرے مختصر کرنے کے لیے اس کا ایک انتخاب تیار کیا ہو اور اس لیے اس کا نام منتخب التذکرہ رکھا ہو ۔ میرے لیے وثوق سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ "منتخب التذکرہ" صرف انتخاب اشعار کی حیثیت رکھتا ہے یا اس میں شعرا کے متعلق نثری تراجم بھی شامل ہیں ۔ کیا اچھا ہو کہ شانتی رنجن بھٹا چاریہ یا اور کوئی صاحب جن کی نظر سے "منتخب التذکرہ" کا مخطوطہ گزرا ہو اس کی تفصیل شائع کر دیں تاکہ ادبی تاریخ کے سلسلے کی یہ کڑی بھی ادب کے طالب علموں سے پوشیدہ نہ رہے اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے ارمان کی قدر و قیمت متعین کرنے میں آسانی ہو جائے ۔

☆ ☆ ☆

گلستانِ سخن

''گلستان سخن'' مرزا قادر بخش صابر دہلوی کی تالیف ہے۔ صابر کے مختصر حالات عبد الغفور نسّاخ کے ''سخن شعرا''، اشپرنگر کے ''یادگار شعرا''، سید علی حسن خان کے ''بزم سخن''، سید نورالحسن خان کے ''طور کلیم''، قطب الدین باطن کے ''گلستان بے خزاں'' گارسین دتاسی کی ''تاریخ ادب ہندوستانی''، کریم الدین و فیلن کے ''طبقات الشعرا'' اور لالہ سری رام کے ''خمخانۂ جاوید'' میں ملتے ہیں۔ صابر کے دیوان ''ریاض صابر'' کے مرتّب سید محمد سلطان عاقل دہلوی اور گلستان سخن کے مرتّب خلیل الرحمٰن داؤدی نے بھی صابر کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ خود صابر نے بھی اپنا ذکر گلستان سخن میں دو جگہ کیا ہے؛ ایک دیباچے میں، دوسرے شاعر کی حیثیت سے اپنے ترجمے میں۔ ان سارے ماخذوں کی مدد سے صابر کے متعلق جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ صرف اس قدر ہیں کہ مرزا قادر بخش خلف مرزا مکرم بخت بہادر ۱۲۲۳ھ میں بمقام شاہجہان آباد پیدا ہوئے، شعر و سخن میں پہلے حافظ عبد الرحمٰن خاں احسان کے شاگرد ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد امام بخش صہبائی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ غدر تک دہلی میں مقیم رہے۔ آخرکار پریشان ہو کر بنارس چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۲۹۹ھ میں ۷۶ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ عاقل دہلوی نے ''محمد قادر بخش'' سے ۱۲۹۹ھ برآمد کیے۔ گویا ان کا نام ان کی تاریخِ وفات تھا۔ صابر سے دو ہی چیزیں ادب میں یادگار ہیں؛ ایک ان کا دیوان ''ریاضِ صابر'' دوسرے ''تذکرۂ گلستانِ سخن''۔ اس وقت گلستان سخن ہی ہمارے زیر بحث ہے۔

بعض لوگوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ گلستان سخن مرزا قادر بخش صابر کی نہیں بلکہ حقیقۃً ان کے استاد امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔

چنانچہ قاضی عبدالودود صاحب نے گلستانِ سخن کے سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''گلستان سخن جس کا ایک نام آثار المعاصرین بھی ہے، شعبان ۱۲۷۰ھ میں شروع ہو کر شوال ۱۲۷۱ھ میں تمام اور اسی سال منطبع ہوا۔ سرورق پر قادر بخش صابر کا نام بہ حیثیت مصنّف درج ہے لیکن اس کے بعد یہ مرقوم ہے کہ اس کے عبارات صہبائی کی اصلاح سے مزین ہیں۔ غالب ۱۲۸۲ھ کے ایک خط میں ذکا کو لکھتے ہیں ''آپ مرزا صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں۔ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد کہیں نظر نہیں آتا'' (اُردوے معلّٰی، ص ۲۸) لیکن ایک قدیم تر خط میں شفیق کو لکھ چکے ہیں کہ ''صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کرتا ہوں'' (ص ۲۲۱) نساخ اور سری رام اسے صہبائی کی تصنیف بتاتے ہیں اور قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ غالب کے قول پر مبنی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مقدمے کے مطالب علمی اور تذکرے کی عبارت صہبائی کی ہے اور شعرا کے حالات اور اشعار دونوں نے جمع کیے ہیں۔''[1]

لیکن مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی رائے اس کے برعکس ہے۔ انہوں نے گلستانِ سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ در اصل تذکرے کے مصنّف امام بخش صہبائی ہیں۔ اس قسم رائیں حسنِ ظن اور صاف دلی سے بعید اور پچھلے بزرگوں پر بغیر کسی دستاویزی شہادت کے سخت نکتہ چینی کا موجب ہیں، اس لیے میں اس کے ماننے پر آمادہ نہیں ہوں۔''[2]

عرشی صاحب کے جواب میں قاضی عبدالودود صاحب نے ''جہان غالب'' ہی کے سلسلے میں لکھا ہے:

''اگر دستاویزی شہادت سے صابر یا صہبائی کا اقرار نامہ مراد ہے تو

۱۔ ''جہانِ غالب''، از قاضی عبدالودود، مشمولہ معاصر نمبر ۴، ص ۷، بابت دسمبر ۱۹۵۳ع۔

۲۔ مقدمہ دستور الفصاحت، ص ۱۰۳، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع۔

یہ واقعی موجود نہیں۔ لیکن غالب گلستانِ سخن کو صہبائی ہی کی تصنیف سمجھتے تھے اور نسّاخ (سخن شعرا ، ص ۲۷۲) اور سری رام دیباچہ خم خانۂ جاوید ، جلد دوم کی بھی یہی رائے ہے۔''[۱]

میری نظر سے جب یہ دونوں تحریریں گزریں تو میں نے دونوں کے بیانات کا اپنے مطالعے کی روشنی میں جائزہ لیا اور خود کو قاضی صاحب کے بجائے عرشی صاحب کے خیال سے متفق پایا۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر (نگار ، سالنامہ ۱۹۶۴ع) میں چونکہ راقم الحروف کا اصل مقصود صرف قدیم تذکروں کا مختصر تعارف کرانا تھا ، اس لیے وہاں بحث سے قطع نظر کر کے میں نے صرف یہ رائے ظاہر کر دی تھی کہ قاضی صاحب کے مؤقف سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ گلستان سخن صہبائی کی نہیں ، در اصل مرزا قادر بخش صابر ہی کی تصنیف ہے۔ یہ بات میں نے حسب ذیل وجوہ کی بنا پر کہی تھی۔

(۱) گلستان سخن کی اشاعت اول کے سرورق پر تو خیر اتنا لکھا ہی ہے کہ . . . ''صہبائی کی اصلاح سے مزیّن ہے'' لیکن تذکرے کے اندر دیباچے اور خاتمے میں دونوں جگہ صابر نے صہبائی کی رہنمائی کا ذکر کیا ہے۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''جناب افادات مآب مولوی امام بخش صہبائی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پیش نہاد کو عرض کیا اور مکرر معروض ہوا کہ سرانجام اس امرِ دشوار کا کم استعداد سے معلوم۔ اگر کمترین تلامذہ کی تحریر خلعتِ اصلاح سے مشرّف ہو جایا کرے تو یہ مشکل آسان ہو جاوے . . . بارے عرض نیاز شعار کی زیورِ قبول سے آراستہ ہوئی اور حلیۂ اجابت سے پیراستہ۔''

''شفقت استاد پر نازاں ہوں کہ ہر چند رفتار قلم سعیِ فکر سے شتاب رو تر تھی اور شب و روز کی محنت اور شام و سحر کی کوشش سے جزو کے جزو فراہم ہو کر اس شاگرد نواز کی نگاہِ عاطفت سے کمال تدقیقِ نظر اور تعمّقِ فکر کے ساتھ گزرتے تھے۔ لیکن اس تحملِ مشقت پر

۱۔ دلی کالج اُردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر) مطبوعہ ۱۹۵۳ع دہلی۔

جبین میں چیں اور ابرو میں شکنج کا نام نہ تھا اور اب تک جمّازۂ قلم کی سیر لا ینقطع ہے ۔ عالم الغیب آگاہ ہے کہ اس دشتِ ناپیدا کنار کی نہایت کب نظر آوے اور اس بحر ذخّار کا ساحل کب پایا جاوے ۔ شفقتِ شاگرد پروری سے امید ہے کہ اس شاہدِ دل ربا کا قامت حلیۂ اصلاح سے ایسا آراستہ ہو کہ نازک نہالانِ چمنِ حسن اس کی غیرت سے برگ خزاں سے پژمردہ تر ہو جاویں اور شمع رویانِ نرم جمال اس کے رشک سے نقابِ خجالت میں منہ چھپاویں ۔''[1]

صابر کی یہ امید پوری ہوئی ۔ خاتمے پر جہاں انھوں نے اپنے استاد صہبائی اور دوسرے معاونین کا شکریہ ادا کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ :

''جناب مستطاب استادی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے آفتاب کی فروغ بخشی کا تو کیا بیان . . . شاہدان عبارت کو اس طرح زیورِ اصلاح سے آرائش دی کہ ان دلرباؤں کی گردن و گوش کا جلوہ اس پیرایہ و حلل کے پردے میں نظر تامل سے روپوش ہو گیا ہے ، گویا ایک سایہ تھا کہ ہجوم انوار میں محو ہو گیا ۔''[2]

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ صابر نے صہبائی کے فیضان کا واشگاف اعتراف کیا ہے اور اس حد تک اعتراف کیا ہے کہ ان کی اصلاح و تزئین کی بدولت گلستان سخن کے تراجم کا حلیہ ہی بدل گیا ۔ ایسی صورت میں اگر شاگرد کی کتاب پر استاد کا رنگ جھلکتا نظر آئے تو اسے مؤلف کی بد دیانتی یا سرقہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ۔ صہبائی نے صرف عبارت کی اصلاح و آرائش نہیں کی بلکہ مباحث میں انھوں نے خاصے اضافے کیے ہیں ۔ لیکن یہ سب کچھ انھوں نے یہ سمجھ کر کیا کہ ایک شاگرد کے لیے کر رہے ہیں اور اشاعت کے بعد یہ سب کچھ صہبائی کا نہیں صابر کا ہوگا ۔ صابر نے تو صہبائی کے فیضان کا جگہ جگہ کھل کر اعتراف کیا ہے ۔ لیکن ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک دو نہیں بہت سی

---

۱ ۔ دیباچہ گلستانِ سخن ، ص ۲۷ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ع جلد اول ۔

۲ ۔ ''گلستان سخن'' ، جلد دوم ، ص ۵۱۳ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔

کتابیں اور بہت سے مقالات ایسے بھی ہیں جن کی تالیف و تصنیف میں اگرچہ دوسروں کا ہاتھ ہے لیکن یہ مقالات اور کتابیں جن کے نام سے چھپ گئی ہیں انھی کی تصنیف کہلاتی ہیں ۔ ایسی صورت میں صابر کی تالیف کو جس میں انھوں نے اپنے استاد کی رہنمائی و اصلاح کا بالاعلان اعتراف کیا ہے اور ان کی دین کو تسلیم کیا ہے ، کیوں کر صہبائی کی تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ایسا خیال کرنا صابر کے ساتھ زیادتی ہے ۔ سارے محققین کو اس پر اتفاق ہے کہ تذکرے کا اصل کام یعنی شعر کے تراجم و اشعار کی فراہمی اور ان کی ترتیب و تدوین کا ابتدائی کام صابر نے کیا ہے ۔ مسودے کی اصلاح البتہ صہبائی نے کی ہے اور یہ اصلاح و آرائش اس نوعیت کی ہے کہ خود صابر کے لفظوں میں اس تذکرے کا رتبہ بہت بلند ہوگیا ہے ۔

(۲) گلستانِ سخن صرف یہی نہیں کہ صہبائی کی رہنمائی میں لکھا گیا بلکہ صہبائی کی زندگی ہی میں ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ع میں شائع بھی ہو گیا ۔ اگر صہبائی اسے اپنی تصنیف سمجھتے تھے تو انھوں نے زبانی یا تحریری کسی جگہ اس کا دعویٰ کیوں نہیں کیا اور اسے صابر کے نام سے کیوں شائع ہونے دیا ۔

(۳) تذکرہ نگاروں میں صرف عبدالغفور نسّاخ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ :

> ''تذکرۂ گلستان سخن ان (صابر) کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرۂ مذکور مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے ۔''

نساخ نے اپنا تذکرہ ۱۲۸۱ھ میں لکھا اور ۱۲۹۱ھ میں شائع کیا ۔ گویا صابر کے تذکرے کے دس سال بعد ''سخن شعرا'' لکھا گیا اور بیس سال بعد منظر عام پر آیا اس لیے اسے معاصر تذکرہ نہیں کہا جا سکتا ۔ سراپا سخن مؤلفہ ۱۲۶۹ھ ، یادگار شعرا مؤلفہ ۱۲۶۹ھ ، گلشن ہمیشہ بہار مؤلفہ ۱۲۷۱ھ ، خوش معرکۂ زیبا مؤلفہ ۱۲۶۲ھ ، طبقات الشعرا مؤلفہ ۱۲۶۳ھ اور گلستان بے خزاں مؤلفہ ۱۲۶۱ھ وغیرہ ضرور معاصر تذکروں کے زمرے میں لا سکتے ہیں ۔ اگر ان میں سے کسی میں یہ شہادت ملتی کہ ''گلستان سخن'' صابر کی ، نہیں صہبائی کی تصنیف ہے تو نسّاخ کے بیان کو وزن دیا جا سکتا تھا ۔

(۴) غالب کے بیانات سے کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ غالب ''گلستان سخن'' کو صہبائی کی تصنیف سمجھتے ہیں ۔ ذکا اور شفق کے نام خطوط کے جو حوالے

دیے گئے ہیں ان کی اصل عبارت دیکھیے ۔ غالب نواب انوار الدولہ شفق کو لکھتے ہیں کہ :

''صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد میری ملک میں سے میرے پاس تھی وہ اپنی طرف سے بہ سبیل ارمغان آپ کو بھیجتا ہوں ۔ نذر قبول ہو ۔''[1]

اس خط پر اگرچہ کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن مجلس ترقی ادب کے مطبوعہ نسخے کے مرتّب سید مرتضیٰ حسین فاضل نے اسے ۱۸۵۶ع کا مکتوبہ بتایا ہے ۔ ایک دوسرے خط میں جو کہ حبیب اللہ خاں ذکا کے نام ہے ، غالب نے لکھا ہے :

''آپ مرزا صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں ۔ اس کا یہ حال ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا ۔ اب ایک مجلّد اس کا کہیں نظر نہیں آتا ۔''[2]

اس خط پر غالب کے ہاتھ کی تاریخ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ مطابق مئی ۱۸۶۶ع دی ہوئی ہے ۔ ان بیانات سے قاضی عبدالودود صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ :

''غالب گلستانِ سخن کو صہبائی ہی کی تصنیف سمجھتے تھے''

حیرت انگیز ہے ۔ اُردوے معلیٰ ، جلد اول و دوم ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور کے فاضل مرتّب مرتضیٰ حسین فاضل صاحب نے بھی بغیر تحقیقِ مزید غالب کے مکتوب کے سلسلے میں حاشیے پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ :

''صہبائی کے تذکرے سے مراد ہے ''گلستان سخن'' ۔ اکثر محققینِ حال اور معاصرینِ صہبائی و صابر کے خیال میں گلستان سخن صہبائی کی تالیف ہے ۔''[3]

خدا جانے وہ کون سے آثار و قرائن ہیں جن کی بنا پر ''صہبائی'' کے تذکرے سے مراد ''گلستانِ سخن'' لی جا رہی ہے ۔ اگر غالب ''گلستان سخن'' کو واقعی

۱۔ اُردوے معلیٰ ، جلد دوم ، ص ۵۷۲ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۹ع ۔

۲۔ اُردوے معلیٰ ، جلد اول ، ص ۱۰۷ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۹ع ۔

۳۔ اُردوے معلیٰ ، جلد دوم حاشیہ ، ص ۵۷ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۹ع ۔

صہبائی کی تالیف سمجھتے تو وہ ذکا کے خط میں ''صابر'' کا نام کیوں لیتے ۔ ان کی افتاد طبع ایسی تھی کہ ذکا کو صاف لکھ دیتے کہ صابر کا کوئی تذکرہ نہیں ہے ، آپ جسے صابر کا تذکرہ سمجھتے ہیں وہ دراصل صہبائی کا ہے ۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے ۔ صہبائی اور صابر دونوں تذکرہ نگار ہیں ۔ صہبائی کا ''انتخاب دواوین'' اور صابر کا ''گلستانِ سخن'' دونوں دلی میں لکھے گئے ہیں ۔ دونوں سے غالب بے خبر نہ تھے ۔ چنانچہ پہلے خط میں ''صہبائی'' کے تذکرے سے غالب کی مراد ''انتخاب دواوین'' ہے اور دوسرے خط میں ''صابر'' کے تذکرے سے ''گلستانِ سخن'' مراد ہے ۔ غالب کے بیانات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے کسی قسم کا مغالطہ پیدا ہو سکے اس لیے غالب کے خطوط کو بنیاد بنا کر یہ رائے ظاہر کرنا کہ غالب ''گلستان سخن'' کو صہبائی کی تالیف سمجھتے تھے ، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ :

''دوسری شہادت غالب کی ہو سکتی ہے ۔ لیکن ان کے بیانات متضاد ہیں ۔ ایک خط میں وہ ذکا کو لکھتے ہوئے گلستان سخن کو صابر کا تذکرہ قرار دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے انھوں نے شفق کو جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں کہ ''صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کرتا ہوں ۔'' معلوم نہیں اس مقام پر اس سے مراد گلستان سخن ہے یا صہبائی کے انتخابِ دواوین کا ذکر کر رہے ہیں جو خود ایک تذکرے کی حیثیت رکھتا ہے ۔''[1]

لالہ سری رام کا کہنا ہے کہ :

''ہاں گلستان سخن ، گلشن بے خار اس سے مستثنیٰ ہیں ۔ یہ دونوں تذکرے مجھے پسند آئے اور دل سے پسند آئے ۔ ارکان تذکرہ نویسی سے مالا مال محققانہ پابندی سے اپنے مدونوں کا کمال دکھا رہے تھے ۔ لیکن گلستان سخن نے جس کی تدوین مولانا امام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے دہلی سے چھپوایا ، دہلی سے آگے قدم بڑھانے کو عار

۱۔ اُردوے معلیٰ ، جلد اول ، ص ۱۴ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۹ع ۔

سمجھا - لفظ صابر کی رعایت سے اس نے شاہجہانی شہر پناہ کے اندر زمین کو زمین اور اس کے اوپر کے آسمان کو آسمان جانا - صرف سروقدان دہلی سے کام رکھا - باہر کے لہلہاتے ہوئے شمشادوں کو وہیں کا وہیں کھڑا رکھا -''[1]

اس کے متعلق یہ نہ بھولنا چاہیے کہ سری رام بہت بعد کے تذکرہ نگار ہیں - انھوں نے ۱۸۹۱ع سے مواد جمع کرنے کا کام شروع کیا تھا اور اس کی پہلی جلد ۱۹۰۸ع میں شائع ہوئی تھی ، باقی جلدیں بعد کو شائع ہوئیں - لالہ سری رام نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس بنا پر گلستانِ سخن کو صہبائی کی تصنیف سمجھتے ہیں - گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے نسّاخ کے بیان پر کلیتہً اعتماد کرکے ایسا لکھا ہے - اس لحاظ سے سری رام کا بیان محض تقلیدی یا اضافی ہو جاتا ہے اور اس سے اس مسئلے کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی اس لیے اسے دلیل مزید کے طور پر پیش کرنا مناسب نہیں -

(٦) باقی رہ گیا شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین کے نواسے شاہ بہاؤ الدین بشیر کا بیان کہ :

''گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر کے نام سے مشہور ہے ، مگر حقیقت میں ان کے استاد مولوی امام بخش صہبائی جنت ماوائی کی تصنیف ہے -''[2]

بشیر کی عبارت ظاہر کرتی ہے کہ ان کا بیان نسّاخ ہی سے ماخوذ ہے - نساخ کا قول پچھلی سطور میں نقل ہو چکا ہے - بشیر کی عبارت کے ساتھ پھر دیکھتے چلیے :

''تذکرۂ گلستان سخن ان (صابر) کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرۂ مذکور مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے -''

دونوں کے بیانات لفظاً و معناً ایک ہیں - یہ دونوں ہم عصر سہی لیکن ان

۱- دیباچہ خمخانۂ جاوید ، جلد اول ، ص ۲۹ مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی -

۲- بحوالۂ مقدمۂ ''گلستان سخن'' از ڈاکٹر وحید قریشی ، ص ۴۰ ، جلد اول مطبوعہ لاہور -

میں سے کوئی بھی صابر کا معاصر کہلانے کا مستحق نہیں ہے، اس لیے کہ دونوں بلحاظ عمر صابر سے بہت چھوٹے ہیں اور ان کے تذکرے گلستانِ سخن کی اشاعت کے بہت بعد منظر پر آئے ہیں -

خصوصاً بشیر نے اپنا تذکرہ نسّاخ کے سخن شعرا مؤلفہ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ع مطبوعہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع کے بہت بعد مرتّب کیا ہے - ہرچند کہ بشیر کے تذکرے کا کوئی مکمل مسودہ مرتّب صورت میں اب تک دستیاب نہیں ہوا، بایں ہمہ اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا - اس لیے کہ وہ ''سخن شعرا'' ہی کے ایک مطبوعہ نسخے کے حاشیوں پر محفوظ ہے -[1] خواجہ مشفق صاحب نے بکمال محنت اس کا مبیضہ تیار کر لیا ہے اور ''تذکرۂ بشیر'' کے نام سے بغرض طباعت مرتّب کر رہے ہیں - اس تذکرے کا اولین تعارف بھی انھی نے کرایا تھا -[2] بشیر کا جو بیان ''گلستان سخن'' کے بارے میں اوپر درج کیا گیا ہے وہ ''سخن شعرا'' ہی کے حاشیوں سے لیا گیا ہے - اس تفصیل سے یہ واضح کرنا تھا کہ بشیر تذکرہ نگاری کے سلسلے میں نسّاخ سے بہت متاثر رہے ہیں اور انھوں نے جو تذکرے یادگار چھوڑے ہیں ان میں نسّاخ کے تذکروں کو خاص طور پر سامنے رکھا ہے - بلکہ بہت سے مقامات پر انھوں نے نسّاخ ہی کے تراجم کو من و عن اپنے تذکروں میں داخل کر لیا ہے - اس کے ثبوت میں ''نگارستان بشیر'' کے تراجم پیش کیے جا سکتے ہیں - ''نگارستان بشیر'' قطعہ نگار شاعروں کا تذکرہ ہے اور اس کے صرف ایک نامکمل و ناقص الآخر نسخے کا اب تک سراغ لگ سکا ہے - اس کے دیباچے میں بشیر لکھتے ہیں :

> ''اول یہ ارادہ تھا کہ پوری پوری غزلیں (درج) کروں اور ہر ایک ردیف کی ایک ایک جلد بناؤں - پھر دیکھا کہ وہ تو بہت ہی ذخیم (ضخیم) ہو جائیں گے - اب یہ فیصلہ ہوا کہ صرف قطعات کا انتخاب لکھوں اور ''نگارستان بشیر'' اس کا تاریخی نام رکھوں - اگر زمانہ فرصت دے گا

۱- ملاحظہ ہو ''سخن شعرا''، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع مخزونہ کتب خانۂ خاص، انجمن ترقی اُردو کراچی -

۲- رسالہ اُردو کراچی، ص ۲۲۷، غالب نمبر، بابت فروری ۱۹۶۹ع -

تو انشاء اللہ ایک اور تذکرہ شعرائے اُردو کا تیار ہوگا۔ اگرچہ اس ایام میں مولوی عبدالغفور کے تذکرۂ سخن شعرا سے بڑھ کر کوئی اور تذکرہ حلیۂ طبع سے آراستہ نہیں ہوا، مگر میرے پاس دو ڈھائی سو شاعروں کا کلام اس کے علاوہ موجود ہے اور ہمیشہ متلاشی اس امر کا رہتا ہوں کہ نئے شاعر کا کلام بہم پہنچاؤں۔"[1]

"نگارستان بشیر" ۱۲۹۴ھ میں مکمل ہوا ہے ظاہر کہ بشیر کا دوسرا تذکرہ جس کا ذکر انھوں نے دیباچے میں کیا ہے اس کے بعد ہی مکمل ہوا ہوگا لیکن "نگارستان بشیر" میں بھی کوئی چیز طبع زاد نہیں ہے۔ یہ بھی نسّاخ ہی کے ایک تذکرے کی تقلید میں لکھا گیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بشیر نے بیشتر مواد استفادہ نہیں بلکہ سرقے کی حد تک نسّاخ سے لے لیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بشیر نے نسّاخ کے "سخن شعرا" کا ذکر تو دیباچے میں کیا ہے لیکن نسّاخ کے "قطعۂ منتخب" کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ یہ "سخن شعرا" سے بھی پہلے ۱۲۷۶ھ میں لکھا جا چکا تھا اور جس سال "سخن شعرا" منظر عام پر آیا، اسی سال یہ بھی مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع میں شائع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر نے اسے ضروری حواشی کے ساتھ دوبارہ شائع کر دیا ہے[2]۔ نسّاخ کا "قطعۂ منتخب" بھی صرف قطعہ نگاروں کا تذکرہ ہے اور اپنی نوعیت کا منفرد تذکرہ ہے۔ بشیر نے "نگارستان بشیر" میں اس سے کس نوعیت کا استفادہ کیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے چند تراجم سے کیا جا سکتا ہے:

قطعۂ منتخب (مطبوعہ رسالہ اُردو شمارہ ۳ سنہ ۶۸)	**"نگارستان بشیر"** (قلمی، مملوکہ انجمن ترقی اُردو کراچی)
آزاد : آزاد تخلص کپتان الگزنڈر ہیڈرلی بن مسٹر جیمس ہیڈرلی	**آزاد** : آزاد تخلص الگزنڈر ہیڈرلی ولد مسٹر جیمس ہیڈرلی سرکار

۱۔ دیباچۂ "نگارستان بشیر" (قلمی)، مخزونہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو کراچی۔

۲۔ رسالۂ اُردو کراچی، شمارہ نمبر ۳، بابت ستمبر ۱۹۶۸ع اور شمارہ نمبر ۴، بابت دسمبر ۱۹۶۸ع۔

شاگرد نواب زین العابدین خاں عارف سرکار الور میں عہدۂ کپتانی پر مامور ہیں ۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا ۔ (ص ۷)

الور میں یہ عہدۂ کپتانی پر مامور تھے ۔ نواب زین العابدین خاں عارف سے مشورہ کرتے تھے ۔ (ص ۱۰)

آشفتہ : آشفتہ تخلص حاجی عبداللہ ولد عبدالحمید باشندۂ سلہٹ شاگرد ضیغم ، راقم کے احباب میں ہیں ۔ (ص ۸)

آشفتہ : آشفتہ تخلص حاجی عبداللہ پسر عبدالحمید ساکن سلہٹ اکرام احمد ضیغم سے نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں ۔ (ص ۱۲)

آشفتہ : آشفتہ تخلص عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں دہلوی ، عزیز سعادت خاں بن مکرم خاں ، شاگرد میر مہدی مائل و فرزند مضمون ، قوم افغان سے تھے ۔ آخر ایام میں شعرگوئی ترک کر کے کسبِ باطن کی طرف مشغول ہوئے تھے ۔ ان کے بیشتر مقطعے میں زلف کا مضمون ہوتا ہے ۔ صاحبِ دیوان گزرے ہیں ۔ (ص ۸)

آشفتہ : آشفتہ تخلص عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں ، شاگرد میر مہدی مائل و فرزند علی مضمون ۔ نواب سعادت علی خاں بن مکرم خاں کے عزیزوں میں تھے ۔ صاحب دیوان گزرے ۔ اکثر مقطعے میں تخلص کی رعایت سے مضمونِ زلف باندھتے تھے ۔ آخر کو اس فن سے تائب ہو کر کسبِ باطن کی طرف متوجہ ہوگئے تھے ۔ (ص ۱۱)

احسن : احسن تخلص مرزا احسن علی دہلوی ، تلمیذِ ضیا و سودا ۔ نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار میں صیغۂ شاعری میں ملازم تھے ۔ خوش نویسی اور نکو بیانی میں مشہور

احسن : احسن تخلص مرزا حسن علی دہلوی ، تلمیذ ضیا و سودا ۔ اخیر ایام میں لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کی سرکار میں بہ صیغۂ شاعری ممتاز ہوئے ۔ خوش نویسی میں اچھی

تھے - دیوان ان کا راقم کی نظر
سے گزرا - (ص ۱۰)

آفتاب : آفتاب تخلص حضرت فردوس
منزل ابوالمظفر مجاہد الدین
شاہ عالم بادشاہ غازی فرماں
روائے دہلی - وصال ان کا
۱۲۲۱ھ میں ہوا ہے - حال ان
کا مانند آفتاب عالم تاب کے
روشن ہے ، محتاج بیان نہیں -
دیوان ان کا نظر سے گزرا -
(ص ۹)

آصف : آصف تخلص وزیر الممالک
نواب یحیئی خاں مرزا امانی
آصف الدولہ بہادر خلف نواب
وزیر شجاع الدولہ بہادر مولد
ان کا فیض آباد مسکن و مدفن
لکھنؤ - ۱۲۱۲ھ میں انتقال
کیا - تیر اندازی میں خوب
دخل رکھتے تھے - ان کے
محامد و مکارم کا حال اظہر
من الشمس ہے ، حاجتِ بیان
نہیں - دیوان ان کا نظر سے
گزرا - (ص ۹)

اسیر : اسیر تخلص منشی میر مظفر
علی خطاب تدبیر الدولہ ولد
میر مدد علی باشندۂ قصبۂ
امیٹھی مقیم لکھنؤ - شاگرد

مہارت حاصل تھی - صاحبِ
دیوان گزرے - (ص ۹)

آفتاب : آفتاب تخلص حضرت فردوس
منزل ابو مظفر مجاہد الدین
شاہ عالم بادشاہ فرماں روائے
خطۂ دہلی - احوال ان کا
مانند آفتاب عالمتاب روشن
و منور ہے ، حاجت بیان
نہیں - (ص ۱۶)

آصف : آصف تخلص نواب وزیرالممالک
نواب یحیئی خاں مرزا امانی
آصف الدولہ بہادر خلف الصدق
نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر
جائے ولادت فیض آباد ،
مسکن و مدفن لکھنؤ - ۱۲۱۲ھ
میں رحلت فرمائے ملکِ
عدم ہوئے - احوال ان کا
اظہر من الشمس ہے ، محتاجِ
بیان نہیں - صاحبِ دیوان
گزرے - (ص ۱۳)

اسیر : اسیر تخلص منشی مظفر علی
خاں سلمہ مخاطب بہ تدبیر
الدولہ مدیر الملک ولد میر
مدد علی باشندۂ قصبہ امیٹھی

مصحفی - واجد علی شاہِ اودھ کے ملازموں میں ہیں - دیوان ان کا نظر سے گزرا - (ص ۱۲)	مقیم لکھنؤ - شاگرد غلام ہمدانی مصحفی - تین دیوان اُردو اور ایک فارسی ان کا راقم آثم کے پاس موجود ہے - (ص ۱۰-۱۱)

دونوں کے تراجم کے یہ چند اقتباسات بطور نمونہ دیے گئے ہیں ، ورنہ ''نگارستانِ بشیر'' کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ دو چار تراجم کو چھوڑ کر اس کے سارے تراجم لفظاً و معناً عبدالغفور نسّاخ کے قطعۂ منتخب سے ماخوذ ہیں - انتخابِ کلام میں بھی تقریباً سارے قطعات وہی دیے گئے ہیں جو قطعۂ منتخب میں ملتے ہیں - اس کے بعض تراجم نسّاخ کے سخن شعرا سے بھی لیے گئے ہیں - چونکہ اس کا ذکر خود بشیر نے ''نگارستان'' کے دیباچے میں کر دیا ہے اس لیے اس کے تراجم کو نقل کر کے مضمون کو یہاں طول دینا مناسب نہیں -

ان صراحتوں سے صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ بشیر کے تراجم عموماً نسّاخ کے تراجم سے ماخوذ ہیں اور گلستان سخن کے سلسلے میں بھی بشیر نے صابر کے ترجمے میں جو کچھ لکھا ہے وہ کسی خارجی شہادت یا تحقیق مزید پر مبنی نہیں ہے بلکہ انھوں نے محض نسّاخ کی تقلید میں یہ لکھ دیا ہے کہ ''گلستان سخن'' صابر کی نہیں صہبائی کی تصنیف ہے -

مذکورہ بالا طویل بحث کی روشنی میں صرف نسّاخ کا بیان اس قسم کا رہ جاتا ہے جس میں کہ ''گلستان سخن'' کو صابر کے بجائے صہبائی کی تصنیف بتایا گیا ہے - لیکن صرف نسّاخ کے بیان کو دلیل بنا کر صابر کو تذکرہ نگاروں کی فہرست سے خارج کر دینا اور مزید شہادت کے بغیر ان کی ضخیم تالیف کو صہبائی کی قرار دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا -

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ صابر کے تذکرے کی تزئین و اصلاح میں صہبائی کا معمولی نہیں بلکہ بعض مباحث میں غیر معمولی دخل رہا ہے اور ان سب باتوں کا واشگاف اعتراف بھی صابر نے اپنے تذکرے میں کیا ہے - لیکن ان کے فراخ دلانہ اعترافات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ گلستان سخن میں صابر کی محنت کو دخل نہیں ہے یا اصل تذکرے کے محرّک و مدون صابر نہیں صہبائی ہیں ، کسی

طرح درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''گلستان سخن کا تجزیہ'' کے زیرِ عنوان مجلس ترقی ادب لاہور کے مطبوعہ نسخے کی جلد اول میں ایک عالمانہ مقدمہ سپرد قلم کیا ہے اور انتخاب دواوین مؤلفہ صہبائی اور گلستان سخن مؤلفہ صابر کے مقدمات کے علمی و ادبی مباحث میں جو مماثلت نظر آتی ہے اس کے پیش نظر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہے کہ:

''گلستانِ سخن کا یہ ابتدائی حصہ یا تو تمام تر صہبائی کی تحریر ہے یا اس کے ابتدائی خاکے کو استاد کے قلم نے یوں شکل و صورت دی ہے کہ یہ اس کی شخصیت کا غماز ہو گیا ہے۔''

یہ رائے صرف مقدمے کی حد تک درست کہی جا سکتی ہے، اس لیے کہ صابر کے تذکرے کا مقدمہ فی الواقع بعض مقامات پر صابر سے کہیں زیادہ صہبائی کی انشاپردازی اور علم و فضل کا ترجمان بن گیا ہے۔ صابر نے شاگرد کی حیثیت سے اپنے مسودوں پر استاد کی اصلاح و تزئین کا اعتراف بھی کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی شاگرد کی تالیف یا تخلیق کو ایک استاد اصلاح کے ذریعے اپنی ذات و صفات کا غماز بنا دے تو اسے شاگرد کا قصور کہا جائے گا یا استاد کا، جب کہ شاگرد استاد کا ہر طرح احسان شناس بھی ہو۔

مقدمے کی بحث سے قطع نظر جہاں تک اصل تذکرے یعنی شعرا کے تراجم اور تراجم کے مواد کا سوال ہے، وہ صہبائی کا فیضان نہیں بلکہ صابر کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی انتخاب دواوین اور گلستان سخن کے تقابلی مطالعے کے بعد ان کے متعدد تراجم کو آمنے سامنے رکھ کر لکھتے ہیں کہ:

''تذکرے کا اصل متن (جس میں شاعروں کا حال ہے) تحریر کے وقت تک کئی مرحلوں سے گزر چکا تھا اور اس کا ابتدائی خاکہ، گمان غالب ہے کہ صابر ہی کا تیار کردہ ہے۔ نظر ثانی میں کہیں کہیں استاد صہبائی نے ترمیم کی ہو تو عجب نہیں ورنہ شعرائے اُردو کے بارے میں صابر اور صہبائی کے خیالات میں بیّن فرق موجود ہے۔ انتخاب دواوین میں صہبائی نے بعض معاصر شاعروں کو بھی شامل کیا ہے اور ان کے حالات لکھ کر کلام کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔ یہ رائے صابر

کی درج کردہ آرا سے مختلف ہے۔''[۱]

''گلستان سخن کے یہ اقتباسات شعرا کے بارے میں زیادہ لفظی اور گہری معلومات کے علاوہ انتخاب دواوین کی بیان کردہ آرا سے مختلف بھی ہیں خصوصاً ممنون اور ناسخ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے وہ صہبائی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہیں اور اس بدلے ہوئے ذوق کی نمایندگی کرتے ہیں جو صابر اور اُسی عمر کے بعض دوسرے نقادان فن کے ہاں جلوہ گر ہے۔ گلستانِ سخن میں شعرا کے حالات و کوائف بھی صہبائی سے جداگانہ ذوق کے آئینہ دار ہیں۔ اب ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ گلستان سخن کا اصل متن صہبائی کی اصلاح سے مزین تو ہوگا لیکن صابر کا اپنا تالیف کردہ ہی سمجھنا چاہیے۔ ہاں دونوں کے اسلوب میں مشابہت ضرور ہے اور اسلوب کی مشابہت کا سبب اصلاح ہو سکتا ہے لیکن نفس مضمون استاد اور شاگرد کا جدا ہے۔''[۲]

ان حقائق کی روشنی میں قاضی عبدالودود یا عبدالغفور نسّاخ کا یہ بیان کہ گلستانِ سخن دراصل صہبائی کی تصنیف ہے، درست نہیں ہے۔ میں نے نگار ۱۹۶۴ء ''تذکروں کا تذکرہ'' نمبر میں بھی قاضی عبدالودود صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہی لکھا تھا کہ ''گلستانِ سخن'' صہبائی کا نہیں قادر بخش صابری ہی کا تذکرہ ہے۔ میرے اس بیان کو نقل کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مقدمے میں پہلے یہ رائے دی کہ:

''معاصر شہادتوں کی موجودگی میں فرمان فتح پوری کی رائے قابلِ تسلیم نہیں۔''[۳]

لیکن جب انہوں نے اس بحث کو آگے بڑھایا تو آخر میں میری طرح وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ گلستان سخن کو صہبائی کی نہیں صابر کی تالیف خیال کرنا چاہیے۔

گلستانِ سخن یا آثار المعاصرین کے اصل نام اور اس کے سالِ آغاز و اتمام

۱۔ مقدمہ گلستانِ سخن، ص ۷۵، ۷۶۔

۲۔ مقدمہ گلستانِ سخن، ص ۱۰۱۔

۳۔ مقدمہ گلستانِ سخن، ص ۴۸، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

کے بارے میں خود صابر نے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''اس شاہد دلربا اور اس عروسِ رعنا کا نام ''آثار المعاصرین'' رکھا تھا کہ اس تالیف کی غایت نام ہی سے معلوم اور اسم ہی سے مفہوم ہو جاوے لیکن یگانۂ آفاق زبدۂ اصحاب وفاق محمد نظام الدین جوش تخلص سلمہ اللہ تعالیٰ نے ''گلستانِ سخن'' نام تاریخی اس کا تجویز کیا اور نامہ اتحادِ مضمون کی وساطت سے شہر لطافت بھرکول سے لکھ بھیجا - ہر چند یہ تصنیف بارہ سو ستر (۱۲۷۰ھ) میں شروع ہوئی ہے اور اس نام (گلستانِ سخن) سے بارہ سو اکہتر چہرہ کشا ہیں لیکن جو اختتام اس کتاب کا سالِ آئندہ سے پہلے ممکن نہیں معلوم ہوتا اس واسطے یہی نام مقرر کیا اور

''شروع کتاب گرامی''

۱۲۷۰ھ آغاز کتاب کی تاریخ ہاتھ آئی -''

اس بیان کی روشنی میں گلستانِ سخن کا سالِ آغاز ۱۲۷۰ھ اور سالِ اختتام ۱۲۷۱ھ ہے - کتاب کے آخر میں ''خاتمہ'' کے عنوان سے مزید لکھا ہے کہ:

''اخیر ماہ شوال بارہ سو اکہتر ۱۲۷۱ھ میں اتمام پایا -''[۱]

مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ شعبان ۱۲۷۰ھ میں شروع ہو کر شوال ۱۲۷۱ھ میں ایک برس دو مہینے میں مکمل ہو گیا لیکن بیاض اشعار کی صورت میں اس کا مواد وہ بہت پہلے سے جمع کر رہے تھے - خود لکھتے ہیں:

''اربابِ شوق اور اصحابِ ذوق پر واضح کرنا ہے کہ اثنائے مشق میں ریختہ گویان پیشیں کا کلام کچھ جزدانِ حافظہ میں فراہم ہو جاتا تھا اور کچھ گنجینۂ بیاض میں انتظام پاتا تھا . . . سخن سنجان عصر کا کلام بھی جو کہ طبیعت کو پسند آتا گیا اور جس قدر دل کو بھاتا گیا اجزائے علٰحدہ میں مخزون اور بیاض جداگانہ میں مشحون ہوتا رہا - ایک مدت کے بعد جو مجموعے پر نظر کی تو دفتر سرمایہ فراہم ہو گیا تھا اور

۱- دیباچۂ دستور الفصاحت ، ص ۱۰۳ -

بے کراں خزانہ مجتمع - گاہ گاہ اپنے خیال میں گزرتا تھا اور کبھی کوئی ذوست بھی تحریک کرتا تھا کہ ایک ذخیرہ بہ طریق کچکول جمع کر لیا جاوے اور ہر مقام میں نام قائل کا بطور عنوان ترقیم کر لیا جاوے کہ ارباب ذوق کے لیے نزہت گاہ عجیب بہم پہنچے گی -''۱

''گلستان سخن'' تکملہ کے فوراً بعد ۱۲۷۱ھ ہی میں مطبع مرتضوی دہلی سے شیخ نثار علی کی فرمائش پر شائع ہوگیا - خاتمے میں مؤلف تذکرہ نے خود صراحت کر دی ہے کہ :

''شیخ نثار علی صاحب مطبع مرتضوی اس کتاب کے چھاپنے کی طرف متوجہ ہوئے - یہ نسخہ ہر چند اہلِ سخن کی طبع کو پسند تھا لیکن جب اس مطبع میں زیور طبع سے آراستہ ہوا اور ارجمند ہو گیا -''

تذکرے کے آخر میں مولوی امام بخش صہبائی کے دو بیٹوں مولوی عبدالعزیز اور مولوی عبدالکریم کے قطعات تاریخی کے علاوہ میرزا غلام نصیر قناعت ، مرزا جمعیت شاہ ماہر ، سید احمد خان آہی (سرسید) ، رحیم بخش طرب ، شتاب خاں سپہر ، مرزا چھنگا فاخر ، حافظ عبدالرحمٰن حیرت ، رحمت علی رحمت ، محمد بیگ محوی ، عبداللہ بیگ عاجز ، منور علی ہوش ، حافظ محمد فخر الدین فخر ، سبحان الدین فنا اور مرزا علی بیگ نازنین کے قطعات بھی شامل میں اور ہر ایک کے مادۂ تاریخ سے ۱۲۷۱ھ برآمد ہوتے ہیں - اس جگہ صرف سرسید احمد خاں کا قطعہ درج کیا جاتا ہے :

کلکِ صابر نگاشت تذکرۂ که ازو خوب تر به دہر مجو
سال تاریخ ختم اُو آہی ذکرِ یارانِ ہمدم است بگو

۱۲۷۱ھ

مولوی عبدالکریم نے سن ہجری کے علاوہ ایک قطعے سے سمبت کا سال ۱۹۱۱ اور ایک قطعے سے سال فصلی ۱۲۶۲ بھی نکالا ہے -

مختصر یہ کہ گلستانِ سخن ۱۲۷۱ھ میں مکمل ہوا اور اسی سال مطبع مرتضوی دہلی سے پہلی بار شائع ہوا - اس کا ایک نسخہ مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں محفوظ ہے - دوسری بار ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ع میں اسے مطبع نول کشور

۱- ص ۲۳ ، دیباچۂ گلستانِ سخن از مؤلف -

لکھنؤ نے شائع کیا ۔ بعد ازاں جون ۱۹۶۶ع میں مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے دو جلدوں میں خلیل الرحمٰن داؤدی اور ڈاکٹر وحید قریشی کے مقدمات کے ساتھ شائع کیا ۔ مجلس کے مطبوعہ نسخے عام طور پر دستیاب ہیں ۔

یہ ضخیم تذکرہ اُردو زبان میں ہے اور اس میں ۵۴۰ شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ فہرست مضامین کی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے حمد ہے جس کے شروع میں ساقی نامہ کے طور پر چند اشعار ہیں ، بقیہ حصہ نثر میں ہے ۔ اس کے بعد مصنّف نے اپنا حال اور وجہ تالیف بیان کی ہے ۔ بعد ازاں ایک طویل و بسیط مقدمہ ہے ۔ یہ مقدمہ زبان و بیان اور فن شعر کے مباحث سے متعلق ہے ۔ ایک مکمل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اور تقریباً دو سو صفحات میں پھیلا ہوا ہے ۔ مقدمے کے متعلق صابر نے دیباچے کے آخر میں لکھا ہے کہ :

"مقدمہ کا نام "تبصرہ" رکھتا ہوں اور اس کو ایک مقدمے اور تین مقصد میں منقسم کرتا ہوں ۔"

مقصد پہلا : زبان کے معنی اور اس امر کی تحقیق میں کہ :

"آغازِ آفرینش میں زبان ایک تھی یا متعدد اور اگر ایک تھی تو اول کون سی زبان موجود تھی اور پھر کس طرح مختلف زبانیں بہم پہنچیں ۔"

مقصد دوسرا : حد شعر اور موجد اشعار اور عروض و قافیہ کے بعض فواید کا ذکر بہ طریق اجمال ۔

مقصد تیسرا : ذکر اقسام نظم اور ہر ایک کی تعریف ۔

مذکورہ بالا مقاصد پر صابر نے فی الواقع بڑی مفصل بحث کی ہے اس کے بعد اصل تذکرہ شروع ہوتا ہے جس میں شعرا کا حال بلحاظ حروف تہجی لکھا گیا ہے ۔ تراجم کا آغاز صدر الدین آزردہ کے نام سے ہوتا ہے اور اس انداز سے گویا تذکرہ ان کے نام سے معنون کیا گیا ہے ۔ اس تذکرے کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر معاصرین یعنی ان شاعروں کا ذکر ہے جو اس وقت حیات تھے ۔ صابر نے اپنے پیش رو شعرا کو تذکرے میں داخل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کا ذکر تکرارِ بے جا میں محسوب ہوگا ، اس لیے کہ اکثر کتابیں ان کے

احوال سے مالا مال ہیں ۔ شعرا میں اکثریت دہلی سے تعلق رکھتی ہے ۔ تنقیدی عنصر زیادہ نہیں ہے ، پھر بھی اس کی تاریخی اور سوانحی اہمیت مسلّم ہے ۔ مؤلف نے ایک معاصر کی حیثیت سے اپنے عہد ، خصوصاً انیسویں صدی کے وسط کے اُردو شعرا اور ان کے ماحول و رجحان کے متعلق بہت سی اہم اور نئی باتیں بہم پہنچائی ہیں ۔[۱] ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے ہے کہ :

"سوانحی حصے پر اگرچہ اس تذکرے میں زیادہ توجہ نہیں کی گئی لیکن بعض دوسری ضمنی معلومات کی وجہ سے گلستانِ سخن کا مرتّب ضرور اپنے بعض دوسرے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے سبقت لے گیا ہے ۔"[۲]

قاضی عبدالودود نے اپنے ایک مضمون میں گلستانِ سخن کے تحقیقی مطالعے کے بعد اس کی حسب ذیل خصوصیات گنوائی ہیں :

۱۔ گلستانِ سخن میں ۵۴۰ شعرا کے مستقل تراجم ہیں ۔ مسلمان ۴۸۲ ، ہندو ۵۶ ، عیسائی ۲ اور ان میں عورتیں صرف دو ہیں اور دونوں مسلمان (پہلی یقینی طور پر دوسری قیاساً) مسلمانوں میں ایسے شعرا جن کے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے اشعار تذکرے میں ہیں ، ۱۶ ہیں ۔۔۔

ایسے شعرا جن کا صرف فارسی کلام ہے ، ۲۳ ہیں ۔ باقی وہ جن کا صرف اُردو کلام دیا گیا ہے ۔ ہندوؤں میں صرف ایک شاعر کا اُردو فارسی کلام تذکرے میں درج ہے ۔ ۱۷ کے صرف فارسی اشعار ہیں اور ایسے شعرا جن کا صرف اُردو کلام ہے ، ۳۸ ہیں ۔ عیسائیوں اور عورتوں کے صرف اُردو اشعار ہیں ۔

۲۔ مقامی حیثیت سے دیکھیے تو دہلی جہاں کے ۳۷۵ شعرا تذکرے میں ہیں اور تمام مقامات پر غالب ہے ۔ لکھنؤ کے صرف ۱۶ شعرا قابلِ شمول

۱۔ سالنامہ' نگار ، ۱۹۶۴ء ۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر ، ص ۲۵۱ ، مرتّبہ راقم الحروف ۔

۲۔ مقدمہ' گلستانِ سخن ، جلد اول ، ص ۱۱۸ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء ۔

سمجھے گئے ہیں - باقی شعرا دوسرے مقامات کے ہیں جن میں غالباً سب سے زیادہ آگرے کے ہیں -

سری رام کا یہ قول تو صحیح نہیں کہ مصنّف نے دہلی سے باہر قدم رکھنا عار سمجھا ہے لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ بہ کثرت بیرونی مشاہیر مثلاً برق ، رشک ، صبا ، نوازش وغیرہ نظر انداز کر دیے گئے ہیں - دہلی کے بارے میں مصنّف کو ایک حد تک دعویٰ تھا لیکن وہاں کے بھی متعدد خوش گو شعرا (مثلاً مجروح ، ظہیر ، انور وغیرہ) کسی نہ کسی وجہ سے گلستان سخن میں داخل نہ ہو سکے - ہاں ایسے لوگ جن کا صابر و صہبائی سے تعلق ہے (خواہ ان کی مشق چند روز ہی کیوں نہ ہو) تذکرے میں شامل ہیں -

۳- زمانۂ تالیف تذکرہ میں دہلی کے ہر طبقے کے لوگ شعر گوئی کی طرف مائل تھے اور صوفیہ ، اوباش اور رند مشرب ، امرا اور بازاری ، بادشاہ اور شہزادے سب کو اس کا ذوق تھا - تیموری خاندان کے شعرا جن کا تذکرے میں ذکر ہے ، ۷۰ ہیں -

۴- اس امر سے کہ پہلے تذکرے کا نام آثار المعاصرین رکھا گیا تھا ، یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں صرف وہی شعرا ہیں جو اصطلاحی معنی میں صابر کے ہم عصر تھے اس لیے کہ اس میں فراق و قاسم وغیرہ ہیں جو صابر کیا صہبائی کے بھی ہم عصر نہیں کہے جا سکتے -

۵- گلستانِ سخن (مقدمہ مقصد) میں دہلی کے جن اساتذہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو زمانۂ تالیف سے بہت قبل وفات پا چکے تھے (نصیر - ممنون) اور وہ بھی جو اس قدر کم عمر تھے کہ شاید صہبائی کے خاص حلقے سے باہر انھیں استاد نہ سمجھا جاتا ہو (مثلاً سوز) - آزردہ کا ذکر سب سے علٰحدہ کیا ہے اور انھیں سب سے بڑھایا ہے لیکن یہ غالباً مصلحت کی بنا پر ہے - نہ وہ اس کے مستحق ہیں اور نہ صہبائی و صابر انھیں واقعی اتنا بڑا سمجھتے ہوں گے -

تذکرے کا آغاز بھی انھیں سے ہوا ہے (حالاں کہ مقررہ قاعدے کے مطابق آباد سے ہونا تھا) ۔ اساتذہ کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کھل کر بات نہیں کہنا چاہتا ، یا کم از کم اس کی ذمہ داری خود قبول کرنا نہیں چاہتا ۔ مثلاً مومن کی خود بینی کا ذکر ۔ اظہار رائے میں ذمہ داری کا احساس کار فرما نظر نہیں آتا ۔ صہبائی ، سوز و صابر کی آواز گری (پروپیگنڈا) تالیفِ تذکرہ کی سب سے بڑی غرض معلوم ہوتی ہے ۔

۶۔ بعض غیر مشہور شعرا کے حالات میں واقعہ نگاری سے کام لیا ہے لیکن بیشتر مشاہیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ، وہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ تاہم بہت سی کام کی باتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں اور آزاد نے آب حیات میں اس سے کئی جگہ کام لیا ہے (مثلاً حالات شاہ نصیر) گو اس کا اعتراف نہیں کیا ۔ یہ تذکرہ سخن شعرا کے بھی ماخذوں میں ہے ۔ خود اس تذکرے میں گلشن بے خار کے سوا کسی تذکرے سے کوئی بات نہیں لی گئی ۔ بعض اور تذکروں کا ذکر اس میں ضرور ہے ۔

۷۔ گلشن سخن میں التزاماً تلمّذ کا ذکر نہیں ۔ خاص خاص شعرا کے شاگردوں کی تعداد جو مجھے اس کتاب سے معلوم ہوئی ، یہ ہے ۔ صہبائی ۳۸ (اس میں درسیات پڑھنے والے بھی شامل ہیں) نصیر ۲۹ ، احسان ۳ ، ذوق ۲۲ ، مومن ۲۱ ، مشیر ۱۵ ، صابر ۱۴ ، غالب (بہ شمول حزیں) ۱۲ ، ممنون ۸ ، سوز ۳ ، تنویر ۳ ، آزردہ ۲ ، عارف ۲ ، ثابت (مؤخر الذکر کے بارے میں لکھا ہے کہ اولاد تیموریہ میں بیشتر اسی صاحبِ طبع کی شاگردی سے ممتاز ہیں) ۔

واضح رہے کہ میں نے احتیاط سے گنا ہے لیکن شمار کرنے میں غلطی کا احتمال ہے ۔ میں نے صرف ان شعرا کو لیا ہے جن کے بارے میں صراحتاً لکھا ہے کہ کس کے شاگرد ہیں ۔ اپنے معلومات یا قیاس سے کام نہیں لیا ۔ اگر کسی شاعر کو ایک سے زیادہ استادوں سے

تلمّذ ہے تو اس کا شمار سب استادوں شاگردوں میں کیا گیا ہے ۔

۸۔ واقعات جب بیان کیے جاتے ہوں اور کتاب میں زیادہ تر ایسے لوگوں کا ذکر ہو جنھیں جاننے کے مواقع حاصل ہیں تو اغلاط زیادہ نہیں ہو سکتے ۔ لیکن دہلوی شعرا ہوں یا بیرونی ، تھوڑے بہت اغلاط ان کے متعلق موجود ہیں ۔ مثلاً سرور کے استاد کا تخلص سامی[1] لکھا ہے حالاں کہ یہ ساقی ہے (تذکرۂ سرور) ۔ میر ببر علی انیس کا نام میر پیر علی لکھا ہے ۔

اور تذکرہ نگاروں کی طرح 'گلستان سخن' کے مؤلف نے بھی حالات کی فراہمی میں زیادہ زحمت اٹھانی گوارا نہیں کی اور سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہو سکا ہے ، پیش کر دیا ہے ۔ مثلاً حزیں دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے عارف سے تلمذ تھا ۔ غالب ہے کہ اب غالب سے اصلاح لیتے ہوں گے ۔ خلاصہ یہ کہ ولی عہد کے نوکر تھے ، بہ آسانی تحقیق کی جا سکتی تھی کہ وفات عارف کے بعد کس کا تلمّذ اختیار کیا تھا ۔

۹۔ شاعروں کے تراجم کے ساتھ جو ان کے اشعار ہیں ان کی تعداد یہ ہے : فارسی ۹۲۹ سید کے دو مصرعے (و مادہ ہائے تاریخ) مزید بران اردو ۳۶۱۴ ، مخمس کے ۲۶ بند ان کے علاوہ مقدمے میں جو اشعار ہیں وہ اس تعداد میں شامل نہیں ۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر ایسے لوگوں کے اشعار بھی بھر دیے ہیں جن کے اشعار کچھ بلند پایہ نہیں ۔ غلط انتساب کی صرف ایک مثال اس وقت میرے علم میں ہے :

ہوا ہے ابر ہے ساقی ہے مے ہے
پر اک 'تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

یہ میر انیس کی طرف منسوب ہے لیکن تذکرۂ قدرت اللہ شوق میں جو میر انیس کی ولادت سے قبل کی تالیف ہے ، ایک گمنام شاعر کے نام سے ہے ۔

۱۔ سامی (دیکھیے تذکرۂ سرور ، ص ۴۴۳ ، مجموعۂ نغز ، ج اول ، ص ۲۸۶ - عقد ثریا ، ص ۳۲) ۔ [ادارہ]

۱۰- کتاب کی عبارت نامانوس عربی و فارسی مفردات و مرکبات سے مملو ہے اور اس میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں اُردو کا لطف ملتا ہو - بے نمک استعارات ، خنک تشبیہات ، دور از کار کنائے - مزید براں ظاہر ہے کہ اس صورت میں بے ارادہ حقیقت سے انحراف ہو جانے کا بہت کچھ احتمال ہے اور ایسا ہوا ہے -

۱۱- مقدمے میں بہت سی غیر ضروری باتیں ہیں لیکن جس زمانے میں لکھا گیا ہے اس لحاظ سے غنیمت ہے - توافق لسانین پر مؤلف کی نظر ہے اگرچہ غلط مثالیں بھی دی ہیں - لفظوں کی اصل معلوم کرنے کا بھی شوق ہے اگرچہ اس میں بھی بعض جگہ دھوکا کھایا ہے - دساتیر سے متعلق طویل بحث ہے - دساتیر سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے - مگر یہ تعجب کی بات نہیں کہ اپنے معاصرین کی طرح مؤلف کو بھی یہ خیال نہ ہؤا کہ یہ جعلی ہے اور حواشی وغیرہ میں جن کتابوں کا ذکر ہے یا تو ان کا وجود ہی نہیں یا یہ بھی جعلی ہیں اور شکل اول میں اقتباسات محض فرضی ہیں -[۱]

ان خصوصیات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گلستانِ سخن ، تاریخ تذکرہ نگاری میں خاص اہمیت رکھتا ہے - چونکہ مصنّف نے اس کے مواد کی فراہمی میں اپنی ذاتی کوششوں کے ساتھ اپنے احباب سے اور اس کی تدوین و تزئین میں اپنے اُستاد صہبائی سے بھی مدد لی ہے ؛ اس لیے یہ تذکرہ سوانح اور مباحث علمی کے سلسلے میں ہر طرح مبسوط اور جامع ہوگیا ہے - مؤلف نے کتاب کے خاتمے پر صہبائی کے ساتھ اپنے دوسرے معاونین کا بھی شکریہ ادا کیا ہے - صابر کا بیان ہے کہ مرزا غلام ، نصیر الدین قناعت ، مرزا پیارے رفعت مرزا ، جمعیت شاہ ماہر ، شتاب خاں سپہر ، عبداللہ بیگ عاجز اور مولوی عبدالکریم سوز نے رنگین کلامان حضرت شاہجہان آباد کے اشعار کی تحصیل میں اور مولوی ابوالحسن نے شعرائے دارالخلافہ مذکور اور سخن گویان نواح نزدیک و دور کے سخن بہم پہنچانے میں بڑی مدد

۱- دلی کالج اُردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر) ، ص ۹۳ - ۹۴ ، مطبوعہ دلی ۱۹۵۳ع -

کی ہے۔

شعرا کے تراجم آزردہ سے شروع ہو کر احمد علی خاں یمین کے ذکر پر ختم ہوتے ہیں۔ اشعار کو محذوف کر کے محمد صادق خاں اختر اور سید محمد خاں رند کے ترجمے یہاں بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں :

اختر : اختر تخلص زبدۂ رؤسائے جہاں محمد صادق خاں۔ وطن آبائی اس بلند مرتبت کا خاکِ نزہت سرشت ہوگلی ہے اور چندے حسن اتفاق سے سوادِ مینو بنیاد لکھنؤ میں تشریف رکھی ، اب کہ عرصۂ دراز سے حکام وقت کی طرف سے عہدۂ تحصیل داری پر مامور ہیں۔ کسی نواح میں فراغ دل اور طیبِ عیش کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ زبانِ قلم دشواریِ اوصاف سے شق اور رنگِ کاغذ بے شماریِ مدائح سے فق ہے۔ نہ ارتفاعِ مدارج کا بیان صورت پذیر ہے اور نہ گزیدگیِ اطوار اور پسندیدگیِ کردار کا حال قابلِ تحریر۔ تخلّقوا باخلاق اللہ ان کے مصحفِ حال سے ایک آیت اور اہلیتِ ذاتی اور مروتِ جبلی" ان کی کتابِ اخلاق سے ایک حکایت۔ ہر چند علومِ درسی سے دل خواہ بہرہ مند اور کامیاب ہیں لیکن فنِ سخن اور دقایقِ شعر سے ایسے ماہر ہیں گویا کہ شخصی کمال کی تشریح میں جالینوسِ روزگار اور رمز شناسی و نکتہ دانیِ ہنر میں افلاطونِ وقت۔ زبان کس کس چیز کا بیان کرے۔ نہ برجستگی نکات اور شوخی اشارات اور خوبی عبارات اور حسن تشبیہ و استعارات کا حال بیان میں آ سکتا ہے اور نہ متانتِ تراکیب اور رشاقتِ اسالیب اور سلاستِ الفاظ اور ایانی سیاق اور ندرت معنی کا وصف تقریر میں سما سکتا ہے۔ راقم تذکرہ کو تالیف کے وقت یہی چند شعر دستیاب ہوئے وگرنہ دفتر دفتر درج کتاب کر کے ارباب شوق و احبابِ صاحبِ ذوق کی ضیافتِ طبع اور مہانیِ خاطر سے دست کش نہ ہوتا۔ جو کہ مشتے نمونہ از خرمنے قول مشہور اور دقیقہ سنجان روزگار کی زبان پر مذکور ہے ، ارباب فہم کے نزدیک ایک ذرہ دلیل آفتاب اور ایک نکتہ حجت کتاب ہو سکتا ہے۔[1]

۱۔ گلستان سخن ، جلد اول ، صفحات ۲۵۹ ، ۲۶۰ ۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

رِند : رند تخلص - سید محمد خاں لکھنوی ، مشتاق قدیم اور صاحبِ طبع سلیم ہے - دو دیوان ریختہ اس سے یادگار اور حلیہٗ طبع سے معلّیٰ ہو کر اکثر نواح ہندوستان میں منظورِ سخن سنجانِ روزگار ہیں - دو تین برس ہوئے کہ 'دردِ تن کو خاک میں ملا کر صاف کوثر و تسنیم کے شوق میں باغ جناں کی طرف راہی ہوا - یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں -[۱]

☆ ☆ ☆

۱- گلستانِ سخن ، جلد اول ، ص ۵۱۸ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور -

مخزنِ نکات (اُردو)

اس تذکرے کے مؤلف محسن لکھنوی ہیں - مخزن نکات اور سراپا سخن کے سلسلے میں قائم اور محسن دونوں کا مفصل ذکر کیا جا چکا ہے - مخزن نکات (اُردو) مترجمہ محسن دراصل قائم کے فارسی تذکرے کا نا مکمل ترجمہ ہے - لیکن جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے اندازہ ہوگا ترجمے کے ساتھ ساتھ مترجم نے اس میں اتنے اضافے کیے ہیں اور اس کی ہیئت و مواد کو اس قدر بدل دیا ہے کہ وہ ایک الگ تالیف بن گیا ہے اور اس لیے اس کا ذکر سراپا سخن سے الگ مناسب معلوم ہوا -

اس تذکرے میں مترجم کا نام نہیں دیا لیکن بعض اندراجات سے پتا چلتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور ان کے والد ''تذکرۂ احبا'' کے مؤلف تھے - ''تذکرۂ احبا'' جیسا کہ سعادت خان ناصر کے تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' میں بیان کیا گیا ہے ، شاہ حسین حقیقت کی تالیف ہے اور حقیقت سید محسن علی کے والد ہیں - اس لیے بقول مولانا امتیاز علی خاں عرشی مخزن نکات (اُردو) کے مترجم و مؤلف سید محسن علی مؤلف سراپا سخن ہی ہیں -[1]

تذکرہ چونکہ نا مکمل ہے اور مخزن نکات (قائم) کے صرف دو طبقات اول و دوم پر مشتمل ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پورے تذکرے کا ترجمہ کب مکمل ہوا - پھر بھی طبقۂ دوم کے آخر میں چونکہ یہ عبارت موجود ہے :

> ''الحمد للہ و المنت کہ تاریخ دوسری ربیع الاول ۱۲۷۱ھ کو یہ طبقۂ دوم بخط خام مؤلف تمام ہوا شہر لکھنؤ میں -''

۱- ''محسن کا ترجمہ مخزن نکات'' از مولانا امتیاز علی خاں عرشی ، مطبوعہ رسالہ اُردو کراچی ، بابت اپریل ۱۹۶۷ع ، ص ۹ -

اس لیے دستیاب تذکرہ جو کہ صرف دو طبقات پر ختم ہو جاتا ہے، یقیناً ۱۲۷۱ھ میں یعنی سراپا سخن مؤلفہ ۱۲۶۹ھ کے صرف دو سال بعد مکمل ہوا ہے۔

پورا تذکرہ اردو میں ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ اب تک دستیاب ہوا ہے۔ یہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کا سراغ پہلے عرشی صاحب نے دستور الفصاحت مؤلفہ احمد خاں یکتا کے مقدمے میں دیا، بعد ازاں اس کا تعارف مضمون کی صورت میں موصوف نے رسالہ اُردو کراچی میں شائع کرایا۔ دوسروں نے اس کے بارے میں جہاں کچھ لکھا ہے وہ بھی عرشی صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے، کہیں حوالے کے ساتھ کہیں بغیر حوالہ۔ میرے پیش نظر اس وقت مولانا عرشی کی دی ہوئی تفصیلات کے علاوہ مخطوطہ رام پور کا مبیضہ ہے۔[۱]

مخزن نکات (اُردو) کا قلمی نسخہ مخزونہ رضا لائبریری رام پور مخزن نکات (قائم) کے صرف طبقۂ اول و دوم کے مکمل ترجموں پر مشتمل ہے، طبقۂ سوم میں صرف شاہ عالم آفتاب کا ذکر آیا ہے۔ اگلا حصہ ضائع ہو گیا۔ نسخے کی کیفیت عرشی صاحب کے لفظوں میں یہ ہے:

> ''خط نستعلیق معمولی۔ روشنائی سیاہ و شنجرفی اور کاغذ باریک ولایتی ہے، اوراق قدرے کرم خوردہ ہیں۔ جلد نئی ہے۔ کتاب ناقص اور یہ نقصان خود کاتب کی طرف سے ہے کہ اس نے نقل کرتے کرتے چھوڑ دیا ہے۔ نیز ہر صفحہ دو کالما ہے۔ اوراق ۹۳، سطور ۲۴ اور ناپ ۳۲، ۲۱½ سینٹی میٹر ہے۔''[۲]

کتابت میں املا کی بعض ایسی غلطیاں ہیں کہ اسے مصنّف کے ہاتھ کا مکتوب تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ طبقہ اول، دوم اور سوم کے متعلق علی الترتیب مندرجہ ذیل عبارتیں ملتی ہیں:

۱۔ ترجمہ طبقۂ اول تذکرہ محمد قائم چاند پوری مسمّٰی بہ ''مخزن نکات'' کہ نام تذکرے کا تاریخی ہے۔

۱۔ مبیضہ مخطوطہ رام پور، مملوکہ مشفق خواجہ کراچی۔

۲۔ رسالہ اُردو، ص ۵، اپریل ۱۹۶۷ع۔

۲- ''اس طبقے (دوم) میں اشعار و احوال ان شعرا کا ہے جو بعد ولی کے آخر زمانۂ اورنگ زیب بہادر سے تا ابتدائے عہد دولت محمد شاہ بادشاہ کے دارالخلافہ شاہجہان آباد اور سائر بلاد ہندوستان میں ہوئے اور راقم نے ہر تذکرے سے مقابلہ کرکے زیادہ اور بھی لکھ دیے۔''

۳- مخفی نہ رہے کہ زمانۂ مرزا رفیع سودا مغفور اور میر تقی میر اور خواجہ میر درد میں طرز کلام میں تغیّر آیا اور بہت الفاظ مترود (متروک) ہو گئے اور ریختہ میں اور رنگ کی پختگی آئی - اس واسطے اس زمانے کے شعرا کو اس طبقۂ سوم میں ترجمہ تذکرۂ احبا سے راقم لکھتا ہے کہ اہلِ تمیز فرق کلام کو دریافت کریں - اور حال اور اشعار ہر شاعر کا زیادہ کر دیا ہے، ناظرین کا موجب مسرت ہو -''

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محسن نے قائم کے مخزن نکات کا صرف لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ مختلف مآخذ کے ذریعے قائم کے تراجم میں اضافے کیے ہیں - مطالب اپنی زبان میں لکھے ہیں - شعرا کی ترتیب بدلی ہے، ادوار کی تقسیم میں شعرا کی زبان و طرزِ کلام کی پختگی کو ملحوظ رکھا ہے - متعدد مقامات پر سابق تذکروں پر اعتراض و تنقید کے ذریعے اپنی سخن سنجی کا ثبوت بہم پہنچایا اور بعض شعرا کے سلسلے میں سابق تذکرہ نگاروں کی دی ہوئی تفصیلات کی تصحیح یا تردید کی ہے - یہ سب کچھ مؤلف نے محض حافظے یا سنی سنائی باتوں کی مدد سے نہیں کیا بلکہ انھوں نے شعرائے فارسی کے تقریباً ایک درجن تذکروں کے علاوہ اُردو شعرا کے تذکروں میں ''گلشن بے خار''، نکات الشعرا، تذکرۂ میر حسن، گلشنِ سخن، تذکرۂ مصحفی، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا اور عمدۂ منتخبہ وغیرہ سے بھی مدد لی ہے اور ہر جگہ اپنے مآخذ کا سراغ بھی دے دیا ہے - یہ باتیں ایسی ہیں کہ جو مخزن نکات (اُردو) مترجمہ سید محسن علی محسن کو مخزن نکات مؤلفہ قائم سے بہت الگ کر دیتی ہیں - اتنا الگ کہ محسن کا ترجمہ ایک جداگانہ تالیف بن گیا ہے -

رام پور کے خطی نسخے کی فہرست شعرا بعض تفصیلات کے ساتھ مجھے کلب علی خاں فائق رام پوری نے مرحمت فرمائی تھی - بعد ازاں اصل مخطوطے کا مبیضہ بھی مجھے دیکھنے کو مل گیا - یہ مبیضہ بلحاظ معنی و مواد، مولانا

عرشی کی دی ہوئی تفصیلات کے عین مطابق ہے۔ خطی نسخے میں ۳۹ ورق یا ۷۸ صفحات ہیں لیکن مبیضہ ۱۹۵ صفحات میں تیار کیا گیا ہے۔ اس کے تراجم کو مخزن نکات مؤلفہ قائم کے تراجم کے ساتھ دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ محسن نے بعض جگہ قائم کے تراجم کا لفظی ترجمہ کر دیا ہے اور بعض جگہ اپنی طرف سے مواد و معنی دونوں میں اضافہ کیا ہے۔ ساتھ ہی بعض ایسے شعرا کے نام اور تراجم اس میں بڑھا دیے ہیں جو مخزن نکات میں سرے سے نہیں ہیں۔

محسن کے تذکرے میں سعدی و خسرو کے سرسری ذکر کے بعد طبقۂ اول کا اولیں ترجمہ فقیر اللہ آزاد کا ہے اور آخری حکیم یونس کا۔ دونوں ترجمے اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں:

آزاد : فقیر اللہ متوطن حیدر آباد دکن والد ان کے راہیِ ملک بقا جب ہوئے ان کا سغر سن تھا۔ اکابرِ محلہ اوس گوہر یتیم کو دوست رکھتے تھے۔ جب جوان ہوئے سودائے زلف عنبربار ایک پری رخسار کا ایسا دماغ میں سمایا کہ پریشان اور آوارہ مدہوش خانہ بدوش ہو کر چندے سرگرداں رہے۔ اتفاقاً ہمراہ شخصے فراق مخلص کہ احوال ان کا کما ینبغی معلوم نہیں واسطے ملاقات محمد یار خاں صوبہ دار وارد دارالخلافہ شاہجہان آباد کے ہوئے تھے۔ بسبب صحبت باشندگان اس دیار کے تتبع اس زباں کا اختیار کیا منہ:

کوئی کسی بھی فن میں ہم ساتھ بر نہ آیا
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا"

یونس : "یونس حکیم یونس نام۔ میر حسن نے ان کو متقدمین میں لکھا ہے اس واسطے اس طبقے میں ان کو لکھا اور حال ان کا معلوم نہیں۔"

طبقۂ اول میں سعدی و خسرو کو شامل کر کے ۴۹ شعرا کے تراجم ملتے ہیں لیکن قائم کے مخزن نکات میں صرف ۳۱ شاعر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محسن نے طبقۂ اول میں ۱۸ شاعروں کا اضافہ کیا ہے۔

طبقۂ دوم آبرو کے ذکر سے شروع ہو کر یونس تخلص کے کسی "پوچ" شاعر کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ قائم نے آبرو کے ذکر میں سراج الدین علی خاں آرزو کا ذکر ضمناً کیا ہے۔ لیکن محسن نے آبرو اور آرزو دونوں کے حالاتِ زندگی

لگ الگ لکھے ہیں ۔ محسن نے خان آرزو کے سلسلے میں لکھا ہے کہ :

''قائم نے جس زمانے میں اپنا تذکرہ تالیف کیا خان موصوف زندہ تھے حال مفصل تحریر نہیں کیا راقم الحروف تذکرۂ احباء ''تذکرۂ خازن الشعرا'' اور ''نتائج الافکار'' سے مفصل تحریر کرتا ہے ۔''۱

اسی طرح کے اضافے بعض دوسرے شعرا کے تراجم میں بھی محسن نے کیے ہیں اور اپنے اضافوں کا ذکر بھی وضاحت سے کر دیا ہے ۔ بطور مثال بیدل اور خسرو کے متعلق اُن کے بیانات دیکھیے :

عبدالقادر بیدل : ''اس تذکرے میں ان کا کچھ حال تحریر نہ تھا ۔ تذکرۂ احباء اور تذکرۂ ''نتائج الافکار'' مولوی قدرت اللہ گوپاموی سے لکھا جاتا ہے ۔''

امیر خسرو : ''قائم نے اپنے تذکرے میں بہ سبب ان کی شہرت کے ان کا حال کچھ بھی تحریر نہیں کیا ۔ مگر راقم الحروف اور تذکروں سے لکھتا ہے ۔''

قائم نے فراق کا ذکر، فقیر اللہ آزاد کے ترجمے میں ضمناً کیا تھا ۔ محسن نے اپنے تذکرے میں فراق کا ترجمہ الگ اس طور پر لکھا ہے :

فراق : ''فراق تخلص ، نام سے آگاہی نہیں مگر یہ وہی فراق ہے جو ہمراہ فقیر اللہ آزاد کہ جن کا مذکور فصل الف میں ہے ، حیدر آباد دکن سے دہلی میں آئے تھے منہ :

فراق کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کمر سے کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آئے

گویا محسن نے قائم کے تراجم پر اضافے بھی کیے ہیں اور نئے تراجم بھی بڑھائے ہیں ۔ محسن نے اس بات کی وضاحت بھی قریب قریب ہر ترجمے میں کر دی ہے کہ کون سی بات انھوں نے کس تذکرے سے لی ہے ۔ جہاں ان کے اور دوسروں کے بیانات میں اختلاف کی صورت پیدا ہوئی ہے وہاں اختلاف کی نوعیت اور اس کے اسباب بھی ظاہر کر دیے ہیں ۔

۱۔ مبیضہ مخطوطہ رام پور ، ص ۷۶ ، مملوکہ مشفق خواجہ ۔

محسن کے تذکرے میں مخزن نکات کے طبقۂ سوم کا ترجمہ نظر نہیں آتا - ہو سکتا ہے یہ حصہ ضائع ہو گیا ہو یا محسن کا ترجمہ ہی نامکمل رہ گیا ہو - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باقی ترجمہ کہیں پڑا ہو اور کسی وقت دستیاب ہو جائے - بہر صورت محسن کے تذکرے سے اتنی بات تو ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے طبقۂ سوم کا ترجمہ شروع کر دیا تھا - اس لیے کہ تمہید کی چند سطریں اور آفتاب کا ترجمہ اس میں شامل ہے - طبقۂ سوم کا دستیاب حصہ پورے کا پورا یہاں نقل کیا جاتا ہے :

''عاشقانِ معشوق سخن پر مخفی نہ رہے کہ زمانۂ مرزا رفیع سودا مرحوم مغفور اور میر تقی میر اور خواجہ میر درد میں طرزِ کلام میں تغیر آیا اور بہت الفاظ متروود ہو گئے اور ریختہ میں اور رنگ کی پختگی آئی - اس واسطے اس زمانے کے شعرا کو اس طبقۂ سوم میں ترجمہ ''تذکرۂ احباء'' سے راقم لکھتا ہے کہ اہلِ تمیز فرق کلام کو دریافت کریں اور حال اور اشعار ہر شاعر کا زیادہ کر دیا کہ ناظرین کا موجب مسرت ہو اور راقم کی خطا پوشی کر کے دعائے خیر سے یاد فرمائیں -''

آفتاب : تخلص ''نام لامی اس گیتی افروز کا مرزا محمد علی گوہر خلف اکبر فرمان روائی چار دانگ ہندوستان جنت نشان مرزا محمد عزیز الدین بادشاہ غازی بن ابوالفتح معزالدین جہاندار شاہ بادشاہ غازی بن خلد منزل ابوالنصر قطب الدین محمد معظم بہادر شاہ پادشاہ غازی بن . . . مکان اور بقول بعض اہل سیر ملقب بفردوس آشیانی المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ غازی صاحبقران ثانی بن جنت مکان مرزا سلیم ابوالمظفر نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی بن عرش آشیانی ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی بن جنت آشیانی نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ غازی بن فردوس مکان ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ غازی بن عمر شیخ مرزا بن سلطان ابوسعید شہید بن سلطان محمد مرزا سلطان محمد عمران شاہ بن ابوالفیض قطب الدین امیر تیور صاحبقران گورگانی نور اللہ مرقدہ وطن قدیم ولایت توران قوم ترک برلاس اور بعض اہلِ سیر نے بغیر تحقیق قوم

چغتائی لکھ دیا ہے ۔ چغتائی لقب ہے ، اس سبب سے کہ چغتائی خاں جو نئی . . . تھے ان کے پاس پرورش پائی تھی اور نسبت پدری اور فرزندی کی غایت محبت سے پہنچی تھی ، اس وجہ سے وہ چغتائی مشہور ہوئے اور نام والدہ ماجدہ اس آفتاب عالم تاب کا بی ننھی . . . تھا ۔ اور سترھویں تاریخ ذیعقدہ ۱۱۴۰ ہجریہ کو دارالخلافہ شاہجہان آباد قلعۂ مبارک میں اس عالم میں جلوہ ظہور ہوا ۔''[۱]

اس طرح سے محسن کا تذکرہ فقیر اللہ آزاد کے ترجمے سے شروع ہو کر آفتاب کے ذکر پر ختم ہوتا ہے ۔ ان ترجموں کی نوعیت کا پورا اندازہ کرنے کے لیے دو ترجمے اس جگہ اور نقل کیے جاتے ہیں :

ولی : تخلص ''شاہ ولی اللہ نام شاعر معروف و مشہور صاحب دیوان مولد ان کا بلدۂ گجرات حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ اولیا مشاہیر اس بلاد کے ہیں ، انھوں نے ولی کو اپنی فرزندی میں لیا تھا ۔ یہ امر بھی موجب افتخار اور شہرت کا تھا ۔ چوالیس برس کے سن میں ہمراہ میر ابوالمعالی کہ ان پر عاشق تھے ، عہد حضرت عالم گیر بادشاہ غازی تھا کہ شاہجہان آباد میں تشریف لائے ۔ شعر فارسی کہا کرتے تھے اور شعرائے فارسی گو میں کچھ شمار ان کا نہ تھا ۔ جب ملازمت حضرت شاہ گلشن قدس سرہٗ کی حاصل ہوئی ، شاہ ممدوح نے فرمایا کہ شعر ریختہ کہا کرو اور یہ مطلع . . . خود موزوں فرما کے عنایت فرمایا : مطلع یہ ہے :

خوبی اعجاز حسن یار اگر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کروں

ان کے ارشاد فرمانے سے یہ برکت ہوئی کہ ولی نے ایسا ریختہ کہا کہ سب معاصرین کو جائے حسد ہوئی اور ولی نے زبان دکن کو ترک کر کے ، جو زبان اس وقت میں شاہ جہاں آباد میں رائج تھی ، اس میں ریختہ

۱- مبیضہ مخطوطہ رام پور ، ص ۵ ، ۱۹۳ -

کہنا شروع کیا ۔ ایسا ریختہ فصاحت و بلاغت سے کہا کہ صدہا شخص کو ریختہ گوئی کی ہوس ہوئی اور ایسے مشہور ہوئے کہ موجد ریختہ ولی مشہور ہیں اور حقیقت میں جو زبان شعرا طبقۂ دوم کی ہے ان میں ولی اس طرز کے موجد ہیں۔''[۱]

مضمون: ''تخلص نام نامی شیخ شرف الدین ولد . . . اولاد ہیں ۔ حضرت شیخ فرید شکر گنج نوراللہ مرقدہ شاعر خوشگو نیک خو موصوف بہ صفات حسنہ مولد ان کا اور مسکن ان کے بزرگوں کا قصبہ جاجو کہ متصل . . . جب سن شریف ان کا چالیس برس سے زیادہ ہوا علائق دنیا سے کنارہ کیا جویائے راہ خدا ہوئے ۔ دارالخلافہ شاہ جہاں آباد میں لب دریا جو مسجد مسمٰی بہ زینت المساجد ہے اس میں آ کر بیٹھے اور توکل اختیار کیا ۔ کمال ذوق و شوق میں عمر بسر کی ۔ بقول سعدی :

ہر کجا چشمۂ بود شیرین
مردم و مرغ و مور گرد آیند

بقول حضرت مولوی معنوی :

چون ازو گشتی ہمہ چیز از تو گشت
چون ازو کشتی ہمہ چیز از تو کشت

آخر روز کو خلق خدا ان کی خدمت میں آ کر فیض یاب ہوتی تھی اور مجمع کثیر ہوا کرتا تھا ۔ نقل ہے نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام سے سفارش کسی بندۂ خدا کی کی ۔ نواب نے اس کو نوکر رکھا مگر کئی مہینے گزر گئے تنخواہ نہ ملی ۔ پھر اس نے یہ حال صاحب شیخ موصوف سے بیان کیا ۔ یہ شعر بدیہہ کہہ کے نواب کے پاس بھیجا ۔ وہ شعر یہ ہے :

عرض حال اپنے سے ہیں اہل شرافت بے نصیب
نہیں سخن رکھتے زباں کے بیچ گویا یہ نجیب

نواب نے اسی وقت تنخواہ ان کی دی اور غور کیا ۔ سبحان اللہ کہا ۔ اس وقت کے امرا قدردان فقرا تھے ۔ طرز ان کے کلام کا چونکہ ایہام

۱۔ مبیضہ مخطوطہ رام پور ، ص ۶۲ - ۶۳ ۔

پر ہے ، لہٰذا یہ بھی شعرائے ایہام گو میں مشہور ہیں ۔ میر حسن لکھتے ہیں اگرچہ کم گو تھے لیکن کلام ان کا شیریں بہت ہے ۔ چنانچہ خود کہتے ہیں :

شکر لب سخن کے نہ کیوں ہوں مرید
کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

اصلاح شعر سراج الدین علی خاں آرزو سے لیتے تھے ۔ دانت ان کے نزلے سے سب گر گئے تھے ۔ خان آرزو ان کو شاعر بے دانہ ظرافت سے کہا کرتے تھے ۔ استاد کے لقب کا یہ اثر ہوا تھا کہ میاں مضمون بیدانہ مشہور ہوئے تھے ۔ اسی شہر اور مسجد میں سنہ . . . میں عالم فانی سے بقا کی طرف رحلت کی ۔ خدا ان کی مغفرت کرے ۔ من کلامہ ۔"[۱]

☆ ☆ ☆

۱ ۔ مبیضہ مخطوطہ رام پور ، ص ۶۹ - ۷۰ ۔

ریاض الفردوس

مصنّف کا نام محمد حسین خاں ہے۔ شاہجہان پور کے باشندے تھے۔ اصل کتاب کے دیباچے میں مصنّف نے اپنے حالاتِ زندگی خود اس طور پر لکھ دیے ہیں :

"آبا و اجداد اس ہیچمیرز محمد حسین شاہجہان پوری کے قوم افغان ترین درانی ابدالی ، حسن زئی ہروی نژاد ہیں۔ قبل از عہد شاہجہانی ہرات سے ہجرت کر کے بمقام ہزارہ قریب پشاور مقیم ہوئے . . . جب غلام قادر خاں پدر بزرگوار مجھ خجستہ حال کے سن بلوغ کو پہنچے ، بمقتضائے گردش فلکی وارد حیدر آباد دکن ہوئے . . . والدۂ اولٰی مؤلف نے ایک فرزند [برادر] بزرگ میرے حکیم محمد نور خاں اور دو دختر چھوڑ کر انتقال فرمایا ۔ پھر جناب والد نے دوسرا نکاح اپنے ماموں کی بیٹی سے منعقد کیا ۔ ان کے بطن سے ایک میں ، دوم حافظ احمد حسین خاں ، سوم مظفر حسین خاں اور ایک دختر ظہور میں آئی ۔ جناب والد مکرم ۱۳- جمادی الاول ۱۲۶۶ھ بہ عمر شصت و ہشت سالگی اس جہان فانی کو بدرود فرما گئے ۔

یہ مؤلف ۲۷- ذی قعدہ ۱۲۳۵ ہجری میں عدم سے عالم وجود میں آیا ۔ اولاً میں نے کتب درسیہ فارسیہ و نیز کتب متداولہ درسِ عربیہ صرف و نحو و مختصرات منطق و فقہ و اصول اپنے وطن شاہجہان پور میں وہاں کے علما سے پڑھیں ، پھر بضرورت وقت رام پور کو جا کر تا مدت دو سال تحصیلِ علومِ مروجہ دینیہ میں مصروف رہا ۔ من بعد دہلی ، پھر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا ۔ وہاں کامل علما سے بقدر استطاعت تعلیم پائی ۔

ضلع محمدی متعلقہ اودھ میں سرشتہ کلکٹری میں بہ عوض نائب سرشتہ دار مقرر ہوا ۔ ۱۲۷۳ھ میں آگرہ گیا وہاں کچھ قیام کے بعد مبتلائے آشوبِ غدر ہوا ۔ جناب والدہ ماجدہ نے ۳- رمضان المبارک ۱۲۷۷ھ میں انتقال

فرمایا - اب کہ ۱۲۸۱ھ شروع ہیں اور عمر بھی ۳۵ برس سے متجاوز ہوگئی ہے ، تمنا یہ ہے کہ جناب باری عز اسمہ کوئی صورت اطمینان کی واسطے بسر اوقات پیدا کرے -''

دیباچے کی درمیانی سطور سے پتا چلتا ہے کہ مصنّف نے اصل کتاب ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ع میں مکمل کر لی تھی - خود لکھتے ہیں کہ :

''چونکہ اس آشوب قیامت زا (غدر کی طرف اشارہ) میں دل لگنے کی کوئی صورت پیدا نہ تھی ، ناچار بنظر رفع وحشت و پریشانی ، تالیف کتاب ریاض الفردوس میں صرف اوقات کرنے لگا - چنانچہ خدا کے فضل سے عرصہ چار پانچ برس میں نسخۂ مذکورہ مع ہر سہ مقالہ جات عربیہ و فارسیہ و ہندیہ بائیسویں ربیع الاول سنہ ایک ہزار دو سو چھہتر ہجری میں باسلوب پسندیدہ و طرز دلپذیر مؤلف ہوگیا -''

لیکن دیباچے کی آخری سطروں کے یہ الفاظ :

''اب کہ سنہ ایک ہزار دو سو اکیاسی ہجری شروع ہیں اور عمر پینتیس برس سے متجاوز ہو گئی ہے''

بتاتے ہیں کہ اس میں ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ع تک اضافے ہوتے رہے ہیں - اس لیے اس کے تکملہ کا سال ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ع کے بجائے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ع خیال کرنا چاہیے -

''ریاض الفردوس'' تکملہ کے تین سال بعد ربیع الاول ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ع میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی - اس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود ہے - اس کا ایک مطبوعہ نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بھی موجود ہے - اس کا آخری صفحہ غائب ہے ، یہ مطبع نول کشور سے ۱۸۶۶ع میں شائع ہوئی ہے - اس کتاب کا جو حصہ اُردو شعرا سے متعلق ہے اسے مرتضٰی حسین فاضل صاحب نے کتاب سے الگ کر کے تذکرۃ الشعرا کی شکل دے دی ہے اور ''ریاض الفردوس'' ہی کے نام سے حواشی و مقدمہ کے ساتھ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور کے زیرِ اہتمام اپریل ۱۹۶۸ع میں شائع کر دیا ہے -

''ریاض الفردوس'' اساسی طور پر شعرا کا تذکرہ نہیں بلکہ خود مصنّف کے لفظوں میں ''کشکولِ طرب انگیز'' ہے - یعنی یہ کتاب مختلف قسم کی منظوم و

منثور تحریروں کا مجموعہ ہے ، جیسا کہ خود مصنّف نے دیباچے میں اس کی صراحت کر دی ہے ۔ پوری کتاب تین مقالات پر مشتمل ہے ۔

پہلا مقالہ عربی میں ہے ، اس میں ۳۱۳ صفحے ہیں ۔ اس کے مضامین میں منظومات ، تذکرۂ علما و عرفا ، صرف و نحو ، معانی و بیان اور حدیث و تفسیر وغیرہ شامل ہیں ۔ دوسرا مقالہ فارسی میں ہے اور مکاتیب و حکایات و منظومات کے علاوہ فارسی شعرا کے تذکرے پر مشتمل ہے ۔ تیسرا مقالہ اُردو میں ہے ، اس کی پانچویں فصل ''تذکرۂ شعرائے متقدمین و متاخرین'' سے متعلق ہے ۔ اسی فصل کو کتاب سے الگ کر کے مرتضیٰ حسین فاضل صاحب نے نئی ترتیب کے ساتھ ''ریاض الفردوس'' کے نام سے شائع کر دیا ہے ۔ گویا پہلے یہ ایک سہ لسانی علمی و ادبی تالیف تھی اب اسے تذکرۃ الشعرائے اُردو کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔

اصل کتاب میں تذکرۃ الشعرا کے تحت صرف دو سو بیس شاعروں کا ذکر تھا ۔ مرتضیٰ حسین فاضل صاحب نے ان شاعروں کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے جن کی غزلیں تیسری فصل میں دی ہوئی تھیں ۔ اس طرح اس تذکرے کے شعرا کی تعداد دو سو باون ہو گئی ہے ۔ دو سو پچاس شاعروں کے نام فہرست میں شامل ہیں اور دو شاعر ، آباد و آتش کا ذکر حاشیے میں ہے ۔[1]

تذکرہ آبرو کے ذکر سے شروع اور یمینی کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے ۔ دونوں کے تراجم بطور نمونہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

آبرو : تخلص نجم الدین اولاد محمد غوث گوالیاری شاگرد خان آرزو کا ہے ، منہ :

کیوں چھپا ظلمت میں گر اس لب سے شرمندہ نہ تھا
جان کچھ باقی مرے ہے چشمۂ حیوان کے بیچ

(ص ۲۹)

یمینی : تخلص خلیفہ عبدالرزاق شعرائے شاہجہان آباد سے ہے ، منہ :

لخت دل آنکھوں میں آ ، حسرت کے مارے رہ گئے
یہ مسافر رات دریا کے کنارے رہ گئے (ص ۱۵۹)

۱۔ ملاحظہ ہو ریاض الفردوس ، مرتبّہ مرتضیٰ حسین فاضل ، مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۶۸ع ۔

یہی صورت پورے تذکرے کی ہے - ہر شاعر کے متعلق صرف نام اور تخلص کے ساتھ ایک ایک شعر دیا گیا ہے - جن شاعروں کے نام کے ساتھ غزلیں یا ایک سے زاید اشعار درج ہیں وہ مرتّب نے دوسری فصلوں سے منتقل کیے ہیں -

اس تذکرے سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی - مرتّب کا یہ خیال صحیح ہے کہ ریاض الفردوس کے مصنّف نے اپنے عہد کے ممتاز تذکروں کو سامنے رکھ کر نام اور تخلص کے ساتھ ایک ایک شعر انتخاب کر لیا ہے -

☆ ☆ ☆

قطعۂ منتخب

"قطعۂ منتخب" عبدالغفور خاں نسّاخ کی تالیف ہے ۔ "سخن شعرا" کے سلسلے میں نسّاخ کے مختصر حالات زندگی لکھے جا چکے ہیں ۔

"قطعۂ منتخب" تذکرے کا تاریخی نام ہے ، اس سے ۱۲۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں ، یعنی سخن شعرا مؤلفہ ۱۲۸۱ھ سے ۵ سال قبل مرتّب ہوا ہے ۔ یہ پہلی بار جمادی الاول ۱۲۹۱ھ مطابق جولائی ۱۸۷۴ع مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا ۔[۱] مطبوعہ نسخے میں خاتمۃ الطبع کے عنوان سے لکھا ہے :

"داورِ داد گررا ستائش کہ این زیبا گلدستۂ جان نواز ، مجموعۂ قطعات اساتذہ اُردو زبان موسوم بہ "قطعۂ منتخب" در مطبع نامی گرامی جناب معلٰی القاب منشی نول کشور لکھنؤ بماہ جولائی ۱۸۷۴ع مطابق شہر جمادی الاول ۱۲۹۱ھ از قالبِ طبع برآمدہ مشام آرائے جہان گردید ۔"

نول کشور کا مطبوعہ نسخہ بہت دنوں سے نایاب تھا ۔ ۱۹۶۸ع میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر کے حواشی کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کراچی نے اسے رسالہ اُردو میں بالاقساط شائع کر دیا ہے ۔[۲]

"قطعۂ منتخب" اُردو میں ہے اور اپنی نوعیت کا منفرد تذکرہ ہے ۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اُردو شعرا کے قطعات جمع کیے گئے ہیں اور جن شاعروں کے قطعات شامل کیے گئے ہیں ان کے حالات زندگی بھی مختصراً لکھ دیے گئے ہیں ۔ اس طرح یہ مجموعۂ قطعات ، تذکرہ بن گیا ہے ۔ سخن شعرا میں

۱۔ عبدالغفور نسّاخ ، ص ۳۱۵ (قلمی) ، از ڈاکٹر محمد صدر الدین ، مملوکۂ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔

۲۔ ملاحظہ ہو رسالہ اُردو ، شمارہ ۳ ، جلد ۴۴ ، بابت ستمبر ۱۹۶۸ع اور شمارہ ۴ ، جلد ۴۴ ، بابت دسمبر ۱۹۶۸ع ۔

نسّاخ نے لکھا ہے :

''اس طرح کا تذکرہ لکھوں جس میں اشعار آبدار میں اطناب و اعجاز ہو اور اس قول کی پابندی قطعۂ منتخب میں کی گئی ہے ۔ احوال شعرا میں اختصار و ایجاز ۔''

تذکرے کے دیباچے میں مؤلف نے لکھا ہے :

''بعد حمد خدا و نعت سرور انبیا محمدؐ . . . سراپا قصور عبدالغفور متخلص بہ نسّاخ خدمت اربابِ فن میں شکر گزار ہے کہ ایک دن مجمع احباب میں ہر قسم کے شعر پڑھے جاتے تھے ۔ اس میں خیال آیا کہ اگر شعرائے متقدمین و متاخرین زبان ریختہ کے مقطعاتِ عمدہ جہاں تک دستیاب ہوں بقید ردیف لیے جائیں اور تخلص اور نام و نشان شاعر بھی بقید حروف تہجی ہر ردیف میں ترتیب پائیں تو ایک معقول یادگار رہ جائے گا کہ کسی نے آج تک ایسا تذکرہ جمع کیا نہیں ۔ اس پر راقم نے کمر ہمت چست باندھی اور تھوڑے عرصے میں بہت سے دیوان اور تذکرے سے چن کر قریب ساڑھے پانچسو قطعوں کے جمع کیا اور نام تاریخی اس کا قطعۂ منتخب رکھا ۔

نکتہ چینان زمان و خوردہ بینانِ دوراں سے امید ہے کہ اگر کہیں غلطی پائیں نکتہ چینی سے باز آئیں اور خردہ بینی سے ہاتھ اُٹھائیں مصرعہ :

کہ ہیچ انفسِ بشر خالی از خطا نہ بود

اس دیباچے کے بعد ردیف وار شعرا کے تراجم ہیں ۔ تراجم کے بعد منتخب قطعات درج ہیں ۔ شعرا کی تعداد ایک سو سولہ ہے ۔ ان میں محمد علی مسرور ، نبی بخش محرور ، حیدر ، مخمور ، نور ، منظور ، قوس اور مولوی عصمت اللہ النسخ مؤلف تذکرہ کے شاگرد ہیں ۔ منتخب قطعات کی تعداد مؤلف نے دیباچے میں ساڑھے پانچسو بتائی ہے لیکن ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر نے پانچ سو انسٹھ او رڈاکٹر صدر الدین نے پانچ سو ترپن ظاہر کی ہے ۔ تراجم کی تعداد ڈاکٹر صدر الدین نے ۱۱۲ بتائی ہے یہ صحیح نہیں ہے ۔[1]

---

۱ - عبد الغفور نسّاخ (حیات اور تصانیف) قلمی ، ص ۳۱۷ ، مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔

تراجم شعرا سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی ، اول اس لیے کہ تراجم بہت ہی مختصر ہیں ، دوم اس لیے کہ جن شعرا کا ذکر اس میں ہے ان سب کا حال سخن شعرا میں بھی درج ہے ، تفصیلات بھی تقریباً ایک سی ہیں۔ چند تراجم دیکھیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسّاخ اپنے ضخیم تذکرہ ''سخن شعرا'' کے لیے جو مواد جمع کر رہے تھے اسی کی مدد سے انھوں نے ''سخن شعرا'' کی تکمیل سے کچھ قبل ''قطعۂ منتخب'' کے نام سے ایک مختصر سا تذکرہ الگ مرتّب کر لیا ہے :

قطعۂ منتخب

غالب : اسد اللہ خاں

''غالب تخلص مخدوم اعظم نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ معروف بہ مرزا نوشہ خلف عبداللہ بیگ خاں اولاد میں افراسیاب کی ہیں مولد ان کا اکبر آباد مسکن دہلی طبیعت ان کی نہایت دشوار پسند ہے اشعار فارسی ان کے ظہوری اور مرزا عبدالقادر بیدل کے اشعار ہم پہلو ہوتے ہیں اور اشعار اُردو رتبۂ بلند رکھتے ہیں ۔ اوائل میں اُردو غزل میں اسد تخلص کرتے تھے بڑا عرصہ گزرا کلکتہ میں بھی آئے تھے راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا کلیات ان کا نظر سے گزرا ۔''

مومن : محمد مومن خاں

''مومن تخلص حکیم محمد مومن خاں مرحوم خلف حکیم غلام نبی خاں مغفور

سخنِ شعرا

غالب : اسد اللہ خاں

غالب تخلص مخدوم اعظم نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ معروف بہ مرزا نوشہ خلف عبداللہ بیگ خاں اولاد میں افراسیاب کے ہیں مولد ان کا اکبر آباد مسکن دہلی طبیعت ان کی بہت دشوار پسند ہے اشعار فارسی ان کے اشعار ظہوری ترشیزی و مرزا عبدالقادر کے ہم پہلو ہوتے ہیں ۔ اشعار اُردو میں بھی وہی انداز ہے اوائل میں اُردو غزلوں میں اسد تخلص کرتے تھے بڑا عرصہ گزرا کہ کلکتے میں بھی آئے تھے راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا کلیات ان کا نظر سے گذرا ۱۲۸۵ بارہ سو پچاسی ہجری میں انتقال کیا ۔ (ص ۳۴۲)

مومن : محمد مومن خاں

مومن تخلص حکیم محمد مومن خاں مرحوم ولد حکیم غلام نبی مغفور

دہلوی شاگرد شاہ نصیر دہلوی ۱۲۶۸ھ میں قضا کی ''ماتم مومن خاں'' ان کی وفات کی تاریخ ہے - علم تنجیم و طب میں خوب دخل رکھتے تھے جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے اشعار ان کے [پُر] مضمون و شیرین و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں - کلیات ان کا نظر سے گزرا -''

نصیر : شاہ نصیر دہلوی

''نصیر تخلص شاہ نصیر الدین دہلوی عرف میاں کلو ولد شاہ غریب اللہ سجادہ نشین شاہ صدر جہاں علیہ الرحمۃ شاگرد میر محمد مایل آخر عمر میں حسب طلب دیوان چندو لال حیدر آباد دکن کو گئے وہاں ۱۸۵۲ع میں وفات پائی - مضامین عالی و تازہ خوب باندھتے تھے سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں ان سے بہتر لکھنے والا پیدا ہوا نہیں - دیوان ان کا نظر سے گزرا -''

ذوق : شیخ محمد ابراہیم

''ذوق تخلص خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم مرحوم دہلوی ، شاگرد نصیر دہلوی ، استاد بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی جمیع اصناف سخن پر قادر تھے، مضامین عاشقانہ

دہلوی ایک یا دو غزل میں نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی اصلاح پسند نہ آئی ۱۲۶۸ھ میں قضا کی ''ماتم مومن خاں'' ان کی وفات کی تاریخ ہے - علم تنجیم و طب میں خوب دخل رکھتے تھے جمیع اصناف پر قادر تھے اشعار ان کے پُر مضمون و شیرین و عاشقانہ و نمکیں ہوتے ہیں - راقم کے [نزدیک] اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گزرا نہیں - کلیات ان کا نظر سے گزرا ہے - (ص ۴۶۷)

نصیر : شاہ نصیر دہلوی

نصیر تخلص شاہ نصیر الدین دہلوی عرف میاں کلّو ولد شاہ غریب اللہ سجادہ نشین شاہ صدر جہاں علیہ الرحمۃ شاگرد میر محمد مایل ، آخر عمر میں حسب طلب دیوان چندو لال حیدر آباد دکن کو گئے وہیں وفات پائی - مضامین عالی و تازہ خوب باندھتے تھے - سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں ان سے بہتر کہنے والا پیدا ہوا نہیں - ان کا دیوان نظر سے گزرا - (ص ۵۲۲)

ذوق : شیخ محمد ابراہیم

ذوق تخلص خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم دہلوی ، استاد جنت آرام گاہ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی ، شاگرد نصیر دہلوی جمیع اصناف سخن پر قادر تھے، مضامین

خوب باندھتے تھے - راقم الحروف کے زعم میں ریختہ گویوں میں اس قوت کا شاعر پیدا نہیں ہوا - ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ع میں راہی ملک بقا ہوئے - دیوان ان کا نظر سے گزرا -"

تازہ و عالی و عاشقانہ خوب باندھتے تھے - راقم الحروف کے زعم میں ریختہ گویوں میں اس قدرت کا شاعر پیدا نہیں ہوا - ۱۲۷۱ھ میں راہی ملک بقا ہوئے - دیوان ان کا نظر سے گزرا - ہیچ میرز نے یہ تاریخ ان کے انتقال کی کہی ہے - (ص ۱۶۶)

ظفر : بہادر شاہ

"ظفر تخلص (جنت آرام گاہ) مرزا ابو محمد ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ دہلی خلف محمد اکبر شاہ گورگانی شاگرد نصیر دہلوی، و محمد ابراہیم ذوق بعد غدر ۱۸۵۷ع کے رنگون میں تشریف رکھتے ہیں اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے ہیں شعر نہایت شیرین و نمکیں و بامزہ کہتے ہیں چار دیوان ان کے نظر سے گزرے -"

ظفر بہادر شاہ

ظفر تخلص ابو ظفر سراج الدین محمد بادشاہ دہلی شاگرد نصیر دہلوی و محمد ابراہیم ذوق بعد غدر نوے برس کی عمر میں ۱۲۷۹ھ بارہ سو اناسی ہجری میں رنگون میں انتقال کیا اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے تھے شعر نہایت شیرین و نمکین کہتے تھے - چار دیوان ان کے نظر سے گزرے - (ص ۳۸۷)

نسّاخ : عبد الغفور

نسّاخ تخلص جامع اوراق ہیچ میرز غفرلہ ذنوبہ -

نسّاخ : عبدالغفور

"نسّاخ تخلص راقم اوراق ہیچ میرز عبدالغفور -" (ص ۵۰۷)

ان تقابلی مندرجات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "قطعہ منتخب" اور سخن شعرا ، نثری تراجم کے لحاظ سے بالکل ایک سے ہیں - ایک آدھ لفظ یا فقرے کا کہیں کہیں فرق پایا جاتا ہے لیکن یہ فرق معنوی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا - نسّاخ نے سخن شعرا مؤلفہ ۱۲۸۱ھ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ انھوں نے بارہ سال میں اسے مکمل کیا ہے گویا سخن شعرا کی تالیف کا آغاز انھوں نے ۱۲۷۰ھ کے قریب کیا تھا - اس کے تکملے سے پہلے دواوین کے مطالعے کے وقت جب قطعات ان کی نظر سے گزرے تو انھوں نے ایک نئے طرز کا تذکرہ

''قطعۂ منتخب'' مرتّب کر لیا لیکن ان قطعات کے سوا نثری مواد وہی رہا جو سخن شعرا کے لیے جمع کیا گیا تھا۔

''قطعۂ منتخب'' سے یہ فائدہ ضرور ہے کہ اُردو کے قطعات اور قطعہ نگار شعرا بہ یک نظر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے صنف قطعہ کے فن اور اس کے تدریجی ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

تذکرہ خواجہ حیدر علی آتش کے ذکر سے شروع ہو کر نواب محمد تقی ہوس کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں ترجمے بطور نمونہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

آتش : ''خواجہ حیدر علی لکھنؤ خلف خواجہ علی بخش شاگرد مصحفی، اشعار ان کے عاشقانہ و پُر مضمون بہت خوب ہوتے ہیں۔ سوائے غزل کے اور کسی صنف پر قادر نہ تھے۔ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ع میں وفات پائی۔ دو دیوان ان کے نظر سے گزرے۔''

ہوس : ''ہوس تخلص نواب محمد تقی خاں خلف نواب مرزا علی خاں بن نواب سالار جنگ باشندۂ فیض آباد، مقیم لکھنؤ شاگرد مصحفی صاحبِ تذکرۂ ''سراپا سخن'' نے جو لکھا ہے کہ لیلیٰ مجنوں کے مضمون سے کوئی غزل ان کی خالی نہیں، محض غلط ہے۔ اشعار ان کے بحر متقارب و متدارک میں بہت خوب ہوتے ہیں۔ ان کی مثنوی لیلیٰ مجنوں و دیوان نظر سے گزری۔''

''قطعۂ منتخب'' کے ڈھب کا ایک تذکرہ بہاء الدین بشیر دہلوی نے بھی ''نگارستان بشیر'' کے نام سے ۱۲۹۳ھ میں مرتّب کیا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بخط مؤلف انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے۔ یہ قطعۂ منتخب کے مقابلے میں بہت مختصر ہے اور اس کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ اس میں صرف چند شعرا کے قطعات اور حالات جمع کیے گئے ہیں۔ اس کا مفصل ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔

☆ ☆ ☆

سخنِ شعرا

سخن شعرا کے مصنّف عبدالغفور نسّاخ ہیں - نسّاخ کا ذکر اکثر تذکروں اور ادبی تاریخوں میں آیا ہے لیکن مفصل حالات خود انھیں کی تصنیفات میں ملتے ہیں - سخن شعرا میں تو وہ اپنے ذکر سے بہت سرسری گزر گئے ہیں - لیکن اپنی خود نوشت سوانح حیات مؤلفہ ۱۸۸۶ع ، اپنے دیوان "دفتر بے مثال" مطبوعہ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ع کے دیباچے اور اپنی تالیف "انتخابِ نقص" مطبوعہ مطبع نظامی ۱۲۹۶ھ میں انھوں نے تفصیل سے کام لیا ہے - دوسری تصانیف کے مقدمات اور اختتامیہ پر بھی کچھ حالات ملتے ہیں - بعض مقالہ نگاروں نے بھی نساخ کی زندگی اور تصانیف پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے - اس سلسلے میں مقیت الحسن کا مضمون قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے نسّاخ کی خود نوشت کا تفصیلی تعارف کرایا ہے -[۱] سید لطیف الرحمٰن نے اپنے ایک مقالے میں نساخ کے کارناموں کا معلومات افزا جائزہ لیا ہے -[۲] سید اقبال عظیم[۳] اور وفا راشدی نے بھی[۴] اپنی تالیفات میں ان کی زندگی اور کمالات پر روشنی ڈالی ہے - ۱۹۶۷ع میں شعبۂ اُردو فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر صدر الدین نے نسّاخ پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے -[۵] وحشت کلکتوی نے

۱- نگار (لکھنؤ) ، ص ۴۳ ، بابت مارچ ۱۹۵۹ع -

۲- نوائے ادب ، بمبئی ، ص ۳۰ تا ۴۰ ، بابت اکتوبر ۱۹۶۰ع ، مملوکہ خواجہ مشفق -

۳- مشرقی بنگال میں اُردو ، ص ۵۴ تا ۶۰ ، مطبوعہ ڈھاکہ ، اگست ۱۹۵۴ع -

۴- بنگال میں اُردو ، ص ۴۰ تا ۵۴ ، مطبوعہ مکتبۂ اشاعت اُردو ، حیدرآباد (پاکستان) ۱۹۵۵ع -

۵- عبدالغفور نسّاخ (قلمی) ، مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی -

ایک مضمون میں نسّاخ کے متعلق بعض اہم اور دلچسپ باتوں کا انکشاف کیا ہے[1] چنانچہ نسّاخ کے حالات سے کماحقہ، واقفیت کے لیے انھیں ماخذ سے رجوع کرنا چاہیے - ہماری معلومات بھی انھیں سے ماخوذ ہیں -

عبدالغفور نسّاخ کا پورا نام ابو محمد عبدالغفور خاں خالدی ہے - والد کا نام قاضی فقیر محمد اور دادا کا نام قاضی محمد رضا تھا - دادا کا سالِ وفات ۱۱۸۶ھ اور والد کا ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۴ع ہے - نسّاخ عید الفطر ۱۲۴۹ھ مطابق فروری ۱۸۳۴ع بمقام کلکتہ پیدا ہوئے - سات سال کی عمر میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں داخل کیے گئے لیکن والد کے انتقال کے سبب تعلیم چھوڑنی پڑی - ۱۸۴۷ع میں بہ عمر تیرہ سال ہگلی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۵۳ع میں وہاں سے فراغت حاصل کر کے تلاشِ معاش میں ڈھاکہ پہنچے - سیشن جج کے دفتر میں دس روپے ماہوار پر ملازم ہوئے - کچھ دنوں بعد صدر دیوانی عدالت میں مترجم مقرر ہوئے اور ۱۸۶۰ع میں ترقی کر کے ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے - ملازمت کے سلسلے میں ان کا زیادہ قیام ہگلی، بھاگل پور، راج شاہی، باریسال اور ڈھاکہ وغیرہ میں رہا - رمضان ۱۲۸۴ھ میں بغرض علاج پہلی بار دلی گئے، الہ آباد اور لکھنؤ ہوتے ہوئے دو ماہ بعد بنگال واپس پہنچ گئے - اس کے بعد علاج ہی کے سلسلے میں وہ تین مرتبہ اور دلی گئے ایک اپریل ۱۸۷۰ع میں دوسرے ۱۸۷۹ع میں اور آخری بار اکتوبر ۱۸۸۵ع میں - لیکن ان کی صحت پوری طرح ٹھیک نہ ہوئی اور جمعہ ۴- شوال ۱۳۰۶ھ مطابق ۳- جون ۱۸۸۹ع کو صرف ستاون سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہو گیا -

نسّاخ انگریزی سے بھی واقفیت رکھتے تھے لیکن عربی فارسی اور دوسرے علوم متداولہ میں انھیں مہارتِ خاص حاصل تھی - شعر و سخن میں پہلے رشیدالنبی وحشت کے شاگرد ہوئے اس کے بعد حافظ اکرام احمد ضیغم سے مشورۂ سخن کرنے لگے - پہلے مہجور تخلص کرتے تھے پھر لکھنؤ کے معاصرین سے چشمک کے سبب ناسخ کے مقابلے میں خود کو نسّاخ لکھنے لگے -

عبدالغفور نساخ اُردو کے ایک ممتاز شاعر اور نثر نگار ہیں - نثر و نظم

۱- ماہ نو کراچی، بابت مارچ ۱۹۵۱ع -

دونوں میں انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کا پہلا دیوان ''دفتر بے مثال'' کے نام سے ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ع میں مظہر العجائب پریس کلکتہ سے شائع ہوا، اس کے بعد ان کے کلام کے تین اور مجموعے ''اشعار نساخ''، ''ارمغان'' اور ''ارمغانی'' کے نام سے علی الترتیب ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ع، ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ع اور ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ع میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ چشمۂ فیض، گنجِ تواریخ اور نظم کے سلسلے کی بعض دوسری کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

نثر میں ان کی چار کتابیں خصوصیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ ایک ''سخن شعرا'' دوسرے خود نوشت سوانح عمری جو ۱۸۸۶ع میں مرتّب ہوئی ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں محفوظ ہے۔ تیسرے ''قطعۂ منتخب'' اسے قطعہ نگار شعرا کا تذکرہ کہنا چاہیے۔ یہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ع مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ چوتھے ''انتخاب نقص'' یہ ۳۲ صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے ۱۲۹۶ھ میں مطبع نظامی کان پور سے شائع ہوا ہے۔ اس میں مرزا دبیر و انیس کے کلام کی غلطیاں نکالی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ''سخن شعرا'' کے طرز پر ایک تذکرہ فارسی گو شعرا کا بھی انھوں نے تذکرۃ المعاصرین کے نام سے لکھنا شروع کیا ابھی عین کی ردیف تک مکمل ہوا تھا کہ نسّاخ کا انتقال ہو گیا۔

''سخن شعرا'' تاریخی نام ہے، اس سے ۱۲۸۱ھ نکلتے ہیں۔ مؤلف نے دیباچے کے آخر میں لکھا ہے کہ:

> ''بارہ برس کی محنت میں یہ تذکرہ شعرائے ریختہ مسمّٰی بہ نام تاریخی سخن شعرا تیار ہوا۔''[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ''سخن شعرا'' کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں اور تکملہ ۱۲۸۱ھ میں ہوا ہے۔

''سخن شعرا'' پہلی بار رمضان ۱۲۹۱ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ع میں تالیف

۱۔ ''سخن شعرا''، مطبوعہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع، مطبع نول کشور لکھنؤ، مملوکہ انجمن ترقی اُردو، کراچی۔

کے پورے دس سال بعد مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا ۔ اس میں اوسط تقطیع کے ۵۸۲ صفحات ہیں ۔ اس کا ایک نسخہ مملوکہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو ہمارے پیشِ نظر ہے ۔ اس کے آخری صفحات میں عبداللہ متخلص بہ آشفتہ ، منور حسین متخلص بہ فیض اور سعید بخت متخلص بہ سعید کے قطعات تاریخی درج ہیں ۔ ان سب سے تذکرے کا سالِ تصنیف ۱۲۸۱ھ برآمد ہوتا ہے ۔ بطور مثال آشفتہ کا ایک قطعہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

بہ املاے نسّاخ معجز رقم
چہ روشن سواد آمد این تذکرہ
ز آشفتہ اے دل بہ تاریخِ آن
بگو در نگہ سرمۂ تبصرہ ۱۲۸۱ھ

(ص ۵۸۱ ، سخن شعرا)

عرشی صاحب اس کے سالِ تصنیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ع تک مصنّف نے جابجا نئے معلومات کا اضافہ کیا ہے ۔ چنانچہ نسیم کا سالِ وفات ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ع آزردہ و غالب کا سنہ وفات ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ع اور شیفتہ و ضیغم کا سالِ وفات ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ع خود مصنّف نے کتاب کے اندر لکھا ہے ۔"[۱]

"سخن شعرا" اُردو میں ہے اور اس میں قدما سے لے کر معاصرین تک دو ہزار چار سو پچاسی شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ ان میں انتالیس شاعرات بھی شامل ہیں ۔ اُردو یا فارسی زبان میں جتنے تذکرے ۱۸۸۰ع تک لکھے گئے ہیں ، "سخن شعرا" ان میں سب سے ضخیم ہے ۔ گارسیں کی تاریخ ادب ہندوستانی جو اصلاً فرانسیسی زبان میں ہے البتہ سخن شعرا سے ضخیم تر ہے ، اس لیے کہ اس میں دو ہزار آٹھ سو کے قریب شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ضخامت کی وجہ یہ ہے کہ گارسیں کی طرح نسّاخ نے بھی عام خاص ، ادنیٰ اعلیٰ اور معروف و غیر معروف سب کو اپنے تذکرے میں جگہ دے دی ہے ۔ حالاں کہ ان میں سے بہت سے شاعر ایسے ہیں جن کے متعلق خود مؤلف کو کچھ نہیں معلوم ۔ کہیں صرف نام لکھ دیا ، کہیں تخلص اور کہیں صاف ظاہر کر دیا ہے کہ اس کے متعلق کوئی علم

۱- مقدمۂ دستور الفصاحت ، ص ۱۰۴ ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع -

نہیں ہے -

تذکرے کے شروع میں مختصر سا دیباچہ ہے - اس میں سبب تالیف کے سلسلے میں نسّاخ نے لکھا ہے کہ ان میں تذکرہ نگاری کا شوق قدیم تذکروں کے مطالعے سے پیدا ہوا ، خود لکھتے ہیں :

''میں نے چاہا کہ شربت تالیف سے کوزے بھروں اور اس کو قندِ مکرر کروں ، یعنی اس طرح کا تذکرہ لکھوں کہ جس میں اشعار آب دار میں اطناب و اعجاز اور احوال شعرا میں اختصار و ایجاز اور حالات ابنائے زمان کو بقدر طاقتِ بشری جامع اور حشو و زوائد کو مانع ہو - بحمداللہ کہ یہ ناوکِ عزم ہدفِ مراد میں دوسار ہوا کہ بارہ برس کی محنت میں یہ تذکرۂ شعرائے ریختہ بنام تاریخی سخنِ شعرا تیار ہوا -''

[ص ۳ ، سخن شعرا]

اس سے پتا چلتا ہے کہ تذکرے میں مؤلف نے احوالِ شعرا سے زیادہ اشعارِ آب دار پر نظر رکھی ہے اور سوانح کے مقابلے میں انتخابِ اشعار کو زیادہ اہمیت دی ہے ، چنانچہ اس تذکرے میں چند شعرا کو چھوڑ کر اکثر کے حالات زندگی بہت مختصر ہیں - خود اپنے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا ، صرف نام اور تخلص دے کر کئی صفحوں میں اپنے کلام کا انتخاب دے دیا ہے - میر و شیفتہ اور کریم الدین و صہبائی کے تذکروں کے بعد جس قسم کے تنقیدی اور سوانحی اشاروں کی توقع نسّاخ سے کی جا سکتی تھی وہ سخن شعرا میں نظر نہیں آتی - روایتی انداز کے مدحیہ جملے کہیں کہیں ملتے ہیں - ہاں لفظی تنقید کے بعض اچھے نمونے مل جاتے ہیں ، اس لیے کہ نسّاخ نے شعرا کے تراجم میں ان کے کلام کے اُن پہلوؤں کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا ہے جن کا تعلق علم بیان و بدیع ، قواعد و عروض اور زبان و بیان کے دوسرے نکتوں سے ہے - چنانچہ بعض مقامات پر مثلاً اپنے استاد حافظ اکرام احمد ضیغم کے کلام میں صنائع لفظی و معنوی کی نشان دہی بڑی وضاحت سے کی ہے -

ہرچند کہ نسّاخ کے سامنے اُردو فارسی کے متعدد تذکرے بطور نمونہ موجود تھے ، شعرا کے تواجم میں خود انھوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ تذکرۂ دلکشا مؤلفۂ راجہ جنم جی متر ارمان ، گلشنِ بے خار مؤلفۂ شیفتہ ، مجموعۂ نغز

قدرت اللہ قاسم ، سراپا سخن ، مؤلفۂ محسن اور تذکرات مؤلفۂ مصحفی وغیرہ ان کے سامنے رہے ہیں ۔ گلستانِ سخن مؤلفۂ قادر بخش صابر ، خوش معرکۂ زیبا مؤلفۂ سعادت خاں ناصر ، بہارستانِ ناز مؤلفۂ رنج اور مجمع الانتخاب [عمدۂ منتخبہ مؤلفۂ سرور بھی ان کی نظر سے گزرے تھے ۔ لیکن نسّاخ نے اپنے تذکرے کو ان سے بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی ۔ اشعار کی کثرت اور شعرا کی تعداد میں اضافہ ہی کو کمال تذکرہ نگاری سمجھا ہے ۔ پھر بھی یہ تذکرہ بعض وجوہ سے اُردو شاعری کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے ۔ اگر یہ تذکرہ موجود نہ ہوتا تو بنگال کے بہت سے اُردو شاعر ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ۔ اس تذکرے سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ صوبۂ بنگال کے دور دراز علاقوں کے بہت سے شعرا کے حالات و اشعار اس میں محفوظ ہو گئے ۔ تذکرہ آباد کے ترجمے سے شروع ہو کر نورن نامی شاعرہ کے ذکر پر ختم ہوتا ہے ۔ ''قطعۂ منتخب'' کے سلسلے میں ہم ''سخن شعرا'' کے متعدد تراجم نقل کر چکے ہیں ، اس جگہ اس کے ابتدائی اور آخری ترجمے مزید درج کیے جاتے ہیں ۔ شعرا میں پہلا ترجمہ آباد کا ہے ، آخری یوسف کا :

آباد : ''آباد تخلص ، محمد یعقوب علی خاں خلف محمد اسحٰق خاں باشندۂ دہلی ۔'' (ص ۳)

یوسف : ''یوسف تخلص ، میر یوسف علی خاں خلف حاجی احمد علی شاہ فرخ آبادی شاگرد امداد حسین صفیر ۔'' (ص ۵۷۱)

شاعرات میں پہلا ترجمہ ہنگن جان اچپل کا ہے اور آخر میں نورن و نزاکت کے ترجمے ہیں ۔ نزاکت کے سلسلے میں لکھا ہے :

''نزاکت تخلص ، رمجو طوائف سکنہ نارنول ، دہلی میں رہتی تھی ، شعر اچھا کہتی تھی ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اُس پر شیفتہ و فریفتہ تھے ۔'' (ص ۵۸۰)

ان تراجم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''سخن شعرا'' سوانحی و تنقیدی لحاظ سے بہت ہی معمولی درجے کا تذکرہ ہے ۔ سیکڑوں شعرا کے نام اور اُن کے منتخبات البتہ محفوظ ہوگئے ہیں اور وہ ادبی تاریخ کی ترتیب و تدوین میں کسی حد تک معاون ہو سکتے ہیں ۔

☆ ☆ ☆

بہارستانِ ناز

مصنّف کا اصل نام محمد فصیح الدین اور رنج و طبیب تخلص ہے۔ غالب کے تلامذہ میں سے تھے۔ خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ ان کا خاندان چونکہ ایک عرصے سے میرٹھ میں آباد ہو گیا تھا اس لیے خود کو میرٹھی لکھتے تھے ورنہ ان کا آبائی وطن سکندر آباد ضلع بلند شہر تھا۔ رنج کے والد حکیم مولوی قمر الدین بقول مالک رام ''اپنے فن میں ماہر اور اس سلسلے میں مہاراجہ سندھیا کے دربار سے منسلک تھے۔ ۱۸۵۷ع کے ہنگامے میں یہ رخصت پر وطن چلے آئے تھے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو مہاراجہ بہادر نے انھیں طلب فرمایا لیکن خدا معلوم کیوں یہ پاؤں توڑ کر یہین کے ہو رہے اور واپس نہ گئے۔ اس کے بعد میں کہیں ملازمت نہیں کی۔ مہوسی کا بھی شوق تھا۔''[1] مولوی قمر الدین کا انتقال ۱۸۸۳ع مطابق ۱۲۹۹ھ میں ہوا ہے۔[2]

حکیم فصیح الدین رنج ۱۸۳۶ع میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۵ع میں بہ عمر ۴۹ سال وفات پائی۔[3] ابتدائی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی۔ فن طب میں حکیم سعادت علی خاں کے اور فن شاعری میں مرزا نوشہ غالب کے شاگرد تھے۔ رنج کے ماموں اور خسر مولوی نصیر اللہ صاحب اپنے زمانے کے فاضل طبیب تھے۔

۱۔ تلامذۂ غالب، ص ۱۳۴، از مالک رام، مطبوعہ مرکز تصنیف و تالیف، نکودر ۱۹۵۷ع۔

۲۔ مقدمہ ''بہارستانِ ناز''، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ع۔

۳۔ تقریظ، از حافظ امداد حسین ظہور و عرفانی، مشمولہ کلیاتِ رنج، مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ع، ص ۱۲۵۔

رنج نے مختلف علوم و فنون میں مہارت انھیں کی صحبت اور نگرانی میں حاصل کی ۔ طبابت بھی انھیں کے ساتھ کرتے رہے ۔ ماموں کے انتقال کے بعد الگ مطب شروع کیا ۔ طب اور شاعری کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم متداولہ پر بھی ان کی نظر تھی ۔ ان کا مذاقِ طبیعت بھی پہلو دار تھا ۔ اپنے ذوق و شوق کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ :

''ابتدائے سن شعور سے خوشہ چینی خرمن ارباب ہر فن کا شوق رہا بدوِ فطرت سے حسنِ سیرت و صورت کا ہمیشہ ذوق رہا ۔ شمعِ جمال شاہدانِ مضامین پر دل کو پروانہ سان جلایا ۔ صحبتِ اربابِ سخن میں ہر رنگ سے اپنا رنگ جمایا ۔ کبھی سلسلۂ نظم میں اسیر رہا ، کبھی خیالِ نثر میں وقفِ تحریر رہا ۔ چندے فن حکمت پر طبیعت آئی ۔ مطب کا سر میں سودا سمایا ۔ کبھی ہیئت اور ہندسے کی مشق بڑھائی مگر اضطراب قلبِ مضطر سے کوئی حساب درست نہ آیا ۔ گاہ علم دینیات میں وقف اہتمام رہا ، کبھی صرف و نحو میں کلمہ و کلام رہا ۔ کبھی منطق کے قضیوں میں جان کھپائی ، گاہ معنی و بیان کی بلاغت پسند آئی ۔ کبھی علم تکسیر جمایا ، پر بغض و حسد سے اپنے تئیں بچایا ۔ غرض کہ طبیعت نے ہزاروں رنگ دکھائے مگر حضرت دل کہنے میں نہ آئے ۔''[1]

مختصر یہ کہ حکیم فصیح الدین رنج اپنے عہد کے ایک عالم فاضل طبیب اور زندہ دل و خوش ذوق شاعر و ادیب تھے ۔ نثر و نظم دونوں میں انھوں نے اپنی تالیفات یادگار چھوڑی ہیں ۔

''بہارستانِ ناز'' ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ع میں مکمل ہوا اور اسی سال پہلی بار مطبع دارالعلوم میرٹھ سے شائع ہوا ۔ چار سال بعد ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ع میں اسی مطبع سے اس کا دوسرا ایڈیشن میرٹھ کے مجسٹریٹ کی اعانت سے شائع ہوا ۔ ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ع میں اس کا تیسرا ایڈیشن از سرِ نو تصحیح و تدوین کے بعد منشی علیم الدین خاں کے زیرِ اہتمام مطبع عثمانی میرٹھ سے

---

۱ - دیباچۂ ''بہارستانِ ناز'' ، طبع سوم ، مطبع عثمانی میرٹھ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ع ، ص ۴ ۔

چھپا - اسی تیسرے اڈیشن کے مطبوعہ نسخے عام طور پر بڑے کتب خانوں میں ملتے ہیں - انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے اس میں ۱۱۴ صفحات ہیں - اس کی طباعت و کتابت بہت صاف ستھری ہے - اس کے دیباچے میں مصنّف نے خود اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ یہ تذکرہ اس سے پہلے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ع اور ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ع میں شائع ہو چکا ہے اور ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ع میں تیسری بار طبع ہو رہا ہے - اس نسخے کے ابتدائی ۱۶ صفحوں میں حمد و نعت ، منشور اور بعد ازاں شاعرات کی فہرست اور دیباچہ ہے - صفحہ ۱۷ سے اصل تذکرہ شروع ہوتا ہے اور ص ۱۰۷ تک شاعرات کا ذکر بلحاظ حروف تہجی کیا گیا ہے آخر کے صفحات ۱۰۸ تا ۱۱۴ تقریظ اور ان قطعات تاریخی پر مشتمل ہیں جو طبع اول اور طبع دوم اور طبع سوم تینوں اشاعتوں سے تعلق رکھتے ہیں -[۱]

مارچ ۱۹۶۵ع میں مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے خلیل الرحمٰن داؤدی کے جامع مقدمے کے ساتھ شائع کیا - افسوس کہ اس نسخے سے پرانے ایڈیشن کی تقریظ و قطعاتِ تاریخ خارج کر دیے گئے ہیں حالاں کہ ان کی شمولیت بعض تاریخی حقائق کو سمجھنے سمجھانے کے لیے بہت ضروری تھی - لطیفہ یہ ہے کہ مجلس کے مطبوعہ نسخے کی فہرستِ مضامین میں حسبِ ذیل مندرجات ملتے ہیں :

تقریظ از حکیم مولا بخش خاق ۲۴۱ -

قطعات تاریخ ، طبع اول و دوم ۲۴۳ -

قطعات تاریخ ، طبع حال ۲۴۵ -

لیکن تذکرہ یاسمین کے ذکر کے بعد صفحہ ۲۴۰ پر ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد ایک صفحے کا الگ سے صحت نامہ چسپہ ہے - تقریظ اور قطعات کا کہیں پتا نہیں ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہارستانِ ناز مطبوعہ ۱۸۸۲ع سے فہرست نقل کر دی گئی ہے ، لیکن اس فہرست کے مشمولات نظر انداز ہو گئے ہیں -

خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب نے اپنے مقدمے کے آخر میں تصحیح متن

۱- سال نامہ نگار ۱۹۶۴ع ، ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' ، مرتّبہ راقم الحروف ، ص ۳۱۸ -

کے ذیل میں لکھا ہے کہ ان کی نظر سے بہارستانِ ناز کے تینوں قدیم مطبوعہ ایڈیشن گزرے ہیں ۔[1] لیکن طباعت و اشاعت بہارستانِ ناز کے زیرِ عنوان انھوں نے صرف طبع دوم اور سوم کی تفصیلات دی ہیں اور طبع اول کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ ۱۸٦۴ع مطابق ۱۲۸۱ھ میں مطبع دارالعلوم میرٹھ سے چھپا ۔[2] دیباچۂ مؤلف بھی وہی ہے جو طبع سوم کی اشاعت میں شامل ہے ۔ اس میں بھی طبع اول کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی پہلے ایڈیشن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

''یہ تذکرہ حکیم فصیح الدین رنج رئیس میرٹھ کی تالیف ہے ۔ مؤلف نے اس کی ترتیب و تالیف کا کام سید علی رئیس میرٹھ کی فرمائش پر انجام دیا تھا ۔ سبب تالیف کے بعد شاعروں کی فہرست بہ ترتیب حروف تہجی دی گئی ہے ۔ یہ غالباً اس تذکرے کا پہلا ایڈیشن ہے جو صرف ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ دو صفحے قطعات تاریخ سے متعلق ہیں ۔ خاتمۃ الطبع یہ ہے :

''تاریخ بستم شہر جمادی الثانی ۱۲۸۱ھ مطابق بست و یکم ماہ نومبر ۱۸٦۴ع ختم ہو کر مطبع دارالعلوم میرٹھ باہتمام وجاہت علی خاں صاحب مہتمم اخبار عالم بتاریخ دوازدہم ماہ دسمبر ۱۸٦۴ع طبع ہوا ۔''[3]

طبع دوم میں ۳۸ کے بجائے ٦۷ صفحے اور طبع سوم میں ٦۷ سے بڑھ کر ۱۱۴ صفحے ہو گئے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف اس میں برابر اضافے کرتا رہا ہے ۔ طبع سوم قدیم اور مجلس کے مطبوعہ نسخوں کے دیباچۂ مؤلف میں سید علی کی فرمائش کا کوئی ذکر نہیں ہے ۔ غالباً طبع دوم اور سوم کے وقت مؤلف نے کسی وجہ سے اسے محذوف کر دیا ہے ۔

یہ اُردو شاعرات کا پہلا تذکرہ ہے اور اُردو زبان میں ہے ۔ درگا پرشاد نادر

۱۔ مقدمۂ بہارستانِ ناز ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔

۲۔ مقدمۂ بہارستانِ ناز ، ص ۴۵ ۔

۳۔ رسالۂ تذکرات ، از گارسیں دتاسی ، مترجمہ مولانا ذکاء اللہ ، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ص ۱۱۰ ، مطبوعہ دہلی ۔

کا تذکرۂ شاعرات ''چمن انداز'' جس کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا، بہارستانِ ناز کی دو اشاعتوں ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۹ء کے بعد ۱۸۷۸ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس لیے اُردو شاعرات کے اولین تذکرہ نگار فصیح الدین رنج ہی قرار پاتے ہیں۔ شاعرات کا ذکر بلحاظ حروف تہجی کیا گیا ہے۔ تراجم اور منتخبات دونوں میں توازن ملتا ہے یعنی دوسرے تذکروں کی طرح یہاں تراجم بہت مختصر اور منتخبات بہت طویل نہیں ہیں، بلکہ دونوں کو تقریباً مساوی جگہ دی گئی ہے۔

بہارستان کی اشاعتِ دوم ۱۸۶۹ء میں شاعرات کی تعداد صرف ستر تھی۔ لیکن نظر ثانی اور اضافوں کے بعد ۱۸۸۲ء میں جب یہی تیسری بار شائع ہوا تو تعداد ۱۷۴ ہو گئی۔ گویا آخری اور مکمل صورت میں یہ ۱۷۴ شاعرات کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے ۴۶ شاعرات کے منتخبات میں صرف فارسی اشعار دیے گئے ہیں۔ تین شاعرات، بیگا متخلص بہ شیریں، لطیف النسا لطیف اور قمر جان مشتری کے ترجموں میں اُردو فارسی دونوں زبانوں کے اشعار ملتے ہیں۔ باقی ایک سو پچیس شاعرات کے سلسلے میں صرف اُردو کلام دیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تذکرے میں ۴۶ فارسی کی، ۳ اُردو فارسی دونوں کی اور ۱۲۵ صرف اُردو کی شاعرات شامل ہیں۔ خلیل الرحمٰن صاحب نے اپنے مقدمے میں فارسی شاعرات کے ناموں کی نشان دہی کر دی ہے۔[۱]

یہ تذکرہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ شاعرات کے ذکر کے ذریعے اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک مخفی پہلو ہمارے سامنے آ گیا، ورنہ بہت ممکن تھا کہ آج ان شاعرات کا کوئی نام بھی نہ جانتا۔ تذکرے میں تنقیدی اشارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بعض شاعرات کی کمزوریوں پر کہیں کہیں ایک آدھ فقرے چست کر دیے گئے ہیں اور کہیں کہیں کسی کی مبالغہ آمیز تعریف کر دی گئی ہے۔ حکیم صاحب چوں کہ خود رند شاہد باز قسم کے آدمی تھے اس لیے اُنھوں نے بعض شاعرات کے تراجم چٹخارے لے کر لکھے ہیں اور ان سے اپنے ذاتی چاؤ اور لگاؤ کا بھی ذکر کیا ہے۔

۱۔ مقدمہ بہارستانِ ناز، ص ۹۴، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء۔

یوں بھی حکیم صاحب کو خواتین اور ان کے بعض مسائل سے گہری دلچسپی تھی - چنانچہ تذکرے کے دیباچے میں اُنھوں نے علم کی فضلیت بیان کرتے ہوئے عورتوں میں تعلیم کی کمی پر اظہار تاسف کیا ہے - لکھتے ہیں کہ :

''بڑی دلچسپ اور افسوس کی بات اور نہایت حسرت کا مقام ہے کہ باوجود ایسے فضائل اور شرائف کے خدا جانے مستوراتِ ہند کو تحصیل علم میں کیوں کلام ہے - خیال کرنا چاہیے مستورات ولایت انگلشیہ کی تحصیل و کسبِ علم پر کہ ہر ایک اعلیٰ اور ادنیٰ جملہ علم صنعت اور ادب پر ایک ایک میم اپنے وقت میں علامۂ زمان ہے - زبان دانی اور تعلیم و تعلّم میں مستثنائے جہاں ہے - بڑے بڑے سکول سرکاری میں ان مستورات کو خدمتِ تعلیم و تادیب ہے - ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر مستعد تحریص و ترغیب ہے - کیسی ہی جاہلہ ان کی صحبت میں دم بھر کو جائے پھر ممکن نہیں ہے کہ تحصیل علم کا اس کو دھیان نہ آئے - بجز شغل ہنر اور کسی شے سے ان کو کام نہیں - سوائے ذکر علم ان کی زبان پر دوسرا کلام نہیں - بہ خلاف ہند کے کہ یہاں سوائے خور و خواب دوسرا کام نہیں - بجز اپنی تن پروری اور تزئین کے کوئی اہتمام نہیں - کاش یہ لوگ آٹھ پہر میں ایک وقت میں بھی عمر صرف حصول علم و ہنر کریں - گاہے گاہے بھی وادی تحصیل میں گزر کریں تو بھی رفتہ رفتہ جہل مرکب دور ہو جائے ، اس فرقے کا عیب بالکل مستور ہو جائے - معاملات اور عبادات سے اچھی طرح خبردار ہوں - دیدہ و دانستہ ضلالت میں پھنس کر نہ گنہ گار ہوں - طرّہ اور ہے کہ جو لوگ ان کے وارث اور والی ہیں وہ ان سے بھی زیادہ تر بے خبر اور لاوبالی [کذا] ہیں - کبھی ان کی تربیت کا خیال نہیں ، ان ناقصوں کو ہرگز قدر کمال نہیں - حالانکہ سرکار گورنمنٹ کا یہ فیضِ عام اب ہر جگہ پر جاری ہے - کوئی شہر و قصبہ ایسا نہیں جہاں سکول اور مدرسے کی تیاری نہیں ہے - مستورات کی تعلیم کے واسطے علیحدہ مدرسے کی تعمیر و ترتیب ہے - ایک ایک علامہ ذی فن فخر لندن وہاں پر معلم و ادیب ہے - اگر یہ لوگ اس حال میں بھی اس دولت سے محروم رہ جاویں تو نہایت

عجب ہے ۔ بلکہ میری دانست میں یہ بھی اک خدا کا غضب ہے ۔''
اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :

''انشاء اللہ تعالٰی بہ شرط فرصت بعد اس کے ایک کتاب طویل احوال مستورات میں لکھنے کا ارادہ ہے کیوں کہ یہ تذکرہ تو فقط مذاقاً لکھا ہے مگر اوصاف کمال کا اس فرقے پر دل زیادہ آمادہ ہے ۔ اگر گردش ِ چرخ نے کوئی دم مہلت دی تو جلد پیش کش بزم ارباب ہوگا ۔ بخت برگشتہ اگر رام ہوا تو کتب تواریخ وغیرہ سے کل حال انتخاب ہوگا ۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے اس لیے کہ اس نوع کی کوئی کتاب ان سے یادگار نہیں ہے ۔

ہر چند کہ اس تذکرے کی بیشتر شاعرات طبقۂ طوائف سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس سے یہ خیال کرنا کہ شعر و شاعری سے صرف طوائفوں کو دلچسپی تھی درست نہ ہوگا ۔ اکثر شریف زادیاں بھی فن شعر میں کمال رکھتی تھیں ، ان کا بھی ذکر اس میں موجود ہے ۔ اگلے وقتوں میں طوائفیں بھی آج کل کی طوائفوں سے بہت مختلف تھیں ۔ ان کے گھر تہذیب و تمدن کے گہوارے سمجھے جاتے تھے اور بڑے بڑے امرا و رؤسا اپنے بچوں کو علم مجلس سے بہرہ مندی کے لیے طوائفوں کے حوالے کر دیتے تھے ۔ طوائفوں نے چوں کہ ''گانا'' کو بطور پیشہ اختیار کر رکھا تھا اس لیے اُنھیں اکثر شعرا کا منتخب کلام ازبر رکھنا پڑتا تھا اور رفتہ رفتہ اس بہانے ان میں خود بھی شعرگوئی کا ذوق پیدا ہو جاتا تھا اور بعض محض ذہن میں پڑے ہوئے دوسروں کے اشعار کو رد و بدل کر کے اپنا لیتی تھیں ۔ اس کا ثبوت بہارستان ِ ناز کے بعض تراجم سے بھی ملتا ہے مثلاً دہلی کی بیبا جان متخلص بہ مغل کے ترجمے میں یہ اشعار ملتے ہیں :

بے وفائی نہ کر خدا سے ڈر　　خود نمائی نہ کر خدا سے ڈر
بحر ِ اُلفت کا انتہا ہے کہاں　　آشنائی نہ کر خدا سے ڈر
کیوں جلاتا ہے اور مارتا ہے　　بت خدائی نہ کر خدا سے ڈر
وہ برا ہے تو اس کو ہونے دے　　تو برائی نہ کر خدا سے ڈر[1]

حالانکہ ولی دکنی کی غزل میں اس کے اکثر مصرعے موجود ہیں ۔ ولی کے

۱- بہارستان ِ ناز ، ص ۲۰۸ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔

چند اشعار دیکھیے :

اب جدائی نہ کر خدا سے ڈر ۔۔۔ بے وفائی نہ کر خدا سے ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور ۔۔۔ خود نمائی نہ کر خدا سے ڈر
اُس سے جو آشنائے درد نہیں ۔۔۔ آشنائی نہ کر خدا سے ڈر
مت تغافل کو راہ دے اے شوخ ۔۔۔ جگ ہنسائی نہ کر خدا سے ڈر[1]

اسی طرح چنبیلی متخلص بہ یاسمن کے ترجمے میں یہ شعر درج ہے :

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[2]

ظاہر ہے کہ یہ غالب کے مشہور شعر :

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کی بگڑی ہوئی صورت ہے -

تذکرہ اختر کے ترجمہ سے شروع اور یاسمن کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے - ہم اس جگہ دونوں ترجمے اشعار کو محذوف کر کے درج کر رہے ہیں -

اختر : اختر تخلص نواب اختر محل بیگم نام - خاندان تیموریہ میں صاحب عزت و احتشام - یہ مخمس اس کا مع چند اشعار تحریر ہے کیسی صاف صاف روزمرہ کی تقریر ہے - (ص ۹۳)

یاسمن : یاسمن تخلص تومن نام ہے سہارن پور ان کے رہنے کا مقام ہے - علمِ مجلسی میں رشکِ حسینان بازاری ہے ، اگرچہ میں نے اس کو دیکھا نہیں مگر سنتا ہوں کہ عادت کی اچھی یہ بے چاری ہے - یہ معلوم نہیں کہ کس کی صحبت کے اثر سے شاعری کے حال پر عنایت ہے - یا اس کا اُستاد اس کے دل کا کہیں لگاؤ اور اندوہ فرقت ہے - غرض یہ دو مطلعے اس کے سنے سنائے لکھے جاتے ہیں - (ص ۲۳۹ - ۲۴۰)

☆ ☆ ☆

۱- کلیات ولی ، ص ۸۳ ، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۵۴ع ، طبع سوم -

۲- بہارستانِ ناز ، ص ۲۳۸ -

تذکرۂ نادری

مصنّف کا نام مرزا کلب حسین خاں تخلص نادر ہے۔ ناسخ کے شاگردوں میں سے تھے، والد کا نام مرزا کلب علی خاں تھا۔ بنارس کے متوطن اور رئیس تھے۔ نادر کے چچا میرزا کلب حسن خان مخلص[1] شاعر و ادیب تھے۔ متعدد کتب و رسائل ان سے یادگار ہیں۔ نادر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے چنانچہ بسلسلۂ ملازمت ان کا قیام بنارس کے علاوہ الہ آباد، آگرہ، فرخ آباد، غازی پور وغیرہ میں بھی رہا ہے۔ نادر کی علمی استعداد غیر معمولی تھی۔ عربی، فارسی اور علوم دینی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ شعر و ادب سے انھیں فطری لگاؤ تھا اور اہلِ علم و فن کی قدر دانی و سرپرستی بھی دل کھول کر کرتے تھے۔ شاعری کو فن شریف سمجھتے تھے اور اس کی مخالفت کو روا نہ رکھتے تھے۔ شاعری کے مخالفوں کے جواب میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

فن شاعری میں ان کے تلامذہ کی تعداد خاصی تھی۔ ان کا ذکر خود نادر نے دیوانِ غریب میں کیا ہے۔ نادر کی ادبی تصنیفات میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں ان کے علاوہ کلام کے مجموعے اور دوسری کتابیں بھی ہیں:

۱۔ شوکت نادری مؤلفہ ۱۲۷۷ھ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

۲۔ تلخیص معلّٰی ۱۲۸۰ھ میں لکھی گئی اور اسی سال مطبع منشی رام سروپ فتح گڑھ سے شائع کر دی گئی۔

۱۔ مخلص تخلص، مرزا کلب حسن خاں سہین برادرِ کلب حسین خاں نادر تخلص، خلفِ کلبِ علی خاں متوطن بنارس، ص ۴۲۴، سخن شعرا۔ [ادارہ]

۴۔ دیوان غریب - مؤلفہ ۱۲۸۳ھ یہی اس وقت زیر بحث ہے اور اس کی تلخیص کا نام ''تذکرۂ نادری'' ہے -

نادر کا ذکر آب حیات اور سراپا سخن وغیرہ میں آیا ہے - ''غم نادر'' مادۂ تاریخ وفات ہے اور اس سے ان کا سالِ وفات ۱۲۹۵ھ نکلتا ہے - یہ دیوان ۱۲۸۴ھ میں تالیف کے ایک سال بعد مطبع دلکشا واقع فتح گڑھ سے زیر اہتمام منشی رام سروپ شائع ہوا ہے - پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے پاس اس کا ایک مطبوعہ نسخہ محفوظ تھا جسے موصوف نے ایک کارآمد مقدمے کے ساتھ ۱۹۵۷ع میں سرفراز پریس لکھنؤ سے شائع کر دیا ہے، اسی کا ایک نسخہ میرے سامنے ہے -

یہ تذکرہ در اصل کلب حسین خاں نادر کے ''دیوان غریب'' کا ایک جزو ہے جسے مسعود حسن رضوی صاحب نے الگ ''تذکرۂ نادر'' کے نام سے اس طرح شائع کر دیا ہے کہ اب اس کی حیثیت تذکرۃ الشعرا کی ہوگئی ہے - اس لحاظ سے اس تالیف کو گلدستۂ حیدری (گلشن ہند) مرتّبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، دستورالفصاحت مرتّبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ریاض الفردوس مرتّبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل وغیرہ کے مماثل خیال کرنا چاہیے -

''دیوان غریب'' در اصل نادر کے اُردو مخمسات کا ضخیم مجموعہ ہے - شروع کے چند مخمس جن کا تعلق نعت و منقبت سے ہے طبع زاد ہیں - اس کے بعد نادر کے وہ مخمسات ہیں جو مختلف شاعروں کی غزلوں کی تضمین کے ذریعے وجود میں آئے ہیں - جن شاعروں کی غزلیات کو نادر نے مخمس کی صورت دی ہے ان کی تعداد، جیسا کہ مطبوعہ نسخے کی فہرست سے ظاہر ہے، پانچ سو سے زاید ہے - ان میں ولی دکنی سے لے کر نادر کے عہد تک کے اعلیٰ ادنیٰ ہر قسم کے شاعر شامل ہیں - نادر نے جن شاعروں کی غزلوں پر مخمس کہے ہیں ان کے مختصر حالات بھی درج کر دیے ہیں اور اسی اضافے نے نادر کے مجموعۂ مخمسات ''دیوان غریب'' کو تذکرے کی شکل دے دی ہے - پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے یہ کیا ہے کہ مخمسات سے نادر کے اشعار کو الگ کرکے ہر شاعر کے پانچ اشعار اور شاعر کے متعلق نادر کے نثری مندرجات لے لیے ہیں، اس طرح ''دیوان غریب'' با ضابطہ تذکرے کی شکل میں ڈھل گیا ہے -

اس میں شعرا کے تراجم برائے نام ہیں - یعنی زیادہ سے زیادہ ایک سطر ہر شاعر کے بارے میں لکھی گئی ہے لیکن اس ایک سطر میں شاعر کا نام، تخلص،

سکونت ، ولدیت اور شاگردی کا ذکر عام طور پر آ گیا ہے۔ اس تذکرے کے صرف دو فائدے ہیں ۔ ایک یہ کہ اس میں بہت سے ایسے غیر معروف شعرا کا ذکر مل جاتا ہے جو کسی اور جگہ مذکور نہیں ہوئے۔ دوسرے یہ کہ اس میں بعض ایسے شعرا کی غزلیں دستیاب ہو جاتی ہیں جو غزل کے علاوہ کسی اور صنف سخن میں شہرت رکھتے ہیں مثلاً ضمیر ، خلیق ، انیس ، دبیر ، انس اور مونس وغیرہ کی غزلیں اس میں مل جاتی ہیں حالانکہ یہ سب مرثیے کے نامور شعرا ہیں ۔

تذکرۂ نادر کو اُردو زبان ہی میں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ یہ اُردو غزلوں کے مخمسات پر مبنی ہے ۔ ورنہ اس کی اصل صورت یہ ہے کہ شعرا کے تراجم میں جو ایک سطر لکھی گئی ہے اگر اس میں فارسی کے فعل کا اضافہ کر دیا جائے تو پوری عبارت یا جملہ فارسی ہو جائے گا ۔ کوئی ترجمہ مکمل جملے کی صورت میں نہیں ہے اور الفاظ کی نشست بالکل فارسی جیسی ہے ۔ آباد اور یوسف کے تذکرے بطور مثال یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

آباد : مہدی حسین خاں ولد غلام جعفر خان صاحب دیوان متوطن لکھنؤ شاگرد جناب ناسخ مغفور ۔[1]

یوسف : سید یوسف علی شاہ ولد میر حاجی احمد علی شاہ ساکن کوٹھ بارچہ من محلات شہر فرخ آباد شاگرد میاں صفیر ۔[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ تذکرۂ نادر ، ص ۱۷ ، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۷ع ۔

۲۔ تذکرۂ نادر ، ص ۱۸۲ ۔

مجموعۂ واسوخت

"مجموعۂ واسوخت" جس کا دوسرا نام "شعلۂ جوالہ" ہے، منشی فدا علی عیش کی تالیف ہے۔ کتاب کے سرورق پر بہ حیثیت مؤلف یا مرتّب ان کا نام نہیں ملتا۔ لیکن مطبوعہ نسخے میں ناشر کی طرف سے جو دیباچہ دیا ہوا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ "مجموعۂ واسوخت" عیش ہی کا مرتّبہ ہے۔ دیباچے کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

"منشی فدا علی صاحب عیش تخلص معروف بہ اچھے صاحب کہ جو شیخ زادگانِ لکھنؤ سے ہیں، ان کی ترتیب عمدہ اور اہتمام شائستہ سے خصوصاً ردیف وار مرتّب ہوا۔"[1]

منشی فدا علی عیش نے اس مجموعے میں ایک واسوخت اپنا بھی شامل کیا ہے اور اس ضمن میں مختصراً اپنے بارے میں لکھا ہے کہ:

"عیش تخلص ہے منشی شیخ فدا علی عرف اچھے صاحب کا خلف الرشید ہیں شیخ منور علی صاحب مرحوم کے اور نواسے ہیں محمد علی خاں صاحب مغفور عرف فقیر صاحب مرحوم کے۔ رئیس لکھنؤ اور شیوخِ اعظم لکھنؤ سے ہیں۔ مولد اور مسکن ان کا اور ان کے بزرگوں کا ہمیشہ سے شہر فیض بہر لکھنؤ ہے۔ صاحبِ دیوان ہیں۔ شاگردِ رشید ہیں میر عرش صاحب کے۔"[2]

۱- "مجموعۂ واسوخت"، ص ۱، جلد اول، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۵ھ مملوکہ انجمن اُردو، کراچی۔

۲- "مجموعۂ واسوخت"، ص ۶۵۱، جلد دوم، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۵ھ۔

"مجموعۂ واسوخت" ۱۲۸۵ھ/۱۸٦۹ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اور اس کا تکملہ بھی اسی سال ہوا ہے۔ لیکن دیباچے کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ اس کا آغاز ۱۲۸۲ھ یا اس سے بھی کچھ پہلے ہو چکا تھا۔ اصل عبارت دیکھیے:

"اس مجموعے میں انھوں نے (عیش نے) بعد فراہمی واسوخت ہائے اساتذہ کہ جس کی فہرست ذیل میں منضم ہے قبل از طبع ہونے مجموعۂ ہذا کے مصنّف کے حالات بطور تذکرہ بذریعۂ اشتہارات مکرر طلب کیے۔ چنانچہ اکثر صاحبوں نے اپنے اپنے حالات عنایت بھی فرمائے اور بعض نے الٰی یومنا ہذا منتظر رکھا۔ پس اسی وجہ سے اور نیز اس خیال سے کہ شاید اور مصنّفین کے واسوخت آ جاویں تین برس تک کاپیاں لکھی ہوئی رکھی رہیں۔ جب زیادہ کاپیاں ناقص ہونے لگیں اس وقت بحکم "الانتظار اشد من الموت" شائقین کے انتظار سے مجبور ہوئے۔ ہر مصنف کے حال کو تذکرۂ سراپا سخن وغیرہ سے رجوع کر کے لکھا اور جن صاحب کے نام کا حال ان کو نہ معلوم ہوا اور نہ تذکرے سے نشان پایا اس کی لا علمی سے اشارہ کیا گیا۔[۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ "مجموعۂ واسوخت" کا بیشتر حصہ، سال طباعت ۱۲۸۵ھ سے تین سال پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن سالِ طباعت تک اس میں اضافے ہوئے ہیں۔ سرورق پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے لیکن دیباچے کے آخر میں مؤلف کا کہا ہوا ایک "قطعہ" موجود ہے۔ چھ اشعار کے قطعے کا آخری شعر یہ ہے:

لکھا مصراع سالِ طبع یوں منقوط میں ہم نے
یہ کیا اچھا ہے گلدستہ گلستانِ محبت کا

آخری مصرعے کے حروف منقوط کے اعداد جمع کرنے سے ۱۲۸۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہی اس کا سالِ تصنیف ہے۔

"مجموعۂ واسوخت" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حقیقتہً واسوختوں کا مجموعہ

۱۔ "مجموعۂ واسوخت"، ص ۱۔

ہے لیکن چونکہ مؤلف نے واسوخت سے پہلے ہر واسوخت نگار کے حالاتِ زندگی بھی درج کر دیے ہیں اس لیے اس کی حیثیت "تذکرۃ الشعرا" کی ہو گئی ہے - یہ تذکرہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں صرف ان شعرا کے تراجم دیے گئے ہیں جنھوں نے واسوخت کہے ہیں - لیکن اس میں سارے واسوخت نگار شامل نہیں ہیں بلکہ جن شعرا کے حالات اور واسوخت مل سکے ہیں انھیں یکجا کر دیا گیا ہے -

"مجموعہ واسوخت" دو جلدوں میں ہے اور اس کے سارے تراجم مع دیباچہ اُردو زبان میں ہیں - حالانکہ ان میں سے بعض واسوخت اور واسوخت نگار فارسی کے ہیں - جلد اول میں پہلے دو صفحے کا دیباچہ اس کے بعد شعرا کے تراجم اور واسوخت ہیں - پورے تذکرے میں شعرا کے تراجم بلحاظ حروف تہجی ردیف وار درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے - جلد اول کے شروع میں محمد یوسف علی خاں ناظم اور جلد دوم کے آغاز میں محمد مردان علی خاں رعنا کے تراجم اور واسوخت دیے گئے ہیں - پہلی جلد ناظم کے ذکر کے بعد امیر احمد مینائی سے شروع ہو کر نواب محمد ذکی کے ترجمے پر ختم ہوتی ہے - اس میں کل چار سو صفحے ہیں - دوسری جلد رعنا کے ترجمے کے بعد محمد یار خاں رند کے ذکر سے شروع ہو کر حسین علی خاں یادگار کے واسوخت پر ختم ہوتی ہے - اس میں پانچ سو دس صفحے ہیں لیکن پہلی جلد سے منسلک کرنے کی غرض سے اس کے صفحات کے نمبر مسلسل ڈالے گئے ہیں - یعنی یہ چار سو ایک سے شروع ہو کر نو سو دس صفحے پر ختم ہوتی ہے -

دونوں جلدوں کی صورت یہ ہے کہ پہلے ہر شاعر کے مختصر حالات اس کے بعد اس کے واسوخت درج کیے گئے ہیں - حالات جلی حروف میں لکھے گئے ہیں اور ہر شاعر کے لیے صرف ایک صفحہ وقف کیا گیا ہے - ممتاز ترین شاعروں مثلاً میر، مومن سودا، مظہر اور جرأت وغیرہ کے تراجم میں بھی یہی التزام قائم رکھا ہے، بطور مثال میر اور مومن کے تراجم دیکھیے :

میر : "میر تخلص ہے بلبل ہند، ملک الشعرا میر محمد تقی میر کا - خلف الرشید تھے میر عبداللہ[1] کے اور ہمشیرزادہ اور شاگرد رشید تھے سراج الدین علی خاں آرزو کے - مولد ان کا دہلی ہے اور مسکن لکھنؤ - یہیں وفات

۱- عبداللہ کے بجائے محمد علی صحیح ہے -

پائی - سات دیوان اُردو مع قصاید اور مثنویات وغیرہ اور ایک دیوان فارسی اور ایک تذکرہ اور ایک رسالہ سبر فیض ان سے یادگار ہے (چار واسوخت) -[1]

مومن : مومن تخلص ہے حکیم مومن خان کا ، مشاہیر شعرائے دہلی سے تھے - دیوان فارسی اور ریختہ اور کئی مثنویاں "قصہ غم" اور "شکایت ستم" اور "قولِ غمیں" اور "تف آتشیں" ان سے یادگار ہیں - ان کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ بہت شاعر شوخ طبع نازک خیال تھے اور استاد عدیم المثال - معاصر تھے ملک الشعرا محمد ابراہیم ذوق کے - دہلی میں شاگرد ان کے بہت ہیں (تین واسوخت) -[2]

لیکن دونوں جلدوں کے آغاز یعنی محمد یوسف خاں ناظم اور مردان علی خاں رعنا کے تراجم میں اس التزام کی پابندی نہیں کی گئی ، بلکہ ناظم کے حالات پانچ صفحوں میں اور رعنا کے حالات تین صفحوں میں خاصی تفصیل سے دیے گئے ہیں - قلم بھی دوسرے تراجم کے مقابلے میں خفی استعمال کیا گیا ہے - بعض واسوخت اس مجموعے میں ایسے بھی ہیں جن کے مصنفین کے بارے میں مؤلف کو کوئی علم نہیں ہے - مثالاً "حشمت" کا ایک فارسی واسوخت دیا گیا ہے لیکن ترجمے میں لکھا ہے کہ حالات نامعلوم ہیں - یہی صورت جولان ، قیصر اور مجرم کے تراجم کی ہے - اسی طرح جلد دوم کے دو واسوخت میں مصنف کا نام نہیں ہے اس لیے "لا ادری" کے عنوان سے شامل کر لیے گئے ہیں - صرف وحشی یزدی محمد عمر دراز خائیض جالندھری اور حشمت کے تراجم میں فارسی کے واسوخت ملتے ہیں ورنہ سارے شعرا اُردو کے ہیں -

اس تذکرے میں کل ترپن شعرا کا ذکر آیا ہے - سولہ تراجم پہلی جلد میں ہیں اور ۳۷ دوسری میں - ان میں سے دو کے نام یا تخلص بھی نہیں معلوم ، باقی اکیاون کے نام اور حالات ملتے ہیں - اوپر مومن اور میر کے تراجم دیے گئے ہیں - ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے اگرچہ اختصار سے کام لیا ہے لیکن

۱- "مجموعہ واسوخت" ، جلد دوم ، ص ۳۷ -

۲- "مجموعہ واسوخت" ، جلد دوم ، ص ۵۳ -

ہر شاعر کے بارے میں ضروری باتیں تقریباً درج کر دی گئی ہیں - چونکہ ان میں سے بہت سے شعرا مؤلف کے معاصر ہیں اور جیسا کہ دیباچے سے ظاہر ہے بعض نے اپنے حالات خود لکھ کر مؤلف کو بھیجے تھے اس لیے اس تذکرے کے نثری تراجم خاصے وقیع ہو جاتے ہیں - عموماً ہر شاعر کے بارے میں تخلص ، نام ، شاگردی ، مولد ، مسکن ، تصانیف ، مشغلہ اور مدفن وغیرہ کا سراغ دے دیا گیا ہے - دوسرے یہ کہ اس کی معرفت بعض ایسے شعرا کے نام اور کام سے واقفیت ہو جاتی ہے جو کسی اور تذکرے میں نہیں ہیں - نیز اس تذکرے سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُردو میں کن کن شاعروں نے واسوخت کہے ہیں اور ان کی اُردو شاعری کے ذخیرے میں کیا نوعیت و حیثیت ہے -

اس جگہ دو ترجمے مزید نقل کیے جاتے ہیں ان سے دوسرے ترجموں کی معنوی حیثیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی :

ذکی : ذکی تخلص ہے اسد الدولہ رستم الملک نواب محمد ذکی خاں بہادر فیل جنگ بہادر عرف نواب بہادر مرحوم کا - یہ خلف اکبر تھے نواب امیر الدولہ مرزا حیدر صاحب مغفور حیدر تخلص کے - بزرگ ان کے سب نیشا پوری ہیں - بڑے سیر چشم امیر ابن امیر اور رئیس ابن رئیس اسم بامسمی طبیعت نہایت ذکی رکھتے ہیں - صاحبِ دیوان ہیں مگر دیوان ان کا نظر راقم سے نہیں گزرا -''[1]

یادگار : یادگار تخلص ہے حسین علی خاں ولد اکرام احمد خاں ابن کاظم علی خاں کا - ساکن قدیم ہیں احاطۂ خانساماں واقع لکھنؤ کے - تحصیل علم و شاعری میں شاگرد ہیں میاں جعفر صاحب متخلص بہ مخمور کے - یہ واسوخت ان کا واسطے ضرورت ردیف حرف یا کے داخل مجموعۂ ہذا کہا گیا -''[2]

☆ ☆ ☆

۱- مجموعۂ واسوخت ، جلد اول ، ص ۳۹۳ -

۲- مجموعۂ واسوخت جلد دوم ، ص ۹۰۳ -

فرح بخش

مصنّف کا پورا نام نواب یار محمد خاں ہے ، شوکت تخلص کرتے تھے - باپ کا نام فوجدار خاں اور دادا کا محمد غوث خان تھا - کلام غالب کا قدیم نسخہ جو کہ نسخہؐ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہے اور ۱۹۲۱ع میں مفتی انوار الحق کے مقدمے کے ساتھ بھوپال سے شائع ہوا ہے ، فوجدار محمد خاں ہی کے کتب خانے میں ابتداءً محفوظ تھا اور انھیں کے لیے تیار کیا گیا تھا -

شوکت نے اپنا حال تذکرۂ فرح بخش میں لکھا ہے ، لیکن بہت سرسری - نہ تاریخ ولادت دی ہے نہ جائے پیدائش اور نہ حسب نسب کے متعلق کچھ لکھا ہے - اتنا پتا ضرور دیا ہے کہ :

"نیاز مند . . . یار محمد خاں متخلص بہ شوکت شروع سن تمیز سے علوم فنون کا بدل راغب ہے - ہمیشہ ارباب کمال کی خدمت میں نہایت شوق سے کسب کمالات سیف و قلم کا طالب ہے - مولوی سید عبداللہ . . . سید علی اکبر خاں غازی ، مولانا محمد عباس شروانی . . . مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب ، والد ماجد فوجدار محمد خاں صاحب جنت مکان وغیرہ چند اہل کمال کی بدولت مجھ کو فنون و علوم سے شناسائی حاصل ہوئی -"[1]

علم و فن سے دلچسپی کے ساتھ یار محمد خاں شوکت کو شاعری سے بھی لگاؤ تھا - ان کے اشعار دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ انھیں شاعری کا ذوق تو تھا لیکن خود شاعر بہت معمولی درجے کے تھے ، چنانچہ تاریخ ادب میں ان کا نام ان کی شاعری کے سبب نہیں ان کے تذکرۂ فرح بخش کی بدولت زندہ ہے -

---

۱- ترجمہؐ یار محمد خاں شوکت مشمولہ تذکرۂ فرح بخش مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ مملوکہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی -

یہ تذکرہ ماہ شعبان ۱۲۸۷ھ میں مکمل ہوا ہے - مؤلف کا بیان ہے کہ:
"پانزدہم ماہ شعبان ۱۲۸۷ھ بطریق سیر باغ فرح بخش میں میرا گزر ہوا۔ ملاحظہ سبزہ زار دلکشا و مشاہدۂ آبشار فرحت افزا سے طبیعت میں راحت کا اثر ہوا - بسکہ دل شاد ہوا یکایک شعر میر کا یاد ہوا:

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نام خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہیے

اس شعر کو مکرر پڑھتا ہوا سرِ شام وارد کاشانہ ہوا، بے اختیار دل مائل عاشقانہ ہوا - قرین مسرت میں نے کاغذ و قلم دان طلب کیا، بیاض سے اشعار بعض شعرائے نازک خیال حال کو منتخب کیا - ایک شب میں یہ تذکرہ تحریر ہوا -"[1]

اس کے بعد وضاحت کر دی ہے کہ:
"فرح بخش اس رسالے کا نام ہے اور "نشاط افزا گنجینۂ مسرت" تاریخ اختتام -"

چونکہ "نشاط افزا گنجینۂ مسرت" کے ٹکڑے سے بھی ۱۲۸۷ھ برآمد ہوتے ہیں اس لیے یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ ۱۲۸۷ھ ہی میں ہر طرح مکمل ہو گیا ہے - ایک سال بعد ۱۲۸۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے محمد عبدالرحمٰن شاکر کے زیرِ اہتمام یہ پہلی بار شائع ہوا - اس کا ایک نسخہ مملوکہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو ہمارے پیش نظر ہے - اس کے سر ورق پر نام کے ساتھ ہی جلی حروف میں ۱۲۸۸ھ درج ہے -

خاتمۃ الطبع میں لکھا ہوا ہے کہ "محمد عبدالرحمٰن شاکر نے اپنے مطبع نظامی واقع کانپور سے ۲۷- ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ میں چھپوایا - آخر میں محمد عبدالرحمٰن شاکر، محمد عبدالعزیز اعجاز سہوانی اور گوبند پرشاد فضا کے کہے ہوئے قطعات تاریخ ہیں - شاکر کا قطعہ ہے:

فرح بخش جہان مطبوع گردید ز دیدارش دل و جان شاد بادا
بگفتار از سر اخلاص شاکر گلستانِ سخن آباد بادا

۱- دیباچہ تذکرۂ فرح بخش، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ، مملوکۂ انجمن ترقی اردو، کراچی -

آخری مصرعہ کے اعداد میں "اخلاص" کے الف کے عدد جمع کرنے سے سال طباعت ۱۲۸۸ھ برآمد ہوتا ہے۔

تذکرۂ فرح بخش اُردو زبان میں ہے اور آخری پانچ شاعروں کو چھوڑ کر صرف بھوپال اور بھوپال کے متوسل شعرا کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ گویا بنیادی طور پر یہ "تذکرۂ شعرائے بھوپال" ہے۔ دیباچے میں مؤلف نے "فرح بخش" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ:

"چار گلشن پر مرتّب ہے۔ نہایت مختصر و مہذب ہے۔ گلشن اول میں اُن شعرا کا حال و قال ہے کہ دم تحریر ان کی ذات سے بیت الکمال بلدۂ بھوپال ہے۔

گلشن دوم میں وہ شعرا مذکور و مذبور ہیں جو بھوپال میں تھے اور اب زیرِ زمین مستور ہیں۔

گلشن سوم میں وہ سخندان مستور ہیں جو نوکر سرکار بھوپال تھے اور اب اس بارگاہ سے دور ہیں۔

گلشن چہارم میں تذکرہ بعض ادبائے نامدار کا ہے جن کے وجود سے ہندوستان نقشۂ گلشنِ بے خار ہے۔"

ہر چند کہ یہ تذکرہ بھوپال سے متعلق شعرائے اُردو فارسی کے لیے مخصوص ہے لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کسی شاعر کے بارے میں بھی کوئی کارآمد اطلاع ہمیں اس تذکرے سے نہیں ملتی۔ جو تذکرہ ایک ہی رات میں طبیعت کے ترنگ کے سہارے تیار کیا جائے اس سے کسی شاعر کے متعلق وقیع معلومات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ ہر شاعر کے متعلق صرف نام یا تخلص کے ساتھ رسمی القاب و آداب لگا کر مبالغہ آمیز تعریفی کلمات درج کر دیے ہیں۔ اشعار کا انتخاب بھی بہت مختصر ہے۔ شعرا کی تعداد صرف چھبیس ہے۔ پہلے گلشن میں مؤلف سمیت نو، دوسرے میں سات اور تیسرے اور چوتھے میں پانچ پانچ شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ چوتھے گلشن کے شعرا جنھیں ہندوستان کے "ادبائے نامدار" سے تعبیر کیا گیا ہے، مرزا نوشہ غالب، والر صاحب، سید شریف حسین، احمد حسن عرشی اور مرزا دبیر لکھنوی ہیں۔ ان میں صرف غالب اور دبیر ایسے ہیں جو "ادبائے نامدار" کے ذیل میں آتے ہیں۔

فرح بخش صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ذریعے اُردو کے بعض شعرا خصوصاً بھوپال سے متعلق شعرا کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تذکرے کی تالیف ۱۲۸۷-۸۸ھ تک کون کون سے شعرا حیات تھے، کون کون سے وفات پا چکے تھے اور کون کون سے بھوپال میں ایک خاص مدت تک رہ کر وہاں سے کہیں اور چلے گئے تھے۔ دوسرے گلشن میں جہاں بھوپال کے متوفی شعرا کا تذکرہ آیا ہے وہاں مؤلف نے دو کو چھوڑ کر باقی کے سالِ وفات کی نشان دہی بھی اس طور پر کر دی ہے:

۱۔ نواب الدولہ جہانگیر محمد خان . . . والی بھوپال تھے بست و ہشتم ماہ ذی قعد سن یک ہزار و دو صد و شصت ہجری عین جوانی میں انتقال کیا۔

۲۔ مولوی حبیب احمد نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال کے استاد تھے۔ بعارضۂ وبا سنہ ۱۲۶۲ھ میں رحلت فرمائی۔

۳۔ مصنّف مثنوی چشمۂ شیریں شیخ عبدالواحد مسکین ۱۲۷۱ھ میں بھوپال میں زیرِ زمین ہوئے۔

۴۔ مولوی امداد علی خیر آبادی کوتوال بھوپال تھے، ۱۲۸۵ھ میں مر گئے۔

۵۔ سید حسین شاہ واصف معروف بہ مولوی بخاری صاحب نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ ولیعہد نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والی بھوپال کے استاد تھے۔ بعارضۂ ہیضہ آخر ۱۲۸۵ھ میں نوجوان راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

تذکرہ شاہجہان بیگم والیۂ ریاست بھوپال کے ترجمے سے شروع ہو کر مرزا دبیر کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ غالب اور مرزا دبیر کے ترجمے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

غالب: ''فردوسی رزم، خسرو بزم، کلیم کلام، نظامی نظام جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالب دہلوی علیہ الرحمۃ مشاہیر بلغائے نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے اور دیوان اُردو اور کلیات فارسی جناب ممدوح مشہور

آفاق ہیں ۔ اس لیے صرف ایک شعر تبرکاً لکھتا ہوں :

بوے گل ، نالۂ دل ، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

آخر ۱۲۸۵ ہجری شہر شاہجہان آباد میں جناب ممدوح کا انتقال ہوا ۔ تاریخ انتقال اکثر شعرائے نازک خیال نے لکھی ہے ۔ از آنجملہ یہ تاریخ جناب مولانا محمد عباس رفعت کی مجھ کو یاد ہے ۔ قابلِ تحسین و داد ہے :

جان اربابِ سخن غالبِ عالی ہمّت
ناظمِ سحر بیان ناثرِ والا فطرت
رشکِ فردوسی و خاقانی و عالی و کمال
ثانیِ خسرو و سعدی و حزین و شوکت
از جہان کرد سفر سوئے ریاضِ رضوان
گفت عبّاس کہ شایانِ سریرِ جنت

دبیر : ''شاعر بے نظیر قدسی ضمیر مرزا دبیر سلمہ القدیر ۔ جناب ممدوح کا کلام تمام ہندوستان میں مثلِ نیر اعظم مشہور ہے ۔ میں دو بند مرثیے کے لکھتا ہوں اور اس رسالے کو ختم کرتا ہوں ۔''

☆ ☆ ☆

خزینۃ العلوم

"خزینۃ العلوم" کے مصنّف منشی درگا پرشاد نادر ہیں - اس تذکرے کے سلسلے میں مؤلف نے لکھا ہے کہ اس کا پورا نام "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" ہے ، خطاب "گلدستۂ نادر الاذکار" ہے اور عرف "تذکرۂ شعرائے دکن" ہے -

درگا پرشاد نادر اُنیسویں صدی کے وسط کے ایک ممتاز ادیب و تذکرہ نگار ہیں - اُنھوں نے اپنے حالاتِ زندگی خزینۃالعلوم کے آخر میں لکھے ہیں - وہ ۳- جمادی الاول ۱۲۴۹ھ روز چہار شنبہ مطابق ۲۱- ستمبر ۱۸۳۳ع بمقام شہر دہلی کوچہ برج ناتھ میں پیدا ہوئے - ۱۸۵۲ع میں دلی کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۵۵ - ۵۶ع تک عربی فارسی اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی - کالج سے نکلنے کے بعد تھوڑے دن کسی دفتر میں ملازم رہے ، بعد ازاں سررشتۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے - ۱۸۵۹ع سے ۱۸۶۳ع تک وہ گڑگاؤں کے تحصیلی مدرسے میں فارسی کے مدرس اول رہے - ۱۸۶۴ع میں پھر دلی آ گئے اور نارمل سکول میں ریاضی کے مدرس مقرر ہوئے - ۱۸۷۲ع میں لاہور پہنچے اور محکمۂ تعلیم کی نصابی کتابوں کی تصحیح پر مامور ہوئے - ۱۸۷۷ع میں ترقی کر کے لاہور کے شعبۂ امتحانات [میں] ممتحن اعلیٰ ہو گئے -[1]

نادر کو لکھنے پڑھنے کا شوق شروع ہی سے تھا چنانچہ تاریخ و تذکرہ کی متعدد تالیفات ان سے یادگار ہیں - شعر بھی کہتے تھے "مطلب غریب" کے نام سے اپنا دیوان بھی مرتّب کیا تھا - ۱۸۶۳ع میں اُنھوں نے اخلاق ناصری کا ایک انتخاب بھی تیار کیا تھا ، یہ ۱۸۶۶ع میں شائع ہوا - "گلزارِ نسیم" اور "قصۂ لیلیٰ مجنوں" کے منتخبات بھی اُنھوں نے مرتّب کیے تھے - "غریب گلزار" کے

۱- خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم ، ص ۲۶۰ ، مطبوعہ مطبع مفید عام لاہور ، مخزونہ کتب خانۂ خاص ، انجمن ترقی اُردو کراچی -

نام سے مختلف تواریخ ہند سے خاندان تیموریہ کا ایک شجرہ بھی اُنھوں نے تیار کیا تھا ۔ رسالہ معیشت، چمن اور معلم المبتدی بھی ان کی تالیفات میں سے ہیں ۔ لیکن ان کے نام کو ادب کی تاریخ میں زندہ رکھنے والے ان کے مرتّب کردہ تذکرے ہیں ۔ ان تذکروں میں "چمن انداز" ۔ "گلشن ِ ناز" اور "خزینۃ العلوم" شامل ہیں ۔ "گلشن ناز" فارسی گو شاعرات کا تذکرہ ہے اور "چمن انداز" ریختہ گو شاعرات کا ۔ "گلشن ِ ناز" ہمارے موضوع کے دائرے سے خارج ہے، چمن انداز پر مفصل بحث علٰحدہ کی گئی ہے ۔

یہ تذکرہ خود مؤلف کی دی ہوئی تفصیلات کے مطابق ۱۸۷۰ - ۱۸۷۱ع مطابق ۱۲۸۸ھ میں لکھا گیا ۔ ۱۸۷۵ع مطابق ۱۲۹۲ھ میں مسودہ صاف ہوا اور ۱۸۷۷ع مطابق ۱۲۹۴ھ میں اپنے حالات شامل کر کے مصنف نے اسے طباعت کے لیے دے دیا ۔[۱] یہ پہلی بار ۱۸۷۹ع مطابق ۱۲۹۶ھ میں منشی گلاب سنگھ قصوری مالک مطبع مفید عام لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا ۔ اس میں ۲۷۰ صفحات ہیں اور اس کا ایک مطبوعہ نسخہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے ۔ اس کے سرورق پر "مطبع مفید ِ عام" کے ساتھ اس کی تاریخ اشاعت نومبر ۱۸۷۹ع طبع اول درج ہے ۔ یہی عبارت انگریزی میں کتاب کے دوسری طرف درج ہے اور درگا پرشاد نادر کے نام کی مہر بھی لگی ہوئی ہے ۔ سرورق کی پیشانی پر مؤلف کے یہ دو شعر بھی ملتے ہیں :

ہوا مطبوع نادر یہ رسالہ ہو مطبوع خلائق بھی خدایا
رہے دنیا میں مدت تک یہ قائم کہ نادر کی ہے یہ نادر تمنّا

سرورق ہی پر نیچے دو شعر اور ہیں :

در مطبع مفید عام لاہور مطبوع ہوا ہے یہ بصد غور
تھوڑا ہی چھپا ہے یہ رسالہ قیمت ہوئی اس لیے زیادہ

کتاب تعداد میں تین سو پچاس چھپی ہے اور قیمت دو روپے چار آنے ہے ۔ بیرونی سرورق کے بعد، اندر پھر ایک سرورق ہے اس پر تذکرے کا نام

۱- دیباچہ دستور الفصاحت، ص ۱۰۶، مرتّبہ مولانا عرشی رام پوری مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

اس طور پر لکھا ہے :

"خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" المخاطب بہ "گلدستۂ نادر الاذکار" المعروف بہ تذکرۂ شعرائے دکن ۔"

جس کے تاریخی نام "مرغوبِ دلہا" "اقوالِ مختلف" بشیر خوش تقریر نے رکھے ہیں ۔"

اس کے بعد مندرجہ ذیل تاریخ طباعت ملتی ہے :

"مارچ ۱۸۷۹ع ، ربیع الاول ۱۲۹۶ھ ۔"

بعد ازاں اُلفت حسین اُلفت ، میرزا قربان علی بیگ ، ہزاری لال ، موہن لال اور منشی بنارسی داس کی تقریظیں اور دیبی پرشاد بشاش اور شاہ بہاء الدین عرف میاں عبداللہ شاہ متخلص بہ بشیر کے قطعات تاریخِ اتمام درج ہیں ۔ بشیر کا ایک قطعہ یہ ہے :

درگا پرشاد میرے مشفق نے　　طرفہ تر تذکرہ کیا تیار
اس کی تاریخ اے بشیر ہے یہ　　زیبِ آئین نادر الاذکار

فہرست مضامین اور فہرست مآخذ تذکرے کے خاتمے پر دی ہوئی ہے اس سے پہلے سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ کی تقریظ اور سب کے آخر میں صحت نامہ ہے ۔

تذکرہ اُردو زبان میں ہے اور جیسا کہ مؤلف نے خود لکھا ہے کہ :

"اس کتاب میں دو سو چھپّن شاعروں اُردو گو کا مختصر حال و مقال مع قواعد و ضوابط ضروریہ علم عروض و قافیہ و بدیع و معانی و بیان وغیرہ کے درج ہے ۔"

اس تذکرے کی تالیف کے وقت مؤلف کے پیشِ نظر یوں تو اُردو فارسی شعرا کے متعدد تذکروں کے ساتھ کئی دوسری علمی و فنی کتابیں بھی رہی ہیں لیکن جیسا کہ خود مؤلف نے اس کی وضاحت کر دی ہے ان کا تذکرہ در اصل "مخزن شعرا" مؤلفۂ قاضی نورالدین کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے ۔ "مخزن شعرا" گجرات سے متعلق شعرا کا تذکرہ ہے ، اس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے ۔ گجرات کا شمار چوں کہ دکن میں ہوتا ہے اور درگا پرشاد نادر دکنی شعرا کا تذکرہ لکھ رہے تھے اس لیے اُنھوں نے مخزن شعرا کو سامنے رکھ کر اس میں جو کمی تھی

اسے پورا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مخزن شعرا میں صرف ایک سو آٹھ شاعروں کا تذکرہ تھا ، نادر نے اس میں اضافہ کر کے اسے دو سو چھپن شاعروں کا تذکرہ بنا دیا ہے ۔ اس اضافے کے سلسلے میں انھوں نے متعدد مآخذوں سے مدد لی ہے ۔ ''مخزن شعرا'' کے علاوہ ''گلشن بے خار'' مؤلفہ شیفتہ ، ''گلستان سخن'' مؤلفہ قادر بخش صابر اور ''گلشن ہند'' مؤلفہ لطف وغیرہ کو بھی سامنے رکھا ہے ۔ اپنے سارے مآخذ کا سراغ مؤلف نے کتاب کے آخری صفحوں میں دے دیا ہے ۔

خزینۃ العلوم ''تذکرۂ شعرا'' سے کہیں زیادہ علم و فن سے متعلق ایک گراں قدر تالیف کہلانے کی مستحق ہے ۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا مقدمہ سات کلیدوں پر مشتمل ہے ، کلیدوں کی تفصیل یہ ہے :

پہلی کلید : علتِ غائی اور مبادی و موضوع کے بیان میں ۔

دوسری کلید : اقسام کلام کی تعداد اور شعر کی تعریف میں ۔ اس کی ساخت دو پیچہ ہے ۔ پہلا پیچ حروف تہجی اور کلام کے بیان کا بنایا گیا ہے ۔ دوسرا پیچ شعر اور قیود شعری کی تعریف میں دو پھولوں سے گھڑا گیا ہے ۔

پہلا پھول قوافی کے بیان میں کھلا ہے ۔

دوسرا پھول علم عروض کی بہار دکھا رہا ہے ۔

تیسری کلید : ابتدائے شعر اور موجد شعر کا بھید کھلا ہے ۔

چوتھی کلید : ریختہ اور ریختی کے رنگ شاعری کے ڈھنگ ظاہر کرتی ہے ۔

پانچویں کلید : اقسام اربعہ شعریہ کی مثالیں عرض کرتی ہے صدہا کتابوں کے نام بتاتی ہے ۔

چھٹی کلید : اقسام کلام بہ اعتبار معنی کا قفل کھولا جاتا ہے ۔

ساتویں کلید : علم موسیقی کے ساز کو درست کر کے عجیب و غریب ترانے سناتی ہے ۔

ان مباحث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''خزینۃ العلوم'' کی کیا نوعیت ہے اور وہ کس قسم کی تالیف ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں مندرجہ بالا سارے موضوعات پر تفصیل سے عالمانہ بحث کی گئی ہے اور ہر بات کے لیے مستند شعرا

کے کلام سے حوالے اور مثالیں درج کی گئی ہے -

جہاں تک شعرا کے تراجم اور منتخبات کلام کا سوال ہے وہ بہت ہی مختصر ہیں - عموماً ایک دو سطریں لکھی گئی ہیں اور ایک دو شعر نمونۂ کلام میں دیے گئے ہیں - چنانچہ اس تذکرے سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دکن سے تعلق رکھنے والے شعرا کی تعداد کتنی تھی لیکن ان کے سوانح حیات اور کلام کے بارے میں قاری کو کوئی مفید بات نہیں معلوم ہوتی - وجہ یہ ہے کہ شعرا کے تراجم بہت تشنہ اور منتخبات حد درجہ مختصر ہیں - اس کے دیباچے سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ قاضی نور الدین فائق کے چھوٹے بھائی حفیظ اللہ خاں تسکین نے ''مخزن شعرا'' پر حاشیہ لکھا تھا جس سے ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ع کا احوال معلوم ہوتا ہے - ابو محمد نے بھی ایک دو جگہ حاشیہ لکھا ہے - یہ حواشی بالعموم سنین وفات ظاہر کرتے ہیں اور ''مخزن شعرا'' مطبوعہ انجمن میں اکثر مفقود ہیں -[1]

یہ تذکرہ آرزو و آزاد کے ترجموں سے شروع ہو کر یعقوب و یکرنگ کے ترجموں پر ختم ہو جاتا ہے - ان ترجموں کی اصل کیفیت کو سمجھنے کے لیے چاروں تراجم یہاں درج کیے جاتے ہیں :

آرزو : ''سید نظام الدین وکالت پیشہ نے ۱۲۸۴ھ بہ بلدۂ بھروچ رحلت کی جس کا یہ شعر ہے -''

آزاد : ''میر فقیر اللہ دکھنی ہم عصر ولی یوں سخن سرا تھا -''

یکرنگ : یکرنگ کا ایک قصیدہ فارسی و اُردو زبان کے شعروں کا ارسطو جاہ کی تعریف میں نظر سے گزرا از آنجاست -''

یعقوب : یعقوب تخلص ہے یعقوب علی خاں خلف محمد علی خاں رام پوری پٹھان ملازم سرکار بڑودہ کا جو فارسی و گجراتی زبانوں میں مہارت رکھتا ہے اور علم موسیقی سے بھی واقف ہے - یہ بیت اس کی ہے -''

☆ ☆ ☆

۱- دیباچۂ دستور الفصاحت ، ص ۱۰۶ -

شمیمِ سخن

(حصہ اول)

شمیم سخن کے مؤلف کا نام محمد عبدالحئی ہے صفا تخلص کرتے تھے۔ بدایوں کے باشندے تھے۔ شعر و سخن میں مولوی سید دلدار علی مذاق بدایونی کے شاگرد تھے۔ خمخانۂ جاوید میں صفا کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''آپ شیخ عبداللہ مکی کی اولاد سے تھے۔ یہ خاندان ۶۱۰ھ سے بدایوں میں آباد ہے۔ صفا مرحوم کو فن شعر میں حضرت مولانا دلدار علی مذاق بدایونی شاگرد حضرت ذوق مرحوم سے تلمذ تھا۔ شعر کے حسن و قبح پرکھنے میں خداداد قابلیت پائی تھی۔ اخبار نویسی کے ابتدائی دور میں اُردو اخبار سید الاخبار دہلی ''لارنس گزٹ میرٹھ'' کے واقعہ نگار تھے۔ زبان اُردو کی ترقی کے بارے میں بھی زبردست مضامین لکھے۔ کئی کتابیں آپ کی تصنیف سے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک تذکرۂ شمیم سخن بھی ہے۔ اس کے پہلے حصے میں شعرائے ذکور اور دوسرے حصے میں شاعرہ عورات کا حال درج ہے۔ کلام میں اپنے استاد کا تتبع کرتے ہیں۔''[1]

صفا نے ''شمیم سخن'' کے دیباچے اور اپنے ترجمے میں بھی اپنا حال لکھا ہے لیکن بہت مختصر۔ ہاں تذکرۂ ''مذاق سخن'' میں انھوں نے اپنے بارے میں قدرے وضاحت سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''محمد عبدالحئی نام ابن شیخ فقیہ الدین احمد متوطن بدایوں . . . حضرت مولانا سید محمد دلدار علی مذاق بدایونی سے گاہ گاہ فکر سخن کرتا ہے . . . بہ اصرار احباب یہ چند اشعار اپنے نذر ناظران باوقار کرتا ہوں . . .

۱۔ خمخانۂ جاوید، ص ۳۰۰، جلد پنجم، مطبوعۂ دہلی ۱۹۴۰ع۔ مملوکہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو کراچی۔

دیوان اُردو نیاز مند موسوم بہ ''نظم محمد عبدالحیٰ بدایونی'' مرتّب ہے اور اکثر اوقات کتب نظم و نثر مؤلفہ و مصنّفہ نیاز مند مثل عمدۃ التواریخ ، محاربۂ کربلا و مثنوی نغمۂ بے بدل و شروح قوانین و تذکرۂ شمیم‌سخن ، گلدستۂ انجمن وغیرہ پسند خاطر اصحاب فہم و ذکا ہیں ۔ اکثر مطبوعہ اور بعض زیور طبع سے معرا ہیں ۔ عرصہ تین سال سے مشق سخن ترک کر دیا ہے ۔''[۱] (۲۵ اشعار)

صفا کے ہم عصر اور حضرت مذاق بدایونی کے ایک اور شاگرد محمد فضل اکرم اپنے تذکرے میں صفا کے متعلق لکھتے ہیں :

''صفا مولوی عبدالحیٰ ابن شیخ فقیہ الدین احمد رئیس بدایوں ۔ یہ صاحب نہایت ذہین اور پُر گو شاعر ہیں ۔ ابتدائے عمر سے ان کو شاعری کا شوق ہوا ۔ حضرت مذاق کے فیض سے مذاق کلام کا پا کر وہ کمال پیدا کیا کہ شاعروں میں یگانہ بلکہ جملہ اہلِ سخن میں فرزانہ سمجھے گئے . . . یہ صاحب صاحبِ تصانیف کثیر ہیں ۔ ایک تذکرہ ''مذاق سخن'' ان کی تصنیف سے طبع ہو چکا ہے ۔ دوسرا ''شمیمِ سخن'' چھپا ہے ۔ اکثر رسالے قانون کے بھی تصنیف کر کے چھپوا چکے ہیں ۔ آج کل عدالت دیوانی ضلع مراد آباد میں وکیل ہیں ۔ علم تواریخ میں وہ کمال پیدا کیا ہے کہ شاید . . . عرصہ ہوا اشعار عاشقانہ لکھنا ترک کر دیا . . . ایک دیوان بھی مرتّب کیا ہے اس کا تاریخی نام ''نظم محمد عبدالحیٰ بدایونی'' ہے ۔''[۲]

یہ تذکرہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں مکمل ہوا ہے ۔ مصنف نے دیباچے میں خود لکھا ہے :

''نام اس تذکرے کا ''شمیم سخن'' رکھا گیا اور جب یہ تمام ہوا ، ۱۲۸۹ھ تھے ۔ لہٰذا ''غنچۂ کلام'' ''بہارِ کلام نظم'' ، ''اقبالنامۂ عشرت افزا'' تین تاریخی نام بھی تجویز کیے ۔'' (ص ۱۰)

۱۔ تذکرۂ مذاق سخن ، مؤلفہ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء از صفا بدایونی ، مطبوعہ مطبع صبح بدایوں ۱۲۹۹ھ ، مملوکہ محمد ایوب قادری استاد اُردو کالج کراچی ۔

۲۔ ''بہارستان شعرا'' ، مرقومہ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء ، مطبوعہ مطبع بدایوں ۱۲۹۹ھ ۔

شمیم سخن حصۂ اول مطبع امداد الہند وعین الاخبار مراد آباد سے شائع ہوا۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے ۔ اس کے آخر کے چند صفحات غائب ہیں ۔ سال طباعت کا سراغ سرورق یا دیباچے سے نہیں ملتا ۔ خاتمے کے متعلق یوں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مطبوعہ نسخہ ناقص الآخر ہے ۔

''شمیم سخن'' جس میں چھ سو سے کچھ زائد شعرا کے تراجم شامل ہیں ، اُردو میں ہے اور اس کے فہرست مضامین کی ترتیب اس طور پر ہے کہ پہلے حمد و نعت و منقبت ہے ۔ پھر سبب تالیف کے عنوان سے تذکرے کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس کے بعد اُردو زبان اور شاعری کی تاریخ مختصراً بیان کی گئی ہے ۔ تاریخ کے ضمن میں شعرائے متقدمین و متوسطین کا ذکر آیا ہے ۔ اسے کتاب کا مقدمہ کہنا چاہیے ۔ مقدمے کے بعد شعرا کے تراجم بلحاظ حروف تہجی دیے گئے ہیں ۔ سب سے آخر میں مؤلف نے اپنے استاد محمد دلدار علی مذاق بدایونی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور نمونۂ کلام میں سیکڑوں اشعار درج کیے ہیں ۔

مقدمے میں مؤلف نے اپنے تذکرے کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''اس تذکرے کے دو حصے مقرر کر کے حصۂ اول میں شعرا کا کلام حصۂ دوم میں شاعرات اُردو کا کلام و حال درج ہوا ہے ۔''

ہم ''شمیم سخن'' حصۂ دوم پر الگ بحث کر چکے ہیں ۔ شمیم سخن حصۂ اول کی اصل نوعیت کے بارے میں خود مؤلف نے دیباچے میں لکھا ہے :

''اس تذکرے میں صرف وہی شاعر جلوہ افروز ہیں کہ جو ۱۲۸۸ھ یا اس کے بعد رونق افزائے عالم ہستی تھے یا اس کے بعد تک زندہ تھے اور جن حضرات نے ۱۲۸۸ھ سے پہلے اس دارِ فانی کو خیر باد کہا ان کا کلام و حال درج تذکرہ نہ ہوا ۔ البتہ دیباچے کو شعرائے ماسبق کے کلام سے زینت دی گئی ۔'' (ص ۱۰)

اس عبارت سے گمان ہوتا ہے کہ مصنّف نے اس میں صرف ان شاعروں کا ذکر کیا جو ۱۲۸۸ھ یا اس کے بعد تک زندہ تھے لیکن تذکرے کی نوعیت اس کے بالکل برعکس ہے ۔ آغاز تا انجام اس کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں صرف وہ شاعر زیر بحث آئے ہیں جو ۱۲۸۸ھ یعنی تذکرے کے تکملے کے وقت تک فوت

ہو چکے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ طباعت کے وقت دیباچے کی عبارت درست نہیں کی گئی ورنہ اگر مذکورہ بالا عبارت میں "بعد" کی جگہ "پہلے" اور "پہلے" کی جگہ "بعد" پڑھیں تو تذکرے کی نوعیت مصنّف کے قول کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اس خیال کو یوں تقویت پہنچتی ہے کہ مصنّف نے دیباچے کے اختتام پر تذکرے کی نوعیت پر دوبارہ یوں روشنی ڈالی ہے :

"اب میں دیگر مشاہیر اُردو کا کلام بہ ترتیب حروف تہجی گزارش کرتا ہوں اور پھر یاد دلاتا ہوں کہ یہ وہ حضرات ہیں کہ جو ۱۲۸۸ھ سے پہلے اس جہانِ فانی کو چھوڑ کر راہی عدم ہوئے اور جو فن شعر میں لاجواب اور فصاحت و بلاغت میں انتخاب تھے ۔" (ص ۸۳)

تراجم شعرا کے خاتمے پر مؤلف نے "تمت" کے تحت بھی یہی لکھا ہے کہ :

"میں حسب وعدہ ان کا کلام و حال لکھ چکا ہوں جو ۱۲۸۸ھ سے پیشتر رہ گزار عدم ہوئے ۔ اب یہ جلد خاتمہ پر آئی اور میں چاہتا ہوں کہ خاتمہ کو کسی ایسے روشن ضمیر و کامل کے اشعار سے ترتیب دوں جن کی استادی کے اکثر کاملین فن شعر معترف ہوں ۔ . . . جب میں بہ نظر غور دیکھتا ہوں تو ان اوصاف سے متصف میں اپنے استاد حضرت مولانا سید محمد دلدار علی مذاق بدایونی کو پاتا ہوں ۔" (ص ۲۶۱)

چنانچہ تذکرے کا خاتمہ مذاق بدایونی کے تفصیلی ذکر پر ہوتا ہے ۔ اس تذکرے کا سب سے کارآمد حصہ اس کا دیباچہ یا مقدمہ ہے ۔ اس میں مؤلف نے "سبب تالیف" کے زیرِ عنوان پہلے تذکرہ نگاری کی روش کا جائزہ لیا ہے ، پھر اپنے تذکرے کی تالیف کا جواز پیدا کرتے ہوئے اس کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے ۔ اس سلسلے کے چند متعلقہ ٹکڑے یہ ہیں :

"جب ہم اپنے ہم عصروں اور ہم وطنوں کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو کمال افسوس ہوتا ہے اور خیال آتا ہے کہ کوئی سامان ایسا کیا چاہیے کہ جس کی بدولت ہماری زبان ترقی پائے ۔ ہماری زبان کے موجودہ شاعروں کا نام باقی رہے اور زمانۂ حال کے حالات لکھ کر آئندہ نسلوں میں بھی شوق تصنیف و تالیف پیدا ہو ۔" (ص ۸)

"ابتدائے سن شعور سے مجھ کو تصنیف و تالیف کا شوق رہا ہے اور اکثر

اوقات شعر گوئی کا بھی اتفاق ہوا ۔ اپنے اس شوق تصنیف و تالیف میں میں نے سیکڑوں شعرائے ماضی و حال اُردو فارسی کے دیوان ، بیسیوں تذکرے ، صدہا بیاضیں اُلٹ پلٹ ڈالیں ، کتب تواریخ و رسائل صنائع بدائع شعری کی بھی ورق گردانی کی ، مختلف جلسے دیکھے ، بڑے بڑے شعرائے کمال کی صحبتوں سے مستفید ہوا ، جس کا کلام دل کو بھلا معلوم ہوا اپنی بیاض میں درج کر لیا ۔ آخر کو اس انتخاب نے کچھ اور ہی رنگ پیدا کیا ۔''

''اب اُردو زبان کے عام شاعروں کے چند تذکرے مرتّب ہوئے ہیں لیکن بجز چار پانچ تذکروں کے اور کوئی تذکرہ مجھ کو ایسا نہ ملا جس میں انتخاب عمدہ ہو یا براہ انصاف بلا رو رعایت حالات شعرا مندرج ہوں ، جس کو ایک مؤرخ یا محقق سند تسلیم کرے ۔''

''ہمارے ابنائے جنس میں بڑی خراب رسم یہ رائج ہے کہ بجائے اس کے کہ اپنی تصنیف کو مقبول و مفید عام کریں اپنے ذاتی تعلقات کو دخل دے کر اس کو مدح یا ذم سے بھر دیتے ہیں جس کو کوئی عاقل پسند نہیں کرتا ۔''

''تذکرہ ہائے شعرا جو وقعت کی نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں ان میں اول درجے پر گلشن بےخار ، دوسرے درجے پر سخن شعرا ، تیسرے درجے پر گلستان سخن اور چھوتھے درجے پر تذکرۂ شعرائے دکن (نادر) ہے ۔''

''بہ خوفِ طوالت شعرا کا حال نہایت ہی اختصار کے ساتھ لکھا گیا ۔ انتخابِ کلام اپنے مذاق شعر فہمی کے مطابق کیا گیا ۔ حتی الوسع نہ کسی کی مذمت سے تعلق رکھا نہ کسی کی بیہودہ مدح سرائی کی ۔ جہاں تک ہو سکا امرِ واقعی تحقیق کر کے ظاہر کیا گیا ۔''

اس کے بعد مؤلف نے اُردو زبان اور اس کی شاعری کی تاریخ سے بحث کی ہے ۔ محمد حسین آزاد کی طرح تاریخ نظم و زبان اُردو کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور نظم اُردو کے موجد حضرت امیر خسرو ہیں ۔ ولی کو صفا نے احمد آباد گجرات کا باشندہ بتایا ہے اور اس بات کا اعترافِ

کیا ہے کہ اُردو زبان کی تکمیل اور شاعری کا آفتاب دکن سے چمکا۔ اس سلسلے میں مصنف نے بیاسی صفحے کا تفصیلی مقدمہ لکھا ہے جس میں متقدمین شعرا کے مختصر حالات کے ساتھ نمونۂ کلام بھی درج کیا گیا ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ کی خصوصیات اور خدمات کا سلیقے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ سوسائٹی اور شاعری اور ادب و اخلاق کے باہمی تعلق پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں زبان و شاعری کے سلسلے میں اور بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو انھیں آزاد و حالی کا ہم نوا اور پیش رو ثابت کرتی ہیں۔

اُردو شاعری کی تاریخ کے سلسلے میں مؤلف نے پہلے امیر خسرو، سراج الدین خاں آرزو، مرزا معز الدین فطرت، ناجی محمد شاکر، شرف الدین مضمون اور حاتم کا ذکر کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ:

''اس کے بعد مظہر، فغاں، تاباں، فدوی، بیان، راسخ، سودا، میر، انشا، قائم، درد، سوز، نوا، بقا، جرأت، مصحفی، رنگین، احسن، اسد، حیران، دیوانہ، افسوس، انجام، بیدل، تجلی، حسرت، حسن اور آفتاب وغیرہ شعرائے اُردو رونق افروز عالم ہستی ہوئے اور انھوں نے اپنی جودت طبع سے پچھلے ٹیڑھے راستے زبان اُردو کے صاف کرکے ایک سیدھا راستہ دکھایا۔'' (ص ۲۳)

مؤلف نے ان سب کا مختصر حال لکھ کر دہلی کے اساتذہ میں شاہ نصیر، ذوق، ممنون، غالب، مومن، احسان، آزردہ، سوز، ظفر، شیفتہ اور اثر کے اور لکھنؤ کے اساتذۂ فن میں ناسخ، آتش، صبا، وزیر، گویا، رند اور آباد کے مختصر حالات مع انتخاب کلام درج کیے ہیں۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ:

''میں ان حضرات کا کلام بھی تھوڑا تھوڑا لکھوں گا اور بعد ان کے کلام کے دیگر شعرائے مشہور کا کلام بھی ناظرانِ رسالہ کے ملاحظے میں پیش کروں گا۔ یہ وہ شعرا ہوں گے جو ۱۲۸۸ ہجری سے پہلے دنیائے فانی ترک کرکے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔'' (ص ۳۹)

مقدمے کے بعد شعرا کا ذکر ردیف وار بلحاظ حروف تہجی کیا گیا ہے لیکن یہ ذکر اس قدر مختصر ہے کہ شاعر کی زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوتی جو اس کی شخصیت یا شاعری کے سمجھنے میں معاون ثابت ہو۔

زیادہ تر نصف سطر سے لے کر دو سطریں تک ہر شاعر کے بارے میں ملتی ہیں۔ کہیں کہیں چار چھ سطریں نظر آتی ہیں۔ اشعار کے انتخاب کا بھی یہی حال ہے۔ ہاں مقدمے میں جن اساتذۂ فن کا تذکرہ ہے ان کے منتخبات خاصے طویل ہیں۔ آخر میں دلدار علی مذاق کا حال بھی مفصل لکھا گیا ہے۔ باقی تراجم حد درجہ مختصر اور تشنہ ہیں۔ بایں ہمہ اس تذکرے میں سنین وفات دینے کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ مقدمہ اور تذکرے کے متن دونوں میں شعرا کے سال وفات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

مقدمے میں جن شعرا کا ذکر آیا ہے ان کے سنین وفات کی چند مثالیں دیکھیے:

۱- امیر خسرو : ''حضرت ممدوح کی وفات ۱۳۲۵ھ [کذا؟] میں ہوئی۔''
۲- مرزا معزالدین فطرت : ''۱۱۰۱ھ میں وفات پائی۔''
۳- آرزو : ''۱۱۶۹ھ میں فوت ہوئے۔''
۴- مظہر : ''ماہ محرم ۱۱۹۵ھ میں بمقام دہلی شربتِ شہادت نوش کیا۔''
۵- فغان : ''۱۱۸۶ھ میں انتقال کیا۔''
۶- سودا : ''۱۱۹۵ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔''
۷- میر : ''۱۲۲۵ھ میں بمقام لکھنؤ فوت ہوئے۔''
۸- قائم : ''۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔''
۹- آفتاب شاہ عالم : ''۱۲۲۱ھ میں رحلت کی۔''
۱۰- منّت : ''۱۲۰۸ھ میں رحلت کی (بمقام کلکتہ)۔''
۱۱- نصیر : ''۱۲۵۴ھ میں رحلت کی۔''
۱۲- ذوق : ''۱۲۷۱ھ میں راہی فردوس بریں ہوئے۔''
۱۳- ممنون : ''۱۲۶۰ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔''
۱۴- غالب و اسد : ''۱۲۸۵ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔''
۱۵- مومن : ''۱۲۶۸ھ میں قضا کی۔''
۱۶- آزردہ : ''۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔''
۱۷- ظفر : ''۱۲۷۹ھ میں انتقال کیا۔''

۱۸- **شیفتہ** : "۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔"

۱۹- **ناسخ** : "۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔"

یہی صورت مقدمے کے علاوہ اصل تذکرے کے تراجم کی ہے۔ یعنی ان میں بھی مختصر نویسی کے باوصف سنینِ وفات دینے کی کوشش ملتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

اصغر : "نواب علی اصغر خاں ۱۲۷۶ھ میں فوت ہوئے۔"

آصف : "آصف الدولہ ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔"

امانت : "آغا حسن ۱۲۷۶ھ میں انتقال کیا۔"

اوج : "عبداللہ خاں ۱۲۷۰ھ میں فوت ہوئے۔"

ضیغم : "حافظ اکرام ۱۲۸۶ھ میں بمقام ڈھاکہ انتقال کیا۔"

لیکن یہ کیفیت صرف معروف و مشہور شعرا کے تراجم کی ہے۔ باقی شعرا کے تراجم سے نام و تخلص کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ تراجم کے اختصار کی کیا صورت ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تراجم سے لگایا جا سکتا ہے:

آباد : "آباد تخلص، محمد یعقوب علی خاں خلف محمد اسحاق خاں دہلوی کم علم موزوں طبع تھے۔"

یوسف : "یوسف تخلص میر یوسف علی باشندۂ دہلی شاگرد عزت اللہ عشق۔"

یمین : "حکیم احمد علی خاں دہلوی شاگرد قدرت اللہ قاسم۔"

یکدل : "دلاور علی خاں شاگرد و برادر مصطفیٰ خاں یکرنگ باشندۂ دہلی۔"

غرض کہ اس تذکرے کا مقدمہ جس میں زبان و شاعری کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے، اصل تذکرے کی بہ نسبت زیادہ کارآمد ہے۔ اس میں بعض ایسے مسائل کا ذکر ملتا ہے جس سے اس زمانے کے تذکرہ نگار سروکار نہ رکھتے تھے۔ رہے شعرا کے تراجم ان میں سے بعض کے تلمذ و سکونت اور سنینِ وفات کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے اور ادبی تاریخ کے لیے اس کے یہی اجزا مفید خیال کیے جا سکتے ہیں۔

✡ ✡ ✡

شمیمِ سخن

(حصہ دوم)

"شمیم سخن" کے مصنّف عبدالحئی صفا بدایونی کا ذکر اس سے پہلے "شمیم سخن" حصہ اول کے سلسلے میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

"شمیم سخن" حصہ دوم بھی "شمیم سخن" حصہ اول کے ساتھ لکھا گیا ہے اور پہلے حصے کی طرح اس کا بھی سال تصنیف ۱۲۸۹ھ ہے۔ اور ۱۸۹۱ع میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے یہ دوسری بار چھپا ہے۔ نول کشور کے یہ مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں۔ اس میں ۵۲ صفحے ہیں، ۳۶ صفحے پر اصل تذکرہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد قطعات تاریخ اور تقریظیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اکثر قطعات کے مادۂ تاریخ سے شمیم سخن کا سنِ تصنیف ۱۲۸۹ھ اور بعض سے ۱۲۹۰ھ نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تذکرہ ۱۲۸۹ھ کے آخر اور ۱۲۹۰ھ کے آغاز میں تکمیل کو پہنچا ہے۔ قطعہ لکھنے والوں اور تقریظ نگاروں میں بعض کم معروف یا غیر معروف شعرا کے ساتھ ساتھ منشی دیبی پرشاد، سحر بدایونی، مظفر حسین صبا، عبدالغفور نساخ اور سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ بھی شامل ہیں۔ مظفر حسین نے اپنی تقریظ کے خاتمے پر یہ قطعۂ تاریخ دیا ہے:

بوئے خوش سے مہک پڑا عالم
طبع جس دم ہوا شمیمِ سخن
با دلِ خوش صبا پئے تاریخ
بولا راحت فزا شمیمِ سخن

۱۸۸۲ع

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تذکرہ ۱۸۸۲ع مطابق ۱۲۹۹ھ میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ سالِ طبع کے سلسلے میں اور بھی قطعات درج ہیں، ان کے

تاریخ ہائے مادہ سے طباعت کا سال ہجری میں ۱۳۰۰ یا ۱۲۹۹ھ اور عیسوی میں ۱۸۸۳ یا ۱۸۸۲ع نکلتا ہے۔ صحفہ ۱۴ پر احسان کے قطعۂ تاریخ آغاز و اختتام طبع کے ذیل میں حاشیے پر یہ نوٹ دیا ہوا ہے:

"مخفی نہ ماند کہ تالیف این تذکرہ درسن یکہزار و سہ صد ہجری بہ انجام رسیدہ و عزم چنان بود کہ ہمدران سال کار طبعش ہم بانجام رسیدہ باشد چنانچہ اکثر احبا شیوا گفتار بہ فرستادن قطعات تاریخی وغیرہ ہمدراں مدت مرہونِ منت کردند۔ لیکن اتفاقاً در آن سال کارِ طبعش بالتوا کشید۔"[1]

اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ شمیم سخن حصۂ اول کے آغاز کا سال دراصل ۱۲۸۹ھ ہے اور تکملہ اس کا دس گیارہ سال کی مدت میں ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ع) میں ہوا ہے اور اس کے فوراً بعد ایک سال کے اندر یہ شائع ہو گیا ہے۔ پہلی بار کہاں سے شائع ہوا؟ جب تک طبع اول کا کوئی نسخہ ہاتھ نہ آ جائے کچھ بتانا مشکل ہے۔ ممکن ہے شمیم سخن حصۂ اول کی طرح یہ بھی پہلے پہل مطبع امدادالہند و عین الاخبار مراد آباد سے چھپا ہو۔

یہ تذکرہ اُردو زبان میں ہے اور صرف ایک سو اکیاون شاعرات کے مختصر تراجم اور انتخاب اشعار پر مشتمل ہے۔ بلحاظ زمانہ اسے شاعرات اُردو کا تیسرا تذکرہ کہنا چاہیے، اس لیے کہ اس سے پہلے فصیح الدین رنج کا بہارستانِ ناز ۱۸۶۴ع میں اور درگا پرشاد نادر کا چمن انداز ۱۸۷۷ع میں لکھا جا چکا تھا۔ مؤلف شمیم سخن نے یقیناً ان دونوں تذکروں سے یا کم از کم بہارستانِ ناز سے ضرور فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس لیے کہ شمیم سخن اور اُس کے تراجم اکثر جگہ تقریباً ایک سے ہیں اور صاف ظاہر کرتے ہیں کہ شمیم سخن کے تراجم بہارستان کے تراجم سے مستفید ہیں۔ بہارستانِ ناز میں منی بائی حجاب، سردار بیگم سردار، امیر جان شرارت، شیرین وحید، لعل بے بہا گوہر، قمر، جان مشتری، ہندی جان ناز اور اختر محل اختر کے بارے میں مؤلف نے بہارستانِ ناز میں جو کچھ لکھا ہے شمیم سخن کے مؤلف نے مختصر لفظوں میں اسی کو دہرا دیا ہے۔ کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں

۱۔ شمیم سخن حصہ دوم، ص ۱۴، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۱ع، طبع دوم۔

ملتا ۔ صفا کے بعض بیان سے یہی پتا چلتا ہے کہ شمیم سخن سے پہلے کے تذکرے ان کے سامنے رہے ہیں ۔ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :

''ہم نے اس حصے کو دو فصل پر منقسم کر دیا ہے ۔ فصل اول میں عورات بازاری کا ذکر ہے ، فصل دوم میں عورات پردہ نشین و با عفت و عصمت کا تذکرہ لکھا ہے ، ہم کو شرم آئی کہ ہم مثل دیگر تذکرہ نویسوں کے عوراتِ بازاری و پردہ نشین کو ایک ہی طرح پر بلا امتیاز یاد کریں ۔ ہم نے اس حصے میں اپنی شرط کو کہ تذکرے میں صرف شعرائے ذی حیات کا کلام ہوگا ، اس لحاظ سے توڑ دیا کہ شاعرہ عورتیں بہت کم دستیاب ہوئیں ۔ ہم نے اس حصے میں حتی الوسع کسی عورت کے خال و خط کی تعریف نہیں کی نہ ہم کو کسی کے حسن و جمال کی تعریف کرنے سے مطلب تھا ۔''[1]

آخری جملوں میں صفا کا اشارہ یقیناً بہارستانِ ناز کے مؤلف فصیح الدین رنج کی طرف ہے ۔ اس لیے کہ انھوں نے شاعرات خصوصاً طوائفوں کے حسن و جمال کا ذکر چٹخارہ لے کر کیا ہے اور ہر ایک کے حال و خط وضاحت سے بیان کیے ہیں ۔ لیکن شمیم سخن کے مؤلف کی عبارت فصیح الدین رنج کی عبارت کے مقابلے میں زیادہ باوقار اور ادیبانہ ہے ۔

جیسا کہ پچھلی سطور سے ظاہر ہے صفا بدایونی نے اس تذکرے میں ایک جدت یہ کی ہے کہ خواتیں پردہ نشین کو شاہدانِ بازاری سے الگ کر دیا ہے ۔ چنانچہ اس تذکرے کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے : فصل اول میں ۱۰۲ شاعرات بازاری کا ذکر ہے اور فصل دوم میں ۹۴ شاعرات کا تذکرہ بہ عنوان ''عورات پردہ نشین و با عصمت'' آیا ہے ۔ مصنّف کا پہلے خیال تھا کہ تذکرے کا حلقہ صرف زندہ شاعرات تک محدود رہے گا لیکن پھر خدا جانے کیوں یہ شرط اڑا دی اور شروع سے لے کر معاصر شاعرات تک سب کو تذکرے میں شامل کر لیا ۔ تنقید کے لحاظ سے تو نہیں ہاں سوانحی اعتبار سے یہ تذکرہ اپنی اختصار پسندی کے باوجود یوں اہم ہو جاتا ہے کہ اس میں مؤلف نے شاعرات کے نام ، وطن ،

۱۔ دیباچۂ شمیم سخن ، حصہ دوم ، ص ۵ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۱ع ۔

زمانہ اور ان کے استاتذہ کے ناموں کا سراغ دینے کی کوشش کی ہے ۔ چند مثالیں دیکھیے ان میں تراجم کے اختصار کے باوجود سوانح حیات کے سلسلے کی بعض ضروری باتیں آ گئی ہیں :

حور : حور تخلص ۔ منا جان نامی طوائفِ لکھنؤ ۔ شاگرد محمد رضا متخلص بہ طور باشندۂ لکھنؤ (ص ۱۱) ۔

زہرہ : زہرہ تخلص سنی بائی طوائف ، وطن اس کا کشمیر ، مولد و مسکن کلکتہ ہے ۔ مولوی عبدالغفور نساخ سے مشورۂ سخن رکھتی ہے ۔ اب منہیاتِ شرعیہ سے تائب ہو کر گوشہ نشینی قبول کی ہے جزا اللہ ۔ (ص ۱۲)

حیا : حیا تخلص حیات النسا بیگم معروف بہ بھورا بیگم بنت شاہ عالم بادشاہ دہلی شاگرد شاہ نصیر دہلوی ۔ یہ شاعرہ پاکدامن تا حیات ناکتخدا رہی ۔ (ص ۲۹ ، ۳۰)

شرم : شرم تخلص ۔ شمس النسا بیگم بنت حکیم قمر الدین شاگرد خواجہ وزیر لکھنوی وطن اصلی ان کا بنارس و مسکن لکھنؤ تھا ۔ (ص ۳۱)

ضیا : ضیا تخلص ۔ ضیائی بیگم نام ، زوجۂ حکیم انور علی لکھنوی یہ شاعرہ فاضلہ علومِ عربی و فارسی کی ہے ۔ (ص ۳۲)

مخفی : مخفی تخلص ۔ سلطان جہان بیگم زوجہ حضرت مرزا قادر بخش بہادر صابر شاہزادۂ خاندان تیموریہ ۔ صاحب تذکرۂ گلستان سخن (ص ۳۵) ۔

محبوب : محبوب تخلص ۔ نواب محبوب بیگم صاحبہ منکوحۂ حضرت واجد علی شاہ بادشاہ اودھ (ص ۳۵) ۔

شیرین : شیرین تخلص ۔ عالی جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیۂ ریاست بھوپال . . . خوش خلق و صاحب جود و ہمت ہیں . . . انتظام نظم و نسق ریاست میں بے نظیر ہیں ۔ سال ولادت ۱۲۵۴ھ ہے ۱۲۶۳ ہجری میں بہ عمر نو سال خلعت ریاست بحکم گورنمنٹ پایا اور غرۂ شعبان ۱۲۸۵ ہجری کو زینت افزائے مسند حکومت ہوئیں ۔ اربابِ فضل و کمال کی قدردان ہیں (ص ۳۲) ۔ تذکرے کے شروع میں مؤلف کا

دیباچہ ہے جس میں انھوں نے تعلیم نسواں کی کمی کی شکایت کی ہے اور اس کی اہمیت کی جانب عوام اور حکومت دونوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ تذکرہ اچپل ہینگن جان کے ذکر سے شروع ہو کر یاسمن کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے۔ اس جگہ منی بائی حجاب اور یاسمن تخلص چنبیلی نام کے تراجم درج کیے جاتے ہیں۔ اشعار محذوف کر دیے گئے ہیں۔

حجاب : ''حجاب تخلص منی بائی عرف منجھلی طوائف ساکنہ کلکتہ محلہ کولو ٹولہ شاگرد مولوی عظمت اللہ انسخ ارشد تلمیذ مولوی عبدالغفور خاں نساخ۔ کم عمر، صاحب طبع سلیم ہے۔ تہذیب و اخلاق میں انتخاب، علوم مروجہ سے ماہر ہے فن موسیقی اچھا جانتی ہے۔ شعر گوئی کی جانب طبیعت زیادہ مائل ہے۔ ریاست رام پور میں بھی آئی تھی۔'' (ص ۹)

یاسمن : ''یاسمن تخلص، چنبیلی نام، کنیزک سید انشاء اللہ خاں انشا کی تھی۔ صحبت مرد سے بالطبع متنفر تھی۔ سید موصوف نے باتباع حکم شریعت ایک مرد معقول کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ تیسرے روز نکاح سے بغیر لاحق ہونے کسی عارضے کے فوت ہو گئی۔ شعر میں اپنے آقا سے مشورہ رکھتی تھی۔'' (ص ۳۶)

☆ ☆ ☆

انتخابِ یادگار

مصنف کا نام امیر احمد ہے ، امیر مینائی کے نام سے مشہور ہیں - اُردو کے نامور شاعر اور مصنّف ہیں - امیر مینائی ۱۶ - شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۱ - فروری ۱۸۲۹ع بروز شنبہ بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے - بعض نے ان کے والد کا نام کریم احمد یا کرم احمد لکھا ہے ، یہ درست نہیں ہے - ان کے والد کا صحیح نام شیخ کرم محمد مینائی تھا -۱ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی اور علوم متداولہ میں مہارت علمائے فرنگی محل لکھنؤ سے حاصل کی - ۱۲۶۸ھ کے قریب واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی اور دو سو روپیہ ماہوار کی ملازمت مل گئی - ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ع میں جب سیاسی ہنگامہ برپا ہوا اور لکھنؤ میں ان کا مکان بھی تباہ ہو گیا تو امیر کو لکھنؤ چھوڑ کر کاکوری جانا پڑا - وہاں تقریباً ایک سال رہے - اس کے بعد ۱۲۷۴ھ تک تلاشِ معاش کے سلسلے میں ان کا قیام کانپور اور ہمیرپور میں رہا - ۱۲۷۵ھ میں نواب یوسف علی خاں ناظم نے انھیں رام پور بلا لیا اور مفتیِ عدالت کے عہدے پر مامور کر دیا - یہاں سے امیر کی زندگی کا زریں دور شروع ہوتا ہے - وہ یہاں ہر طرح اعزاز و اکرام سے نوازے گئے - امیر نے اپنے خاندان اور اپنے استاد اسیر کو بھی رام پور بلا لیا - نواب یوسف علی خاں ناظم کے بعد جب کلب علی خاں کا عہد آیا تو ان کی قدر و منزلت کچھ اور بڑھ گئی - لیکن ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ع میں کلب علی خاں کی وفات کے بعد امیر مینائی پھر مالی پریشانیوں کا شکار ہو گئے اور انھیں پٹنہ ، بھوپال اور حیدر آباد وغیرہ کا سفر کرنا پڑا -

---

۱- مطالعۂ امیر ، ص ۶۷ ، از ڈاکٹر ابو محمد سحر ، مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۴ع -

امیر نے اکہتر سال کی عمر پائی اور ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ع میں انتقال کیا ۔ نثر اور نظم دونوں میں امیر مینائی کی متعدد تصانیف ہیں لیکن اُردو ادب میں ان کی شہرت دراصل ان کی شاعری اور ان کی دو نثری تصانیف امیر اللغات اور انتخاب یادگار کی بدولت قائم ہے ۔ امیر کا ذکر یہی نہیں کہ اُردو شعرا کے تذکروں اور ادبی تاریخوں میں آیا ہے بلکہ ان کی زندگی اور فن کے متعلق کتابی صورت میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ خود امیر مینائی نے بھی اپنے حالاتِ زندگی اپنے بڑے بھائی مولوی طالب حسن مینائی کی تصنیف ''آئینۂ ایمان'' کے دیباچے میں اور اپنی تصنیف انتخابِ یادگار میں لکھ دیے ہیں ۔ ان کے ایک شاگرد ممتاز علی آہ نے ''امیر مینائی'' کے نام سے ان کی سوانح عمری بھی شائع کر دی ہے ۔ ایک اور شاگرد مولوی احسن اللہ خاں ثاقب کے ہاتھوں ان کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیب امیر مینائی'' بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے ۔ پاکستان میں ڈاکٹر کریم الدین اور ہندوستان میں ڈاکٹر ابو محمد سحر امیر مینائی پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ۔ ڈی کی سند حاصل کر چکے ہیں ۔

''انتخاب یادگار'' تذکرے کا تاریخی نام ہے ۔ اس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ع نکلتا ہے ، یہ اس کے تکملے کا سال ہے ۔ ورنہ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے کا آغاز ۱۲۸۹ھ میں ہو چکا تھا ۔ نام کے تاریخی ہونے کا ثبوت خود مؤلف کے اس شعر سے ملتا ہے :

انکشاف سال ہجری ہو اگر مدنظر
نام تاریخی ہے اس کا انتخاب یادگار
۱۲۹۰ھ

اور ۱۲۸۹ھ میں آغاز کا ثبوت دیباچے میں مؤلف کے اس فقرے سے ملتا ہے :

''آغاز سے انجام تک برابر حضور نے التفات فرمایا تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمام پر آیا ۔''

اضافے ۱۲۹۰ھ کے بعد تک ہوتے رہے ہیں ۔[1]

۱- مقدمۂ دستور الفصاحت ، ص ۱۰۵ ، مرتبۂ مولانا عرشی ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ع ۔

یہ تذکرہ پہلی بار ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ع میں تاج المطابع رام پور سے شائع ہوا۔ پہلے حصے میں ۱۶۸ اور دوسرے میں ۳۰۶ صفحات ہیں۔ اخیر میں آغا علی تقی متخلص بہ غنی کی تقریظ اور قطعات تاریخ ہیں۔ غنی نے لکھا ہے کہ:

"للہ الحمد کہ یہ صحیفۂ انتخاب چوتھی ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ کو تاج المطابع میں چھپ کر مشتہر ہوا۔"

محمد شاہ خاں کاوش کے قطعۂ تاریخ کے اس مصرع سے بھی:

"تحفۂ اہل سخن بھی چھپ گیا"

۱۲۹۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔

تذکرہ اُردو میں ہے اور اس میں ۱۵۳ شعرا کے تراجم شامل ہیں۔ غنی نے تقریظ میں لکھا ہے کہ:

"ہنگام تالیف ۱۰۳ شعرا کے نام تھے . . . مگر چھپنے میں تاخیر ہوئی۔ آفتاب الدولہ قلق، گوبند لال صبا، شیخ امیر اللہ تسلیم وغیرہ ملازمین شامل ہوئے۔ لہٰذا چھپنے کے وقت تک ۱۵۳ شعرائے نازک خیال کے نام اس تذکرے میں داخل ہوئے۔"

لیکن مطبوعہ نسخے کی فہرست میں تراجم کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے، راز یزدانی رام پوری نے اپنے ایک مضمون میں ۱۸۳ بتائی ہے[1] غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ بعض شاعروں کا ذکر دو جگہ مختلف تخلص کے ساتھ آیا ہے۔

یہ تذکرہ شعرائے رام پور اور ریاست رام پور کے متوسل شاعروں کے لیے مخصوص ہے اور نواب کلب علی خاں والی رام پور کے ایما پر لکھا گیا ہے۔ دیباچے میں خود مؤلف نے وجہ تالیف یہ بتائی ہے کہ:

"ایک دن بندگانِ حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعرائے ماضی و حال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص والی ریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی مختصر کیفیت، سخن گوئی کی حقیقت نقشِ صفحۂ روزگار ہو۔"

مؤلف کے بعض بیانات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ تذکرے کی تالیف و تدوین میں پوری طرح آزاد نہ تھے بلکہ نواب کلب علی خاں کی قدم قدم پر

۱۔ امیر مینائی کا تذکرہ (انتخاب) یادگار مشمولۂ نگار (لکھنؤ) بابت اپریل ۱۹۵۷ع، ص ۱۴۔

مداخلت کے سبب انھیں بہت سی باتیں اپنے مزاج کے خلاف بھی داخل کرنی پڑی ہیں ۔ اپنی اس مجبوری کا اظہار انھوں نے تذکرے میں تو کہیں نہیں کیا لیکن اپنے ایک شاگرد احسن اللہ خاں ثاقب کو لکھتے ہیں کہ :

''میں اپنی تالیفات کو اس قابل نہیں جانتا کہ ہدیۂ احباب کروں ، علی الخصوص یہ تذکرہ جس میں مجھ کو حالات تاریخی اور انتخاب اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسے قلم کو دستِ کاتب میں ۔''[1]

(خط مؤرخہ ۲۹ ۔ نومبر ۱۸۸۱ع)

دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

''بندہ پرور اس تذکرے میں اگر کچھ محاسن ہوں تو ان کو آپ سے بنرہیں جانیں اور جو اس میں بہ مجبوری قبائح ہیں قرار واقعی ان کو میرا دل جانتا ہے ۔ مگر کیا کروں مامور تھا ، معذور تھا ۔ دیباچہ میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے ۔ آپ غور سے پڑھیے گا تو سمجھ جائیے گا کہ مؤلف مجبور تھا ۔''

(خط مؤرخہ یکم ربیع‌الاول ۱۲۹۹)

مؤلف کے دیباچے کی مندرجہ ذیل سطریں ایسی ہیں جو اس کی مجبوری کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

''اگر ناخن امداد حضور گرہ کشائی نہ فرماتا تو ممکن نہ تھا کہ ایسا تذکرہ جامع جس میں راست راست بےکم وکاست من و عن واقعات تاریخی ہیں ، ترتیب پاتا ۔ اس مہم کا انجام ہونا محض نتیجۂ توجہ سرکار ابد قرار ہے ، اس بےحقیقت کی سعی مانند حرکت خامہ بدست نامہ نگار ہے ۔''

(ص ۷)

امیر مینائی کے ان بیانات کی روشنی میں بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''انھیں رام پور کے تاریخی حالات لکھنے میں تو آزادی حاصل نہیں تھی لیکن شعرا کے ذکر میں انھیں کوئی مجبوری لاحق نہ تھی ۔''[2] لیکن یہ درست نہیں ۔ امیر مینائی

۱۔ مکاتیب امیر مینائی ، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب ، ص ۲۴۵ ، ۲۴۷ ، بحوالۂ اُردو ادب علی گڑھ ، ص ۵۶ ، شمارہ نمبر (۱) ۱۹۶۴ع ۔

۲۔ نگار (لکھنؤ) بابت اپریل ، ۱۹۵۷ع ، ص ۱۳ ۔

کے ایک خط کی سطریں اوپر نقل کی گئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ ''تاریخی حالات کے ساتھ ساتھ انتخابِ اشعار کے سلسلے میں بھی مجبور رہے ہیں ۔''

تذکرہ دو حصوں میں تقسیم ہے ، پہلے حصے میں والیان ریاست رام پور کا ذکر ہے ۔ یہ حصہ صفحہ ۱۰۹ سے ۱۶۸ تک پھیلا ہوا ہے ۔ دوسرے حصے میں شعرائے رام پور اور شعرائے متوسلین ریاست رام پور کا ذکر ہے ۔ یہ حصہ ص ۶۰۸ پر ختم ہوتا ہے ۔

دیباچے میں مؤلف نے اس تذکرے کی مندرجہ ذیل خصوصیات بتائی ہیں :

(۱) تذکرے کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ طبقۂ اول میں والیانِ ریاست کا ذکر ہے ، بہ ترتیب زمانۂ حکومت ۔

(۲) طبقۂ ثانی میں بہ ترتیب حروف تہجی اور شاعروں کا حال مختصر اور انتخابِ کلام ہے ۔

(۳) خاندان عالی شان ریاست کے سخندان بلفظِ ''صاحبزادہ'' تعبیر کیے گئے ہیں ۔

(۴) چونکہ اس تذکرے میں عربی ، فارسی ، اُردو اور بھاکا چاروں زبانوں کے شاعر ہیں اور بعض اہلِ سخن کئی زبانوں کی شاعری کے ماہر ہیں لہٰذا فہرست میں ان کے اسما کے ساتھ عربی کی علامت ''ع'' فارسی کی علامت ''ف'' اُردو کی علامت ''الف'' اور بھاکا کی علامت ''ب'' اور فارسی عربی کی علامت ''فع'' اور فارسی اُردو کی علامت ''فا'' اور فارسی بھاکا اُردو کی علامت ''فبا'' اور بھاکا اُردو کی علامت ''با'' مذکور ہے ۔

(۵) جو سخنور دو زبانوں کے شاعر ہیں اور دونوں زبانوں میں ان کے تخلص مختلف ہیں ، تو وہ دونوں تخلص بہ اعتبار حروف تہجی اپنے اپنے محل پر لکھے گئے ہیں ۔ جیسے عنبر شاہ خاں کہ فارسی میں عنبر اور اُردو میں آشفتہ تخلص کرتے ہیں تو حرف الف میں آشفتہ اور حرف عین میں عنبر لکھا گیا ہے ۔

(۶) ہر شاعر کے استاد کا نام اور مقدار عمر اور ولدیت اور در صورت متوفی ہونے کے تاریخ ماہ و سال رحلت لکھنے کا اس تذکرے میں

التزام کیا ہے ۔''

(۷) جہاں کوئی امر با وصفِ تفحص معلوم نہ ہوا بہ مجبوری چھوڑ دیا خصوصاً وہ شعرا جن کا نام تذکروں میں دیکھ کر لکھا گیا وہاں یہ التزام نہیں رہا بلکہ ان میں کہیں تخلص ہے نام تک نہیں ۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ اُردو ادب علی گڑھ میں[1] ''انیسویں صدی کا ایک منفرد اُردو تذکرہ'' انتخاب یادگار کے زیر عنوان ، اس تذکرے کی حسب ذیل خصوصیات ظاہر کی ہیں ۔ یہ مضمون ان کی کتاب ''مطالعۂ امیر'' میں بھی شامل ہے[2] :

(۱) انتخاب یادگار کے طبقہ اول میں امیر نے تذکرہ نگار سے آگے بڑھ کر بڑی حد تک ایک مؤرخ کے فرائض انجام دیے ہیں ۔ یہ حصہ رام پور کی تاریخ کے لیے ایک اہم معاصرانہ ماخذ کا درجہ رکھتا تھا ۔

(۲) انتخابِ یادگار میں نہ صرف شعرا کا حال اور کلام ملتا ہے بلکہ اس سے پہلے ان تاریخی واقعات اور روایات کی تصویر بھی سامنے آتی ہے جن پر ان کی شاعرانہ ترقی اور قدر دانی کا انحصار تھا ۔

(۳) امیر نے جن شعرا کا حال لکھا ہے ان کی ایک بڑی تعداد سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے ۔ اکثر کے حالات و کلام کی فراہمی میں انہیں ان کا یا ان کے اعزا اور تلامذہ کا تعاون حاصل تھا ۔ بعض ممتاز اُردو شعرا مثلاً جلال و منیر نے اس تذکرے میں شامل کرنے کے لیے خود اپنا کلام منتخب کر کے امیر کو دیا تھا ۔

(۴) شعرا کے حالات عموماً بہت مختصر لکھے ہیں ۔ بہتوں کا ذکر دوچار سطروں سے زیادہ نہیں ہے لیکن انھوں نے جا بجا حفظ مراتب کا خیال رکھا ہے ۔

(۵) خالص عربی شعرا جن کا حال اس تذکرے میں لکھا گیا ، صرف دو

۱۔ نگار (لکھنؤ) اپریل ۱۹۵۷ع ، ص ۱۲ تا ۲۰ ۔

۲۔ مطالعۂ امیر ، ص ۳۶۷ تا ۳۸۶ ، مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۵ع ۔

ہیں ۔ ایک محمد یوسف الدین خاں باخی اور دوسرے مولوی فضل حق خیر آبادی ۔ ہندی شعرا یا کبت گویوں کی تعداد دس ہے ۔ ایک فرانسیسی الاصل اُردو اور فارسی شاعر جارج فانتوم متخاص بہ صاحب و جرجیس کا ذکر بھی ملتا ہے ۔

راز یزدانی رام پوری نے ''انتخاب یادگار'' پر بحث کرتے ہوئے امیر مینائی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے شعرائے رام پور کے ساتھ اپنے تذکرے میں انصاف نہیں کیا ۔ دہلوی یا دہلوی دبستان سے متاثر شعرا کو انھوں نے مناسب جگہ نہیں دی بلکہ صرف لکھنوی شعرا کی دل کھول کر داد دی گئی ہے ، اہلِ رام پور کی جانب سے خصوصاً بے اعتنائی برتی ہے ۔ رام پور کے ممتاز ترین شعرا بیاں ، رسا اور نظام کے انھوں نے علی الترتیب ۱۸ ۔ ۱۶ اور ۳۹ اشعار ، انتخاب کلام کیے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو ادب میں رام پور کی حیثیت صرف اتنی رہ گئی کہ وہاں دہلی اور لکھنؤ کے امتزاج سے ایک نیا رنگ تو پیدا ہو گیا مگر رام پور کے عوامی ادبی رجحانات کا ریکارڈ سامنے نہ آ سکا ۔[۱] لیکن راز یزدانی کے یہ اعتراضات درست نہیں ہیں ۔ انتخاب کلام کے سلسلے میں اس طرح کی فروگزاشت اکثر تذکروں میں موجود ہے اور انتخاب یادگار بھی اس سے خالی نہیں ہے ۔ پھر یہ بھی تھا کہ انتخاب کلام میں بھی امیر مینائی پوری طرح آزاد نہ تھے ، نواب کلب علی خاں کی مداخلت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ۔ انتخابِ کلام کے سلسلے میں فروگزاشت کی ذمہ داری نیاز فتح پوری نے امیر کی لکھنوی عصبیت کے بجائے ان کے ذوق پر عائد کی ہے ۔ لیکن بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ انتخاب کلام میں ہر جگہ مجبور نہ تھے ۔ اس سلسلے میں ان کے استاد اور بیٹے کے ترجمے پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ امیر مینائی نے اپنے استاد اسیر کے ۳۶۰ اشعار منتخب کیے ہیں اور اپنے دس سالہ بیٹے قمر ، جو پوری طرح شعر کہنے کے اہل بھی نہ تھے اور صرف باپ کی اصلاح یا کہے ہوئے اشعار کی بدولت شعرا کی صف میں شامل رہے ہوں گے ۔ بعد میں بھی قمر ایسے مشہور شاعر نہ ہو سکے کہ دس سال کی عمر میں ان کی شاعرانہ فطانت کا جواز پیدا

۱۔ حاشیہ بر مضمون راز یزدانی ، نگار لکھنؤ ، اپریل ۵ ، ص ۔ ۱۹ ۔ ۲۰ ۔

ہو جاتا ۔ ان کمزوریوں کے باوجود انتخاب یادگار ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے اور ادبی تحقیق میں اس کی رہنمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

قائم اور امیر اللہ تسلیم کے تراجم نمونتہً یہاں لکھے جاتے ہیں ۔ اشعار چھوڑ دیے گئے ہیں :

قائم : ''شیخ قیام الدین متوطن چاند پور ضلع مراد آباد تھے ، شاگرد میرزا رفیع سودا سخن آفرینی میں یکتا ۔ پہلے بادشاہی توپ خانے میں نوکر رہے پھر صاحبزادہ محمد یار خاں بہادر امیر کی سرکار میں معزز اور مؤقر رہے ، بارہ سو دس ہجری میں رحلت کی ، صاحبزاہ محمد یار خاں مرحوم کے مقبرے میں جو فی الحال پرانا مدرسہ مشہور ہے اور وہیں نواب محمد علی خاں بہادر بھی مدفون ہیں ، دفن ہوئے ۔ جملہ اقسام شعر گوئی پر قادر تھے اور فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں سے بخوبی ماہر تھے ۔ فارسی کلام اُن کا جس قدر طبقات الشعرا تذکرۂ فارسی مولوی قدرت اللہ شوق میں پایا وہ لکھنے میں آیا ۔ اور اُردو دیوان جس کے آخر میں دو ایک چھوٹی مثنویاں تھیں وہ بھی انتخاب کر کے لکھا لیکن کلیات اُن کا دستیاب نہ ہوا ۔ یہ دیوان جو راقم کی نظر سے گزرا اس کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منتخب ہے ، کلیات اُن کا اَور ہے ۔ خدا جانے مصنّف نے منتخب کیا یا کسی اَور نے ۔[۱]

تسلیم : ''شیخ امیر اللہ ابن مولوی عبدالصمد انصاری ۔ ان کے بزرگوں کا وطن قدیم فیض آباد ۔ مرزا محمد اصغر علی خاں نسیم دہلوی ان کے استاد ، لکھنؤ میں نشو و نما پائی ۔ حضور پُرنور دام ملکہم کی قدر دانی یہاں کھینچ لائی ۔ باون برس کی عمر ہے ۔ چار مثنویاں اور دو دیوان اُردو ان سے یادگار ہیں ۔ یہ ان کے منتخب اشعار ہیں ۔''[۲]

☆ ☆ ☆

۱۔ ''انتخاب یادگار'' ، ص ۳۰۱ ، مطبوعہ تاج المطابع ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ع مملوکہ کتب خانۂ جامعہ ، کراچی ۔

۲۔ ''انتخاب یادگار'' ، ص ۹۵-۹۶ ، مطبوعہ تاج المطابع ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ع مملوکہ کتب خانۂ جامعہ ، کراچی ۔

تذکرۂ شعرائے رام پور

تذکرۂ شعرائے رام پور کے مصنف کا نام جارج فانتوم (Georg Fanthome) اور تخلص صاحب و جرجیس ہے - امیر مینائی نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ :

''صاحب ، جارج فانتوم خلف کپتان برنارڈ فانتوم - یہ اصل میں فرانسیسی ہیں - باپ ان کے چندے ''پونا چیری'' میں کہ دارالحکومت[1] شاہ فرانس ہے ، رکن اول کونسل تھے - پھر نواب نظام الملک والی دکن کی سرکار میں فرانسیسی فوج کے کپتان ہوئے اور اس سبب سے کہ افسر اس فوج کے جنرل موسٰی راموں صاحب ان کے عزیز تھے روز بروز ترقی کی - جب وہاں کا معاملہ میر عالم نائب نواب ممدوح کے فساد سے برہم ہو گیا ، یہ کرنیل گارڈنر صاحب عرف گارن صاحب کی فوج میں عہدۂ کپتانی پر مقرر ہوئے - اٹھارہ سو چھ عیسوی میں پنشن لے کر بقیہ عمر امرائے ہندوستان کے معالجے میں بسر کی - چنانچہ حسب اجازت گورنمنٹ نواب احمد علی خاں بہادر مرحوم کے علاج کو اس دارالریاست میں آئے - علاج مفید ہوا پھر رسم آمد و رفت رہی - اٹھارہ سو تیس عیسوی میں نواب ممدوح کے نوکر ہوئے ، اٹھارہ سو پنتالیس عیسوی میں قضا کی - یہاں تک تو حال کپتان برنارڈ فانتوم کا ہوا -

---

۱- امیر مینائی کی عبارت سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ''پونا چیری'' [پانڈیچری] دارالحکومت شاہ فرانس غالباً یورپ کا حصہ ہوگا حالاں کہ یہ علاقہ بھارت کا ہے - پہلے زیرِ انتظام حکومت فرانس تھا - جیسا کہ نجم الغنی خاں لکھتے ہیں :

چندے ''پونا چیری'' میں کہ سلطنت فرانس کی عمل داری میں ہے - ص ۱۷۱ - اخبار الصنادید ، جلد اول مؤلفہ نجم الغنی خاں - [ادارہ]

اب جارج فانتوم کا حال ضروری ، جن کا ذکر مقصود اصلی ہے لکھا جاتا ہے کہ اب ان کی عمر باون برس کی ہے ۔ حافظ شیرانی طالب اور مولوی محمد نور الاسلام اور مولوی محمد حفظ اللہ سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں اور میر نجف علی شفقت سے علم شعر سیکھا ۔ صاحب اور جرجیس دونوں ان کے تخلص ہیں اور فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں ۔ چونکہ ان کو اس سرکار سے آبائی توسل ہے اس واسطے نام ان کا اس تذکرے میں درج ہوا ۔''۱

امیر مینائی نے یہ نہیں بتایا کہ صاحب کے جو حالات انھوں نے درج کیے ہیں ان کا ماخذ کیا ہے ۔ قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے صاحب کے حالات ان کے بعض معاصر احباب و اعزا سے پوچھ کر لکھے ہوں گے ۔ اس لیے کہ ''انتخاب یادگار'' کی تالیف کے وقت جارج فانتوم حیات تھے اور اگرچہ وہ خود اس وقت رام پور میں موجود نہ تھے ۔ لیکن ان کے ملنے والے ضرور موجود رہے ہوں گے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امیر مینائی کی نظر سے صاحب کا تالیف کردہ تذکرہ گزرا ہو اور انھوں نے جارج فانتوم کے حالات کے سلسلے میں ان کے تذکرے سے استفادہ کیا ہو لیکن امیر مینائی نے صاحب کے تذکرے کا کوئی سراغ نہیں دیا ۔

''اُردو کے یوروپین شعرا'' کے نام سے محمد سردار علی نے ایک مختصر سا تذکرہ مرتّب کیا تھا ۔ یہ پہلی بار ۱۹۲۶ع میں چھپا تھا ، اس کا دوسرا ایڈیشن اس وقت سامنے ہے ۔ اس میں محمد سردار علی نے جارج فانتوم کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''جارج فانتوم نام ، صاحب تخلص تھا ان کے والد برنارڈ فانتوم حیدر آباد دکن کی فرانسیسی فوج کے کپتان تھے ۔ موسیو ریمو دکن کی فرانسیسی فوج کے افسر اعلیٰ کے رشتے دار تھے ۔ ۱۸۱۶ع میں پنشن لے کر اپنی بقیہ زندگی علاج معالجے میں بسر کی ۔ ان کے والد نے ۱۸۴۵ع میں وفات پائی ۔

صاحب کا سن پیدایش معلوم نہیں ہوا لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ

۱۔ انتخاب یادگار ، ص ۱۸۹ - ۱۹۰ ، مطبوعہ تاج المطابع ۱۲۹۰ھ ۔

۱۲۹۰ھ میں زندہ تھے ، ان کا تعلق ریاست رام پور سے تھا ۔ حافظ شیرانی طالب ، مولوی محمد نور الاسلام اور مولوی حفیظ اللہ سے فارسی اور عربی کتابیں پڑھی تھیں ۔ شعر و سخن میں میر نجف علی شفقت سے مشورہ لیتے تھے ۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ صاحب کے علاوہ کبھی کبھی جرجیس بھی تخلص کرتے تھے ۔"[1]

محمد سردار علی نے اگرچہ اپنا ماخذ ظاہر نہیں کیا لیکن صاف پتا چلتا ہے ان کا بیان امیر مینائی کے بیان سے ماخوذ ہے ۔ امیر مینائی نے کپتان برنارڈ کی پنشن کا سال ۱۸۰۶ع بتایا تھا ۔ سردار علی خاں کے یہاں غلطی سے یہ ۱۸۱۶ع ہو گیا ہے ۔

جارج فانتوم کے ذاتی اور خاندانی حالات کا تفصیلی ذکر در اصل رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری[2] اور محمد علی اثر رام پوری[3] نے بھی اپنے مضامین میں ان کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے ۔ کلب علی خاں فائق رام پوری کی ذاتی ڈائری میں بھی فانتوم اور ان کے تذکرے کے متعلق بعض اہم یادداشتیں محفوظ ہیں ۔ میں نے ان سب سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس جگہ مختصراً جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے وہ بحث کے خلاصے کی حیثیت رکھتا ہے ۔

جارج فانتوم متخلص بہ صاحب و جرجیس ایک فرانسیسی نژاد شاعر تھے اور اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے ۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب میں اُردو فارسی کلام کے طویل منتخبات کے ساتھ انگریزی نظموں کے بھی بعض نمونے درج کر دیے ہیں ۔ جارج فانتوم کے والد کپتان

۱۔ تذکرہ یوروپین شعرائے اُردو ، ص ۳۸ - ۳۹ ، مطبوعہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۴ع ، طبع دوم ۔

۲۔ "شعرائے رامپور کا ایک قلمی تذکرہ"، مطبوعہ "معارف" اعظم گڑھ ، ص ۶۴ تا ۷۰ ، بابت جنوری ۱۹۴۶ع ۔

۳۔ "تذکرۂ شعرائے رامپور ، مصنفہ جارج فانتوم" ، مطبوعہ "معاصر" پٹنہ ، ص ۱۳۴ تا ۱۴۱ ، بابت جنوری ۱۹۵۲ع ۔

برنارڈ فانتوم برّصغیر کے فرانسیسی مقبوضات میں مختلف ممتاز عہدوں پر فائز رہے ۔ وہ پانڈیچری میں فرانسیسی کونسل کے رکن تھے ۔ پھر حیدر آباد دکن میں فرانسیسی فوج کے کپتان مقرر ہوئے ۔ ۱۸۰۶ع میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور طبابت کو ذریعۂ معاش بنایا ۔ کپتان برنارڈ چونکہ معالج کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے تھے اس لیے بہت سے امرا و نوابین سے ان کا تعلق قائم تھا ۔ نواب احمد علی خاں والی رام پور سے بھی اس سلسے میں ان کے روابط بڑھے اور نواب صاحب نے انھیں دیوان ریاست کی حیثیت سے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا ۔ ۱۸۳۸ع میں وہ رام پور کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۱۸۴۵ع میں بمقام بریلی انتقال کیا ۔

کپتان برنارڈ فانتوم کا خاندانی نام فانتوم (Fanthome) تھا اس لیے خاندان کے سارے افراد اپنے نام کے ساتھ فانتوم لکھتے تھے لیکن بعض تحریروں میں ان کے نام کے آگے فانتوم کے بجائے فالتون بھی لکھا گیا ہے ۔ اس کی وجہ محمد علی خاں اثر رامپوری نے یہ بتائی ہے کہ علاج معالجے میں مہارت خاص کے سبب کپتان برنارڈ کو بعض لوگ ''افلاطون'' کہنے اور لکھنے لگے تھے ۔ یہی افلاطون بگڑ کر فالتون بن گیا ۔

کپتان برنارڈ فانتوم کے بیٹوں میں جارج فانتوم صاحب و جرجیس کے علاوہ جارج فانتوم شائق اور الفرڈ فانتوم صوفی بھی اُردو کے شاعر تھے ۔ ان دونوں کا ذکر رام بابو سکسینہ نے کیا ہے ۔ لیکن ان میں بہ حیثیت شاعر سب سے برتر مقام جارج فانتوم صاحب و جرجیس کا ہے ۔ رام بابو سکسینہ کے بیان کے مطابق صاحب کا سال پیدائش ۱۸۰۹ع ہے ۔ لیکن اثر رامپوری اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں ۱۸۷۳ع میں (صاحب) کی عمر ۵۲ سال بتائی ہے جس کی رو سے سال ولادت ۱۸۲۱ع ٹھہرتا ہے ۔ میری رائے میں یہ زیادہ قرین قیاس ہے جس کی وجوہ یہ ہیں ۔ جارج فانتوم کا رام پور میں مستقل قیام کپتان برنارڈ کے زمانۂ ملازمت (۱۸۳۰ع تا ۱۸۳۷ع) یقینی ہے ۔ اسی زمانے میں انھوں نے رام پور میں تعلیم پائی ہے ۔ اگر ۱۸۰۹ع سال پیدائش تسلیم کیا جائے تو ۱۸۳۷ع میں ۲۱ سال عمر ہوتی ہے جو ابتدائی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ۔ اس کے بر خلاف

۱۸۲۱ء سال ولادت قرار دیا جائے تو ۱۸۳۰ء میں دس سال کی عمر ہوئی جو ابتدائی تعلیم کے لیے موزوں ہے۔"[1]

اثر رام پوری کے قیاس کو غلط قرار دینے کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جارج فانتوم، ابتدائی تعلیم بریلی میں حاصل کرنے کے بعد رام پور گئے ہوں اور وہاں عربی و فارسی کی تکمیل کر کے شعر و سخن کا مشغلہ اختیار کیا ہو۔ ایسی صورت میں صاحب کے پیدائش کا سال ۱۸۰۹ء قرین قیاس ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں رام بابو سکسینہ نے ۱۸۰۹ء کا سال یونہی نہیں لکھا بلکہ فانتوم خاندان کے ایک فرد بنے صاحب کی تحریری یادداشتوں کی مدد سے لکھا ہے اس لیے مزید شہادت کے بغیر ۱۸۰۹ء کو غلط اور ۱۸۲۱ء کو صحیح خیال کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

جارج فانتوم صاحب کی ماں چوں کہ مسلمان تھیں اس لیے جارج فانتوم اور ان کے بھائی بہنوں کی تعلیم و تربیت بالکل مسلمانوں کے طرز پر ہوئی۔ جارج فانتوم صاحب خود بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ عقاید کے سوا انھوں نے اپنی ظاہری وضع قطع یا نام میں کوئی نمایاں تبدیلی پسند نہیں کی۔ صاحب کی زندگی کا زیادہ حصہ بریلی اور رام پور میں گزرا۔ ۲۰۔ جنوری ۱۸۷۹ء کو بریلی میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان کے انتقال کی خبر رام پور کے اخبار دبدبۂ سکندری نمبر ۴، جلد ۱۴، سن ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی ہے۔[2]

جارج فانتوم نے اُردو فارسی دیوان کے ساتھ ساتھ اُردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی یادگار چھوڑا ہے۔ یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کا کوئی قلمی نسخہ پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ افسوس کہ اس تذکرے تک براہ راست میری رسائی نہ ہو سکی، اس لیے اس کے بارے میں جو کچھ عرض کروں گا وہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، محمد علی اثر رامپوری کے مضامین اور کلب علی خاں فائق رامپوری کی ڈائری سے ماخوذ ہوگا۔ صاحب کے "تذکرۂ شعرائے

۱۔ "معاصر"، ص ۱۳۶، بابت جنوری ۱۹۵۲ء۔

۲۔ "اخبار دبدبۂ سکندری رام پور"، مطبوعہ معاصر پٹنہ، ص ۱۱۹ بابت جنوری ۱۹۵۲ء۔

رام پور'' کے بارے میں ڈاکٹر سبزواری کا بیان ہے کہ :

''میرے دوست مولوی عبدالرشید صاحب کے پاس تذکرۂ شعرائے رام پور کا ایک قدیم ترین نستعلیق خط میں لکھا ہوا قلمی نسخہ موجود ہے . . . تذکرہ عام سائز کے ۱۱۴ صفحات میں ہے جس میں ہجا کی ترتیب کے ساتھ ۶۳ رام پوری شعرا کا تذکرہ ہے - ہر صفحے پر ۱۴ سطریں ہیں - کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن قیاس ہے کہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے - سن کتابت مرقوم نہیں ہے - بعض مقامات پر نمونۂ کلام کی جگہ چھوڑ دی گئی ہے -''[1]

اب یہ نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے - اس کا تعارف کراتے ہوئے اثر رامپوری نے لکھا ہے کہ :

جارج فانتوم کا تذکرۂ شعرائے رام پور نواب سید کلب علی خاں کی فرمائش سے تصنیف ہوا تھا اور اس کا ایک قلمی نسخہ جو کتب خانۂ رام پور میں ہے خود مصنّف کے ہاتھ کا خوشخط لکھا ہوا ہے - مگر اس کے آغاز سے پہلے ذیل کی عبارت ہے جو کسی دوسرے[2] شخص کے قلم سے ہے :

تذکرہ نگاشتۂ قلم اعجاز رقم حضرت جرجیس فلاطون فرانسیسی المخاطب بہ صاحب پدر بزرگوار حضرت نانا (یوسف) المدعو بہ بنے صاحب -

تذکرے میں سالِ تصنیف کا کہیں ذکر نہیں . . . یہ تذکرہ ۳۴ صفحوں میں ہے اور اس کی زبان فارسی ہے - کچھ تعجب نہیں کہ امیر مینائی نے

۱- معارف (اعظم گڑھ) ، ص ۳۴ تا ۷۰ ، بابت جنوری ۱۹۴۶ع -

۲- یہ عبارت مولوی عبدالرشید صاحب کی معلوم ہوتی ہے - جو بنے صاحب (ابن جارج فانتوم) کے نواسے تھے اور راقم الحروف سے رام پور میں ملے تھے اور اس تذکرے کا ذکر کیا تھا - بعد میں یہ تذکرہ رضا لائبریری رام پور میں پہنچا - اسی تذکرے کے نوٹ میری بیاض میں ہیں - [فائق رکن ادارۂ مجلس ترقی ادب ، لاہور]

انتخاب یادگار کی تصنیف میں اس سے فائدہ اٹھایا ہو۔"[1]

صاحب کے تذکرے میں تاریخ تصنیف کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے - ایسی صورت میں اس کے سال تصنیف کا تعیّن وثوق کے ساتھ مشکل ہے - تذکرے کے بعض تراجم کی مدد سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کا آغاز ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۶ع میں یا اس سے کچھ پہلے ہوا - ہر چند کہ کریم اللہ خاں کرم کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال بیس سال پہلے ہوا ہے ، اثر رام پوری نے کرم کا سال انتقال ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۶ع بتایا ہے - اس لحاظ سے اس تذکرے کا سال تالیف ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ع ہوتا ہے - لیکن یہ صحیح نہیں ہے - نواب یوسف علی ناظم کے بارے میں تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو دس سال ہوئے ہیں - ناظم کی تاریخ وفات ۱۴ - ذی قعد ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۱ - اپریل ۱۸۶۵ع ہے -[2] اب اگر اس میں دس سال جمع کریں تو کرم کے ترجمے کی تحریر کا سال ۱۲۹۰ - ۹۱ھ مطابق ۱۸۷۳ - ۷۴ع قرار پاتا ہے - یہی سال تذکرے کی تالیف کے سلسلے میں بھی درست معلوم ہوتا ہے - اثر رام پوری نے بھی ۱۲۹۱ھ کو ترجیح دی ہے - وجہ یہ ہے کہ صاحب نے اپنا تذکرہ ، ناظم کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں والی رام پور کے عہد میں لکھا ہے - ناظم رام پور حاکم اعلیٰ اور ایک ممتاز شاعر تھے - صاحب کا قیام خود بھی رام پور میں تھا ایسی صورت میں قرین قیاس یہی ہے کہ ناظم کا سال وفات انھیں اور ان کے معاصر دوستوں کو اچھی طرح یاد رہا ہوگا - علاوہ ازیں چونکہ صاحب نے اپنا تذکرہ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی فرمائش پر لکھا ہے ، اس لیے اُنھوں نے ناظم کے زمانۂ وفات کے اندراج میں احتیاط ضرور برتی ہوگی - سب سے بڑھ کر یہ کہ صاحب نے اپنا تذکرہ نواب کلب علی خاں والی رام پور کی فرمائش پر لکھا ہے - نواب کلب علی خاں کا عہد ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ع سے شروع ہوتا ہے - اس لیے ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ع کو تذکرے کا سال تالیف قرار ہی نہیں دیا جا سکتا -

---

۱- "معاصر" پٹنہ ، ص ۱۳۷ ، بابت جنوری ۱۹۵۲ع -

۲- "مطالعہ امیر" ، ص ۸۷ ، از ڈاکٹر ابو محمد سحر مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۵ع ، طبع اول -

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں صرف رام پور کے شعرا کا ذکر بلحاظ حروف تہجی ردیف وار کیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے شعرا کی تعداد ترسٹھ[1] بتائی ہے اور اثر رام پوری نے باسٹھ[2] ظاہر کی ہے ۔ باسٹھ کی تعداد صحیح ہے ۔ اس لیے کہ سبزواری صاحب کے مضمون میں شعرا کے ناموں کے نمبر شمار غلط ہو گئے ہیں یعنی بیس کے بعد بائیس کا نمبر درج ہے اور نمبر اکیس چھٹ گیا ہے اس لیے ان کی فہرست میں آخری نمبر ۶۳ ہو گیا ہے اور اسی کی روشنی میں انھوں نے سہواً شعرا کی تعداد ترسٹھ لکھ دی ہے ۔ شعرا کے ناموں کی ترتیب بھی فہرستوں میں بعض جگہ پر بدلی ہوئی ہے ۔ اثر رام پوری نے اپنی فہرست میں احمد علی رسا رام پوری ، نامعلوم الاسم محنت ، نواب یوسف علی خاں ناظم اور مہدی علی خاں نحیف رام پوری کے نام بالترتیب ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۲ اور ۵۳ کے نمبروں کے مقابل یعنی اپنی اپنی ردیف سے الگ درج کیے ہیں اور بقول اثر رام پوری اس وجہ سے اصل نسخے میں ہندسے غلط ہو گئے ہیں ۔ سبزواری صاحب کی فہرست میں یہ نام اپنی اپنی ردیف کے تحت بالترتیب ۲۴ ، ۵۴ ، ۵۷ اور ۵۹ کے ہندسوں کے ساتھ درج ہیں ۔ ناموں کی فہرست میں اس اختلاف کے باوجود شعرا کی تعداد ترسٹھ نہیں باسٹھ ہی ہوتی ہے ۔ مذکورہ شعرا کے نام یہ ہیں :

۱- اکبر : صاحبزادہ محمد اکبر خاں ۔

۲- امیر : نواب محمد یار خاں ۔

۳- افسر : نواب احمد یار خاں ۔

۴- امداد : صاحبزادہ امداد اللہ خاں ۔

۵- آزاد : حکیم غلام حسین ۔

۶- احمد : احمد خاں ۔

۷- آشفتہ : عنبر شاہ خاں ۔

۸- بخش : صاحبزادہ بخش اللہ خاں ۔

۹- بیمار : شیخ علی بخش ۔

۱- ''معارف'' ، ص ۶۴ تا ۷۰ ، بابت جنوری ۱۹۴۶ع ۔

۲- ''معاصر'' ، ص ۱۳۷ ، بابت جنوری ۱۹۵۲ع ۔

۱۰- بیتاب : محمد عباس علی خاں -
۱۱- تسلیم : کبیر خاں -
۱۲- تراب : سید تراب شاہ -
۱۳- ثاقب : سیف اللہ -
۱۴- جعفر : محمد جعفر خاں -
۱۵- جلالی : جلال الدین احمد -
۱۶- حسرت و ذوق : ذوق رام -
۱۷- حیات : حیات خاں -
۱۸- حسین : میاں حسین شاہ -
۱۹- حیدر : غلام حیدر خاں -
۲۰- حفظ : حفظ اللہ -
۲۱- حرمت : شہامت خاں -
۲۲- خورشید : ملک کریم خاں -
۲۳- رسا : احمد علی -
۲۴- رافت : رؤف احمد -
۲۵- رفعت : غلام جیلانی -
۲۶- رند : نواب احمد علی خاں -
۲۷- سلطان : نصر اللہ خاں -
۲۸- سراج : سراج النبی -
۲۹- سراج : سراج الدین احمد -
۳۰- شائق : جارج فانتوم -
۳۱- شفقت : میر نجف علی -
۳۲- شجاعت : شجاعت علی خاں -
۳۳- شوق : قدرت اللہ -
۳۴- شیفتہ : انعام اللہ خاں -
۳۵- شاد : نظیر شاہ خاں -
۳۶- شاکر : نجیب اللہ خاں -

۳۷- صنعت : کریم الدین ۔
۳۸- صاحب : جارج فانتوم ۔
۳۹- طالب : حافظ شیرانی ۔
۴۰- عبرت : ضیاء الدین ۔
۴۱- عشرت : میر غلام علی ۔
۴۲- عابد : زین العابدین خاں ۔
۴۳- عباس : سید عباس علی ۔
۴۴- غفلت : احمد خاں ۔
۴۵- غیاث : غیاث الدین ۔
۴۶- غمین : محمد عطا اللہ ۔
۴۷- فرحت : حبیب اللہ خاں ۔
۴۸- قادر : عبدالقادر ۔
۴۹- قائم : قیام الدین ۔
۵۰- کفایت : کفایت اللہ خاں ۔
۵۱- کرم : کریم اللہ خاں ۔
۵۲- لاچار : نام نامعلوم ۔
۵۳- محنت : نام نامعلوم ۔
۵۴- مہدی : مہدی علی خاں ۔
۵۵- ماہر : غلام محمد خاں ۔
۵۶- ناظم : نواب یوسف علی خاں ۔
۵۷- نزہت : رفیع الدرجات ۔
۵۸- نحیف : صاحبزادہ مہدی علی خاں ۔
۵۹- نواب : کلب علی خاں ۔
۶۰- نجف : نجف علی خاں ۔
۶۱- وسعت : مقیم خاں ۔
۶۲- ہمدم : عباد اللہ خاں ۔

تذکرے کے دیباچے میں مؤلف نے سبب تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا

ہے کہ اُردو شعرا کے تذکرہ نگاروں نے چونکہ رام پور کے شعرا کو اپنے تذکروں میں جگہ نہیں دی اور ان کے حالات میں بے سر و پا باتیں کہی ہیں اس لیے شعرائے رام پور کا ایک الگ تذکرہ نواب کلب علی خاں والی رام پور کی فرمائش پر لکھا جا رہا ہے ۔ دیباچے کی ابتدائی چند سطور دیکھیے :

''بعد حمد و ثنائے رب العالمین و نعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین بر ارباب علم و سخن واضح و لائح باد کہ ہر چند کہ اکثرے از شائقان فن شعر ، تذکرہ ہائے شعرائے ہند اُردو گو متعدد جمع نمودہ اند لاکن کسے از اوشان حالات نازک خیالان خطۂ مینو سواد مصطفیٰ آباد عرف دارالسرور رام پور دارالریاست سرکار . . . بطور علیٰحدہ درج تالیفات نہ ساختہ ، با آن کہ مؤلفان تذکرہ جات بسبب بُعد از مساکن خود ہا و لا علمی از صاحبان علوم آنجا درین معنی قاصر ماندند ۔ یا ایں کہ اسا می بعض شاعران آنجا را کہ درج تالیفات خود نمودہ اند از ممالک عام ہندوستان شمردند ۔ لہٰذا حسب ارشاد فیض بنیاد حضور عطوفت معمور . . . نواب محمد کلب علی خان بہادر والی ملک رام پور . . . این تذکرۂ شعرائے آن فرخ سواد و خجستہ بنیاد مرتب نمودہ شد و چون کہ این تالیف مشتمل بر واقعات قریب یک صد سال است و کلام تمامی اساتذہ بہم نہ رسیدہ . . . لہٰذا انچہ کہ از تازہ خیالات اوشان بدست آمد بطور یادگار درج نمودہ شد ۔ اگر جائے خطا سرزدہ باشد معاف فرمایند کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نہ بود ۔[1]

''تذکرۂ شعرائے رام پور'' بھی تذکروں کی عام روش کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے ۔ شعرا کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں اہم واقعات یا سنین پیدائش و وفات کے اندراج کا کوئی اہتمام نہیں ملتا ۔ حتیٰ کہ تذکرے کی تالیف کی تاریخ بھی کہیں درج نہیں ہے ۔ نثری تراجم مختصر اور کلام کے منتخبات طویل ہیں ۔ بقول شوکت سبزواری شعروں کے انتخاب سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ وہ شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے ۔ اشعار کے انتساب میں البتہ بعض مقامات پر تذکرہ نگار

۱۔ ''ذاتی ڈائری'' کلب علی خاں فائق رام پوری ۔

سے غلطی سر زد ہوئی ہے - اثر رام پوری نے اپنے مضمون میں اس قسم کی بعض غلطیوں کی نشان دہی کی ہے مثلاً سراج اورنگ آبادی کی وہ مشہور غزل جس کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے کہ :

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

تذکرے میں رام پور کے ایک شاعر سراج النبی سراج کے نام سے درج ہے - اسی طرح جرأت کا یہ مطلع :

امشب کسی کاکل کی حکایات ہے واللہ
کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

قدرت اللہ شوق سے منسوب ہے اور نواب محمد خاں رند لکھنوی کی وہ غزل جس کا مطلع ہے :

پڑ نہ رہنا کسی صیّاد کے پالے بلبل
دیدِ گل کے تجھے پڑ جائیں گے لالے بلبل

رند رام پوری کے نام سے درج کی گئی ہے :

تذکرے کے تراجم صاحبزادہ محمد اکبر خاں اکبر کے ذکر سے شروع ہو کر عباد اللہ ہمدم پر ختم ہوتے ہیں - تراجم کی اصل صورت کیا ہے ؟ اس کے جواب میں ہم کلب علی خاں فائق رام پوری کی ڈائری سے دو ترجمے بطور نمونہ نقل کرتے ہیں :

افسر : تخلص - نواب احمد یار خان خلف نواب محمد یار خاں خلف نواب علی محمد خاں بانی ریاست رام پور - مثل رؤسائے قدیم صاحب علم و حوصلہ و سیر چشم و قدردان اہلِ ہنر بود - دو ہزار روپیہ ماہواری از سرکار والیٔ ملک می یافت - در نظم و نثر فارسی و اُردو مہارتے می داشت بہ درجۂ کہ صاحب دو دیوان نغز ُپر مغز است - گاہ گاہے از حافظ شیرانی صاحب کہ یکے از علمائے اجل آن شہر بود اصلاح می گرفت - این چند اشعار از تازہ خیالی اوشان است - افسوس کہ کلیات اوشان بہ عدم خبر گیری وارثان شان برباد رفت - زیادہ از سی سال می گزرد کہ ازین دار فانی

به ملک جاودانی نقل کرد۔''۱

نحیف : تخلص صاحبزاده مہدی علی خاں خلف صاحبزاده محمد حفیظ اللہ خاں خلف نواب غلام محمد خاں ، در علم فارسی و عربی بہرۂ وافی داشت۔ بذاتِ خود بسیار خلیق و سیر چشم و اہلِ مروت و فتوت بودند۔ گاہ گاہے شعر ہم می گفتند ، این چند اشعار ازو یادگار اوست۔ عرصہٗ دو سال (ف ۱۲۸۹ھ) می گزرد کہ رخت اقامت ازین جہان برداشتند۔''۲

☆ ☆ ☆

۱- ''ذاتی ڈائری'' کلب علی خاں فائق رام پوری۔
۲- ایضاً۔

عروس الاذکار

مصنّف کا معروف نام نصیر الدین احمد اور تاریخی نام ''برکات الحق نصیر الدین احمد'' ہے ، نقش تخلص کرتے تھے - حیدر آباد (دکن) کے باشندے تھے اس لیے نقش حیدر آبادی کہلاتے تھے - ''برکات الحق نصیر الدین احمد'' سے ان کا سالِ پیدائش ۱۲۶۰ھ نکلتا ہے - نقش نے اپنا حال ''عروس الاذکار'' میں لکھا ہے لیکن تاریخ پیدائش نہیں بتائی - ہاں یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد در اصل ملتان کے رہنے والے تھے - باپ کا نام محمد غوث تھا - نقش نے عربی و فارسی کی تعلیم انھی کی نگرانی میں حاصل کی تھی - شعر و سخن کا ذوق طبعی تھا - نو عمری سے اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے - نقش نے شاعری میں خود کو حافظ شمس الدین فیض حیدر آبادی کا شاگرد بتایا ہے لیکن ''عروس الاذکار'' کے مرتّب افسر امروہوی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے انھیں فیض حیدر آبادی کے ایک شاگرد حافظ عبدالرحیم صفا کا شاگرد بتایا ہے -[1]

نقش حیدر آبادی نے اُردو فارسی میں متعدد کتابیں یادگار چھوڑی تھیں لیکن دست بردِ زمانہ سے سب محفوظ نہ رہ سکیں ، صرف مندرجہ ذیل چند کتب کا سراغ ملتا ہے :

(۱) مخیّل الشعرا -
(۲) تحقیقات المصلحین -
(۳) شطرنج اخلاص -
(۴) عروس الاذکار -
(۵) مطالب عزا -

۱- مقدمہ ''عروس الاذکار'' (قلمی مسودہ) مرتّبہ افسر امروہوی ، زیر طباعت انجمن ترقی اُردو کراچی -

(۶) اشعار مثنوی -

سخاوت مرزا صاحب نے ''عروس الاذکار'' کے ایک قلمی نسخے کا تعارف کراتے ہوئے نقش حیدر آبادی کے اُردو فارسی دواوین کے علاوہ مزید گیارہ کتابوں کے نام دیے ہیں' جن میں سے بعض کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں - ''عروس الاذکار'' میں خود مؤلف نے لکھا ہے کہ وہ اس سے پہلے بارہ کتابیں لکھ چکے ہیں - مختصر یہ کہ نقش حیدر آبادی اپنے زمانے کے ایک ممتاز شاعر اور مصنّف تھے لیکن آج ہماری ادبیات میں وہ صرف ''عروس الاذکار'' کی معرفت یاد کیے جاتے ہیں - افسر امروہوی صاحب نے عمر یافعی کے حوالے سے نقش کی تاریخ وفات ۱۳۳۵ فصلی مطابق ۱۳۲۷ ہجری بتائی ہے - گویا انھوں نے سڑسٹھ سال کی عمر پائی -

''عروس الاذکار'' کے تین قلمی نسخوں کا سراغ اب تک ملا ہے - ایک نسخہ تمکین کاظمی کا عطا کردہ ادارۂ ادبیات حیدرآباد دکن میں ہے اور دو نسخے انجمن ترقی اُردو کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہیں - ان میں سے ایک نسخہ ناقص الطرفین ہے اور دوسرا نستعلیق میں صاف ستھرا ہے - اس کے دیباچے میں مؤلف نے تذکرے کا تاریخی نام ''عروس الاذکار'' بتایا ہے - اس سے ۱۲۸۹ ہجری برآمد ہوتے ہیں - لیکن افسر امروہوی کے لفظوں میں یہ سنہ اس وقت کا ہے جس وقت مصنّف کو تذکرہ لکھنے کا خیال آیا - ورنہ تذکرے کے آخر میں دیے ہوئے قطعاتِ تاریخ سے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۹۲ھ نکلتا ہے - اس سلسلے میں مؤلف کے خواجہ تاش میر احمد علی عصر کے قطعۂ تاریخ کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے :

عصر تاریخ تمامش ثبت کرد   یادگار شاعرانِ روزگار
۱۲۹۲ھ

دوسرے مصرعے سے ۱۲۹۲ھ نکلتے ہیں - اس لحاظ سے اس تذکرے کا آغاز ۱۲۸۹ھ میں اور تکملہ ۱۲۹۲ھ تین سال کی مدت میں ہوا ہے -

یہ تذکرہ بھی روایتِ عام کے مطابق فارسی زبان میں ہے اور اس میں

۱- تذکرۂ ''عروس الاذکار''، ص ۱ - ۳۲ ، رسالہ اُردو بابت جنوری ۱۹۵۸ع -

تین سو ستر شاعروں کا ذکر آیا ہے - مؤلف نے دیباچے میں لکھا ہے :

"بہ ترتیب اسامی شعرائے مسیح زبان و سخنوران معجز بیان عہد حضرت مغفرت (سکندر جاہ آصف جاہ ثالث) منزل تا شعرائے زمانۂ محبوب علی خان بہادر والی حیدرآباد دکن برگاشت -"

سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کا زمانہ ۱۲۱۸ھ سے شروع ہوتا ہے ، گویا مؤلف نے اس میں تیرھویں صدی ہجری کے اوائل سے لے کر اپنے سالِ وفات ۱۳۲۷ھ سے قبل تک کے شعرائے دکن کے ذکر کا اہتمام خاص کیا ہے - دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نقش کے معاصرین کا تذکرہ ہے ، یوں تبرک کے طور پر بعض شعرائے قدیم کو بھی شامل کر لیا گیا ہے - خود مؤلف کا بیان ہے کہ :

"بیشتر درین ذکر معاصرین است کہ احوال ہر یکے بہ چشم خود دیدہ و بر حسن و قبح مراتبِ سخنور رسیدہ -"

"کوائف بعضے از متقدمین این بلدہ نیز بہ طریق تیمناً آن چہ کہ بہم رسیدہ و ہم دست شدہ برائے ضیافت بلند طبعان بہ فحوائے خیر الکلام ما قل و دل زیب قلم و آرائش رقم گرفت -"

لیکن معاصرین کے تراجم بھی اکثر تشنہ ہیں - جن شعرا سے مؤلف کی ذاتی واقفیت تھی ، ان میں سے بعض کے متعلق البتہ ولدیت ، سکونت اور تاریخ وفات وغیرہ دے دی گئی ہے ورنہ عام طور پر شعرا کے ضروری حالات میں بھی تفصیل سے گریز کیا ہے ، بلکہ بعض شعرا کے سلسلے میں تو صرف تخلص اور نام کے ساتھ ایک آدھ شعر دے کر ترجمہ پورا کر دیا ہے - چند مثالیں دیکھیے :

(۱) اعزاز تخلص ازوست (ایک شعر) -

(۲) امانی میر امانی (ایک شعر) -

(۳) برق شخصے از طبقۂ پیشین (ایک شعر) -

(۴) تابان مردیست از قدیم (ایک شعر) -

افسر امروہوی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ :

"اس قسم کے اندراجات سے شعرا کی تعداد میں تو اضافہ ضرور ہوگیا مگر

تذکرے کی اہمیت و قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوا ۔''[۱]

ہرچند کہ یہ تذکرہ شعرائے دکن سے متعلق ہے اور زیادہ تر شعرائے عصر سے بحث کی گئی ہے ، تاہم اس میں بعض ایسے شعرا کا ذکر بھی آیا ہے جن کا تعلق دکن سے نہیں ، مثلاً امانی اور شاہ رکن الدین عشق وغیرہ ۔ اس کے برعکس ارضِ دکن سے تعلق رکھنے والے بعض شعرا فراموش کر دیے گئے ہیں ۔ افسر امروہوی نے اس قسم کے شعرا کے ناموں کی نشان دہی کر دی ہے ۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نقش کو عبدالرحیم صفا سے تلمذ تھا ۔ صفا شاگرد تھے حافظ شمس الدین فیض کے اور فیض شاگرد تھے تاج الدین مشتاق کے ۔ گویا شعر و سخن میں نقش کا تعلق تاج الدین مشتاق کے سلسلۂ تلامذہ سے تھا ۔ شاید اسی لیے اس تذکرے میں سب سے بڑی تعداد ان شعرا کی ہے جو مشتاق کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ صرف شمس الدین فیض کے شاگردوں کی تعداد نوے ہے اور ایک سو بارہ ایسے ہیں جو مشتاق کے سلسلۂ تلمذ میں آتے ہیں ۔

اپنی بعض کمزوریوں کے باوصف دکنی شعرا کا یہ ایک اہم تذکرہ ہے ۔ اس سے پہلے اسد علی خاں تمنا کا ''گل عجائب'' مؤلفہ ۱۱۹۲ھ ایسا تذکرہ نظر آتا ہے جو دکنی شعرا کے لیے مخصوص ہے ۔ ''عروس الاذکار'' اس کے تقریباً سو سال بعد وجود میں آیا ہے اور حیدرآباد کے سلسلۂ شعر و ادب کی ایک اہم کڑی بن گیا ہے ۔ اس میں صرف حیدر آباد دکن کے معاصر شعرا ہی کے متعلق بعض مفید معلومات فراہم نہیں ہوتیں بلکہ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس وقت دکن کا ادبی ماحول کیا تھا اور دہلی و لکھنؤ کے کون کون سے شعرا وہاں موجود تھے ۔

تذکرہ ، آصف کے ذکر سے شروع ہو کر یوسف کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے ۔ دونوں ترجمے نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں :

آصف : ''آصف تخلص میر گوہر علی خاں مخاطب بہ مبارز الدولہ بہادر پورِ نواب سکندر جاہ مغفور والیِ حیدرآباد ، تلمیذ حضرت فیض ۔''

یوسف : ''یوسف خاں فرزند شاہ عالم خاں . . . سپہ دار سرکارِ آصفیہ شاگرد

۱۔ ''مقدمۂ عروس الاذکار'' ، مرتبہ افسر امروہوی ، زیر طبع انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

بڑے میاں صاحب مصدق در ۱۲۷۱ھ ازین جہان فانی بہ عشرت کدۂ جاودانی نقل کرد - چنانچہ منشی تفضل حسین عطا تاریخش نوشتہ :

رفت خلق از خلق یوسف خان چو رفت
او نہ رفتہ نیک خوے رفتہ آہ
سال تاریخش عطا کلکم نوشت
یوسف از مصر نکوئی رفتہ آہ

۱۲۷۱ھ

این اشعار ازوست -''

☆ ☆ ☆

نگارستانِ بشیر

''نگارستان بشیر'' کے مصنّف شاہ بہاء الدین بشیر دہلوی ہیں ۔ بشیر کے حالاتِ زندگی کے بارے میں قدیم تذکروں میں کچھ نہیں ملتا ۔ بشیر کے معاصر تذکرہ نگاروں میں لالہ سری رام اور درگا پرشاد نادر نے البتہ ان کا ذکر کیا ہے ۔ نادر کی تالیف ''مرأت خیالی''[۱] میں بشیر کے کہے ہوئے پانچ تاریخی قطعات شامل ہیں ۔ قطعات سے پہلے بشیر کے بارے میں چند تعارفی کلمات بھی ہیں ۔ نادر کے ''خزینۃ العلوم'' میں بھی بشیر کے قطعات تاریخی موجود ہیں اور شاہ نصیر کے ذکر میں ان کا حوالہ بھی دیا گیا ہے ۔ لالہ سری رام نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ :

> شاہ بہاء الدین دہلوی معروف بہ عبداللہ شاہ بشیر ۔ آپ شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین صغیر کے حقیقی نواسے تھے اور چوں کہ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لیے انھوں نے انھیں متبنّٰی بھی کر لیا تھا ۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد درگاہ و جاگیر آبائی خانقاہ صدر جہاں (دہلی) کے مالک ہوئے ۔ فن سخن کا مذاق موروثی تھا اور اس میں اپنے عزیز شاہ تنویر سے مشورہ لے لیا کرتے تھے ۔ عربی فارسی کی تحصیل اچھی تھی ۔ تصوف اور فن سخن کی کتابوں کا اکثر مطالعہ کرتے تھے ۔ افکار زمانہ نے کبھی دل جمعی نہ ہونے دی ۔ ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا لکھنا شروع کیا تھا مگر اسے پورا نہ کر سکے ۔ سات برس کا عرصہ ہوا انتقال کیا ۔ ۵۵ - ۶۰ برس کے قریب عمر پائی ۔ قلمی

۱- ''مرأت خیالی''، ص ۳ تا ۶ ، مطبوعہ مطبع فوق کاشی دہلی ، مملوکہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو ، کراچی ۔

دیوان جو راقم تذکرہ کے کتب خانے میں موجود ہے ، اس کا انتخاب درج ذیل ہے ۔"[1] (۶۰ اشعار)

اس سے زیادہ تفصیل کسی اور تذکرے میں نہیں ملتی - ہاں بشیر نے خود اپنی تصانیف میں جابجا اپنے حالات لکھ دیے ہیں - چنانچہ "نگارستان بشیر" کے دیباچے میں انھوں نے اپنا ذکر کیا ہے لیکن چونکہ ان کی ساری تحریریں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں اور مختلف کتب خانوں میں بکھری پڑی ہیں ، اس لیے ان سب تک رسائی بھی ممکن نہیں ہے - مشفق خواجہ صاحب نے بکمال محنت بشیر کی تقریباً ساری تحریروں کی نقلیں حاصل کر لی ہیں اور ان کے حالات و تصنیفات کے متعلق بہت سا قیمتی مواد فراہم کر رکھا ہے جس کا مختصر تعارف انھوں نے رسالہ اُردو ، غالب نمبر ، بابت فروری ۱۹۶۹ع میں شائع بھی کر دیا ہے - بشیر کے دوسرے تذکروں کے مسودے بھی خواجہ صاحب نے بغرضِ اشاعت مرتّب کر لیے ہیں -

"نگارستان بشیر" تاریخی نام ہے - اس سے ۱۲۹۴ھ برآمد ہوتے ہیں - اس سے ایک سال پہلے ۱۲۹۳ھ میں بہاء الدین بشیر "سیرستان بشیر" کے نام سے ایک کتاب لکھ چکے تھے - اس کا اظہار خود بشیر نے "رسالۂ تذکرات" مؤلفہ گارسیں دتاسی مترجمہ ذکاء اللہ کے حاشیے میں کیا ہے -[2] یوں بھی "سیرستان بشیر" تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۲۹۳ھ نکلتے ہیں - ممکن ہے اس میں بشیر نے اپنی سیاحت کا حال اور سیاحت کے دوران میں ملنے والے شاعروں کا ذکر کیا ہو ، یا ان کا کلام منتخب کیا ہو - خاص "تذکرۃ الشعرا" یوں نہیں ہو سکتا کہ "نگارستان بشیر" میں مؤلف نے "سخن شعرا" مؤلفۂ نساخ کے طرز کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے - بہرحال سیرستان بشیر کا کوئی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ، اس لیے اس کی نوعیت کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے -

---

۱- خمخانۂ جاوید ، جلد اول ، ص ۵۹۹ تا ۶۰۲ ، مطبوعہ مخزن پریس دہلی ۱۹۰۸ع -

۲- "رسالۂ تذکرات" ، ص ۵۴ ، مترجمہ ذکاء اللہ ، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۷ع ، مملوکہ قیصر ابن حسن ، کراچی -

"نگارستان بشیر" کا ایک ناقص الآخر اور نامکمل قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں البتہ موجود ہے۔ یہ مؤلف کے ہاتھ کا ہے۔ اس کے سرورق پر اس کا سال تصنیف ۱۲۹۴ھ درج ہے۔ یہ تذکرہ درگا پرشاد نادر کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ چنانچہ نادر کی ایک منظوم تقریظ بھی بصورت مثنوی اس میں شامل ہے۔ تقریظ میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد قیصر ہند ملکہ وکٹوریہ اور لارڈ لٹن کی تعریف ہے۔ پھر بشیر کے حالات و اوصاف کا بیان ہے۔ آخر میں یہ شعر ہے:

بے سرِ بغض اک ہوا مصرع عیاں
ہے کتابِ یادگارِ شاعراں

دوسرے مصرعے کے اعداد ۱۲۹۶ھ ہوتے ہیں۔ اس میں سے "ب" کے اعداد تفریق کرنے سے ۱۲۹۴ھ رہ جاتے ہیں۔

بشیر نے رسالہ تذکرات مؤلفہ گارسیں دتاسی مترجمہ مولانا ذکاء اللہ کے حاشیے میں بھی اس کا سال تصنیف ۱۲۹۴ھ درج کیا ہے اس لیے یہی اس کا سال تکمیل ہے۔ مشفق خواجہ نے پچھلے سال رسالۂ اُردو میں اسے شائع کر دیا ہے۔

"نگارستان بشیر" اُردو زبان میں لکھا گیا ہے اور عبدالغفور نساخ کے تذکرے "قطعۂ منتخب" کے طرز پر ہے۔ یعنی اس میں صرف قطعہ نگار شعرا کے تراجم اور منتخب قطعات شامل ہیں۔ لیکن افسوس کہ بشیر کا مکمل تذکرہ دستیاب نہیں ہے۔ "نگارستان بشیر" مخزونہ انجمن ترقی اُردو جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، ناقص الآخر اور نامکمل ہے۔ اس میں کل سولہ صفحات ہیں اور صرف الف کی ردیف کے بیس شاعروں کے تراجم و منتخبات محفوظ ہیں۔ گویا اصل تذکرے کے صرف چند اوراق محفوظ ہیں اور اس کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا یا ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔ تذکرہ خواجہ حیدر علی آتش کے ذکر سے شروع ہو کر آغا جان دہلوی کے ترجمے پر ختم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا "نگارستان بشیر" کے اگرچہ صرف چند اوراق دستیاب ہیں، پھر بھی یہ بڑے کام کے ہیں۔ خاص طور پر اس کا دیباچہ بہت قیمتی ہے۔ بشیر کو تذکرہ نگاری کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا؟ "نگارستان بشیر" انھوں نے کیوں لکھا اور اس کے بعد وہ کس نوع کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے؟

اس طرح کے اور کئی سوالوں کے جوابات اس دیباچے میں مل جاتے ہیں اور بشیر کے مزاج اور ان کے ذوق و شوق کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ اس کی افادیت کے سبب ہم پورا دیباچہ یہاں نقل کرتے ہیں :

''اللہ اللہ ، کیا ذات کبریائی کا جلوہ ہے ، تیری شان شایان ہر برگِ گاہ سے ہویدا ہے ، گو احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلواۃ اللہ علیہ جیسے نبی برحق اور حضرت علی ید اللہ جیسے وصی صادق کرم اللہ وجہہ نے اپنا اپنا عجز ظاہر فرمایا پھر بھی ذرہ ذرہ زبان حال سے تیرے اوصاف میں گویا ہے ۔ گو اولیاے عظام رحمۃ اللہ علیہما [کذا] و شعرائے بلند مقام معترف بہ عجز رہے ، الا" شانِ جلالی و جمالی کے اوصاف میں سبھی کو رطب اللسان پایا ۔ یارو یہ دریائے نا پیدا کنار ہے جس کا وار ہے نہ پار ہے ، مجبور ہے ۔ پُر معاصی خاکِ پائے غربا محب الفقرا کج مج زبان ہیچ مدان ہندی نژاد بے بنیاد کلمات ضروری الاظہار عرض کرتا ہے اور سہو و خطا پر اصلاح کی التماس رکھتا ہے ۔ ناچیز پہلے آغاز سن تمیز سے کہ ہنوز بے تمیز ہے بہ عنایت بے غایت اپنے نانا صاحب یعنی زبدۃالکاملین شاہ نجم الدین صغیر فخر المعاصرین کھین پورِ شاہ نصیر الدین المعروف بہ شاہ نصیر دہلوی جاگیردار موضع ہرسانہ خورد و ملہا فروعہ وغیرہ خلف الصدق شاہ غریب نبیرہ و سجادہ نشین خلفا [ے] راشدین حضرت بابرکت سید مخدوم شاہ صدر جہاں صاحب علیہ الرحمۃ ۔ نظر یا [کذا] و حضرت سید مخدوم داتا شاہ عالم صاحب قدس سرہما کہ اب یہ خدمت بھی یہی عاصی بجا لاتا ہے ۔ بعد حاصل کرنے ارادت کے شعر و شاعری پر مائل رہا اور یہ شوق یہاں تک بڑھا کہ قریب دو تین سو دواوین متقدمین و متاخرین شعراے گرامی ، قلمی اور چھپے ہوئے فراہم ہو گئے اور انھی کے مطالعے میں اپنی حیات مستعار کے دن بسر کیے ۔ ایک روز یہ خیال آیا کہ اگر ان میں سے کچھ کلام لے کر ایک کتاب جمع ہو تو بہت ہی دلچسپ رہے ۔ پس اول تو یہ ارادہ تھا کہ پوری پوری غزلیں کروں اور ایک ردیف کی ایک ایک جلد بناؤں ، پھر دیکھا کہ وہ تو بہت ہی زخیم [کذا] ہو جائیں گے ۔ اب یہ قصد ہوا کہ صرف

قطعات کا انتخاب لکھوں اور ''نگارستان بشیر'' اس کا تاریخی نام رکھوں - اگر زمانہ فرصت دے گا تو انشاء اللہ ایک اور تذکرہ شعرائے اُردو کا تیار ہوگا - اگرچہ اس ایام میں مولوی عبد الغفور خاں صاحب کا تذکرہ ''سخن شعرا'' سے بڑھ کر کوئی اور تذکرہ حلیۂ طبع سے آراستہ نہیں ہوا ، مگر میرے پاس دو ڈھائی سو شاعروں کا کلام اس کے علاوہ موجود ہے اور ہمیشہ متلاشی اس امر کا رہا ہوں کہ نئے شاعر کا کلام بہم پہنچاؤں - اسی نظریے سے یہ فقرہ اس موقع پر لکھ دیا ہے کہ جس صاحبِ کلام کا دل چاہے بذریعہ خط پیڈ اپنا حال و مقال فقیر کے پاس روانہ فرمائیں - فقیر کا تکیہ اندرون شہر دہلی دروازہ واقعہ محلہ روشن پورہ درگاہ شریف مخدوم شاہ صدر جہاں صاحب قدس سرہٗ میں ہے اور نام اس گمنام کا شاہ بہاءالدین عرف عبد اللہ شاہ تخلص بشیر -''

اس دیباچے سے بشیر کے خاندانی حالات کے علاوہ ان کے علمی ذوق و شوق اور ادبی مشغلوں کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) بشیر کو شعر و شاعری سے لگاؤ اور اساتذۂ فن کے دواوین و کلیات کے قلمی و مطبوعہ نسخے جمع کرنے کا شوق شروع ہی سے تھا اور ۱۲۹۴ھ میں ان کے پاس شعرائے متقدمین و متاخرین کے دو ڈھائی سو دواوین قلمی و مطبوعہ جمع تھے -

(۲) پہلے وہ ایک ایسا ضخیم تذکرہ لکھنا چاہتے تھے جس میں تراجم کے ساتھ ساتھ شعرا کی پوری پوری غزلیں نقل کی جائیں ، لیکن طوالت و ضخامت کے خوف سے وہ اس ارادے سے باز رہے -

(۳) ''نگارستان بشیر'' کے بعد وہ شعرائے اُردو کا ایک مکمل تذکرہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے -

(۴) عبد الغفور نسّاخ کا تذکرہ ''سخن شعرا'' کا مطبوعہ نسخہ ان کے پاس تھا اور وہ اسے اپنے دور کا بہترین تذکرہ خیال کرتے تھے -

(۵) اس وقت بھی دو ڈھائی سو ایسے شاعروں کا منتخب کلام ان کے پاس موجود تھا جن کا ذکر سخن شعرا میں نہیں ہے -

(۶) وہ مزید شعرا کی تلاش میں تھے اور انھوں نے اس سلسلے میں مواد جمع کرنے کے لیے باقاعدہ اشتہار بھی دیا تھا -

"نگارستان بشیر" کے تراجم اگرچہ مختصر ہیں لیکن شعرا کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں بعض ضروری امور مثلاً نام ، تخلص ، تلمذ ، وطن ، سکونت ، عمر ، عہد اور مشغلہ وغیرہ کی نشان دہی اکثر جگہ کر دی گئی ہے ۔ بعض واقعات اور وفات کے سنین بھی جا بجا دے دیے گئے ہیں ۔ مثلاً آتش کے بارے میں لکھا ہے :

"۱۲۶۳ھ میں فوت ہوئے"

محمد علی خاں اثیم کے سلسلے میں لکھا ہے :

"گورکھپور جا کر ڈگری نویسی محکمہ منصفی کی اختیار کی ۱۸۴۷ء تک اسی عہدے پر مامور رہے ۔"

حافظ عبدالرحمٰن احسان دہلوی کے متعلق لکھا ہے :

"۱۲۶۷ھ میں مضمون قضا باندھا ۔"

آصف الدولہ کے ترجمے میں لکھا ہے :

"۱۲۱۲ھ میں رحلت فرمائے ملک عدم ہوئے ۔"

شاہ عالم آفتاب کے بارے میں لکھا ہے :

"۱۲۲۱ھ میں ان کا وصال ہوا ۔"

تراجم کی طرح انتخابِ کلام بھی مختصر ہے ۔ عموماً ایک یا دو قطعے درج کیے گئے ہیں ۔ قطعے بھی طویل نہیں ، مختصر ہیں ۔ زیادہ قطعات دو دو شعر کے ہیں بعض البتہ پانچ یا چھ اشعار پر مشتمل ہیں ۔ حالاتِ زندگی اور انتخاب قطعات کے سوا کسی کے بارے میں تنقیدی رائیں نہیں ملتیں ۔

"نگارستان بشیر" کے اس قلمی مخطوطے میں صرف بیس تراجم ہیں ۔ ان تراجم میں : (۱) خواجہ حیدر علی آتش ۔ (۲) خواجہ سید محمد میر اثر ۔ (۳) محمد علی خان لکھنوی اثیم ۔ (۴) عبدالرحمٰن احسان ۔ (۵) مرزا احسن علی احسن ۔ (۶) محمد یار خاں احقر ۔ (۷) قاضی محمد صادق اختر ۔ (۸) حافظ احمد علی احمد ۔ (۹) واجد علی شاہ اختر ۔ (۱۰) الگزنڈر ہیڈرلے آزاد ۔ (۱۱) نواب سید محمد آزاد ۔ (۱۲) مظفر علی اسیر ۔ (۱۳) عظیم الدین خاں آشفتہ ۔ (۱۴) حاجی عبداللہ آشفتہ ۔ (۱۵) آصف الدولہ آصف ۔ (۱۶) مرزا زین العابدین آشنا ۔ (۱۷) اصغری (نام معلوم نہیں) ۔ (۱۸) محمد ظہیر الدین اظفری ۔ (۱۹) شاہ عالم آفتاب اور (۲۰) میر آغا خاں آغا دہلوی کے نام شامل ہیں ۔ ان بیس میں آتش ،

آزاد الگزنڈر ، آشفتہ حاجی عبداللہ آشفتہ ، عظیم الدین آشفتہ ، آصف الدولہ ، آفتاب ، اثر ، احسن ، قاضی محمد صادق اختر ، اسیر اور اظفری یعنی گیارہ ایسے شاعر ہیں جو نساخ کے قطعۂ منتخب مرقومہ ۱۲۷۶ھ میں بھی شامل ہیں ۔[۱] اثیم ، احسان ، احقر ، احمد ، آزاد ، سید محمد آشنا ، اصغری ، آغا اور اختر واجد علی شاہ کے تراجم ''قطعۂ منتخب'' کے تراجم پر بظاہر اضافہ ہیں ۔ بشیر نے دیباچے میں نسّاخ کے ''سخن شعرا'' مرقومہ ۱۲۸۱ھ کا ذکر تو کیا ہے لیکن قطعۂ منتخب کا ذکر نہیں ہے ۔ ہو سکتا ہے نساخ کے ترجمے میں اس کا ذکر ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ ''نگارستان بشیر'' کے صرف چند صفحے دستیاب ہیں اور ان میں ردیف الف کے بیس شعرا کے تراجم محفوظ ہیں ۔ پھر بھی نگارستان بشیر کے دستیاب تراجم صاف ظاہر کرتے ہیں کہ بشیر کی نظر سے نسّاخ کا ''قطعۂ منتخب'' ضرور گزرا ہے ۔ بلکہ اکثر تراجم تو یہ بتاتے ہیں کہ بشیر نے قطعۂ منتخب کو سامنے رکھ کر اپنا تذکرہ مرتّب کیا ہے ۔ دونوں کے تراجم بطور ثبوت یہاں ایک دوسرے کے مقابل نقل کیے جاتے ہیں :

قطعۂ منتخب	نگارستانِ بشیر
(۱) احسن : احسن تخلص مرزا احسن علی دہلوی تلمّذ ضیا و سودا نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار میں صیغۂ شاعری میں ملازم تھے ۔ خوش نویسی اور نکو بیانی میں مشہور تھے دیوان ان کا نظرِ راقم سے گزرا :	احسن : احسن تخلص مرزا احسن علی دہلوی تلمذ ضیا و سودا اخیر ایام میں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کی سرکار میں بہ صیغۂ شاعری ممتاز ہوئے خوش نویسی میں اچھی مہارت حاصل تھی ۔ صاحب دیوان گزرے :
آشنا مطلب ہی کا دیکھا جسے دیکھا ہے یار اس زمانے میں نہیں کوئی کسی کا آشنا آشنا ہر ایک کو سمجھا نہ کر کہتا ہوں میں فہم ہے گر تجھ کو ہو میرے سخن کا آشنا	آشنا مطلب ہی کا دیکھے جسے دیکھا ہے یار اس زمانے میں . . . . آشنا آشنا ہر ایک . . . . . میں فہم . . . . آشنا

۱۔ ملاحظہ ہو قطعۂ منتخب مطبوعہ ''رسالہ اردو'' کراچی بابت ستمبر ۱۹۶۸ع ۔

(۲) **اسیر** : منشی میر مظفر علی خطاب تدبیر الدولہ ولد میر مدد علی باشندۂ قصبہ امیٹھی مقیم لکھنؤ شاگرد مصحفی واجد علی شاہِ اودھ کے ملازموں میں ہیں دیوان ان کا نظر سے گزرا :

کیا ذکر ہے اور ساتھیوں کا
چھوڑا دل نے بھی ساتھ اپنا
تنگ آئے ہیں سخت ان بتوں سے
پتھر کے تلے ہے ہاتھ اپنا

(۳) **اظفری** : مرزا محمد ظہیر الدین مرزا علی بخت عرف مرزا کلاں دہلوی کچھ روز وہ مدراس میں تھے وہاں سے کلکتے میں آ کر پھر شاہجہان آباد کو چلے گئے :

کئی دن ہیں کہ یار نے مجھ سے
ربط بارِ دگر کیا پیدا
شکر اللہ آہ نے میری
اظفری کچھ اثر کیا پیدا

(۴) **آشفتہ** : حاجی عبداللہ ولد عبدالحمید باشندۂ سلہٹ شاگرد حضرت ضیغم ۔ راقم کے احباب میں ہیں :

وہی عالم اچھا تھا آشفتہ جس میں
وجود و عدم کا نہ رنج و محن تھا

(یہ پانچ اشعار کا قطعہ ہے)

اسیر : تخلص منشی مظفر علی سلمہ مخاطب بہ تدبیر الدولہ تدبر الملک ولد میر مدد علی باشندۂ قصبۂ امیٹھی مقیم لکھنؤ شاگرد غلام ہمدانی مصحفی تین دیوان اُردو اور ایک فارسی . . . ان کا راقم آثم کے پاس موجود ہے :

کیا ذکر . . . کا
چھوڑا . . . اپنا
تنگ آئے . . . سے
پتھر تلے ہے ہاتھ اپنا

اظفری : تخلص محمد ظہیر الدین مرزا علی بخت بڑے مرزا دہلوی :

کئی دن ہیں کہ یار نے مجھ سے
ربط . . . . . پیدا
شکر اللہ . . . . میری
اظفری . . . کیا پیدا

آشفتہ : تخلص حاجی عبداللہ پسر عبدالحمید ساکن سلہٹ حافظ اکرام احمد ضیغم سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں :

وہی عالم اچھا تھا آشفتہ جس میں
وجود و عدم کا نہ رنج و محن تھا

(یہ پانچ اشعار کا قطعہ ہے)

(۵) آشفتہ : عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں دہلوی عزیز سعادت خاں بن مکرم خاں شاگرد میر مہدی مائل و فرزند علی مضمون [موزوں] ، قوم افغانی تھے آخر ایام میں شعر گوئی ترک کر کے کسب باطن کی طرف مشغول ہوئے تھے ان کے بیشتر مقطعے میں زلف کا مضمون ہوتا ہے ۔ صاحب دیوان گزرے ہیں :

کل بعد عمر بزم میں کر اس کی میں نے راہ
فن سے کمیں سے داؤ سے حیلہ سے گھات سے
(یہ پانچ شعر کا قطعہ ہے)

(٦) آتش : تخلص خواجہ حیدر علی لکھنوی خلف خواجہ علی بخش شاگرد مصحفی اشعار ان کے عاشقانہ و پُر مضمون بہت خوب ہوتے ہیں ۔ سوائے غزل کے اور کسی صنف پر قادر نہ تھے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۸ع میں وفات پائی دو دیوان ان کے نظر سے گزرے :

کیا عجب جو وہ گیسوے شب رنگ
لیں متاعِ دلِ احبّا لوٹ
جانتے ہیں کہ فوج جنگی سے
نہیں سردار پھیر ایتا لوٹ

آشفتہ : عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں شاگرد میر مہدی مائل و فرزند علی مضمون [موزوں] نواب سعادت خاں بن مکرم خاں کے عزیزوں میں تھے ۔ صاحب دیوان گزرے ۔ اکثر مقطعے میں تخلص کی رعایت سے مضمون زلف باندھتے تھے آخر کو اس فن سے تائب ہو کر کسب باطن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے :

کل بعد عمر بزم میں کر اس کی میں نے راہ
فن سے کمیں سے داؤ سے حیلہ سے گھات سے
(یہ پانچ شعر کا قطعہ ہے)

آتش : تخلص خواجہ حیدر علی لکھنوی خلف خواجہ علی بخش شاگرد غلام ہمدانی مصحفی اشعار ان کے نہایت عاشقانہ و دلچسپ اور گرما گرم ہوتے ہیں دو دیوان ان کے مختلف چھاپوں میں چھاپے گئے ۱۲۶۳ھ میں فوت ہوئے ۔ اس فن میں اکثر اہل لکھنؤ اس سے مستفیض ہوئے اکثر باشندہ (کذا) لکھنؤ ناسخ اور آتش استادی میں برابر شمار کرتے ہیں ۔ یہ تاریخ ان کی راقم نے موزوں کی ہے :

حضرت خواجہ آتش آہ بشیر
رفت از دہر و خلد شد مسکن

ہاتف غیب بہر تاریخش
گفت طوطی بوستانِ سخن

کیا عجب وہ جو گیسوے شب رنگ
لیں متاع دل احبا لوٹ
جانتے ہیں کہ فوج جنگی سے
نہیں سردار پھیر لیتا لوٹ

(۷) اثر: تخلص سید محمد میر دہلوی حضرت خواجہ میر درد قدس سرہ، کے چھوٹے بھائی - شعر ان کے نہایت عاشقانہ و درد مندانہ ہوتے ہیں - دیوان اور مثنوی ان کی نظر سے گزری -

اثر: تخلص خواجہ سید میر محمد میر دہلوی برادرِ خورد و شاگرد خواجہ میر درد خلف محمد ناصر ، خواجہ احمد جان سے بڑے تھے فی الواقع ان حضرت کے کلام میں ایک طرح کا اثر پایا جاتا ہے دیوان ان کا ہیچ مدان کے پاس قلمی موجود ہے - شعر خوب کہتے تھے اور علوم باطنی اور تصوف . . . خوب ماہر تھے . . . :

کیا کہیے اثر تو آپ ٹک دیکھ
یوں حال اپنا تباہ کرنا
جی اب کے بچا خدا خدا کر
پھر اور بتوں کی چاہ کرنا

کیا کہیے . . . دیکھ
یوں . . . . . کرنا
جی . . . . . . کر
پھر اور . . . . کرنا

(۸) آزاد: تخلص کپتان الگزنڈر ہیڈرلی بن مسٹر جیمس ہیڈرلی شاگرد نواب زین العابدین خاں عارف سرکار الور میں عہدۂ کپتانی پر ماسور ہیں - دیوان ان کا نظر سے گزرا :

آزاد: تخلص کپتان الگزنڈر ہیڈرلی ولد مسٹر جیمس ہیڈرلی سرکار الور میں بہ عہدۂ کپتان ماسور تھے - نواب زین العابدین خاں عارف سے مشورہ کرتے تھے - ۱۸۶۱ع میں انتقال کیا - دیوان ان کا چھپ کر شائع ہوا بندے کے پاس بھی ہے :

ہم نے جو آنکھ گاڑ کر دیکھا
حسن اس رشکِ ماہِ کامل کا
رخِ روشن پہ جم گئی پتلی
سب کو ناحق گمان ہے تل کا

(ردیف ی کا ایک قطعہ اور بھی ہے)

(۹) **آصف** : تخلص وزیر الممالک نواب یحییٰ خان مرزا امانی آصف الدولہ بہادر خلف نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر مولد ان کا فیض آباد مسکن و مدفن لکھنؤ ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا ۔ تیر اندازی میں خوب دخل رکھتے تھے ۔ ان کے محامد و مکارم کا حال اظہر من الشمس ہے حاجت بیان نہیں دیوان ان کا نظر سے گزرا :

آج بیمار کو پھر دیکھا تھا میں نے تیرے
وہی بیتابی تھی جی کی وہی گھبرانا تھا
کوئی ظاہر میں تو آثار نہیں جینے کے
مرضِ عشق ہے میں پہلے ہی پہچانا تھا

(دس قطعات اور ہیں)

(۱۰) **آفتاب** : تخلص حضرت فردوس منزل ابو المظفر مجاہد الدین شاہ عالم بادشاہ غازی فرمانروائے دہلی ، وصال ان کا ۱۲۲۱ھ میں ہوا ہے ۔ حال ان کا مانند آفتاب عالم تاب کے روشن ہے ۔ محتاج بیان نہیں ۔ دیوان ان کا نظر سے

ہم نے جو آنکھ گاڑ کر دیکھا
حسن اس رشک ماہ کامل کا
رخِ انور پہ جم گئی پتلی
سب کو ناحق گمان ہے تل کا

(ی کی ردیف کے دو قطعات اور ہیں)

آصف الدولہ : تخلص نواب وزیر الممالک نواب یحییٰ خان مرزا امانی آصف الدولہ بہادر خلف الصدق نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر جائے ولادت فیض آباد مسکن و مدفن لکھنؤ ۱۲۱۲ھ میں رحلت فرمائے ملک عدم ہوئے ۔ احوال ان کا اظہر من الشمس ہے محتاج بیان نہیں ۔ صاحب دیوان گزرے ۔ اشعار ان کے خوب و مرغوب ہوتے ہیں :

آج بیمار کو پھر دیکھا تھا میں نے تیرے
وہی بے تابی تھی جی کی وہی گھبرانا تھا
کوئی ظاہر میں تو آثار نہیں جینے کے
مرضِ عشق ہے میں پہلے ہی پہچانا تھا

(دو قطعے اور ہیں)

آفتاب : تخلص حضرت فردوس منزل ابوالمظفر مجاہد الدین شاہ عالم بادشاہ فرماں روائے خطۂ دہلی ۔ احوال ان کا مانند آفتاب عالم تاب روشن و منور ہے ۔ حاجت بیان نہیں ۔ اخیر ایام غلام قادر کی نمک حرامی سے بینائی زائل ہو گئی تھی ۔

گزرا :

صبح اٹھ جام سے گزرتی ہے
شب دلارام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

(۱۱) اختر : تخلص قاضی محمد صادق خاں مرحوم ولد قاضی محمد لعل مغفور باشندۂ ہوگلی شاگردِ مرزا قتیل ۔ لکھنؤ و اطراف لکھنؤ میں ہمیشہ عہدۂ جلیلہ پر مامور رہے ۔ محامد حیدریہ و دیوان فارسی و ریختہ و گنجِ میزبخ و تذکرۂ آفتاب عالم تاب و مثنوی سراپا سوز وغیرہ بہت سی تصنیفات و تالیفات ان کی مشہور ہیں ۔ زبان فارسی و اُردو کو جانتے تھے۔ فن شعبدہ میں کمال تھا کیمیا گر مشہور تھے اور بہت سے فنون میں دخل رکھتے تھے ۔ نظم و نثر ان کی نہایت مرغوب ہے ۔ ان کا دیوان و مثنوی محامد حیدریہ نظر سے گزرے :

کل شیخ بن کے مجتہدِ عصر ساقیا
دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا

(یہ دس شعر کا قطعہ ہے چار قطعات اور بھی ہیں)

۱۲۲۱ھ میں ان کا وصال ہوا ۔ مراقبہ [کذا] شاہ عالم بادشاہ فردوس مکان سے تاریخ پیدا ہوئی ہے :

صبح اُٹھ جام سے گزرتی ہے
شب دلا رام سے گزرتی ہے
عاقبت . . . . خدا جانے
اب تو . . . . . . گزرتی ہے

اختر : تخلص قاضی محمد صادق خاں مرحوم باشندۂ ہوگلی ولد قاضی محمد لال مغفور مرزا قتیل سے نسبت تلمذ رکھتے تھے ۔ اضلاع لکھنؤ میں سدا جلیل القدر عہدے پر ممتاز رہے ۔ صاحب دیوان و تذکرہ وغیرہ گزرے :

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر ساقیا
دکھلا کے باغ مجھکو عذاب وثواب کا

(یہ دس اشعار کا قطعہ ہے)

یہ تراجم بتاتے ہیں کہ بشیر نے نساخ کے تراجم اپنے تذکرے میں من و عن داخل کر لیے ہیں - کہیں کہیں فقروں کی ساخت اور الفاظ کی نشست میں معمولی تبدیلیاں کر دی ہیں - مندرجہ بالا تراجم میں منتخب قطعات بھی وہی ہیں جو نساخ نے ''قطعۂ منتخب'' میں درج کیے ہیں - ان شواہد کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''نگارستان بشیر'' بڑی حد تک ''قطعۂ منتخب'' کا چربہ ہے - نگارستان بشیر مکمل صورت میں دستیاب نہیں ورنہ پوری کیفیت معلوم ہوتی -

چونکہ ۱- اثیم - ۲- احسان - ۳- احقر - ۴- احمد - ۵- آزاد ۶- اصغری - ۷- آغا - ۸- آشنا اور ۹- اختر واجد علی شاہ یعنی نو شاعروں کے تراجم ''قطعۂ منتخب'' میں نہیں ہیں ، اس لیے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بشیر نے نساخ کے تذکرے پر نو تراجم کا اضافہ کیا ہے - لیکن ایسا نہیں ہے - انھیں جو تراجم ''قطعۂ منتخب'' میں نہیں مل سکے نساخ کے سخن شعرا سے لے لیے ہیں - چنانچہ احسان ، احمد - اختر واجد علی شاہ اور آشنا و آزاد کے تراجم کم و بیش وہی ہیں جو نساخ کے سخن شعرا میں ہیں ، یہ تراجم بھی ایک دوسرے کے مقابل یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

سخن شعرا	نگارستان بشیر
(۱) **احسان** : تخلص حافظ عبدالرحمٰن خاں خلف حافظ غلام رسول خاں استاد و مختار مرزا فرخندہ بخت بہادر ابن شاہ عالم بادشاہ باشندۂ دہلی ۱۲۶۷ھ میں انتقال کیا - صاحب دیوان گزرے -[۱]	**احسان** : حافظ عبدالرحمٰن خاں دہلوی خلف حافظ غلام رسول خاں استاد و مختار مرزا فرخندہ بخت پسر شاہ عالم بادشاہ ۱۲۶۷ھ میں مضمون قضا باندھا - صاحبِ دیوان تھے -
(۲) **احمد** : حافظ احمد علی جن کا مجموعہ برہانہ و منتخب دیوان	**احمد** : تخلص حافظ میر احمد علی شاگرد میر عزت اللہ عشق مقیم دہلی -

۱- سخن شعرا ، ص ۱۳ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ع ، مملوکہ انجمن ترقی اردو ، کراچی -

مطبع تاج المطابع میں چھپ
کر مشہور ہوا ۔

(۳) اختر : تخلص واجد علی بادشاہ
دیوان اور مثنوی ان کی نظر سے
گزری ۔ ان دنوں کلکتے کے موچی
کھولی میں تشریف رکھتے ہیں ۔

اختر : واجد علی بادشاہ لکنھؤ خلف
امجد علی شاہ مرحوم فی الحال
کلکتے میں تشریف فرما ہیں ۔ دیوان
ذخیم [کذا] اور چند رسالے ان کے
نظر سے گزرے ۔

(۴) آزاد : تخلص سید محمد امین الحسینی
المعروف بہ نواب ۔

آزاد : نواب سید امین الحسنی الموسوی
المروف بہ نواب شاہ مرزا خان
بہادر ادب یافتہ شیخ فضل احمد
المتخلص بہ کیف باشندۂ لکھنؤ
گلدستہ شعرا جو لکھنؤ میں چند
مشاعرہ ردیف وار مطبوع ہوئے
تھے ، اس سے یہ قطعہ نقل کیا
گیا ۔

(۵) آشنا : تخلص میر زین العابدین
عرف میر نواب متوطن گجرات ،
باشندۂ دہلی خلف حکیم اصلح الدین ،
خان آرزو کے معاصر تھے ۔

آشنا : تخلص مرزا زین العابدین عرف
میر نواب متوطن گجرات باشندۂ
دہلی خلف حکیم اصلح الدین ، خان
آرزو کے ہم عصر تھے ۔

گویا ''نگارستان بشیر'' کے بیس تراجم میں گیارہ ''قطعہ منتخب'' سے لیے گئے ہیں اور پانچ سخن شعرا سے ۔ صرف چار تراجم جن کا تعلق اثیم ، احقر ، اصغری اور آغا سے ہے ، بشیر کے اضافہ کردہ ہیں ۔ یہ چاروں تراجم اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں :

اثیم : محمد علی خاں لکھنوی ، گورکھپور جا کر ڈگری نویسی محکمۂ منصفی کی اختیار کی ۔ ۱۸۴۷ع تک اسی عہدے پر تھا ۔ ایک کتاب معدنِ فصاحت

اس کی تصنیف سے ہے:

دل مرا زندانِ اُلفت میں سدا قیدی رہا
پہلے اس کے ابروئے پُر خم پہ مائل ہو گیا

(یہ قطعہ دو شعر کا ہے)

احقر : منشی محمد یار خاں باشندۂ کانپور تربیت یافتہٴ محمد اکرام اللہ خاں اکرم اور کچھ حال اس شاعر کا معلوم نہیں صرف یہ قطعہ ''بزمِ سخن'' سے نقل کیا گیا جس سے شوخیٔ طبع ہویدا ہے:

ٹوٹے بال ان کے جو کنگھی سے دکھا دل میرا
کیا ہی بیتاب ہوا عاشقِ زارِ گیسو

(دو شعر کا قطعہ ہے)

اصغری : نام ان کا پردۂ عصمت میں ان کی مانند مخفی ہے وطن اصلی ان کا لکھنؤ ۔ یہ جنابہ شہر لاہور میں اکثر رئیسوں کی لڑکیوں کو پڑھاتی ہیں ۔ فارسی میں اچھی استعداد ہے ۔ میرے عنایت فرما سید اصغر علی حقیر کی قرابت دار ہیں یقیناً ان سے مشورہ بھی ہو ۔ اشعار ان کے بیشتر نعتیہ ہوتے ہیں:

جلدی پہنچاؤ مجھ کو یا اللہ
کعبے کا اشتیاق ہے بے حد

(دو شعر کا قطعہ ہے)

آغا : میر آغا جان دہلوی پسر میر احمد جان ، راقم سے مشورہ ہے ۔ اکثر پنجاب کے ضلع میں بود و باش رکھتے ہیں ۔ بابو جگندر چندر بوس وکیل عدالت ہائی کورٹ کلکتہ کے منشی کہلاتے ہیں ۔ فی الحال دہلی میں اپنے بابو صاحب موصوف کے ساتھ فروکش ہیں ۔ کلام ان کا عاشقانہ فی زمانہ عمدہ و پُر مذاق ہوتا ہے ۔ ایک قطعہ بطور نمونہ تذکرۂ ہذا میں مندرج کیا گیا:

کہا میں نے جو اک دن موقع پا کر اک پری وش سے
کسی دن کامیاب وصل کیجے ہم کو بھی آخر

(دو شعر کا قطعہ ہے)

بشیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ چاروں تراجم سخن شعرا مطبوعہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ع کے حاشیے پر بھی موجود ہیں[۱] - گویا بشیر نے ان تراجم کو دو جگہ استعمال کیا ہے ، ایک نگارستان بشیر میں دوسرے اس تذکرے میں جس کو مرتّب کرنے کا ارادہ انھوں نے نگارستان بشیر کے دیباچے میں ظاہر کیا ہے - بشیر کے اس تذکرے کی تفصیل آئندہ صفحات میں الگ ملے گی -

☆ ☆ ☆

۱- ملاحظہ ہو سخن شعرا ، مطبوعہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع ، مملوکۂ انجمن ترقی اُردو ، کراچی -

چمن انداز

مرأت خیالی

''چمن انداز'' کے مصنف کا نام درگا پرشاد اور تخلص نادر ہے۔ ''خزینۃ العلوم'' معروف بہ '' تذکرۂ شعرائے دکن '' کے سلسلے میں ان کے حالات لکھے جا چکے ہیں ۔

''چمن انداز'' دراصل ''مرأت خیالی'' کا ایک حصہ ہے ۔ نادر نے شاعرات کے تراجم اور منتخباتِ کلام پر مشتمل ''تذکرۃ النسا نادری'' کے نام سے ایک تذکرہ لکھا تھا اور اس کا تاریخی نام ''مرأت خیالی'' رکھا تھا ۔ ''مرأت خیالی'' سے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ع برآمد ہوتے ہیں ۔ مؤلف نے ''تذکرۃ النسا نادری'' مطبوعہ ۱۸۷۸ع کے دیباچے میں اس تذکرے کے بارے میں لکھا ہے ۔

''تذکرۃ النسا نادری جس کا تاریخی نام ''مرأت خیالی'' رکھا گیا ہے اور دو حصوں میں منقسم ہوا ، ازاں جملہ بخش اول ملقب بہ ''گلشن ناز'' اول دفعہ ۱۸۷۶ع میں حلیۂ طبع سے آراستہ ہوا اور بہرۂ ثانی معروف بہ ''چمن انداز'' چھپنے کے واسطے ۱۸۷۸ع میں صاف ہو رہا ہے ، یعنی اصل تذکرے کا یہ دوسرا حصہ ہے ۔''[1]

ایک دوسرے مطبوعہ نسخے کے دیباچے میں لکھا ہے کہ :

''حمد و نعت کے بعد شعر و سخن کے مشتاقوں کو معلوم ہو کہ ۱۸۷۵ع موافق ۱۲۹۲ھ کو یہ ''تذکرۃ النسا نادری'' تیار ہوا تھا جس کا پہلا حصہ ملقب بہ گلشن ناز ایک سال بعد حلیۂ طبع سے آراستہ ہوا ۔ اس کے دو برس بعد دوسرا حصہ بنام چمن انداز زیور طبع سے پیراستہ ہوا ۔''[2]

۱- دیباچہ تذکرۃ النسا نادری ، مطبوعہ فوق کاشی دہلی ۱۸۷۸ع -

۲- دیباچہ تذکرۃ النسا نادری ، مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۸۸۴ع -

ان اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ ''چمن انداز'' دراصل ''مرأت خیالی'' کے ایک حصے کی حیثیت سے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ع میں مرتّب ہوا - ''مرأت خیالی'' کا دوسرا حصہ جس کا تعلق فارسی شاعرات سے تھا ۱۸۷۶ع میں پہلی بار ''گلشن ناز'' کے نام سے شائع ہوا اور ''چمن انداز'' اس کے دو سال بعد ۱۸۷۸ع میں مطبع فوق کاشی دہلی سے چھپا - بعد ازاں دونوں حصے ۱۸۸۳ع میں اکمل المطابع دہلی سے اک ساتھ بعض اضافوں اور ضمیمے کے ساتھ شائع ہوئے - دونوں مطبوعہ نسخے کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو میں محفوظ ہیں -

مذکورہ بالا مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ''مرأت خیالی'' یا ''تذکرۃ النسا نادری'' کا دوسرا حصہ جس کا تعلق شاعرات اُردو سے ہے اور جس کا نام ''چمن انداز'' ہے ، پہلی دفعہ مطبع فوق کاشی دہلی سے ۱۸۷۸ع مطابق ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا - سرورق کی عبارت سے پتا چلتا ہے ، تعداد میں صرف پانچ سو چھپا تھا - اس میں کل ۹۶ صفحے ہیں - ابتدا میں ''گلشن ناز'' مطبوعہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ع کا تکملہ اور اس سے متعلق وہ قطعات تاریخی بھی شامل ہیں جو اشاعت کے وقت اس میں شامل نہ ہو سکے تھے - تمہید کے بعد تراجم کا آغاز آرائش کے ذکر سے ہوتا ہے - آخر میں یاسمین کا تذکرہ ہے - خاتمہ پر دی ہوئی تفصیل کے مطابق اس میں ۱۴۴ شاعرات ریختہ گو کا ذکر آیا ہے - آخری صفحے پر مؤلف کی کہی ہوئی مناجات ہے جس میں تذکرے کی مقبولیت کی دعا مانگی گئی ہے -

''چمن انداز'' دوسری بار ۱۸۸۳ع مطابق ۱۳۰۰ھ میں اکمل المطابع دہلی سے فخر الدین کے زیرِ اہتمام ''گلشن ناز'' کے ساتھ شائع ہوا - اس کے آغاز میں مؤلف نے پہلے اپنی تالیفات کا ذکر کیا ہے پھر اہلِ چین کی ایک کتاب توشن کے حوالے سے اہلِ ہند کی توجہ تعلیمِ نسواں کی طرف مبذول کرائی ہے - اس مطبوعہ نسخے میں ''چمن انداز'' کا ایک ضمیمہ اور فصیح الدین رنج مؤلف ''بہارستان ناز'' کے نام ایک طویل عریضہ بھی شامل ہے - اس میں ضمیمہ سمیت ۱۷۶ صفحے ہیں - پہلے ''گلشن ناز'' ہے جو صفحہ ۶۴ پر ختم ہوتا ہے - اس کے بعد صفحہ ۶۵ سے صفحہ ۱۶۲ تک ''چمن انداز'' اور صفحہ ۱۶۳ سے آخر تک ''چمن انداز'' کا ضمیمہ اور رنج کے نام عریضہ ہے -

''چمن الداز'' اُردو زبان میں ہے اور تاریخ تالیف کے لحاظ سے شاعرات اُردو

کا دوسرا تذکرہ ہے ۔ اس نوعیت کا ایک تذکرہ اس سے پہلے فصیح الدین رنج "بہارستان ناز" کے نام سے لکھ چکے تھے ۔ رنج کے تذکرے کا ذکر تفصیل سے کیا جا چکا ہے ۔ ان دونوں تذکرہ نگاروں نے معاصرانہ چشمک کے تحت اپنے تذکروں میں ایک دوسرے پر اخذ و تقلید کا الزام لگایا ہے ۔ پس منظر یہ ہے کہ رنج کا "بہارستان ناز" پہلی بار ۱۸۶۴ع میں اور دوسری بار ۱۸۶۹ع میں شائع ہوا اور درگا پرشاد نادر کا تذکرہ "چمن انداز" پہلی دفعہ ۱۸۷۸ع میں یعنی رنج کے تذکرے کی اولیں طباعت سے چودہ سال بعد منظر عام پر آیا ۔ دونوں کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ نادر نے اپنی تالیف میں "بہارستان ناز" سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ چنانچہ ۱۸۸۲ع مطابق ۱۲۹۹ھ میں جب رنج نے اپنے تذکرے پر نظر ثانی کی اور شاعرات کی تعداد میں ۱۰۴ شاعرات کا مزید اضافہ کر کے اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس کے دیباچے میں چمن انداز مطبوعہ ۱۸۷۸ع کے مؤلف نادر پر اس طور پر چوٹیں کی گئیں :

"اب ایک اور امر ضروری لکھنا بھی ضرور ہے اس لیے کہ اس کا پہلے ہی ظاہر ہو جانا ہر خاص و عام پر منظور ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض کامل لغو اور ناقص بیان نو مشق اپنے منہ میاں مٹھو صاحب جھوجھرے دماغ کے دن کے اندھے رات کے سوانکھے اس تذکرے کو کھرچ کھرچا کر کچھ فرضی اور خیالی شاعرہ کا کلام خود ہی گھڑ کے عاصی کی ریس پر کچھ کاغذ سیاہ کریں گے ۔ چوہے کو ہلدی کی گرہ سے فائدہ :

جس پاس عصا ہو ، اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

مگر ویسے اس ہیچ و پوچ پر جو اپنے تئیں کسی موجد کا مقلد بتائے اگر طبیعت کی غواصی پر بھروسا ہے تو اس بحر لیاقت علمی کی تہہ سے مرغوطہ میں ہمارے آگے کوئی چیز نئی لے کر آئے :

کسی حاسد کو گر ہے ہم سری کا رنج سے دعویٰ
تو یہ حاضر ہے وہ بھی ہاتھ میں اپنے قلم لے لے

ان ناکاروں کو باوصف ہیچ مدانی فروتنی سے عار ہے ان بے جوہروں کو

بازاری آدمیوں کی طرح رات دن ذی جوہروں سے بلا وجہ تکرار ہے :

بہانہ کچھ نہیں بہر حسد درکار حاسد کو
بھلا کہیے کیا تھا کیا گنہ آدم نے شیطاں کا

جاہلوں میں اپنا اعتبار بڑھانے کو استادوں پر منہ آتے ہیں گو چار اندھوں میں اگر کوئی کانا آ جائے گا تو وہ ضرور ان میں راجا کہلائے گا ۔ مگر پھر منہ کی کھاتے ہیں اور اسی لیے اعتراضات پڑتے ہی بیٹھ جاتے ہیں ۔ شریفوں کا نشان خاص فروتنی ہے ورنہ پندار ہے اور ہیرے کی کنی ہے ، سچ ہے :

جو نخل پُر ثمر ہیں اٹھاتے وہ سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں[1]

رنج نے نادر کو یہ سخت سست ان کے تذکرۂ ''چمن انداز'' مطبوعہ ۱۸۷۸ع کو دیکھ کر کہا ہے ۔ اس سے انکار نہیں کہ نادر نے ان کے تذکرے کی اشاعت اول و دوم سے فائدہ اُٹھایا ہے ، لیکن ان کا کام محض اخذ و استفادہ تک محدود نہیں ہے ۔ اُنھوں نے ''چمن انداز'' مطبوعہ ۱۸۷۸ع میں ۱۴۴ شاعرات کا ذکر کیا تھا جب کہ رنج کے ''بہارستان ناز'' میں دوسری اشاعت تک صرف ۷۰ شاعرات مذکور ہوئی تھیں ۔ رنج نے ''بہارستان ناز'' کے تیسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۸۲ء میں شاعرات کی تعداد ۱۷۴ کر دی ہے ۔ ۱۰۴ شاعرات کا یہ اضافہ در اصل ''چمن انداز'' مطبوعہ ۱۸۷۸ع سے متاثر و مستفید ہو کر کیا گیا ہے ۔ گویا جس طرح نادر نے ان کے تذکرے کی پہلی اور دوسری اشاعتوں سے فائدہ اُٹھایا تھا اسی طرح خود اُنھوں نے نادر کے تذکرے کی اشاعت سے استفادہ کیا ہے ۔ اس لیے جب رنج نے اپنے تذکرے کی تیسری اشاعت میں نادر پر تقلید اور سرقے کا الزام لگایا تو نادر نے رنج کو ایک طویل عریضہ لکھا ۔ یہ عریضہ ''چمن انداز'' مطبوعہ ۱۸۸۴ع میں شامل ہے ، حالانکہ لکھا گیا ہے ۲۰ ۔ نومبر ۱۸۸۲ع کو ۔ مسئلے کی وضاحت کی خاطر ہم اسے یہاں پورے کا پورا

۱۔ دیباچہ ''بہارستان ناز'' ، طبع سوم ، ص ۹۰ ، ۹۱ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب ، لاہور ۱۹۶۵ع ، طبع اول ۔

نقل کرتے ہیں :

''معروضہ سراپا گناہ ، روسیاہ ، عجز بنیاد ، درگا پرشاد ، جامع تذکرۃ النسائے نادری ، موسومہ بہ ''مرأت خیالی'' ، جس کے دونوں حصے ''گلشن ناز'' و ''چمن انداز'' ۱۲۹۲ھ اور ۱۲۹۵ھ میں علٰحدہ علٰحدہ منشی انبے پرشاد صاحب تاجر کتب دہلی نے طبع فرمائے ہیں اور اب مکرر صحیح ہو کر بہ ہیئت مجموعی مع تکملہ اور ضمیمہ کے چھپا چاہتا ہے :

بخدمت فیض درجت ، شرافت پناہ ، لیاقت دست گاہ جناب حکیم محمد فصیح الدین صاحب رئیس میرٹھ موجد تذکرہ نویسی زنانہ ، یکتائے زمانہ متخلص بہ رنج نکتہ سنج سلمہ اللہ تعالٰی -

حضور نے کمال عنایت فرمائی جو ہیچ مدان کی یاد دل سے نہ بھلائی - ۱۲۹۹ ہجری قدسی میں جو آپ نے تیسری مرتبہ ترمیم فرما کر اپنی ''بہارستان ناز'' چھپوائی تو اس میں کئی جگہ ''چمن انداز'' کو بخطاب ردیات ''چمن انداز'' زیب تحریر فرمایا - شاید آپ کو سال . . . ہاتھ نہ آیا اور نہ گلشن انداز حضور کے ملاحظے سے گزرا - خیر بقول شخصے :

بد نام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

مجھے اس مزخرفات سے کچھ بحث نہیں ہے - اپنا مذہب صلح کل ہے - میں نے اپنے رسالے میں کوئی لفظ جناب کی نسبت گستاخی کا نہیں لکھا تھا ، ہاں جہاں غلطی پائی تھی اس کو درست کر دیا تھا - حضور نے اپنے اخلاق کریمانہ سے جو چاہا بندے کی نسبت زیب ارقام فرمایا - اس کے علاوہ مجھے جناب منشی محمد علم الدین صاحب مالک مطبع عثمانی کی خدمت میں تین چار سال سے نیاز حاصل ہے جن کی فرمائش سے جناب نے یہ نسخہ ترمیم فرمایا ہے اس سبب سے بھی زیادہ لکھنا فضول سمجھتا ہوں - صرف اس قدر مؤدبانہ گزارش کرتا ہوں کہ تیرہ صفحے کی دس و گیارہ سطر میں جو آپ نے ارقام فرمایا کہ ''اس تذکرے کو کھرچ کھرچا کر کچھ فرضی اور خیالی شاعرہ کا کلام خود ہی گھڑ کے عاصی کی ریس پر کچھ کاغذ سیاہ کریں گے . . . الخ'' بہ نظر انصاف ملاحظہ فرمائیے

کہ بندگان حضور نے ''چمن انداز'' سے کیا کچھ نہیں لیا اس کے سوا حضور اس کام کے بقول اپنے موجد ہیں ، بندہ مقلد ۔ ہیچ مدان نے کہیں تصنیف کا دعویٰ نہیں کیا اور تالیف کے معنی یہی ہیں کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا ۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا ۔''

میرے ''گلشن ناز'' میں ترپن (۵۳) اور اس کے تکملہ مطبوعہ سابقہ میں جو چمن انداز کے ساتھ چھپا ہے آٹھ (۸) اور چمن انداز میں ایک سو چوالیس (۱۴۴) یعنی کل دو سو پانچ (۲۰۵) عورتوں کا کلام لکھا گیا تھا ۔ حضور کی بہارستان ناز مطبوعہ دفعہ سوم میں بھی صرف ایک سو چوہتر (۱۷۴) کی میزان لکھی گئی ہے ۔ حالانکہ شمار میں ایک کم آتے ہیں ۔ نیز فہرست کا مقابلہ کل سے کیا گیا تو فہرست میں صرف کاف کی نو (۹) شاعرہ لکھی ہیں اور کتاب میں دس (۱۰) کا کلام ہے ، فرمائیے گُنّا لکھنوی فہرست سے کیوں خارج ہے اور اب جو میرا تذکرہ مکرر چھپا ہے اس میں گلشن ناز کے تکملے میں قریب پچاس کے اور چمن انداز کے ضمیمے میں پچاس شعر گویوں کا ذکر بڑھایا گیا ہے ، جس سے کل شعر کہنے والیوں کی تعداد تین سو (۳۰۰) سے زیادہ ہو گئی ہے ۔ فرمائیے کھرچن کس کی کتاب ہے اور خیالی گھڑت کی جو تہمت لگائی ہے اس کا حال یہ ہے کہ بندے نے اکثر جگہ منقول عنہ کا حوالہ دے دیا ہے ۔ مگر فکر ہرکس قدر ہمت اوست یا ہرکس بہ خیال خویش خبطے دارد ، اغلب کہ حضور نے اس خیالی مسئلے کو برتا ہوگا ، پس دوسرے کو بھی ایسا ہی سمجھ لیا ۔

حضور نے پانچویں صفحے کی گیارھویں سطر میں ترقیم فرمایا ''غرض کہ اس تصور میں سیکڑوں تذکرے دیکھ ڈالے ۔ جابجا سے ڈھونڈھ کے نکالے مگر کوئی تذکرہ خاص مستورات کا نہ پایا'' الخ لیکن جناب نے ان تذکروں کی فہرست ارقام نہ فرمائی ۔ سیکڑوں تذکرے تو شاید کل ہندوستان کے کتب خانوں میں بھی نہ ملیں گے ۔ آپ کے دیکھنے میں کہاں سے آئے ۔ ہاں کسی چھپے ہوئے تذکرے کے سیکڑوں نسخے کسی مطبع وغیرہ میں دیکھ لیے ہوں گے ۔ کیوں کہ جواہرالعجائب ،

مطبوعہ مطبع نول کشور صاحب بھی بندگان عالی کو نہ ملا۔ کمال تعجب کی بات ہے۔ میرے گلشن ناز مطبوعہ سابقہ کے چوتھے صفحے کو بھی حضور نے ملاحظہ نہ فرمایا جس میں اٹھارہ بیس تذکروں کے نام اور ان میں عورتوں کی شاعری کا پتا لکھا گیا ہے۔ مگر دیکھتے کہاں سے۔ ہاں تو صرف چمن انداز کی کچھ ردی ہی نظر اقدس سے گزری تھی۔ کامل کتاب کی آپ کو کیا خبر تھی۔ خیر اب چوتھی دفعہ اس کو ترمیم فرمائیے۔ یہ نسخۂ کامل میں حضور کی نذر کروں گا۔ ع
بقول قاضی اختر:

تقصیر ہو معاف تو اک عرض میں کروں
مجھ کو نہ کیجیے آپ جو مورد عتاب کا

جب کہ مختلف تذکروں سے حضور نے بہارستان ناز کو انتخاب فرمایا تو حضور اس کے موجد کس طرح ٹھہرے۔ اگر یہ فرماتے کہ بہ ہیئت مجموعی تو کوئی خاص کتاب اس قسم کی پہلے نہیں تھی۔ چنانچہ فرمایا ہی ہے تو حضور ''جواہر العجائب'' کو اب ملاحظہ فرمائیں کہ وہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں تیار ہوئی تھی۔ جس صورت میں کہ آپ موجد نہ رہے بندہ آپ کا مقلد کیوں کر ہوا۔ ہاں متقدمین کی تقلید سے آپ نے بھی کتاب لکھی بندے نے بھی تذکرہ تیار کیا، اس میں قصور کیا کیا۔

''چمن انداز'' کی ردی سے آرائش کا نامرغوب کلام لے کر آپ نے ناحق اپنی کتاب کی آرائش بگاڑی ہے۔ اس پر کا [کذا] بکائن کا پھول آپ کی کتاب میں نہ سما سکا۔ تعجب کا مقام ہے کہ ''چمن انداز'' کی ردی سے اس کا دوسرا شعر لیا، پہلا چھوڑ دیا۔ تیسرا آج تک اغلب کہ نظر مبارک سے نہ گزرا ہوگا۔ پھر کس طرح آپ اس کے باقی کلام کو بکائن کا پھول قرار دیتے ہیں۔ اشک کی نسبت جو تحریر ہے صرف دعویٰ بے دلیل کی تقریر ہے۔ اپنے بیان صداقت نشان کا ثبوت تو دیا ہوتا۔

بسم اللہ کے بیان میں منشی انعام اللہ بیگ صاحب کو غیر مشہور جو آپ نے لکھا ہے مجھے نہیں معلوم کہ شہرت سے آپ کی کیا غرض ہے۔ دہلی کے مشاعروں میں ان کی غزلیں پڑھی گئیں اور چھپیں اخباروں میں

بھی چھپیں - دہلی کے مدرسہ سرکاری میں یہ صاحب ہوش مدرس فارسی ہیں - عالی خاندان والا دودمان ہیں - اگر آپ ان سے ناواقف ہیں تو کیا یہ غیر مشہور ہیں -

"حجاب" تخلص نواب بیگم نام صاحب دیوان کے بیان میں جو حضور نے "چمن انداز" کی ردی سے لکھا ہے کہ دروغ برگردن راوی ، شاید اس میں بندگان حضور کو شبہ رہا ہے کیوں کہ آوروں کا حال و مقال جو چمن انداز سے لیا وہ سب راست راست سمجھا گیا - صرف اسی میں شک رہا جو یہ فقرہ سنایا گیا - مقتضاے تحقیق تو یہ تھا کہ آپ تحقیق فرماتے ، اپنا شبہ مٹاتے ، میرا قصور جتاتے - جیسا کہ میں نے حیا کے بیان میں جناب کی خطا ظاہر کی تھی -

منجھو خانم کنیز کی رباعی جو حضور نے زیب ارقام فرمائی ہے وہ دراصل میر علی اوسط صاحب رشک کی ہے - ان کا دیوان نظم مبارک (۱۲۵۳ھ) ملاحظہ فرمائیے - چھوتھی دفعہ کی ترمیم میں اس کی تحریر سے بھی ہاتھ اٹھائیے -

"فریدن" کے باب میں جو کچھ ارشاد ہوا بجا و درست ہے - کیوں کہ حضور خاص وہاں کے رئیس ابتداے آبادی سے شہر میرٹھ کی رنڈیوں کی فہرست آپ کے ہاں تیار ہوگی - بندے نے جیسا سنا تھا لکھ دیا تھا - بالفرض اگر غلط ہے تو بقول آپ کے دروغ برگردن راوی - میرے پاس بمقام لاہور دلی سے ایک خط میں اس کا احوال یوں پہنچا تھا کہ "میرزا محمد بیگ صاحب حیران قرابت دار نواب شمس الدین خاں مرحوم کی زبانی فریدن کا حال لکھا جاتا ہے - عرصے تک جن کی ملاقات اس شاعرہ سے رہی تھی -" پس میں نے درج تذکرہ کر دیا - وہ خط بجنسہ میرے پاس موجود ہے - جس صاحب کو شک ہو آ کر ملاحظہ فرما لیں - پس بندہ اس بہتان سے بر کنار ہے - بقول ہندی :

جیسی سنی ویسی کہے ‌ ‌ ‌ ‌ پاپ پن سے نیارا رہے

"کنیز" کے بیان میں حضور نے سب سے بڑھ کر گل کھلائے ہیں - عجیب و غریب فقرے اُڑائے ہیں - سب سے قطع نظر کرکے بندہ صرف اتنا

عرض کرتا ہے کہ وہ نصر الدولہ بہادر کو اہل مطابع نے نضرت الدولہ بہادر چھاپا - حضور نے اسے ''نضرت الدولہ یہ اور'' بنا لیا - خیر اچھا کیا - رہا کنیز فاطمہ بیگم ، ممکن ہے کہ فاطمہ بیگم کی لونڈی کا تخلص کنیز ہو ، حضور ہی اس کو کنیز فاطمہ بیگم نام سمجھے ہوں - پس میری ہیچ مدانی پر بہتان بندی ناحق و ناروا ہے - زیادہ گزارش کرنا تہذیب کا منہ کالا کرنا ہے -

''ماہ لقا'' کی نسبت ارشاد ہے کہ ''یہ ایک شعر اس کے اشعار سے منتخب ہوا'' بخدا سچ سچ کہنا کہ اس کے کتنے اشعار نظر مبارک سے گزرے تھے جن میں سے یہ منتخب ہوا - بندے کو تو صرف اس کا یہی شعر ہاتھ آیا تھا - وہی چمن انداز میں لکھ دیا تھا جس کی ردی سے حضور نے نقل کر لیا ہے - یہ چوری اور سینہ زوری نہیں تو کیا ہے -

''نازک'' تخلص زینت جان نام کے کلام کی نسبت ارشاد ہوا ہے کہ ''یہ دو شعر اس کے یاد تھے لکھ دیے گئے -'' اگر حضرت کو شعر ہی یاد تھے تو اس کی سکونت و سن موجودگی چمن انداز سے لکھ دیتے - اس میں کیا قاضی جی گلہ کرتے -

''نازک'' تخلص فتن جان نام پر تحریر ہے کہ ''منا جان رنڈی کے ڈیرے میں آنے جانے لگی'' جناب عالی وہ تو اس کے ڈیرے میں آ کر آباد ہوگئی اور چمن انداز کے چھپنے تک منا جان کے پاس رہی - بلکہ اس کے بعد منا جان کی تجہیز و تکفین بھی خود ہی کی - آپ نے ناحق ''چمن انداز'' کے اس فقرے کو بدلا کہ ''منا جان والدۂ بتن جان متوفی کے ڈیرے میں آئی -'' غرض اس کا بیان آپ نے خلاف واقعہ تحریر فرمایا ہے - اس پر آپ لکھتے ہیں کہ ''باور فرمایے گا جھوٹ نہیں سچ ہے - یہ اشعار اس کی زبانی سنے ہوئے تحریر ہیں -'' سبحان اللہ چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چرغ دارد - جناب نے چمن انداز کی خاک چھان کر یہ شعر فتن کے لکھے اور زبانی سنے ہوئے تحریر فرمائے - آپ نے جس وقت یہ شعر لکھے ہیں اس وقت اس سے ہم کلام ہونا تو در کنار اس کا دیکھنا بھی غیروں کو نصیب نہ تھا اور اگر آپ پہلے سن چکے تھے تو اول ہی دفعہ یا دفعہ

ثانی میں کیوں نہ لکھے - الغرض یہ ہٹ دھرمی اچھی نہیں ہے - یہاں سے معلوم ہوا کہ آپ کے سارے دعوے نرے دعوے ہی دعوے ہیں - راستی کے دریا سے سب کنارے ہی کنارے ہیں - خیر غیب کا حال خدا ہی جانتا ہے -

صفحہ	سطر	لفظ غلط	صحیح
۴	۸	مطلب	مطب
۵۱	۱	برام	بزم
۵۱	۸	تھی بعد غیر	بھی بعد غدر
۶۴	۴	کلا کھول کر	گھول کر
۶۸	۱۲	میر کرامت علی	میر برکت علی
۹۶	۳	فرحت کے بیان کی عبارت سے نہ اس کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے نہ مر جانا - کوئی فقرہ موجودگی پر دال ہے کوئی فوتیدگی پر - غرض کہ اجتماع نقیضین ہے - بہار مطبوعہ دفعہ ۲ کی تحریر تو اس کی فوتیدگی صاف ظاہر کرتی ہے ، دفعہ ثالث کی ناحق دھوکا دیتی ہے -	
۹۹	۱۵	لوزم	نورم

جناب حکیم صاحب ! یہ سات آٹھ غلطیاں بہارستان ناز مطبوعہ دفعہ ثالث کی صرف اس سبب سے نمونے کے طور پر گزارش ہوتی ہیں کہ باوجود اس قدر کوشش و سعی کے بھی مطبع کے کارپرداز جیسی کہ چاہیے صحت نہیں کرتے - آپ تو خود وہاں رونق افروز تھے - جس قدر صحت ہوتی کم تھی اور جس وقت کہ میرا ''چمن انداز'' چھپا تھا میں لاہور میں تھا اور کتاب دہلی میں چھپی تھی - پھر بھی حضور کو اس میں بجز ایک اس (یہ اور) لفظ کے اور کوئی گرفت کا موقع نہ ملا - گو اپنی ہٹ دھرمی سے آپ نے فریدن اور کنیز کے بیان میں اپنے دل کا غبار نکال لیا - خوب ہوا کہ میں عاقبت کی باز پُرس سے بری ہو گیا - اب زیادہ گوئی

یاوہ گوئی سمجھ کر سلام عرض کرتا ہوں اور اس کا انصاف منصف مزاجوں سے چاہتا ہوں ۔

تحریر تاریخ ۲۰ - نومبر ۱۸۸۲ع -

الراقم

درگا پرشاد نادر''

یہ عریضہ تذکرۃ النساے نادری کے خاتمے پر چھپا ۔ تذکرۃ النسا کی طباعت کا اختتام ۱۵ - فروری ۱۸۸۴ع کو ہوا ۔ تذکرۃ النسا کے مؤلف درگا پرشاد نادر نے اس کا ایک نسخہ خود حکیم فصیح الدین رنج کو میرٹھ بھیجا جسے حکیم صاحب نے ۲ - اپریل ۱۸۸۴ع کو وصول کیا ۔ درگا پرشاد نادر نے رقعہ راستی مرقع بے مجادلہ مطبوعہ ۱۸۹۲ع (بنام ابوالقاسم محتشم صاحب مؤلف تذکرہ ''اختر تاباں و ماہ درخشاں'' رونق افزاے دار الاقبال بھوپال) کے خاتمے پر اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :

''غور فرمایے کہ جب ''بہارستانِ ناز'' دو دفعہ چھپ چکی تو بندے نے گلشنِ ناز اور چمن انداز تیار کیا ۔ اس میں جہاں موقع پایا بہار مستور کی غلط بیانی دکھائی مگر کہیں بد تہذیبی کی عبارت نہیں لکھی ۔ مگر اس کے مؤلف نے پھر تیسری دفعہ اپنی کتاب کو ترمیم فرما کر چھپوایا جس میں اس جاہل مطلق کی نسبت جو دل میں آیا حوالۂ قلم کیا ۔ پس خاکسار نے بھی اپنے تذکرے کے دونوں حصے بدستور بہ ایزادی تکملہ و تیاری ضمیمہ مع ایک عریضہ چھپوا کر جناب حکیم صاحب مرحوم مؤلف بہار کو نذر کیا ۔ چنانچہ ان کی دستخطی رسید بھی میرے پاس موجود ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''تذکرۃ النسا جمال جہاں آرا بر رخ نظارگیان کشود مشکورِ عطیۂ مصنّف بے بدل منشی درگا پرشاد شدم ، ۲ - اپریل ۱۸۸۴ع ''مگر پھر صدائے نہ برخواست ۔''[۱]

اس خط کی روشنی میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ رنج نے نادر پر بے جا چوٹیں

۱۔ تذکرۃ النساء نادری (بہ شمول گلشنِ ناز و چمن انداز مع ضمیمہ و تکملہ) مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۸۸۴ع -

کی تھیں - رنج یقیناً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو شاعرات کا پہلا تذکرہ مرتب کیا - یہ بھی صحیح ہے کہ نادر کا تذکرہ اس کے بعد کا ہے اور رنج کے تذکرے سے مستفید ہے لیکن بعد کو نادر کے تذکرے سے رنج نے بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے - اس لیے نادر کو مقلد اور سارق کہنا درست نہیں ہے - انھوں نے ''چمن انداز'' کی تالیف میں ذاتی کوشش اور تلاش سے بھی کام لیا ہے -

''چمن انداز'' میں ابتداءً شاعرات کی تعداد ۱۴۴ تھی لیکن ۱۸۸۴ع میں جب یہ گلشن ناز کے ساتھ مع ضمیمہ و تکملہ اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تو اس میں ادا ، امیر ، اہل ، بدلا ، پری ، پکھراج ، پیاری ، جعفری ، جہان ، چترا ، چندر ، سکھی ، حجاب ، حرمت ، حسین ، حنا ، حور ، حیا ، حیدری ، خورشید ، رحیمن ، زیب ، سونا ، شتاب ، شوخ ، شیریں ، صنم ، ضیا ، ضیا ، قائل ، گوہر ، گوہر ، مخفی ، مخمور ، فریب ، مستور ، مطلوب ، معشوق ، ملکہ ، ملکہ ، لہک ، ناز ، ناز ، ناز ، نازاں ، نازنین ، نصیبن ، نظیر ، نقاب ، وزیر ، ولایتو اور ہنر تخلص کی باون (۵۲) شاعرات کا اور اضافہ کیا گیا - اس طرح چمن انداز کے تراجم کی تعداد آخر ۱۴۴ سے بڑھ کر ۱۹۶ ہو گئی -

مثل ''بہارستان ناز''، ''چمن انداز'' کے تراجم بھی بہت مختصر ہیں - انتخاب کلام کی بھی یہی صورت ہے - دونوں کے نفس مضمون اور انداز عبارت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے - اس لحاظ سے ''چمن انداز'' کی معنوی حیثیت وہی ہے جو ''بہارستان ناز'' کی ہے - مؤلف نے تمہید میں لکھا ہے :

> ''بندے نے بخوف طوالت شاعروں کا حال نہایت اختصار سے لکھا ہے - پہلے مسودہ بہت طویل تھا اس کو فضول سمجھ کر چھوڑ دیا -''[1]

پہلا ترجمہ ''آرائش'' تخلص کی شاعرہ کا اور آخری یاسمین کا ہے ، دونوں ترجمے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

آرائش : ''آرائش تخلص کی کوئی مجہول الاسم کسبی بازار دہلی کی زیبائش بڑھاتی تھی - اب کسی کے گھر کی نمائش کر رہی ہے - اس نے یہ شعر اپنے حسب حال لکھا ہے -'' (چمن انداز ، ص ۱۵)

۱- ''چمن انداز''، ص ۱۵ ، مطبوعہ فوق کاشی دہلی ۱۸۷۸ع -

یاسمین : ''یاسمین تخلص توسن نام سے کسی سہارنپوری شاعرہ کی غزلیں
بزم سخن اور گلدستۂ سخن میں طبع ہوئی ہیں ۔'' (چمن انداز ، ص ۹۵)

۱۸۸۴ع کے ایڈیشن میں ''چمن انداز'' کے ساتھ جو ضمیمہ شامل کیا گیا ہے اس میں پہلے ادا کا اور آخر میں ہنر کا ذکر آیا ہے ۔ یہ دونوں تراجم بھی نقل کیے جاتے ہیں :

ادا : ''ادا تخلص ہے اس با ادا کا جس کا نام امیر بیگم ہے اور چھوٹی صاحب کے نام سے مشہور ہے ۔ لکھنؤ اس کا مقام ہے ۔ بشاگردان مرزا عباس صاحب مشہور انام ہے یہ کلام اس کا نتیجۂ سخن سے زیب ارقام ہے ۔''

ہنر : ''ہنر تخلص ہے اس گنّا جان رنڈی کا جو دربھنگا میں مقیم ہے اور کبھی کبھی حسن بھی اپنا تخلص باندھتی ہے ۔ یہ شعر اس کا ہے ۔''

''چمن انداز'' کے دونوں ایڈیشنوں کی تمہید میں مؤلف نے سب سے پہلے ''اہلِ چین'' کی ایک تالیف ''توشن'' کا جس کا تعلق تعلیم نسواں سے ہے ، تعارف کرایا ہے ۔ پھر اس کے حوالے سے اہلِ ہند کو تعلیم نسواں کی طرف راغب کرتے ہوئے تذکرے کی تالیف کا جواز پیدا کیا ہے ۔ اس تذکرے سے معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ، لیکن اس کی تنقیدی حیثیت کچھ نہیں ہے ۔

☆ ☆ ☆

تذکرۂ بشیر

مصنّف کا نام شاہ بہاء الدین بشیر ہے ۔ ان کا ذکر پچھلے صفحات میں ''نگارستان بشیر'' کے سلسلے میں ہو چکا ہے ۔ ان کے حالاتِ زندگی اور کمالات کے بارے میں مشفق خواجہ صاحب[1] کا ایک تعارفی مضمون شائع ہو چکا ہے ۔ علاوہ ازیں بشیر کے متعلق اُن کے پاس وافر مواد ، وجود ہے ۔ اس مواد کو وہ ''تذکرۂ بشیر'' کے مقدمے کے لیے مرتّب کر رہے ہیں ۔ اس جگہ بشیر اور ''تذکرۂ بشیر'' کے متعلق جو معلومات دی جا رہی ہیں وہ انھیں کے مسودات سے ماخوذ ہیں ۔

بشیر کے حالات زندگی کے سلسلے میں ہم ''نگارستان بشیر'' کی بحث میں لالہ سری رام کا بیان نقل کر چکے ہیں ۔ یہ بیان ''خمخانۂ جاوید'' جلد اول مطبوعہ مخزن پریس دہلی ۱۹۰۸ع میں شامل ہے ۔ اس بیان میں بشیر کی زندگی اور تذکرے کے بارے میں مندرجہ ذیل دو اہم باتیں بھی ملتی ہیں کہ :

(۱) ''ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا لکھنا شروع کیا تھا مگر اسے پورا نہ کر سکے ۔''

(۲) ''سات برس کا عرصہ ہوا انتقال کیا ۵۵ - ۶۰ کے قریب عمر پائی ۔''

یہ دونوں باتیں پوری طرح صحیح نہیں ہیں ۔ بشیر نے ''نگارستان بشیر'' مؤلفہ ۱۲۹۳ھ کے دیباچے میں ایک تذکرہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا ۔ آئندہ سطور سے معلوم ہوگا کہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا تذکرہ عجیب و غریب صورت میں منتشر پڑا رہا اور ہمارے محققین ایک مدت تک اس کے وجود سے بے خبر رہے ۔ ورنہ بشیر کا تذکرہ ''سخن شعرا'' مؤلفۂ نسّاخ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع مخزونہ

۱- رسالۂ اُردو ، ص ۲۲۷ ، غالب نمبر ، بابت فروری ۱۹۶۹ع -

کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو کے حاشیوں پر بقلم مصنّف آج بھی محفوظ ہے۔ مشفق خواجہ صاحب نے بڑی محنت و عرق ریزی سے اس کا مبیضہ تیار کر لیا ہے۔ نیز پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ''تذکرۂ بشیر'' کے نام سے بشیر کی ایک بیاض بھی محفوظ ہے۔ اس بیاض کے اوراق کی ترتیب درست نہیں معلوم ہوتی۔ بعض مقامات پر خلط بحث ہے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ اوراق غلط جوڑ دیے گئے ہیں۔ اس بیاض میں دوسری معلومات کے ساتھ ساتھ متعدد شعرا کے تراجم و منتخبات کلام بھی شامل ہیں۔ بشیر کی دوسری بیاض ''کشکول'' مخزونہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ کی بھی یہی صورت ہے۔ مشفق خواجہ صاحب کے پاس بیاض لاہور کی نقل اور ''کشکول'' کی ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ ان دونوں بیاضوں کے تراجم مشفق خواجہ صاحب نے ''تذکرۂ بشیر'' میں شامل کر لیے ہیں۔ گویا بشیر کا دوسرا تذکرہ جس کا نام ''بہارستان بشیر'' تھا اِدھر اُدھر منتشر پڑا تھا۔ اب اسے یکجا کر کے ''تذکرۂ بشیر'' کے نام سے مشفق خواجہ صاحب مرتّب کر رہے ہیں۔

لالہ سری رام نے دوسری اہم بات بشیر کے متعلق یہ بتائی ہے کہ سات برس کا عرصہ ہوا انتقال کیا۔ ۵۵ - ۶۰ کے قریب عمر پائی۔ خمخانۂ جاوید جلد اول جس میں یہ بیان درج ہے ۱۹۰۸ع میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے سات سال پہلے کا مطلب یہ ہوا کہ بشیر نے ۱۹۰۱ع کے قریب وفات پائی۔ لیکن اس وقت ان کی عمر ۵۵ - ۶۰ سال کے لگ بھگ نہیں بلکہ ۵۲ اور ۵۵ کے درمیان رہی ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ خود بشیر نے اپنی پیدائش کا سال ۱۲۶۶ھ ظاہر کیا ہے۔ ان کے خود نوشت حالات دیکھیے:

''بشیر تخلص شاہ بہاء الدین عرف عبداللہ شاہ خلف متبنٰی شاہ نجم الدین المتخلص بہ صغیر فرزند شاہ نصیر دہلوی ساکن محلہ روشن پورہ سجادہ نشین درگاہ حضرت سید مخدوم شاہ صدر جہاں صاحب علیہ الرحمۃ جاگیردار موضع مولربن شاگرد صغیر دہلوی۔ طبیعت اس کی بیشتر تاریخ گوئی پر مائل ہے۔ بتاریخ ششم ماہ شوال ۱۲۶۶ھ اس کی پیدائش ہے۔ برس میں دو مرتبہ اپنے بزرگوں کا عرس کرتا ہے اور بتاریخ ۷- جمادی الاول کو حضرت سید مخدوم شاہ عالم صاحب قدس سرہ' کا عرس ہوتا ہے، واقع

موضع وزیر آباد ۱۲- ذی قعدہ کو حضرت مخدوم شاہ صدر جہاں صاحب کا عرس ہوتا ہے واقع دہلی محلہ روشن پورہ :

ہے کچھ نہ کچھ ضرور بشیر اوس گلی میں روز[۱]
چھپ چھپ کے جانا رات میں یہ بے سبب نہیں

بشیر کے ایک اور بیان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں - تینوں کے نام تاریخی تھے - بڑی لڑکی کا نام بختیارا بیگم ، چھوٹی کا غریبہ بیگم اور لڑکے کا نام شاہ فیاض الدین تھا - اُن کے سنین پیدائش علی الترتیب ۱۲۸۶ھ/۱۲۸۹ھ اور ۱۲۹۴ھ ہیں - فیاض الدین کا عرف عبدالعزیز خاں تھا - بشیر ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

''این دو دختران و یک فرزند بندۂ مسکین شاہ بہاء الدین عرف عبداللہ شاہ متخلص بہ بشیر اند اللہ تعالیٰ جل شانہ عمر آن ہر سہ برخورداران ہزار سالہ کند -''[۲]

بشیر ہی کے تذکرے کے بعض دوسرے تراجم سے ان کے متعلق جو اطلاعات ہیں وہ یہ ہیں کہ :

(۱) طرہ باز خاں طرہ بشیر کے خسر تھے اور بشیر کے بیٹے شاہ فیاض الدین کا تخلص خیر تھا - دونوں کے تراجم بشیر کے یہاں موجود ہیں -

(۲) عبدالرحمٰن بالا ، دیبی پرشاد بسمل ، محمد یعقوب علی خاں ، محمد اسماعیل ذبیح ، وزیر سنگھ راقم ، ماسٹر رام چندر ، حافظ محمد اکبر ، میر نثار علی رحمت وغیرہ بشیر کے دوستوں اور ملاقاتیوں میں تھے -

---

۱- ''تذکرۂ بشیر'' (قلمی مسودہ) مملوکہ مشفق خواجہ نیز حاشیہ ''سخن شعرا'' ص ۶۷ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی -

۲- ''کشکول'' قلمی نسخہ ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ، بحوالہٗ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو ، مرقومہ یکم اکتوبر ۱۹۶۶ع ، بنام خواجہ مشفق -

(۳) محمد ابراہیم خمیر دہلوی ، لالہ گنگا پرشاد گنگا ، سید احمد حسن ، میر آغا جان آغا دہلوی ، بشیر کے شاگرد تھے -

(۴) بشیر اگرچہ دہلی میں رہتے تھے لیکن انھوں نے سہارن پور ، لاہور اور ٹونک وغیرہ کا سفر بھی کیا تھا ، اس کا ثبوت بھی ان کی تحریروں ہی سے ملتا ہے -

(۵) بشیر نے متعدد کتابوں کے حاشیے بھی لکھے ہیں - اس کا ذکر بھی خود انھوں نے بعض تراجم میں کیا ہے - ہم ان کی تفصیل آگے بیان کریں گے -

(۶) بشیر با ذوق اور صاحب مطالعہ آدمی تھے - قدیم تذکروں ، بیاضوں ، گلدستوں اور انتخابوں کے علاوہ سیکڑوں شعرا کے مجموعہ ہائے کلام اور دواوین بھی ان کے پاس موجود تھے اور انھوں نے اپنے تذکرے کی تدوین میں ایک دو نہیں متعدد مآخذ سے مدد لی ہے -

بشیر کو تصنیف و تالیف اور تاریخ گوئی و تذکرہ نگاری سے خصوصی دلچسپی تھی ، چنانچہ انھوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں - یہ سب غیر مطبوعہ ہیں اور مختلف کتب خانوں میں بکھری پڑی ہیں ، اس جگہ ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے -

(۱) سیرستان بشیر : اس کے موضوع کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے خود بشیر نے اس کا ذکر رسالہ تذکرات مؤلفہ گارسیں دتاسی مترجمہ ذکاء اللہ میں کیا ہے اور سال تصنیف ۱۲۹۳ھ بتایا ہے -[1]

(۲) نگارستان بشیر : مؤلفہ ۱۲۹۴ھ قطعہ نگار شعرا کا تذکرہ ہے اور نساخ کے ''قطعہ منتخب'' کی تقلید میں لکھا گیا ہے - اس کا ایک نامکمل اور ناقص الآخر قلمی

۱- حاشیہ ''رسالہ تذکرات'' ، ص ۴۴ ، مطبوعہ دلی ۱۹۶۷ع ، مملوکہ قیصر ابن حسن کراچی -

نسخہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ ہم اس کا مفصل ذکر پچھلی سطور میں کر چکے ہیں ۔

(۳) بہارستان بشیر : نایاب ہے ۱۲۹۴ھ سال تصنیف ہے ۔[1]

(۴) انتخاب دیوان فدوی : فدوی لاہوری کے دیوان کا انتخاب ہے یکم شعبان ۱۲۸۸ھ کا منقولہ ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں ہے اور ''نگارستان بشیر'' ہی کے ساتھ مجلد ہے ۔

(۵) دیوان شاہ آثم : نامکمل صورت میں صرف تیرہ صفحات انجمن ترقی اُردو کراچی میں دستیاب ہیں اور ''نگارستان بشیر'' کے ساتھ مجلد ہیں ۔

(۶) اصطلاحات بشیر : ۳۰ صفحے کا مخطوطہ ہے اور نگارستان بشیر ہی کے ساتھ بندھا ہوا ہے ۔ اس میں بشیر نے ضرب الامثال جمع کی ہیں اور بعض کے استعمال کی مثالیں اشعار کے ذریعے دی ہیں ۔ ہر شعر کے ساتھ شاعر کا نام بھی دیا گیا ہے ۔ زیادہ مثالیں بشیر نے خود اپنے کلام سے دی ہیں ۔ یہ مخطوطہ ۱۲۹۰ھ کا مرقومہ ہے ۔

(۷) خزینۃ الاشعار : بشیر کی بیاض ہے ، اس میں کل ۸۳ صفحے ہیں ۔ اس کا ایک مخطوطہ مرقومہ ۲۹ محرم ۱۲۹۱ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور پنڈت دتاتریا کیفی کا عطیہ ہے ۔ اس میں شعرا کے اشعار و قطعات ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ نگارستان بشیر کا ابتدائی مسودہ ہے ۔[2]

۱۔ رسالہ اُردو غالب نمبر ، ص ۲۲۸ ، بابت فروری ۱۹۶۹ع ۔
۲۔ ''مبیضہ'' ، خزینۃ الاشعار ، مملوکہ خواجہ مشفق کراچی ۔

(۸) کشکول[1] : یہ بھی بشیر کی ایک بیاض ہے اور انجمن ترقی اُردو علی گڑھ میں محفوظ ہے - اس میں نثر کی بھی بہت سی چیزیں شامل ہیں لیکن زیادہ حصہ اشعار پر مشتمل ہے - کہیں کہیں شاعر کا نام لکھ کر چند جملے حالاتِ زندگی کے بارے میں لکھے گئے ہیں - بقول ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو دو چار دس ورق کے بعد ایک شاعر کا ترجمہ اور اشعار درج ملتے ہیں - لازمی طور پر یہ بیاض ہے اور صرف اشعار لکھے ہوئے ہیں - ان کی کوئی ترتیب نہیں ہے - زمانہ بھی ایک نہیں ہے مرتّب کو جیسے جیسے موقع ملا ہے اشعار پسندیدہ لکھتا گیا ہے -''[2]

(۹) قطعات تاریخی بشیر : اس کا ایک مخطوطہ بیاض کی صورت میں مرقومہ ۱۲۸۸ھ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے اور پنڈت دتاتریا کیفی کا عطیہ ہے - بشیر میں تاریخ گوئی کا خاص ملکہ تھا چنانچہ اس میں انھوں نے اپنے قطعات تاریخی جمع کیے ہیں -[3]

(۱۰) کنز تواریخ : اس کا مخطوطہ ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے اور پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور میں محفوظ ہے - اسے بشیر نے کتابی صورت میں مع دیباچہ مرتّب کیا ہے - اس میں اہم اشخاص و واقعات کے متعلق بشیر کے کہے ہوئے تاریخی قطعات ہیں -

---

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون ''ایک تذکرہ جو لکھا نہ جا سکا'' ، از عتیق صدیقی ، مطبوعہ ''صبح نو'' ، بابت جولائی ۱۹۶۷ع -

۲- خط بنام مشفق خواجہ ، مرقومہ یکم اکتوبر ۱۹۶۶ع -

۳- مبیضہ ''قطعات تاریخی بشیر'' ، مملوکہ خواجہ مشفق کراچی -

یہ ایک نہایت معلومات افزا دستاویز ہے اور بعض شعرا کے سال پیدائش اور وفات کی دریافت کے سلسلے میں بہت اہم ہے۔ "کنز تواریخ" تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۹۴ھ نکلتے ہیں۔[۱]

(۱۱) دیوان بشیر : اس کا مخطوطہ بنارس یونی ورسٹی لائبریری میں ہے۔ مشفق خواجہ صاحب اسے بھی مرتّب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

(۱۲) حاشیے : بعض مطبوعہ کتابوں پر بشیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حاشیے بھی ملتے ہیں۔ یہ حاشیے، شعرا اور ان کے تذکروں کے متعلق بعض مفید معلومات فراہم کرتے ہیں خاص طور پر "گلستان سخن" مؤلفہ قادر بخش صابر مملوکہ وزیر الحسن عابدی صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونی ورسٹی لاہور، "رسالۂ تذکرات" مؤلفہ گارسیں دتاسی مترجمہ مولانا ذکاءاللہ اور "مرأت خیالی" مؤلفہ درگا پرشاد نادر مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور اور "سخن شعرا" مؤلفہ عبدالغفور نسّاخ مخزونہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو کے حواشی بہت اہم ہیں اور ان کے ذریعے بعض نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱۳) تذکرۂ بشیر : اس وقت یہی ہماری بحث کا حقیقی موضوع ہے۔ ہر چند کہ اس نام سے بشیر کے تذکرے کا کوئی مکمل مخطوطہ اب تک دستیاب نہیں ہوا تاہم یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ انھوں نے "بہارستان بشیر" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں ایک بیاض البتہ ایسی ہے

۱۔ مبیضہ "کنز تواریخ"، مملوکہ خواجہ مشفق کراچی۔

جس کے سرورق پر ''تذکرۂ بشیر'' لکھا ہوا ہے - لیکن بعض شعرا کے تراجم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی تاریخ اور اُردو زبان کے ارتقا کا حال بھی اس میں تفصیل سے بیان ہوا ہے - ہو سکتا ہے یہ نثری مضامین بنیادی طور پر تذکرے کے دیباچے کے لیے لکھے گئے ہوں اور بیاض میں اوراق کی غلط جلد بندی کے سبب اصل مسودے کی صورت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے - لیکن اس بیاض کو مکمل تذکرے کا نام یوں نہیں دے سکتے کہ اس میں تذکرے کی سی ترتیب اور جامعیت نہیں پائی جاتی - یہ بیاض واصل خان واصل دہلوی کے ذکر سے شروع ہو کر مرزا رضا قلی آشفتہ ابن حکیم محمد شفیع کے ترجمے پر ختم ہو جاتی ہے - اس میں تراجم ہیں لیکن شعرا کے ناموں کے اندراج میں کسی قسم کی کوئی ترتیب نہیں ہے -

بشیر کا اصل ''تذکرۃ الشعراء'' جس کا ذکر لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں اور خود مؤلف نے ''نگارستان بشیر'' کے دیباچے میں کیا ہے وہ دراصل ''سخن شعرا'' مؤلفۂ نساخ مطبوعہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے حواشی پر محفوظ ہے - بشیر نے اس تذکرے پر دو طرح کے حاشیے لکھے ہیں ایک وہ جو نسّاخ کے تراجم پر کسی قسم کے اضافے ، ترمیم ، یا تردید کی حیثیت رکھتے ہیں - دوسرے وہ حواشی جن کا تعلق ایسے شعرا کے تراجم سے ہے جو سخن شعرا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں - یہ اضافہ شدہ ترجمے ایک دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں - مشفق خواجہ صاحب نے ''سخن شعرا'' کے حاشیوں سے بشیر کے تذکرے کے یہ تراجم الگ نقل کر کے مرتّب کر لیے ہیں - چونکہ ان کے خیال میں بشیر کے تذکرے کا بنیادی مواد یہی ہے اور باقی چیزیں اس کی اجزا ہیں ، اس لیے انھوں نے بشیر کی دوسری دستیاب بیاضوں

خصوصاً ''تذکرۂ بشیر'' قلمی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور ''نگارستان بشیر'' مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے تراجم کو بھی ''سخن شعرا'' کے حاشیائی تراجم میں شامل کر لیا ہے اور اس کا نام ''تذکرۂ بشیر''[۱] رکھا ہے۔ ''نگارستان بشیر'' کا ذکر ہم نے بعض وجوہ سے الگ کیا ہے۔ اس لیے یہاں ''تذکرۂ بشیر'' کے زیرِ عنوان جو کچھ لکھا جائے گا اس کا اطلاق ''نگارستان بشیر'' کے تراجم پر نہ ہوگا۔

تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ خواجہ مشفق صاحب البتہ اسے اشاعت کی غرض سے مرتّب کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر ''تذکرۂ بشیر'' کب تالیف ہوا، اس کے بارے میں کسی خاص سن کا تعین مشکل ہے۔ اس تذکرے کا کوئی دیباچہ، ترقیمہ یا قطعۂ تاریخ بھی اس قسم کا اب تک نہیں ملا جس کی مدد سے کہا جا سکے کہ یہ تذکرہ فلاں سن میں مکمل ہوا ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ یہ ''نگارستان بشیر'' مؤلفہ ۱۲۹۴ھ کے بعد تکمیل کو پہنچا ہے۔ ''نگارستان بشیر'' کے دیباچے میں بشیر نے لکھا ہے:

''اگر زمانہ فرصت دے گا تو انشاء اللہ ایک اور تذکرہ اُردو کا تیار ہوگا ... میرے پاس دو ڈھائی سو شاعروں کا کلام اس (سخن شعرا) کے علاوہ موجود ہے اور ہمیشہ متلاشی اس امر کا رہتا ہوں کہ نئے شاعر کا کلام بہم پہنچاؤں۔ اسی نظر سے یہ فقرہ اس جگہ لکھ دیا ہے کہ جس صاحبِ کلام کا دل چاہے بذریعہ خط پیڈ اپنا حال و مقال فقیر کے پاس روانہ فرمائیں۔ فقیر کا یہ تکیہ اندرونِ شہر دہلی دروازہ واقع محلہ روشن پورہ درگاہ شریف مخدوم شاہ صدر جہاں صاحب قدس سرہٗ میں ہے اور نام اس گمنام کا شاہ بہاء الدین عرف عبداللہ شاہ تخلص بشیر۔''

ان سطور سے پتا چلتا ہے کہ بشیر نے اپنے تذکرے کے لیے مواد جمع کرنے کا کام ۱۲۹۴ھ سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا، اور اس وقت ان کے پاس دو ڈھائی سو ایسے شعرا کا کلام موجود تھا جو نساخ کے ''سخن شعرا'' میں نہیں ہیں۔ گمان یہ ہے کہ بشیر کے تذکرے کے لیے مواد کی فراہمی کا آغاز سخن شعرا کے سال طبع ۱۲۹۱ھ سے قبل ہو چکا تھا۔ ''تذکرۂ بشیر'' میں کئی ایسی تاریخیں

۱۔ ''تذکرۂ بشیر'' (قلمی)، مرتّبہ و مملوکہ خواجہ مشفق، کراچی۔

ملتی ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ۔ اس تذکرے کے جو اجزا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہیں ، ان میں ۱۲۹۰ھ[1] اور ''سخن شعرا'' مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے حواشی پر تذکرۂ بشیر کا جو حصہ محفوظ ہے اس میں ۱۲۹۱ھ[2] تک کے اندراجات بھی ملتے ہیں ۔ اضافہ اور اصلاح و ترمیم کا عمل اس کے بہت بعد تک جاری رہا ہے ۔ ۱۲۹۹ھ تک کے اندراجات کا ثبوت تذکرے میں واضح طور پر موجود ہے ۔[3] تذکرۂ بشیر میں جا بجا دی ہوئی ان تاریخوں کی مدد سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا زیادہ حصہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ع اور ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ع کے درمیان مکمل ہوا ہے لیکن اس میں اضافے بشیر نے آخری دم تک کیے ہیں ۔

بشیر کا تذکرہ بھی اُردو زبان میں ہے اور خاصا ضخیم ہے ۔ تقریباً دو ہزار شعرا کے تراجم شامل ہیں ۔ ہر چند ''سخن شعرا'' مؤلفہ نساخ بہت ضخیم تذکرہ ہے اور اس میں تقریباً ڈھائی ہزار شاعروں کا ذکر آیا ہے لیکن تذکرۂ بشیر کے شعرا ، نسّاخ کے تذکرے پر اضافہ ہیں ۔ اس میں اٹھارہ سو کے قریب ایسے شعرا ہیں جن کا ذکر ''سخن شعرا'' میں سرے سے نہیں ہے ۔ نثری تراجم اور انتخاب کلام دونوں عام طور پر مختصر ہیں ۔ لیکن بعض تراجم میں تفصیل سے کام لیا ہے ۔ تنقیدی اور سوانحی اعتبار سے تذکرے کی نوعیت دوسرے قدیم تذکروں سے مختلف نہیں ہے ۔ لیکن چونکہ اس میں بہت سے ایسے شعرا شامل ہیں جن کا حال کسی اور دستیاب تذکرے میں نظر نہیں آتا ، اس لیے اس کی تاریخی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔ بعض شعرا کے تراجم دوسروں کے یہاں بھی ہیں لیکن بشیر کے یہاں ان کی بعض ایسی تفصیلات ملتی ہیں جو تذکرۂ بشیر کے سوانحی پہلو کو بھی اہم بنا دیتی ہیں ۔ مثلاً صدر الدین خاں آزردہ ، مومن خاں مومن اور مرزا رضا قلی آشفتہ کے متعلق بعض بالکل نئی باتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں ۔ بعض تاریخی واقعات کی گتھیاں بھی یہ تذکرہ کھولتا ہے مثلاً درگا پرشاد نادر نے ''مرأت خیالی''

۱- ''مخطوطہ'' ، ص ۳۵ ، بحوالہ مبیضہ ، مملوکہ خواجہ مشفق کراچی ۔

۲- ''سخن شعرا'' ، ص ۵۸۲ ، مملوکہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو ۔

۳- ''سخن شعرا'' ، ص ۱۷۴ ، مملوکہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو ۔

میں لکھا تھا کہ قطب الدین باطن کو ''گلستان بے خزاں'' کا جواب اہل دہلی کی طرف سے ''ارمغان'' کے نام سے بھیجا گیا تھا اور وحشی نے ''ارمغان'' کا قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا - لیکن ''ارمغان'' کا مصنّف کون تھا اس کا جواب نادر نے واضح طور پر نہیں دیا - بشیر کے اندراجات سے معلوم ہوا کہ ارمغان کے مصنّف وحشی ہی ہیں - وحشی کا ترجمہ بشیر کے یہاں اس طور پر موجود ہے :

وحشی : ''وحشی تخلص کنھیا لال خلف لالہ منگل سین کائستھ شاگرد مولوی اشرف علی مسکین باشندۂ دہلی کدخدہ نواب روشن الدولہ - آدمی وحشی خصال ہے فرشتہ خو نازک گفتگو ہے - ۲۲- مئی روز شنبہ ۱۸۸۰ع فوت ہوئے -''[1]

اس کے ساتھ جہاں بشیر نے باطن کے ترجمے مرقومہ نساخ پر اضافہ کیا ہے وہاں صراحت کر دی ہے کہ :

''تذکرہ ''نغمۂ عندلیب'' اُردو جو انھوں نے اپنے زعم میں گلشن بے خار کا جواب لکھا ہے ، میرے مہربان منشی کنھیا لال المتخلص بہ وحشی نے جواب الجواب مختصراً لکھ کر چھپوا دیا ہے - ناظرین اس کو ملاحظہ فرما لیں -''[2]

بشیر نے اپنے تذکرے میں شعرا کے تراجم بلحاظ حروف تہجی ردیف وار مرتّب کیے ہیں اور مطبوعہ و قلمی دونوں قسم کے سیکڑوں مآخذ کی مدد سے اس کا متن تیار کیا ہے - ''سخن شعرا'' کے حواشی پر بشیر کے تذکرے کا جو حصہ محفوظ ہے وہ آبرو و آزاد کے تراجم سے شروع ہو کر یوسف کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے - یہ تراجم ہم بطور نمونہ یہاں نقل کرتے ہیں :

آبرو : میر اصغر علی :

چھوڑ مت دامِ زلف سے یہ دل
بال باندھا غلام ہے تیرا

آزاد : آزاد تخلص کوئی ہندوستانی شاعر ہے جس کا صرف ایک شعر منو لال نے اپنی کتاب علم بلاغت میں منتخب کیا ہے -

---

۱- حاشیہ سخن شعرا ، ص ۵۰۸ ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی -

۲- بین السطور سخن شعرا ، ص ۵٦ ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو ، کراچی -

یوسف : یوسف تخلص شیخ محمد یوسف سہارنپوری شاگرد مولوی مقیم ۔

''تذکرۂ بشیر'' کے زیادہ تراجم اسی انداز کے ہیں ۔ انتخاب و حالات دونوں میں حد درجے اختصار سے کام لیا گیا ہے ۔ لیکن تذکرۂ بشیر کا وہ حصہ جو ''بیاض لاہور'' کے تراجم پر مشتمل ہے ، اس کے منتخبات تو زیادہ طویل نہیں ہیں ، تراجم خاصے معلومات افزا ہیں ۔ ہم اس جگہ تین ترجمے بطور نمونہ نقل کرتے ہیں ۔

آشفتہ مرزا رضا قلی :

آشفتہ تخلص ، مرزا رضا قلی نام ، حکیم محمد شفیع کے بیٹے تھے ۔ اکبرآباد وطن اصلی ہے مگر لکھنؤ میں سکونت کرتے تھے ۔ اس فن شریف سے مناسبت ازلی تھی ۔ میر سوز مرحوم سے فیض اندوز ہوئے ۔ علم حکمت جو ان کے خاندان میں مدت سے چلا آتا تھا ، اس کے وسیلے سے ۱۲۰۸ھ میں مبارک الدولہ نواب بنگال کے علاج کے واسطے . . . آرزوؤں سے بلانے پر گئے ، مگر بقول شخصے : ع

چون قضا آید طبیب ابلہ شود

نواب موصوف ان کے علاج سے صحت پذیر نہ ہوئے اور اسی بیماری کی وجہ سے انتقال کیا ۔ . . . وفات کے بعد اس کے بیٹے نواب ناصر الملک بہادر نے ۷ برس تک . . . رکھا اور ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا ۔ مگر یہ اپنی بد انتظامی اور بد چلنی کے سبب سے مقروض ہی رہا ۔ آخرش وہاں سے ۱۲۱۴ھ میں کلکتہ چلا گیا اور وہاں بھی اس کے کمال نے خاطر خواہ عزت پائی اور بڑی قدر و منزلت ہوئی ۔ فن موسیقی کے شائق اس سے بہت رغبت رکھتے تھے اور یہ با کمال جس کو حسن فن کا مائل دیکھتا اس کے آگے ویسی ہی دوکانداری کا اسباب پیش کرتا اور حسب دلخواہ قیمت حاصل کرتا ۔ اس کی شیریں کلامی اور خوش فکری میں کسی کو کلام نہیں ، البتہ دیوان کے فراہم نہ کرنے کے سبب سے اپنے ہم عصروں میں مطعون رہا کیونکہ وہ ایسا زمانہ تھا کہ دیوان مرتّب کرنے کو امر عظیم خیال کرتے تھے ، خواہ وہ چھوٹا سا ہی کیوں

نہ ہو ۔ صاحب دیوان کو پورا شاعر سمجھتے تھے ورنہ اس کی ایسی مثال ہوتی تھی جیسے گویّوں میں اتائی [عطائی] کی کچھ پرسش نہیں ہوتی ہے ۔ القصہ اب ان کے اشعار سنیے اور دماغ تازہ کیجیے ۔ ایک زمانے میں غزل مرقومہ ذیل گلی گلی میں لوگ گاتے پھرتے تھے اور طبیعت خوش کرتے تھے :

جام گدائی ہاتھ میں لے نت شام سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر ہیں دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں
یوں کاندھے پر زلفیں اس کی بل کھاتی ہیں وقتِ خرام
مارِ سیہ کو ڈال گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں
مدت سے ہیں اخترِ طالع، ماہ جبیں بِن گردش میں
کھول تو باہمن پوتھی اپنی کب دن میرے پھرتے ہیں
پنڈت پوچھو ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کیا حاصل
دن جو ہوئے برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں
عقل ہوئی جب سلب ہماری آہ جنون و واہ جنوں
کوچہ بکوچہ اب تو ہم کو لڑکے گھیرے پھرتے ہیں
لشکر میں دل ایک سپاہی زادے نے ہے چھین لیا
ہم درویش اب طلب میں اس کی ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

آزردہ ، مفتی صدر الدین :

(ابتدائی اوراق غائب ہیں) "بے ادب گستاخ مشہور کرتے ہیں کہ ان کو امرد پرستی سے بہت ذوق تھا، چنانچہ ایک لونڈا ہمیشہ آپ کے پاس رہتا تھا اور آپ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے کہ وہ لاپروا ہو جاتا ۔ اچھا کھلانا اچھا پہنانا، سواری کو گھوڑا، خدمت کو نوکر جس چیز کی اس کو ضرورت ہوتی وہ موجود کر دیتے اور اس کے حسن ملیح کے شیدا بنے رہتے ۔ سنگی اور . . . دونوں اشخاص اب تک آپ ہی کی

ارواح کا صدقد اپنا گزارہ کرتے ہیں۔
اکثر پینس میں سوار ہو کر بازار میں نکلا کرتے تھے۔

لطیفہ : ایک دن ان کے ہاں کچھ تقریب تھی۔ علاوہ ارباب نشاط کے دو چار بھانڈوں کے طائفے بھی وہاں حاضر تھے۔ ایک بھانڈ نے یہ نقل کی کہ ایک تو امیر بن کر بیٹھ گیا اور نوکر (کو) حکم کیا کہ ہمارے لیے بہت عمدہ کوئی رنڈی حاضر کرو۔ وہ ایک کا اپنے آدمیوں میں سے ہاتھ پکڑ کے آ موجود ہوا۔ فرمایا اس کی خرچی کیا ہے۔ اس نے ہزار روپے بیان کیے۔ انھوں نے کہا بھئی کچھ کم کرو۔ اس نے کہا پانچ سو دیجیے۔ آخر یہاں تک کہ ایک روپیہ آٹھ آنے اور چار آنے تک نوبت پہنچی۔ یہ یہی کہے جاتے کہ کچھ اور کمی کرو۔ آخرش وہ جل بھن کر بولا کہ آپ کو اگر منظور ہو تو مفتی کی (یعنی مفت ہی کی) لا دوں۔ اس پر تمام حضّارِ بزم نے قہقہہ لیا۔ مفتی صاحب چین بہ ابرو ہوگئے اور دوسرا طائفہ بدلوا دیا۔ . . . کے باب میں یہ شعر بھی پڑھا کرتے ہیں :

. . . . . . سے انکاری
بیٹی دے کر داماد کی . . .

لطیفہ : مفتی صاحب کے مکان میں ایک بیری کا درخت ہے، اس پر کسی ہندو کا طوطا آ بیٹھا۔ بچوں نے نوکروں سے پکڑوا کر پنجرے میں بند کر دیا۔ اس کی صدا تھی ''ست گُر دھن داتا''۔ ہرچند ان کے ہاں کی مستورات نے اس کو ''نبی جی بھیجو'' وغیرہ کا سبق پڑھانا چاہا مگر اس کو تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ کا وظیفہ تھا، اور کچھ کب کہہ سکتا تھا۔ مفتی صاحب کو بھی اس کی اطلاع ہوئی۔ آپ نے فرمایا اس کو یوں پڑھاؤ ''سب پر فضل خدا کا۔ سب پر فضل خدا کا''۔ خدا کی شان دوپہر کے عرصے میں وہ طوطا یہی پڑھنے لگا اور یہ جملہ اس کو ایسا رواں ہوا کہ اپنا اصلی وظیفہ بھول گیا۔

لطیفہ : ایک دن مفتی صاحب نے مشاعرے میں غزل پڑھی، اس کا مطلع تھا :
(یہاں مطلع نہیں ہے، جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے)۔
''اس پر بڑی تعریف ہوئی۔ کسی ظریف الطبع نے بہت سی تحسین و آفرین

کے بعد یہ بھی کہا کہ حضرت سبحان اللہ ! کیا بات ہے ، آپ کے اشعار میں بھی مرنے مرانے ہی کا مضمون ہوتا ہے - مفتی صاحب مسکرا کے چپکے ہو رہے - بہر کیف مفتی صاحب بڑے زندہ دل اور یارباش آدمی تھے - یہ ضرور ہے کہ خوب صورت آدمی سے محبت کرتے تھے اور کچھ ان پر خصوصیت نہیں -"

مومن - مومن خاں :

معلوم ہوتا ہے کہ اس مخطوطے کے کئی ورق ضائع ہو گئے ہیں ، بعد کے صفحات کی بعض عبارتیں کسی بھی اگلے صفحے سے مربوط نہیں ہوتیں - ماقبل کے صفحات سے بھی کوئی سلسلہ قائم نہیں ہوتا -

"مصرع :

مصرعِ سال فوت گفت بشیر   رضی اللہ عنہ یوم خیر

. . . پورا مادۂ تاریخ ہے -

درگاہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا میں مدفون ہوئے ، پھر بعد کو وہیں مرزا غالب اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مفتی صدر الدین علی [کذا] خان بہادر بھی جو اُن کے بڑے یار تھے آ پہنچے - میں اپنی آنکھوں سے یہ گنج شہیداں دیکھ چکا ہوں - سچ پوچھو تو بادشاہوں کی قبروں پر وہ تاسف نہیں آتا جو ان کے باکمالوں کی قبروں پر آتا ہے - حیف کہ کسی وارث کو یہ نہ سوجھا کہ آپ کا یہ شعر مزار پر کندہ کر دیتا -

سنگ مرقد سے مرے فیض ہے سب کو مومن
ہوں تہِ خاک بھی طوطیِ پسِ آئینہ

راقم کے زعم میں نازک خیالی ان سے بڑھ کر کسی شاعر میں نہیں پائی جاتی - اس مزے کی طبیعت کا کوئی سخنور ریختہ گویوں میں نہیں گزرا - کلیاتِ فارسی و ریختہ جمیع اصناف سخن سے مملو ہے - دیوان اردو کئی دفعہ چھپا بھی ہے -

نقل :

اس امرِ ناگزیر کے کئی مہینے بعد نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ نے کہ انسان صورت ملک سیرت تھے، خواب میں دیکھا کہ گویا مومن خاں کا خط آیا ہے اور اس کے خاتمے پر خط سبز سے لکھا ہے :

"مومن اہل الجنہ"

وسعتِ رحمت سے کیا بعید ہے کہ جوش دریاے مغفرت نے اس مستحق کرامت کے دامن کو لوثِ عصیاں سے پاک کر دیا ہو۔

"صدق اللہ عز و جل قال . . . رحمتی وسعت کل شی"

نقل :

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، جو آپ کے ہم عصر تھے، انھوں نے اس رباعی کی عبارت میں اظہار الم اور اس کے نظم کے پیرایے میں افشاے غم کیا ہے :

شرط ست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر
خون نابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

ایک مرتبہ جناب حکیم صاحب سہسوان تشریف لے گئے تھے، وہاں کے ساکنین نے استفسار حال کیا۔ آپ نے فی البدیہ یہ قطعہ موزوں فرما کے پڑھ سنایا اور صلۂ تحسین و آفرین بخوبی پایا :

صاحبو میرا حال مت پوچھو
بندۂ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلی جو سہسواں آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذر بے جا ہے سرکشی کے لیے
شاکیٔ بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوند شوخ کے غم میں
قابلِ رحم ہو گیا ہوں میں

مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک
کہ غلامِ گریزپا ہوں میں

علیٰ ہذا القیاس اس شعر سے بداؤں کا جانا ثابت ہوتا ہے :

بداؤں میں مجھے جوش جنوں لایا ہے دلی" سے
یہ کیوں کر چارۂ پند خرد مندان ہوش آیا

ان کی قابلیت اور فضیلت کا شہرہ دہلی میں مشہور و معروف تھا۔ چنانچہ جناب لفٹننٹ گورنر مسٹر طامسن صاحب بہادر جب بنا بر بندوبست مدارس دہلی میں تشریف لائے اور سب مدرسوں کے طلبا کا امتحان لے کر بہ سعیِ مفتی صدر الدین خان بہادر صدرالصدور حکیم صاحب کو بلا کر نوکر رکھنا چاہا ، آپ نے سو روپیہ ماہواری . . . ۔"

(اس کے بعد کا ورق غائب ہے)

☆ ☆ ☆

ارمغانِ گوکل پرشاد

''ارمغانِ گوکل پرشاد'' کا صرف ایک مطبوعہ نسخہ اب تک ہمارے علم میں آیا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں نگار کا تذکروں کا تذکرہ نمبر شائع ہوا تھا[1] لیکن اس وقت تک راقم الحروف کو اس تذکرے کی دستیابی کی خبر نہ تھی۔ صرف بعض کتابوں میں اس کا حوالہ نظر سے گزرا تھا۔[2] بعد میں حاجی محمد یعقوب خاں خورجوی نے جب ایک تعارفی مضمون اس کے بارے میں اشاعت کے لیے بھیجا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ ان کے پاس موجود ہے۔[3] میں نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو موصوف نے از راہ نوازش مجھے بھیج دیا اور اس طرح مجھے اس کے تفصیلی مطالعے کا موقع مل گیا۔

''ارمغانِ گوکل پرشاد'' دو حصوں پر مشتمل ہے اور مطبع مطلع نور منشی بہاری لال واقع کانپور سے شائع ہوا ہے۔ لیکن دیباچہ یا سرورق پر سنہ اشاعت یا سالِ ترتیب درج نہیں ہے۔ دوسرے حصے کے آخر میں دی ہوئی تقاریظ اور قطعاتِ تاریخی سے البتہ اس کی تاریخ ترتیب و اشاعت کا حال کھلتا ہے۔

پہلی تقریظ جادو رائے شمیم رئیس بھوپال کی ہے۔ اس کی آخری سطریں یہ ہیں:

"مؤلف نے عجب پایہ پایا ہے جو اس کو ''گلدستۂ عضو'' بنایا ہے۔ نازنینوں کو ارمغان ہے، ناز برداروں کی جان ہے۔ اگر ''گلدستۂ

۱۔ نگار پاکستان (تذکروں کا تذکرہ نمبر) مؤلفہ و مرتّبہ راقم الحروف، سالنامہ ۱۹۶۴ء۔
۲۔ مقدمۂ بحر الفصاحت، ص ۹۴، مؤلفہ نجم الغنی، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔
۳۔ نگار پاکستان بابت جنوری ۱۹۶۶ء۔

تصور صنم" کہیں تو بھی بجا ہے ، کس لیے کہ مملو از ناز و ادا ہے - مؤلف کی صفت لکھنا عقل سے دور ہے اس لیے تاریخ اتمام لکھنا ضرور ہے -

دفتر اول رسا نے ارمغاں کا جب لکھا
واسطے تاریخ کے مجھ کو ہوئی فکر عظیم
ہاتف غیبی نے فوراً آسماں سے دی ندا
شکرستان سخن کہدے سن ہجری شمیم

نثر کے ٹکڑے میں "گلدستۂ عضو" اور "گلدستۂ تصور صنم" اور قطعہ کے آخری مصرعے میں "شکرستان سخن" کے نیچے ۱۲۹۵ کے اعداد درج ہیں لیکن ان ٹکڑوں سے یہ اعداد نہیں نکلتے -

اس کے بعد تاریخ ترتیب ہی کے سلسلے میں منشی جگموہن لال ، سررشتہ دار کلکٹری ضلع کانپور ، رئیس شکوہ آباد کی تقریظ و قطعۂ تاریخ ہے - آخری شعر یہ ہے :

چرخ دانش سے پئے تاریخ ترتیب کتاب
دی صدا عیسیٰ نے لکھ دو مخزن اشعار خوب

"مخزن اشعار خوب" کے نیچے ۱۸۸۲ اعداد لکھے ہیں لیکن اس سے صرف ۱۸۷۷ برآمد ہوتے ہیں - چونکہ ۱۲۹۵ھ اور ۱۸۷۷ع میں تقریباً مطابقت ہے اس لیے ارمغانِ گوکل پرشاد کا سال تصنیف ، جادو رائے شمیم اور جگموہن لال کی تقریظوں اور قطعات تاریخ کی روشنی میں ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۷ع - ۷۸ع خیال کرنا چاہیے - یہ خیال کہ یہ ۱۲۸۲ھ میں مکمل ہوا ہے ، کسی طرح درست نہیں ہے -[1]

تاریخ طباعت کے سلسلے میں پہلا قطعہ منشی بینی پرشاد ذکا کا ہے - اس میں سات اشعار ہیں - آخری دو شعر یہ ہیں :

بحمد اللہ کیا رنگ سے چھپ کے نکلا
سزاوارِ تحسینِ اہلِ زباں ہے
ذکا اس کی تاریخ اس طرح لکھو
یہی اپنے استاد کا ارمغاں ہے

۱- نگار پاکستان ، ص ۳۸ ، بابت جنوری ۱۹۶۶ع -

دوسرے مصرعے کے نیچے ۱۲۸۲ کے عدد درج ہیں - یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے - اس مصرعے سے ۱۸۸۲ برآمد ہوتے ہیں یعنی سال عیسوی نکلتا ہے -

آخر میں غافل دہلوی کا چار مصرعی قطعۂ تاریخ ہے - آخری شعر یہ ہے :

غافل نے لکھا یہ طبع کا سال
از گوکل پرشاد ''ارمغان باد''

''ارمغان باد'' کے ٹکڑے کے نیچے ۱۲۹۹ درج ہیں اور اتنے ہی نکلتے ہیں - چونکہ ۱۸۸۲ع اور ۱۲۹۹ھ میں مطابقت ہے اس لیے ذکا اور غافل کی کہی ہوئی تاریخوں کی روشنی میں ''ارمغانِ گوکل پرشاد'' کا سال طباعت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ع قرار پاتا ہے -

ارمغان کے مصنّف کا اصل نام گوکل پرشاد اور تخلص رسا ہے - باپ کا نام منشی گور دیال اور وطن کھجوا تھا - کھجوا راقم الحروف کے وطن سابق ضلع فتح پور ہسوہ (یو-پی) کا ایک مشہور تاریخی قصبہ ہے - ۱۶۵۹ع میں اورنگ زیب عالم گیر اور شاہ شجاع کے درمیان فیصلہ کن جنگ اسی قصبے میں ہوئی تھی - اورنگ زیب نے جشنِ فتح کے سلسلے میں ایک بڑی عمارت "سرائے" کے نام سے بنوائی تھی - یہ سرائے آج بھی قائم ہے - اس میں دو بڑے دروازے ، درمیان میں ایک عالی شان مسجد اور ۱۳۰ کمرے ہیں - مغلوں کی یادگار عمارتوں میں یہ فتح پور ہسوہ کی سب سے بڑی عمارت ہے -

گوکل پرشاد رسا ذات کے سریوستوا کائستھ تھے - کسی زمانے میں فتح پور ہسوہ کے بعض کائستھ خاندان دولت و ثروت اور علم و ادب کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے - ان میں سب سے ممتاز خاندان لالہ ایشور سہائے کا تھا - اس خاندان کی رشتہ داریاں فتح پور شہر کے علاوہ دوسرے قصبات مثلاً کھجوا اور ہتگام وغیرہ سے بھی قائم تھیں - اُردو کے ممتاز نقاد و شاعر لالہ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی دو حقیقی بہنیں اسی خاندان میں لالہ ایشور سہائے کے بیٹوں سے بیاہی ہیں - لالہ کرشن سہائے وحشی ایڈووکیٹ جو خود کو وحشی کانپوری لکھنے لگے تھے ، فتح پور کے کائستھ خاندان کے ایک فرد تھے اور بغرض معاش کانپور میں رہنے لگے تھے - اقبال ورما نشتر ہتگامی اور خوشتر ہتگامی کا تعلق بھی اسی خاندان

سے ہے ۔ غرض کہ فتح پور ہسوہ کے کائستھوں نے علم و فن کے بعض شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اور ارمغان کے مؤلف گوکل پرشاد رسا بھی اُسی علمی و ادبی گھرانے کے ایک فرد ہیں ۔

مؤلف نے اپنا ذکر تذکرے میں دو جگہ کیا ہے ۔ ایک دیباچے میں ، دوسرے اپنے ترجمے میں ۔ دیباچے میں بس اتنا لکھا ہے :

''گوکل پرشاد رسا خلف منشی گور دیال مدظلہ بن منشی شیو پرشاد مرحوم بن رائے سنپت رائے کایست سری باست کھری ساکن قصبہ کھجوا ضلع فتح پور متعلق کمشنری الہ آباد ۔'' (ص ۲)

اپنے ترجمے میں بھی کوئی تفصیل نہیں دی ۔ اوپر کی عبارت میں چند فقروں کا اضافہ کر دیا ہے ۔ پورا ترجمہ یہ ہے :

''بندہ گوکل پرشاد مؤلف تذکرہ ہذا خاف اکبر منشی گور دیال سلمہ اللہ تعالیٰ بن منشی شیو پرشاد مرحوم قوم کائست چترگپت سری باست کھری ساکن قصبہ کھجوا ، پرگنہ کوڑا ضلع فتح پور ۔ ہرچند اس نالائق کو یہ جرأت نہ تھی کہ اپنا نام سخنورانِ جادو بیاں کی فہرست میں درج کرتا مگر اس نظر سے کہ جب تک اپنا شاعر ہونا ظاہر نہ کرے گا عوام میں میرے تذکرے کی وقعت نہ ہوگی ۔ مجبوراً دو چار اشعار ٹوٹے پھوٹے لکھنے پڑے ۔ (ص ۲۴)

مؤلف کے باپ گور دیال غالباً شاعر نہ تھے اس لیے کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں نہیں ہے ۔ مؤلف کے دادا شیو پرشاد البتہ شاعر تھے ۔ ان کے اشعار جا بجا نقل ہوئے ہیں اور ان کا ذکر بھی دوسرے شعرا کے مقابلے میں قدرے تفصیل سے اس طور پر آیا ہے :

''منشی شیو پرشاد مرحوم جامع فضل و کمال صوری و معنوی ، ہادیِ مراحل دینی و دنیوی ، رئیس قصبۂ کھجوا ضلع فتح پور ، بندۂ مؤلف کے جد امجد اور عربی فارسی اور سنسکرت میں ذی استعداد ، افکار دنیوی سے آزاد ، فارسی اور اُردو ہر دو زبان میں شعر فرماتے تھے مگر بہت کم حتیٰ کہ تخلص کا قرار دینا قبول نہ فرمایا ۔ فن شعر میں منشی سورج مل خوشدل مرحوم قانون گو منصورنگر ملک اودھ سے مشورہ رہا ۔

علم نجوم کاشی میں تحصیل کیا تھا - نسخۂ اوبھاسِ پرکاش علم تصوف کا
ترجمہ فارسی تحریر فرمایا اور ہندی بیاکرن کی مطابقت اُردو صرف و نحو
سے کرکے ایک رسالہ ترتیب کیا - اس کے علاوہ رقعات اور فرشنامہ
[فرس نامہ] اور متاکسرہ کا خلاصہ نثر میں اور قصاید و غزلیات اور رباعیات
اور قواعد حساب نظم میں موجود ہیں - مگر ناموری سے ایسا پرہیز تھا
کہ ہمیشہ چھپانے سے انکار رہا - سن ۱۹ بکرمی ماہِ کوعین ہوش و حواس
کے ساتھ سری کشن گویاں روضۂ رضوان کی راہ لی - یہ نالائق اس وقت
حاضر خدمت تھا - دم واپسیں صرف اس قدر ارشاد فرمایا کہ فرصت قلیل
نے تمہاری (یعنی مؤلف کی) تعلیم و تربیت کی تکمیل نہ ہونے دی -''
(ص ۵۹)

اس سے زیادہ اس تذکرے سے مؤلف یا اس کے خاندان کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم ہوتا - بعض شعرا سے ذاتی تعلقات کا سراغ ضرور ملتا ہے - مثلاً ثابت کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

''ثابت منشی بشن دیال قوم کائستھ سری باست انگریزی اور فارسی میں
کمال حاصل ، وکیل ہائی کورٹ کانپور ہیں . . . بندہ مؤلف کے کرم فرماؤں
میں ہیں -'' (ص ۲۷)

اسی طرح زخمی کے ذکر میں ہے کہ :

''منشی راج بہادر قوم کائست متوطن کاکوری ضلع لکھنؤ باشندۂ
نواب گنج محلہ شہر کانپور . . . راقم سے ملاقات ہے -'' (ص ۳۶)

شاداب کے ترجمے میں لکھا ہے :

''شاداب منشی رنگین لال خلفِ منشی دیبی پرشاد صاحب . . . فن شعر
کے علاوہ خوشنویسی میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں ، ان دنوں مطبع
مطلعِ نور سے تعلق ہے - یہ تذکرہ خاص انھی کے قلم جادو رقم کا لکھا
ہوا ہے -'' (ص ۵۸)

بینی پرشاد ذکا کے حالات میں لکھا ہے کہ :

''راقم کے ملاقاتیوں میں ہیں -'' (ص ۳)

لیکن تذکرے کے آخر میں ذکا کا جو قطعۂ تاریخ شامل ہے اس سے پتا چلتا

ہے کہ ذکا محض ملاقاتی نہیں بلکہ رسا کے شاگرد ہیں ۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ۔
سید امداد علی انعام کے بارے میں تحریر ہے کہ :

"ہنگام تحریر رسالہ ہذا مؤلف سے چند بار ملاقات فرمائی ۔ بڑی خوبی کے شخص ہیں ۔" (ص ۱۵)

اپنے عزیزوں اور اپنے بعض احباب کے ذکر کے علاوہ گوکل پرشاد رسا نے اپنے وطن ضلع فتح پور ہسوہ کے مندرجہ ذیل شعرا کا ذکر بھی اپنے تذکرے میں کیا ہے :

(۱) حیرت : میر محمد حسین ولد سید امید علی واسطی ۔ وطن بزرگوں کا قصبہ اکبر پور معروف بندکی ، ضلع فتح پور ہسوا ہے اور شاگرد ہیں شیخ احمد علی کامل کے ۔ (ص ۳۵)

(۲) داغ : سید لطف حسین ابن سید حیدر علی رئیس فتح پور ہسوا شاگرد ناسخ ۔ آپ کی مثنوی راقم نے دیکھی ہے ۔ بدر منیر کے ہم وزن اور شگرفی موزوں رکھی ہے ۔ (ص ۳۷)

(۳) ظاہر : مرزا بندہ حسن خاں باشندۂ فتح پور ہسوا وارد لکھنؤ شاگرد نواب عاشور علی خاں ۔ (ص ۶۹)

(۴) عاجز : سید اکرام علی خلف سبحان علی رئیس فتح پور ہسوا ۔ (ص ۷۱)

(۵) عاشق : شیخ محمد جان فیض آبادی ، ساکن دیوسنی پرگنہ کوڑا ضلع فتح پور شاگرد شیخ احمد علی کامل ۔ (ص ۴۷)

(۶) عشرت : حکیم میر عشرت حسین خلف حکیم عزت حسین بن حکیم الملک مسیح الزمان حکیم سید ابوالحسن خان بہادر مرحوم رئیس قصبۂ کوڑا ضلع فتح پور ۔ حضرت عشرت ابھی نوعمر ہیں لیکن فیض خداداد نے یازدہ [شانزدہ ؟] سالگی میں دستار فضیلت کی بندھوائی ۔ اپنے زمانے میں فخر ہوئے ۔ ہم نے بنظر اپنے تذکرے کی رونق افزائی کے آپ کا نام درج فہرست

شعرا کیا ورنہ آپ کا مرتبہ شاعری سے کہیں افضل ہے (ص - ۷۵)

(۷) گوہر : احمد علی خاں ولد الف خاں باشندۂ فیض آباد مقیم فتح پور ہسوا - نواب باندہ کے ملازم رہے ہیں - حضرت اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے شاگرد - (ص ۸۸)

(۸) موج : منشی کالکا پرشاد خلفِ منشی بہاری لال مرحوم کائستھ سری باست کھری - سابق سرشتہ دار کلکٹری ضلع فتح پور باشندۂ کوڑا جہان آباد - (ص ۱۰۱)

(۹) ناصر : میر ناصر علی خلف مرزا محمد علی ساکن ضلع فتح پور ہسوا شاگرد میر اکرم علی توانا - (ص ۱۰۶)

(۱۰) یوسف : نواب امجد علی خاں رئیس قصبہ دیومنی پرگنہ کوڑا ضلع فتح پور - (ص ۱۱۲)

ان شعرا میں سے بعض شعرا مثلاً ظاہر ، عاشق ، گوہر ، ناظر اور یوسف کا ذکر بعض دوسرے تذکروں میں بھی مل جاتا ہے لیکن حیرت ، داغ ، عاجز ، عشرت اور موج کے تراجم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں -

مؤلف اور مؤلف کے خاندان یا اس کے احباب اور ہم وطن شعرا کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم ہوتا - مؤلف نے اپنے اشعار البتہ مختلف عنوانات کے تحت درج کیے ہیں لیکن اُن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری میں اُن کا مقام کچھ زیادہ بلند نہ تھا اسی لیے شہرت نہ پا سکے -

ارمغانِ گوکل پرشاد کے مطبوعہ نسخے کی ظاہری صورت یہ ہے کہ اس کے دونوں دفتر یا حصے یکساں سرورق اور یکساں عنوان کے ساتھ ایک ہی پریس سے اکٹھا شائع ہوئے ہیں - دونوں حصوں کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

''بعون شیرازہ بندِ مجموع اوراقِ عنصری مخلوق انسان

بہ نظر پیش کش حضور پُر نور عالی جناب مہاراجہ مہندر پرتاب سنگھ صاحب بہادر والی ورچھہ دام اقبالہ -

ارمغانِ گوکل پرشاد

بحسن سعی فراوان و اہتمام نمایاں شیخ نبی بخش پرنٹر در شہر معمور کانپور

بہ مطبع مطلع نور منشی بہاری لال رونق طبع یافتہ''

پہلی ، تیسری اور آخری سطریں جلی حروف میں ہیں - صفحات کے نمبر دونوں حصوں میں الگ الگ ڈالے گئے ہیں - پہلا حصہ جس میں نثری تراجم ہیں ، ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے - اس کے بعد دو صفحے ''غلط نامہ'' کے لیے الگ سے لگائے گئے ہیں - غلط نامے کا پورا عنوان یہ ہے :

''غلط نامہ فہرست دفتر اول ارمغان گوکل پرشاد''

پہلے حصے کے پہلے صفحے پر تذکرے اور مطبع کا نام ہے - دوسرے اور تیسرے صفحوں میں مؤلف کا دیباچہ ہے - چوتھے صفحے سے شعرا کے تراجم شروع ہوتے ہیں اور بلحاظ تخلص ردیف وار الف تا ی درج کیے گئے ہیں - ہر ردیف میں کتنے شاعر ہیں ؟ اس کی تفصیل اگلی سطور میں ایک جدول کے ذریعے ہم نے ظاہر کر دی ہے -

نثری تراجم کا ہر صفحہ دو خانوں میں بہ عنوان ''تخلص'' اور ''نام مع کیفیت'' بٹا ہوا ہے - پہلے خانے میں جلی حرفوں میں ہر شاعر کا تخلص مع نمبر شمار درج ہے اور دوسرے میں حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے - پہلا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے :

''اخگر حکیم اصغر حسین ، فرخ آباد کے رہنے والے منشی غلام غوث وکیل سرکار کے فرزند رشید ، ریاست بھوپال میں معزز عہدے پر کارفرما -''
(ص ۴)

اس حصے کا خاتمہ یقین کے مندرجہ ذیل ترجمے پر ہوتا ہے :

''یقین سید محمد حسین باشندۂ دہلی ، صاحب تذکرۂ سراپا سخن نے آپ کی ایک شعر پرچہ' صادق الاخبار سے نقل کی تھی - اس سے راقم نے ایک شعر انتخاب کیا -'' (ص ۱۱۲)

''ارمغان'' کے دوسرے حصے میں ایک سو چھیانوے (۱۹۶) صفحات ہیں - پہلا صفحہ سرورق کے لیے ہے اور پہلے حصے کے سرورق کی طرح اس پر بھی

عنوان اور پریس کا نام چھپا ہوا ہے - دوسرے صفحے سے اشعار کا انتخاب شروع ہوتا ہے - اس سلسلے میں مؤلف نے حمد کے بعد محبوب کے سراپا اور اعضائے جسمانی کی حرکات دلبرانہ کے لیے سو کے قریب عنوانات قائم کر لیے ہیں - ہر عنوان کے تحت مختلف شعرا کے اشعار منتخب کیے گئے ہیں - ہر شعر کے ساتھ شاعر کا تخلص بھی ظاہر کر دیا گیا ہے - یہ سلسلہ صفحہ ۱۹۳ تک چلا گیا ہے - صفحہ ۱۹۴ سے لے کر صفحہ ۱۹۷ تک تقریظیں اور قطعاتِ تاریخی ہیں - صفحہ ۱۹۷ کی پشت یعنی آخری صفحے پر یہ عبارت درج ہے -

"اعلان

یہ کتاب ہماری فرمائش سے ترتیب دی گئی ہے ، اس کا حق سوائے ہمارے دوسرے شخص کو نہیں پہنچتا - اُمید کہ اربابِ مطابع ہمارے اس اعلان کو خیال فرماویں گے -

العبد

بہاری لال مالک مطبع مطلع نور کانپور"

تقریظوں میں پہلی تقریظ منشی جادو رائے شمیم کی ہے - تقریظ کے آخر میں دو شعروں کا قطعۂ تاریخ ہے - شمیم نے نثر اور نظم دونوں کے بعض ٹکڑوں سے تاریخ نکالی ہے ، اصل تقریظ دیکھتے چلیے :

"کار قلم دبیر عطارد رقم مخزن لطف عمیم جناب منشی
جادو رائے صاحب تخلص شمیم رئیس بھوپال

بجا کرکے حواس اپنے بشر خاموش ہو جائیں
ملائک اس کے سننے کو سراپا گوش ہو جائیں

وفور فیض باری ہے ، ہر شے میں کیفیت اعتدال ساری ہے - موتیا کی کلیوں پر ستاروں کا گماں ہے ، ہر جادۂ راہ کہکشاں ہے - ہر جگہ مخمل سبز کا فرش ہے ، شادی زمین سے تا عرش ہے - بلبل ترانۂ شور میں مصروف ہے ، قمری کوکو سے مالوف ہے - پھول کو دیکھ کر غنچہ مسکراتا ہے اور غنچے کو دیکھ کر پھول پھولا جاتا ہے - ہر درخت نشۂ حسن سے جھوم رہا ہے ، پتّا پتّی کا منہ چوم رہا ہے - نہالوں نے سبز لباس پہنا ہے ، پتوں پر شبنم سے موتیوں کا گہنا ہے - مرغان

چمن نوا سنجی کر رہے ہیں ، ہر شاخ پر عنادل کے یہ چہچہے ہیں - حسینانِ جہاں کدھر ہیں ، آئیں افصح الفصحا اکمل الکملا منشی گوکل پرشاد صاحب رسا کا شکریہ بجا لائیں - حضرت نے عجب کام کیا ہے کہ کل ترانہائے ہزار داستان گلبنِ سخن کو تھوڑے جزوں میں کھینچ لایا ہے - بڑا خونِ جگر کھایا ہے ، جب صفحۂ کاغذ کو صحن گلستان بنایا ہے - کہیں اوصاف قامت سے سرو و شمشاد کا ظہور ، کہیں وصف عارض سے دامن قرطاس پھولوں سے معمور - کسی جگہ نرگسی چشم کا بیان ہے ، سراپا شوخی عیاں ہے - جہاں پستان کے اشعار جمع فرمائے ہیں ، حسینانِ جہاں چھاتی پکڑے ہوئے آئے ہیں - دہانِ تنگ کے اوصاف بجز ہاتف غیبی دوسرے کے سمجھ میں نہ آئے ، کمر کے وصف نے اس کو دھوکے کھلائے - ثنائے لب پڑھنے میں اگر آئے منہ میں پانی بھر آئے - حسینوں کا دستورالعمل ہے عاشقوں کی اجل ہے - ہزار سے زیادہ شعرا کا کلام اکٹھا ہوا ، جس نے اس کو پڑھا اس کا دل تمام دیوانوں سے کھٹّا ہوا - ابھی یہ پہلا دفتر ہے ، رسا کی عقلِ رسا کا ادنیٰ جوہر ہے - مؤلف نے عجب پایہ پایا ہے جو اس کو گلدستۂ عضو[1] بنایا ہے - نازنینوں کو ارمغان ہے ، ناز برداروں کی جان ہے - اگر گلدستۂ تصور صنم -[2] کہیں تو بھی بجا ہے ، کس لیے کہ مملو از ناز و ادا ہے - مؤلف کی صفت لکھنا عقل سے دور ہے ، اس لیے تاریخ اتمام لکھنا ضرور ہے :

قطعۂ تاریخ

دفتر اول رسا نے ارمغاں کا جب لکھا
واسطے تاریخ کے مجھ کو ہوئی فکر عظیم
ہاتف غیبی نے فوراً آسماں سے دی ندا
شکرستان سخن[3] کہدے سنِ ہجری شمیم" (ص ۱۹۴)
۱۲۹۵

---

۱ ، ۲ ، ۳- "گلدستۂ عضو" ، "گلدستۂ تصور صنم" اور "شکرستان سخن" کے نیچے ۱۲۹۵ کے اعداد درج ہیں لیکن ان ٹکڑوں سے یہ اعداد برآمد نہیں ہوتے - (ف - ف)

منشی جادو رائے شمیم ، جن کی تقریظ اُوپر درج کی گئی ہے ، گوکل پرشاد رسا کے عزیز اور ہم وطن معلوم ہوتے ہیں اس لیے کہ شمیم کا ذکر رسا نے اس طور پر کیا ہے :

''شمیم - منشی جادو رائے بن منشی بھوانی لال قوم کایست - چند عرصے سے بھوپال میں سکونت اختیار فرمائی - صاحبِ ذہن وقاد و طبع خداداد سے مقبول روزگار ، نظم و نثر میں یکتائے عصر مشہور ہر دیار - آپ کی تصانیف میں انشائے گلشن شمیم ، زبان فارسی اور انشائے چمن شمیم اُردو اور گلزار شمیم اور مثنوی ضیائے عشق اور دستور الحساب وغیرہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ہیں - آپ کا کلام فیض انضمام بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے -'' (ص ۶۱)

دوسری تقریظ منشی جگ موہن لال کی ہے ، اسے بھی دیکھتے چلیے :

''ریختۂ خامۂ گہربار دبیر جادو خیال تحریر بے مثال منشی جگ موہن لال سررشتہ دار کلکٹری ضلع کانپور رئیس شکوہ آباد ضلع مین پوری -

''آج ہم نے یہ تذکرہ مسمیٰ بہ ارمغانِ گوکل پرشاد دیکھا ، جس کی ترتیب و تالیف کا اشتہار ۱۸۷۸ع کو اکثر اخباروں میں چھپا تھا - اخبار کے اشتہار میں جو کیفیت لکھی تھی ، وہ کتاب کے دیکھنے سے مفصل معلوم ہو گئی - مؤلف نے اس کتاب میں ہزار سے زیادہ شاعروں کا کلام اس ترتیب سے جمع کیا ہے کہ سر سے پا تک اعضا کی تعریف اور پوشاک کی توصیف ، رفتار و گفتار کا بیان ، ناز و نزاکت کی داستان ہے - اشعار اس رنگ کے منتخب کیے گئے ہیں کہ جس کے مضامین سے بندش مضمون اور تلاش معانی کا اور ہی رنگ و بو نظر آتا ہے - جہاں تک کہ ہم نے اس بیاض جنت ریاض کی سیر کی ہے ، کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب خود آپ اپنی جواب ہے اور اپنے طرزِ خاص میں کمیاب - یہ تو انتخاب کی صنعت ہے - اس پر تذکرہ بھی ہر شاعر کا لکھا گیا ہے - حتی الامکان اکثر شعرا کا مفصل حال بلا مبالغہ درج ہے اور شعر کے روبرو نمبر لگا دیے گئے ہیں جس کے ذریعے سے تلاش میں دقت نہیں - بہرحال اس انتخاب سے مبتدی کو خیال آفرینی کی طاقت آ سکتی ہے اور منتہی کو اپنی طرز جداگانہ پیدا کرنے کی لیاقت - امید کہ مقبول عام ہو -

قطعۂ تاریخ

واہ وا کیا طرز نو کا تذکرہ لکھا گیا
خامۂ مشکیں نے کھینچی صورت دلدار خوب
چرخ دانش نے پئے ترتیب تاریخ کتاب
دی صدا عیسیٰ نے لکھ دو ''مخزن اشعار خوب''[1] (ص ۱۹۵-۱۹۶)

۱۸۸۲

جادو رائے شمیم اور جگ موہن لال کی تقریظوں کے بعد ایک اور تقریظ منشی حامد حسین کاکوروی کی ہے - یہ بھی درج کی جاتی ہے :

''تقریظ ریختہ خامۂ جادو رقم منشی شیخ محمد حامد حسین صاحب کاکوروی صدر منصرم بندوبست ملک میواڑ -

ساکنان[2] پرستانِ سخن کو مژدہ ہو کہ آج عروس سخن کا نکھرا جوبن غضب ڈھا رہا ہے - عاشق تن حرفوں کو لوٹن کبوتر بنا رہا ہے - تذکرۂ ارمغانِ گوکل پرشاد تیار ہے - یہ سراپا تصویر یوسفِ بازار ہے - کتاب نہیں آراستہ دلہن ہے ، بیاض ہے کہ سراپا چمن ہے - مونس تنہائی ہے ، شاید [کذا] بزم آرائی ہے - انتخاب کا لفظ لفظ اپنے بانکپن میں لاجواب ہے ، ہر دائرہ روکشِ آفتاب ہے - سطروں میں زلف مشکبو کی لپٹیں آ رہی ہیں ، کوچۂ سلامت کی راہیں بُھلا رہی ہیں - بین السطور خندۂ دنداں نما کی یاد دلاتا ہے ، مصرعہ مصرعہ [کذا] قامت دلدار کا جلوہ دکھاتا ہے - بیاض کی سفیدی گردن شاہدان چین و ختن کو شرماتی ہے ، سیاہی کی چمک غزالانِ ختن کی شوخی میں دھبہ لگاتی ہے - عشاق کے واسطے معشوق بے نظیر ہے ، معشوق کے لیے عاشق نظیر - سر سے پا تک نور کی صورت ہے - ہر جگہ . . . تازہ صنعت ہے - کہیں زلف

۱- ''مخزن اشعار خوب'' کے نیچے ۱۸۸۲ کے اعداد درج ہیں لیکن اس ٹکڑے سے صرف ۱۸۷۷ برآمد ہوتے ہیں - (ف ف)

۲- ''ساکنان'' کی صرف ن موجود ہے ، باقی حروف غائب ہیں - میں نے اندازے سے ''ساکنان'' بنا دیا ہے ۔ (ف ف)

مسلسل کے پیچ تاب کا بیان ہے ، صفحۂ کتاب سنبلستان ہے - کہیں چشم بیمار کی سفاکی کا اظہار ہے ، غمزۂ فتّاں کی جادو شکار ہے - مضامین لب اعجاز مسیحائی سے دم مارتے ہیں ، دہنِ بےنشان اثبات و نفی میں منطقی ہارتے ہیں - یا رب یہ مجموعۂ بےمثال مقبول روزگار ہو ، تسکین بخش دیدۂ ارباب انتظار ہو -''[1] (ص ۱۹۶-۱۹۷)

حامد حسین کا کوروی کی یہ تقریظ صرف تعریفی کلمات پر ختم ہو جاتی ہے ، یعنی اس میں تذکرے کی تاریخ تالیف یا طباعت کا کوئی ذکر نہیں ہے - اس تقریظ کے بعد منشی بینی پرشاد ذکا کا قطعۂ تاریخ اس طور پر درج ہے :

''قطعۂ تاریخ نتیجۂ طبع عالی و ذہن صافی شاعر شیریں بیان مؤرخ یکتا منشی بینی پرشاد صاحب تخلص ذکا :

جناب رسا اپنے اُستادِ اوّل
کہ جن کے فضائل سے واقف جہاں ہے
سخن ور بڑے نامی و نامور[2]
سخنور زمانے میں ایسا کہاں ہے
انھوں نے وہ اک تذکرہ طرفہ لکھا
کہ جس سے کمال ان کا بالکل عیاں ہے
ہزار و دو صد شاعروں کا کلام [کذا]
سراپائے خوبانِ ہندوستاں ہے
یہ نسخہ پئے اہلِ معنی ہے تحفہ
اسی وجہ سے نام بھی ارمغاں ہے
بحمد اللہ کیا رنگ سے چھپ کے نکلا
سزاوار تحسینِ اہل جہاں ہے

۱- اس تقریظ کی آخری سطریں اندازے سے مکمل کی گئی ہیں اس لیے کہ ہر سطر کے شروع اور آخر کے الفاظ غائب ہیں - (ف ف)

۲- اس مصرعے کا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے - (ف ف)

ذکا اس کی تاریخ اس طرح لکھو
یہی اپنے استاد کا ارمغاں ہے[1] (ص ۱۹۷)
۱۲۸۲

اس قطعۂ تاریخ کے پہلے اور آخری مصرعے سے پتا چلتا ہے کہ ذکا کو رسا سے تلمذ حاصل تھا لیکن ذکا کے ترجمے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ موزوں طبع ہونے کے باوجود مصرعے موزوں کرنے کی زحمت نہ کرتے تھے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسا انھیں لکھ کر دیتے تھے اور تذکرے میں ذکا کے جو اشعار درج ہیں وہ دراصل رسا کے ہیں ۔ ذکا کے بارے میں ذکا کا ترجمہ دیکھیے ۔ ''ذکا منشی بینی پرشاد خلف لالہ رام کوئی چالیس برس سے کانپور میں سکونت اختیار کی ۔ طبیعت موزوں ہے اور سخن فہمی میں کمال ہے ۔ راقم کے ملاقاتیوں میں ہیں ۔ آپ کے مزاج میں آزادہ روی اس قدر ہے کہ ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کرتے ۔''
(ص ۳۰)

آخری قطعۂ تاریخ صرف دو شعروں پر مشتمل ہے اور یہ مرزا محمد بیگ غافل کا ہے :

از نتیجۂ طبع حکیم مرزا محمد علی بیگ صاحب غافل دہلوی

کس درجہ یہ کی رسا نے محنت
چھپتا ہے جو ارمغان گوکل پرشاد
غافل نے لکھا یہ طبع کا سال
از گوکل پرشاد ارمغان باد (ص ۱۹۷)
۱۲۹۹

ان تقریظوں اور تاریخی قطعات پر ارمغان گوکل پرشاد کا مطبوعہ نسخہ صفحہ ۱۹۷ پر ختم ہو جاتا ہے ۔ اس کی پشت ، یعنی ص ۱۹۸ پر ناشر کی طرف سے وہ اعلان درج ہے جو اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے ۔

''ارمغانِ گوکل پرشاد'' انفرادی نوعیت کا تذکرہ ہونے کے باوصف اُردو شعرا

۱- اس مصرعے کے نیچے ۱۲۸۲ کے اعداد درج ہیں جو درست نہیں ۔ اس مصرع سے ۱۸۸۲ برآمد ہوتے ہیں اور یہی صحیح ہے - ۱۲۸۲ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔ (ف ف)

کے متعدد تذکروں سے مستفید ہے ۔ لیکن رسا نے بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح اپنے ماخذ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں سے جو کچھ لیا ہے عام طور پر اسے ظاہر کر دیا ہے ۔ تراجم پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارمغان سے پہلے اُردو شعرا کے جو مشہور تذکرے موجود تھے ان میں سے اکثر مؤلف کے علم میں تھے ، بطور مثال مندرجہ ذیل ترجمے دیکھیے :

محسن : سید محسن علی ولد منشی شاہ حقیقت موسوی متوطن لکھنؤ ۔ صاحب دیوان اور ایک تذکرہ مسمّٰی بہ ''سراپا سخن'' لکھا ۔ (ص ۹۰)

ذکا : ''منشی خوب چند مرحوم کایست دہلوی شاگرد شاہ نصیر ۔ ایک منظوم تذکرہ[1] اُردو زبان میں لکھا ۔'' (ص ۳۹)

صابر : ''شاہزادہ مرزا قادر بخش خلف مرزا مکرم بخت بہادر . . . شاگرد عبدالرحمٰن خاں احسان و مولوی امام بخش صہبائی ، ''تذکرۂ گلستانِ سخن ۔'' (ص ۶۲)

شیفتہ : ''نواب حاجی محمد مصطفٰی خاں بہادر دہلوی . . . شاگرد مومن ۔ آپ کی تصانیف میں ''تذکرۂ گلشنِ بےخار'' ، ''رہ آورد'' حسرتی دیوان اُردو یادگار ہیں ۔'' (ص ۵۷)

مبتلا : ''مردان علی خاں خلف محمد علی خاں ۔ آپ کی تصانیف میں علاوہ دیوان کے ''گلشن سخن'' بھی ہے ۔'' (ص ۹۸)

مصحفی : ''غلام ہمدانی . . . آپ کے چھ دیوان اُردو اور ایک فارسی ، ایک تذکرہ یادگار ہے ۔'' (ص ۹۰)

نسّاخ : ''مولوی عبدالغفور بہادر . . . مصنّف نسخۂ مرغوب دل و شاہدِ غیرت و چشمۂ فیض و قند پارسی و قطعۂ منتخب و تذکرۂ سخن شعرا و گنجِ تواریخ وغیرہ . . . ۔'' (ص ۱۰۳)

۱۔ ''منظوم'' کا لفظ زائد ہے ۔ ذکا کا تذکرہ ''عیار الشعرا'' منظوم نہیں ہے ۔ (ف ف) ۔

ناصر : ''سعادت خاں خلف رسالت خاں صاحب دیوان و تذکرہ ۔''[1] (ص ۲)

باطن : ''حکیم میر قطب الدین . . . حضرت باطن کی تالیفات میں تذکرۂ بے خزاں موجود ہے جو بہ جواب نغمۂ عندلیب[2] تذکرہ مؤلفہ حضرت شیفتہ لکھا گیا ہے . . . ۔'' (ص ۲۱)

نادر : ''آپ کی تصانیف میں چار دیوان اور ''تذکرۂ شوکت نادری'' وغیرہ مشتہر و مطبوع ہیں . . . ۔''[3] (ص ۱۰۲)

مہجور : ''نواب اقبال الدولہ عنایت حسین خان بہادر . . . صاحبِ دیوان و تذکرہ ۔''[4] (ص ۹۹)

مندرجہ بالا تراجم اس امر کا ثبوت ہیں کہ سید محسن علی محسن ، خوب چند ذکا ، مرزا قادر بخش صابر ، مصطفیٰ خاں شیفتہ ، مردان علی خاں مبتلا ، غلام ہمدانی مصحفی ، عبدالغفور خاں نساخ ، قطب الدین باطن ، کلب حسین خاں نادر ، عنایت حسین خاں مہجور اور سعادت خاں ناصر کے تذکروں سے گوکل پرشاد رسا باخبر تھے اور ان سے انھوں نے حسبِ ضرورت فائدہ بھی اٹھایا ہے ۔ ''گلشنِ بے خار'' اور ''سخنِ شعرا'' سے استفادے کا سراغ تو کئی ترجموں سے ملتا ہے ۔ راجہ جسونت رائے پروانہ کے ذکر میں لکھا ہے :

''صاحب گلشنِ بے خار نے آپ کے حسن و جمال کا بڑا ذکر کیا ہے ۔'' (ص ۲۰)

۱۔ ''تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا'' کی طرف اشارہ ہے (ف ف) ۔

۲۔ ''نغمۂ عندلیب'' شیفتہ کے تذکرے کا نام نہیں بلکہ ''گلستان بے خزاں'' ہی کا تاریخی نام ہے ۔ باطن نے اپنا تذکرہ گلشنِ بے خار مؤلفۂ شیفتہ کے جواب میں لکھا تھا (ف ف) ۔

۳۔ ''شوکتِ نادری'' مطبوعہ کا سراغ اب تک نہیں لگا ۔ ایک قلمی نسخہ رام پور میں البتہ موجود ہے ۔ مولانا عرشی رام پوری نے ''دستور الفصاحت'' کے مقدمے میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ (ف ف)

۴۔ عنایت کے تذکرے کا نام ''مدائح الشعرا'' ہے (ف ف) ۔

خدا بخش موج اکبر آبادی کے بیان میں ہے کہ :

"بزمرۂ سر آئیندگان درجِ گلشنِ بے خار ہے اور لکھا ہے کہ ۱۲۴۵ھ میں بعارضہ ہیضہ . . . وداع کیا -" (ص ۹۵)

انشاء اللہ خاں انشا کے سلسلے میں لکھا ہے کہ :

"صاحب سخن شعرا نے لکھا ہے کہ کچھ روز وہ میاں مصحفی سے صلاح لے کر منحرف ہوگئے . . . -" (ص ۵)

اسی طرح زہرہ کے متعلق لکھا ہے کہ :

"کلام اپنا حضرت نسّاخ مؤلف "تذکرۂ سخن شعرا" کو دکھلاتی ہیں - تذکرۂ مذکور میں بھی زہرہ کی نسبت یہ فقرات درج ہیں :

"گلرو و گلبدن و گل اندام ہے - خوش خو و خوش گو و خوش خرام ہے - سخن سنج و سخن فہم و سخن طرازی میں آفت ہے ، سخن چینی و سخن سازی و سخن پردازی میں قیامت ہے -" (ص ۴۵)

نسّاخ کے سلسلے میں ان کے دو تذکروں "قطعۂ منتخب" اور "سخن شعرا" کے ساتھ ساتھ ان کی مشہور تالیف "انتخابِ نقص" کا تذکرہ بھی اس طور پر موجود ہے :

"۱۸۷۸ع میں میر صاحب و مرزا صاحب مرحوم مشہور مرثیہ گویان لکھنؤ کے اغلاط مشتہر فرمائے ہیں جس میں بعض بعض محض اعتراض ہی اعتراض ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت نسّاخ کا کلام بھی خالی از بغض [نقص] نہیں ہے -" (ص ۱۰۳)

بعض جگہ کسی خاص تذکرے کا نام لیا گیا ، لیکن پتا چلتا ہے کہ کئی تذکرے پیشِ نظر رہے ہیں - اٹل کے ترجمے میں لکھا ہے :

"اٹل ، عبدالجلیل دہلوی - تخلص ہی سے ظاہر ہے کہ کس مذاق کے انسان تھے - اس پر تماشا یہ کہ حضرت زٹل کے شاگرد تھے - آپ کے کلام میں یہی ایک شعر تین چار تذکروں میں درج پایا جاتا ہے -" (ص ۷)

منولال صفا کے ذکر میں لکھا ہے :

"بعض اصحابِ تذکرہ نے آپ کو مصحفی کا شاگرد لکھا ہے -" (ص ۶۳)

جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے ، بعض تراجم میں ماخذ کی واضح طور پر نشان دہی کر دی گئی ہے - عوض کے بارے میں لکھا ہے :

''سید محمد حسین باشندۂ دہلی - صاحبِ تذکرۂ ''سراپا سخن'' نے آپ کی ایک شعر پرچہ ''صادق الاخبار'' سے نقل کی تھی - اس سے راقم نے شعر انتخاب کیا -'' (ص ۱۱۲)

شعرا کے تذکروں اور مطبوعہ دواوین کے علاوہ بعض کے قلمی دیوان بھی گوکل پرشاد رسا کی نظر سے گزرے تھے - میر سوز کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

''پہلے آپ کا تخلص میر تھا - جب میر تقی لکھنؤ پہنچے ، انھوں نے سوز اختیار کیا - اسی برس کے ہو کر بمقام تلہر رحلت کی - آپ کے کلام میں ایک طرح کا سوز پایا جاتا ہے - راقم نے دیوان قلمی دیکھا ہے -'' (ص ۴۹)

اسی طرح ''طرح'' کے ترجمے میں ہے کہ :

''دیوان قلمی مؤلفِ تذکرہ کی نظر سے گزرا -'' (ص ۶۸)

منشی بالمکند بے بصر ولد منشی کانجی مل کے ترجمے میں ہے :

''آپ کی مثنوی ''لختِ جگر'' دیکھنے میں آئی - اس میں منشی صاحب نے اصلاحِ سخن حاصل کرنا غالب دہلوی سے تحریر فرمایا ہے -''

(ص ۱۳)

سراپا سخن اور ارمغان کے بعض تراجم کو ایک ساتھ دیکھنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ گوکل پرشاد رسا نے محسن کے تذکرے سے بطور خاص فائدہ اٹھایا ہے - وجہ یہ تھی کہ محسن کے تذکرے کی نہج ''ارمغان'' سے ملتی جاتی تھی - لیکن ارمغان اور سراپا سخن میں بعض تراجم کی ہم رنگی اور یکسانی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ گوکل پرشاد رسا کا تذکرہ محسن کے تذکرے سے کمتر درجے کا ہے یا انھوں نے صرف سراپا سخن کو سامنے رکھ کر اپنا تذکرہ مرتّب کر لیا ہے - ایسا نہیں ہے ، رسا نے سراپا سخن کو اپنا ماخذ بنایا ہے ، لیکن جیسا کہ اوپر وضاحت کی جا چکی ہے ، اس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد ماخذوں کو سامنے رکھا ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کا تذکرہ شعرا کی تعداد ، ان کے تراجم ، تراجم کی تفصیل و استناد ، اشعار کے انتخاب ، انتخاب و تراجم کی ترتیب اور

موضوعات کے تنوع میں ہر لحاظ سے سراپا سخن سے برتر ہو گیا ہے - سراپا سخن اس کے سامنے بہت کمتر درجے کا تذکرہ معلوم ہوتا ہے -

بظاہر ''سراپا سخن'' رسا کے تذکرے کے مقابلے میں بہت ضخیم ہے - سراپا سخن مطبوعہ نول کشور میں بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات ہیں اور اس کے حاشیے بھی متن کے لیے استعمال کیے گئے ہیں - اس کے برعکس ''ارمغان'' بہ شمول حصہ اول و دوم صرف تین سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے - اس کا مسطر اور سائز بھی چھوٹا ہے ، پھر بھی ارمغان میں مذکور شعرا کی تعداد ''سراپا سخن'' سے بہت زیادہ ہے - سراپا سخن میں کل سات سو اکتیس شاعروں کا ذکر آیا ہے لیکن ارمغان میں گیارہ سو دو شعرا کے تراجم شامل ہیں ، یعنی اس میں تین سو اکہتر ترجمے زائد ہیں - خ اور د کی ردیفوں میں تعداد یکساں ہے ، باقی ساری ردیفوں میں ''ارمغان'' میں شعرا کی تعداد سراپا سخن کے مقابلے میں زیادہ ہے - سب سے زیادہ فرق الف اور میم کی ردیف میں ہے - ذیل کے خاکے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر ردیف میں رسا نے کتنے شعرا کے تراجم کا اضافہ کیا ہے :

نام ردیف	شعرائے 'سراپا سخن'	شعرائے 'ارمغان'	فرق
الف	۸۹	۱۲۸	۳۹
ب	۲۲	۴۰	۱۸
پ	۱	۳	۲
ت	۳۰	۳۳	۳
ث	۳	۸	۵
ج	۲۲	۳۵	۱۳
چ	۱	۲	۱
ح	۳۶	۴۸	۱۲
خ	۱۶	۱۶	—
د	۱۲	۱۲	—
ذ	۶	۱۳	۷
ر	۳۹	۴۳	۴
ز	۶	۹	۳

س	۴۱	۶۱	۲۰
ش	۴۹	۷۴	۲۵
ص	۱۸	۴۰	۲۲
ض	۱۰	۱۸	۸
ط	۱۰	۱۷	۷
ظ	۶	۹	۳
ع	۴۱	۷۰	۲۹
غ	۹	۱۳	۴
ف	۳۰	۵۳	۲۳
ق	۲۷	۴۴	۱۷
ک	۱۰	۲۱	۱۱
گ	۹	۱۶	۷
ل	۲	۵	۳
م	۸۷	۱۴۱	۵۴
ن	۶۲	۷۳	۱۱
و	۲۱	۳۱	۱۰
ہ	۸	۱۵	۷
ی	۸	۱۱	۳
الف تا ی	۷۳۱	۱۱۰۲	۳۷۱

شعرا کی تعداد سے قطع نظر شعرا کی نمائندگی کے لحاظ سے بھی محسن کا تذکرہ ، ارمغان کے مقابلے میں کمتر درجے کی چیز ہے - سراپا سخن میں صف اول کے متعدد شعرا نظر انداز ہو گئے ہیں لیکن رسا کے ہاں نظر آتے ہیں - بطور مثال صرف ردیف الف کے شاعروں کو لے لیجیے - محسن نے میر ببر علی انیس ، نواب صدر الدین خاں آزردہ اور انشاء اللہ خاں انشا کا ذکر نہیں کیا لیکن ارمغان میں ان کے تراجم و منتخبات موجود ہیں - یہی کیفیت دوسری ردیفوں کی ہے - علاوہ ازیں ''ارمغان'' کے نثری ترجمے بھی سراپا سخن کے مقابلے میں زیادہ

تفصیلی ہیں مثلاً ردیف الف کے چند تراجم ساتھ ساتھ دیکھیے :

سراپا سخن

۱- آباد ، مہدی حسین خاں ولد غلام جعفر خاں - عزیزوں میں تجمل حسین خاں کے - باشندۂ لکھنؤ ، ہر بحر میں غزل کی ان کا ایک دیوان ہے - شاگرد شیخ امام بخش ناسخ کے -

۲- آتش ، سخنور عالی فکر خواجہ حیدر علی مرحوم خلف خواجہ علی بخش باشندۂ لکھنؤ - دو دیوان ان سے یادگار ہیں - شاگرد رشید غلام ہمدانی مصحفی -

۳- امانت ، سید آغا حسن موسوی مرحوم خلف میر آغا رضوی باشندۂ لکھنؤ ، صاحبِ دیوان - شاگرد رشید میاں دلگیر مرثیہ گو اور دلگیر شاگرد ناسخ -

ارمغان گوکل پرشاد

۱- آباد ، مہدی حسین خاں ولد غلام جعفر خاں لکھنوی ، حضرت ناسخ کے شاگرد ہیں - آپ کا واسوخت اور دیوان جس میں ناسخ و آتش کی غزلیات ہم وزن و ہم ردیف و ہم قافیہ تھیں طبع و مشتہر ہو چکا ہے - ۱۲۲۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی تھی - (ص ۵)

۲- آتش ، خواجہ حیدر علی خلف خواجہ علی بخش مرحوم لکھنوی ، حضرت ناسخ کے ہمعصر تھے - یہ دونوں صاحب مسلم الثبوت استاد گزرے - آپ کی وفات ۱۲۶۳ھ میں واقع ہوئی - آپ مصحفی کے شاگرد تھے ، زبان زد عام ہے - آپ کا اور حضرت ناسخ کا باہم لطف کلام رہا کرتا تھا - کلیات آپ کی مشہور و مطبوع ہے - (ص ۷)

۳- امانت ، سید آغا حسن ولد میر آغا رضوی لکھنوی ، غضب کی طبیعت تھی - کچھ روزوں میاں دلگیر مرثیہ گو سے اصلاح سخن لی تھی پھر وہ مشق بڑھی کہ قبول خدا داد نے اوستاد بنا دیا - واسوخت میں ایسا زور دکھلایا کہ اصفہانی

لوہا مان گئے - رعایت صوری و معنوی کے بادشاہ تھے - اندر سبھا اور گلدستۂ امانت اور واسوخت و دیوان وغیرہ اکثر کتابوں نے ان کی تصانیف سے قبولیت عام حاصل کی - ۱۲۷۵ھ میں دنیاے دوں سے عالم بقا کی راہ لی - (ص ۶)

۴- اثر محمد میر مغفور برادر خورد خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ -

۴- اثر سید محمد میر برادر خورد خواجہ میر درد کے ہیں - آپ کے کلام میں ایک طرح کا درد پیدا ہے - خاص کر مثنوی نے تو بہت کچھ قبول عام پایا - مدت ہوئی کہ جہانِ گزراں سے رحلت فرمائی - (ص ۱۲)

۵- انسخ ، سید ابو تراب عرف منجھو صاحب خلف سید اکرام علی - باشندۂ لکھنؤ شاگرد میر کلّو عرش -

۵- انسخ ، سید ابو تراب عرف منجھو صاحب مخاطب بہ سپہر الدولہ ولد سید اکرام علی لکھنوی - شاگرد میر کلو عرش - بادشاہ اودھ کے ہم رکاب کلکتے میں پہنچے - (ص ۱۶)

۶- اسیر ، مصاحب حضرت سلطان عالم تدبیر الدولہ دبیر الملک منشی مظفر علی خان بہادر خلف میر مدد علی - اولاد میں حضرت عباس علیہ السلام کی ، باشندۂ امیٹھی مقیم لکھنؤ ، ایک دیوان فارسی ، دو دیوان ریختہ اور عشق نامہ ان سے

۶- اسیر ، تدبیر الدولہ سید مظفر علی خان بہادر خلف میر مدد علی - غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہیں - قصبہ امیٹھی (من مقامات اودھ) کے قدیم رہنے والے ہیں اور فی الحال وطن لکھنؤ میں پسند فرمایا - اس وقت سرکار رام پور

یادگار ہیں ۔ شاگرد رشید غلام ہمدانی مصحفی ۔ | میں تعلق رکھتے ہیں ۔ آپ کا دیوان طبع ہو چکا ہے ۔ (ص ٦)

ان تراجم سے پتا چلتا ہے کہ رسا نے محسن کے تذکرے کو ایک ماخذ کے طور پر استعمال تو کیا ہے لیکن ان کا رجحان محض تقلیدی نہیں ہے ۔ انھوں نے شعرا کی تعداد اور ان کے تراجم دونوں میں اپنے دلخواہ اضافے کیے ہیں ۔ ان اضافوں کے نتیجے میں ارمغان کے تراجم ، سراپا سخن کے تراجم کے مقابلے میں زیادہ معلومات افزا اور سوانحی اعتبار سے زیادہ وقیع ہو گئے ہیں ۔ مختصر سے مختصر تراجم میں بھی گوکل پرشاد رسا نے ولدیت ، سکونت اور شاگردی وغیرہ کی نشان دہی اکثر جگہ کر دی ہے ۔ سنین وفات کے اندراج کا اہتمام پرانے تذکروں میں بہت ہی کم ملتا ہے ۔ "سراپا سخن" میں تو سرے سے اس طرف توجہ ہی نہیں کی گئی ، لیکن "ارمغان" کے مؤلف نے اس اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ۔ چنانچہ ان کے یہاں مندرجہ ذیل شعرا کے سلسلے میں سنین وفات کے اندراجات اس طور پر ملتے ہیں :

١- آزردہ : صدر الدین : ١٢٧٩ھ[1] میں انتقال فرمایا ہے ۔ (ص ٥)

٢- آتش : خواجہ حیدر علی : آپ کی وفات ١٢٦٣ھ میں واقع ہوئی ۔ (ص ٧)

٣- آزاد : کپتان الگزنڈر ہیڈرلے : ١٨٦١ع میں رحلت کی ۔ (ص ١٠)

٤- آصف : آصف الدولہ : ١٢١٢ھ میں گلستان جناں کی سیر کو عزیمت فرمائی ۔ (ص ١٠)

٥- اصغر : نواب اصغر علی : ١٨٧٦ع میں جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی مسافرت کی ۔ (ص ١٧)

٦- جرأت : قلندر بخش : ١٢٢٥ھ میں دار ناپائدار سے رحلت کی ۔ (ص ٢٨)

٧- حسن : غلام حسن : آپ نے ١٢٠١ھ میں وفات پائی ۔ (ص ٣١)

١- ١٢٧٩ھ صحیح نہیں ہے ۔ آزردہ کا انتقال ١٢٨٥ھ میں ہوا ہے ۔ (ف ف)

۸- دولہ : نواب دولہ جہانگیر محمد خاں : بست و ہشتم ماہ ذی قعدہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال فرمایا - (ص ۳۹)

۹- ذوق : شیخ محمد ابراہیم : ۱۲۷۱ھ میں بزم آرائے مشاعرۂ عالم قدس ہوئے - (ص ۳۹)

۱۰- رنگین : سعادت یار خاں : ۱۲۵۱ھ ماہ جمادی الثانی میں انتقال فرمایا - (ص ۴۱)

۱۱- سودا : مرزا محمد رفیع : ۱۱۹۵ھ میں انتقال فرمایا - (ص ۴۷)

۱۲- سلطان : راجہ طالب علی خاں : ۱۲۷۲ھ میں انتقال فرمایا - (ص ۴۷)

۱۳- شہیدی : کرامت علی : چوتھی ماہ صفر ۱۲۵۶ھ میں وفات پائی - (ص ۵۳)

۱۴- صبا : میر وزیر علی : ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گرے اور فردوس بریں کو سدھارے - (ص ۶۳)

۱۵- ضیغم : حافظ اکرام احمد : ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا - (ص ۶۵)

۱۶- ظاہر : حکیم میر مہدی : مؤلف تذکرہ ''نغمۂ عندلیب'' کے والد ماجد ہیں ۱۲۵۹ھ میں رحلت کی - (ص ۶۹)

۱۷- عارف : نواب زین العابدین : ۱۲۶۸ھ میں انتقال فرمایا - (ص ۷۰)

۱۸- غالب : مکرم الدولہ بہادر جنگ : ۱۲۸۰ھ[۱] میں رحلت کی - (ص ۷۶)

۱۹- فقیر : شمس الدین : ۱۱۷۰ھ میں نقد روح امانت دہندۂ حقیقی کو نذر کیا - (ص ۷۹)

۲۰- قبول : مرزا مہدی علی خاں : ۱۲۷۶ھ میں لکھنؤ پہنچ کر وفات پائی - (ص ۸۲)

۲۱- کوثر : آغا غلام علی : شاگرد حافظ ضیغم - ۱۲۸۹ھ میں انتقال فرمایا - (ص ۸۵)

۱- ۱۲۸۰ھ کی جگہ ۱۲۰۸ھ ہونا چاہیے -

۲۲- موج : خدا بخش اکبر آبادی : ۱۲۴۵ھ میں بعارضہ ہیضہ مقام لکھنؤ کو وداع کیا - (ص ۹۵)

۲۳- ناسخ : امام بخش : ۱۲۵۴ھ میں انتقال فرمایا - (ص ۱۰۱)

۲۴- قادر : کاب حسین خاں : ۱۸۷۸ھ میں رحلت فرمائی - (ص ۱۰۲)

۲۵- نسیم : اصغر علی خاں : ۱۲۸۲ھ میں وفات پائی - (ص ۱۰۳)

۲۶- ہدایت : ہدایت اللہ خاں : ۱۲۱۵ھ میں رحلت فرمائی - (ص ۱۱۱)

سال ولادت کا ذکر صرف مہدی حسین آباد کے ذکر میں اس طور پر آیا ہے - ''۱۲۲۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی -'' (ص ۶)

''سراپا سخن'' میں مہدی حسین آباد کا ذکر آیا ہے لیکن سال ولادت کا تذکرہ نہیں ہے - سنہ وفات پورے تذکرے میں صرف ایک جگہ درج کیا گیا ہے -

ارمغان کی ترتیب و تسوید بھی سراپا سخن سے بہتر ہے - سراپا سخن کی بے جا طوالت و ضخامت کا ایک سبب یہ ہے کہ محسن نے ایک ایک شاعر کا ترجمہ مختلف عنوانات کے تحت کئی کئی بار لکھا ہے - یعنی اگر کسی شاعر کا کلام بیس عنوانوں کے تحت منتخب ہوا ہے تو اس کا ترجمہ بیس مرتبہ ہر عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے - یہ بھی نہیں کہ اس تکرار سے کسی جگہ کوئی معنوی اضافہ یا لفظی تغیر رونما ہوا ہو - ایک ہی عبارت بار بار دہرائی گئی ہے - مثال کے طور پر مہدی حسین خاں آباد کو لے لیجیے ، ان کے اشعار سراپا سخن میں زلف و گیسو ، جبیں ، آنکھ ، پلکیں ، عارض ، دہن ، دوش ، ہاتھ ، کلائی ، دل ، روح ، پشت ، ذقن ، پہلو ، کمر اور پا کے عنوان کے تحت سولہ جگہ منتخب کیے گئے ہیں - سب سے پہلے زلف و گیسو کے سلسلے میں ان کا ترجمہ اس طور پر آیا ہے :

''آباد مہدی حسین خاں ولد غلام جعفر خاں ، عزیزوں میں تجمل حسین خاں کے ، باشندۂ لکھنؤ - ہر بحر میں غزل کی ان کا ایک دیوان ہے -

شاگرد امام بخش ناسخ ۔"[۱]

یہ ترجمہ تذکرے میں سولہ جگہ نقل کیا گیا ہے ۔ یہی صورت دوسرے شعرا کے تراجم کی ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ "تذکرۂ سراپا سخن" بے سبب ضخیم و طویل ہو گیا ہے ۔ پھر یہ بھی نہیں کہ شعرا کے تراجم ، ہر جگہ بلحاظ حروف تہجی ردیف وار درج کیے گئے ہوں ۔ کسی عنوان کے تحت آباد کا ترجمہ پہلے ہی آ گیا ہے ، کسی میں درمیان میں اور کسی میں آخر میں ۔ نتیجۃً "سراپا سخن" کے سلسلے میں یہ پتا لگانا کہ اس میں کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے ، کتنی بار آیا ہے ، مشکل ہو جاتا ہے ۔ ارمغان گوکل پرشاد میں یہ خرابی نہیں ہے ، بلکہ شعرا کے تراجم خاصے قرینے سے ان کے تخلص کی رعایت سے ردیف وار صرف ایک بار درج کیے گئے ہیں ۔

ارمغان گوکل پرشاد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں انتخاب کلام کے تحت پوری پوری غزلوں کے بجائے منتخب اشعار دیے گئے ہیں اور ان اشعار کے انتخاب میں قدما سے لے کر معاصر شعرا تک سب کے کلام پر نظر ڈالی گئی ہے ۔ ان کے یہاں کسی خاص عنوان کے تحت جو اشعار ملتے ہیں وہ فی الواقع اس موضوع پر اُردو شاعری کی نمایندگی کرتے ہیں ۔ بطور مثال "ابرو" کے عنوان کو لے لیجیے ۔ اس کے تحت مؤلف نے اڑتالیس شاعروں کے کلام سے انتخاب دیا ہے ۔ اس انتخاب میں بعض کم مشہور اور غیر معروف شاعروں کے منتخبات بھی شامل ہیں ۔ ساتھ ہی آتش ، آبرو ، امانت ، اسیر ، اثر ، برق ، ذکی ، تسلی ، تسلیم ، تعشق ، حسن ، دبیر ، ذوق ، سودا ، شہیدی ، وزیر اور رند جیسے اساتذۂ فن کے تراجم و اشعار بھی نظر آتے ہیں ۔ محسن نے "ابرو" کے عنوان میں ان بزرگ شعرا میں سے کسی کا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ ان کے تذکرے میں اڑتالیس کے بجائے صرف بیس شاعروں کے اشعار درج ہیں ۔ وہ بھی زیادہ تر صف اول کے نہیں دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یہی حال دوسرے عنوانات کا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر عنوان کے تحت محسن کو جن شعرا کی غزلیں بہ آسانی مل گئی ہیں انھی کو اپنے تذکرے میں جگہ دے دی ہے ۔

۱۔ سراپا سخن ، ص ۴۴ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۵ء ۔

سراپا سخن کے دیباچے میں انھوں نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ اپنے تذکرے کی ترتیب و تالیف میں انھوں نے دس سال صرف کیے ہیں اور سیکڑوں کلیات و دواوین کی چھان بین کے بعد تذکرہ مکمل کیا ہے ، لیکن ارمغان سے مقابلہ کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے ۔ ان کا تذکرہ نہ تو شعرا کی صحیح نمایندگی کرتا ہے اور نہ کسی موضوع پر انتخاب کلام کی ، بلکہ ایک طرح سہل انگاری اور تذکرے کو خواہ مخواہ طول دینے کی کوشش ضرور نمایاں ہے ۔ اس لیے محسن نے اپنے دیباچے میں سراپا سخن کی جامعیت کے سلسلے میں جو دعویٰ کیا ہے اسے محض مبالغہ اور تعلّی خیال کرنا چاہیے ۔ ہاں گوکل پرشاد رسا نے البتہ ہر لحاظ سے اپنے تذکرے کو جامع بنانے کی کوشش کی ہے ۔ اس کوشش کے نتیجے میں ان کا تذکرہ شعرا کی نمایندگی کے ساتھ ساتھ ہر موضوع پر کلام کی نمایندگی کا حق بھی ادا کر دیتا ہے ۔ اس کے برعکس محسن نے سراپا سخن میں انتخاب کلام کے سلسلے میں یہ کیا ہے کہ ہر شاعر کی پوری پوری غزلیں درج کر دی ہیں ۔ مثلاً زلف اور ابرو کے عنوانات کو لے لیجیے ، محسن نے ابرو کے تحت دس شاعروں اور زلف کے تحت پچاس کے قریب شاعروں کی پوری پوری غزلیں نقل کر دی ہیں ۔ ان میں بعض شاعروں کی دو دو تین تین غزلیں بھی شامل ہیں ۔ انتخاب کلام کے اس طریقۂ کار نے مختلف عنوانات پر بے کیف و بے جان غزلوں کا ایک طومار لگا دیا ہے ۔ اس طومار کو سمجھنے کے لیے "دل" ، "آنکھ" اور "ہاتھ" کے عنوانات کو لے لیجیے ۔ پہلے اور دوسرے عنوانوں کے اشعار ساٹھ ساٹھ صفحوں میں اور تیسرے عنوان کے کچھ کم پچاس صفحوں پر مشتمل ہیں ۔[۱] ہر صفحے پر مع حاشیہ اوسطاً چار غزلیں درج ہیں ۔ گویا پہلے عنوانوں میں سے ہر ایک کے لیے دو سو پچاس کے قریب مکمل غزلیں اور آخری عنوان کے لیے دو سو سے کچھ کم پوری پوری غزلیں نقل کی گئی ہیں ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ تذکرے کی طوالت و ضخامت بڑھانے میں نثری تراجم کی تکرار نے جو کسر چھوڑی تھی وہ بے ہنگم انتخاب نے پوری کر دی ۔ ارمغان گوکل پرشاد "انتخاب کلام" کے اس عیب سے پاک ہے ۔

۱۔ ملاحظہ ہو سراپا سخن ، ص ۲۴۷ و ص ۵۴ اور ص ۱۷۴ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ع ۔

انتخاب اشعار کی جامعیت اور شعرا کی زیادہ سے زیادہ نمایندگی سے قطع نظر موضوعات کی تعداد بھی ''ارمغان'' میں سراپا سخن کے مقابلے میں تقریباً دو چند ہے - محسن نے اپنے تذکرے میں کل اکیاون موضوعات یعنی سر ، دماغ ، بال ، زلف ، گیسو ، کاکل ، جبیں ، ابرو ، آنکھیں ، پلکیں ، ناک ، عارض ، لب ، دنداں ، زباں ، دہن ، ذقن ، کان ، کان کی لو ، منہ ، گلا ، گردن ، دوش ، ہاتھ ، بازو ، کہنیاں ، کلائی ، پہونچا ، ہتھیلیاں ، انگلیاں ، گھائیاں ، پوریں ، ناخن ، سینہ ، چھاتیاں ، بغل ، پہلو ، دل ، روح ، پیٹ ، ناف ، پشت ، کمر ، کولھے ، سرین ، رانیں ، زانو ، ساق ، پاؤں ، ایڑیاں اور تلوے کو جگہ دی ہے - ارمغان کے موضوعات میں یہ سارے موضوعات شامل ہیں - لیکن کم و بیش اتنے ہی موضوعات رسا نے اپنی طرف سے اضافہ کیے ہیں - محسن نے صرف سراپا کا ذکر کیا ہے ، رسا نے محبوب کے سراپا کے ساتھ ساتھ اُس کے سارے اعضاے جسمانی کی دل ربا حرکات و سکنات ، ان کی صفات اور اُن کی آرائش و زیبائش کے بعض ملبوسات و زیورات کو بھی شامل کر لیا ہے - رسا نے ہر موضوع کے لیے خاصے طویل فقرات لکھے ہیں - ان فقروں کی ترکیب میں موضوع کی رعایت سے تشبیہ و استعارہ اور بعض دوسری صنائع لفظی سے بھی کام لیا گیا ہے - بطور مثال چند موضوعات کے عنوانات دیکھیے :

خال : ''سویداے دل یعنی اخل [نخل ؟] چشم و ابرو مژہ معشوقانِ سنگدل -''

بینی : ''خود بینی خامہٗ جادو نگار در صفت بینی معشوق شیریں ادا ستم شعار -''

گوش : ''شمع افروزی مضامین بلاغت نیوش یعنی صفت گوش -''

رُو : ''چہرہ آرائی شاہد مضامینِ نازک خیال یعنی مدح روے شاہد خوش جمال -''

رخسار : ''نغمہ سراے عندلیب خامہٗ اعجاز رقم بہوائے وصف گلزار سراپا بہار رخسار لالہ خدانِ یوسف قدم -''

چیچک : ''چمن پیراے صحیفہ بیان از بوقلمونی گلہاے مضامین داغ چیچک رخسار گل رخان -''

زبان : ''ندرت بیانی زبان کلک گوہر فشان یعنی صفتِ زبانِ معشوقِ جادو بیان ۔''

نگاہ : ''جادو خیالیِ سخنوران جادو خیال در مدحِ نگاہِ محبوبِ یوسف جمال ۔''

ابرو : ''جوہر نمائی شمشیرِ قلم در مدح ابروے معشوقۂ سراپا ناز و نعم ۔''

کاکل : ''مشک فرسائی خامۂ عنبریں رقم در وصف کاکل زیبا نسبت رعنا با ناز و نعم ۔''

انگشت : ''گرہ کشائی بند ہائے مضامین سخن در مدح انگشت معشوق شیرین سخن ۔''

فقرات کی یہ صورت ہر موضوع کے عنوان میں نظر آتی ہے ۔ صرف ابتدائی موضوع جسے ''حمد'' کا نام دینا چاہیے ، بغیر کسی عنوان کے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے شروع ہو جاتا ہے ۔ آخری موضوع محبوب کی شرم و حیا سے متعلق ہے اور اس کا عنوان ہے :

''شرمگینی عرایس مضامین پیش فکر رسا یعنی صفتِ شرم و حیا شاہدانِ جادو تمثال با ناز و ادا ۔''

''ارمغان'' کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فتح پور ہسوہ اور اس کے قرب کے اضلاع کے بہت سے ایسے شاعروں کا ذکر اور نمونۂ کلام مل جاتا ہے جن کا کسی اور تذکرے میں ذکر نہیں آیا ۔ یہی بات ہندو شعرا کے سلسلے میں کہنی چاہیے ۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے اُردو کے ہندو شعرا کو نظر انداز کیا ہے ۔ ''سراپا سخن'' اور ''سخن شعرا'' میں بھی جن سے رسا نے اکثر جگہ فائدہ اٹھایا ہے ، گنے چنے ہندو شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ لیکن ارمغان میں ان کی تعداد خاصی ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہندو ہونے کے سبب تذکرہ نگار نے اس طرف بطور خاص توجہ کی ہے ۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن ادبی تاریخ کے لیے ارمغان کا یہ پہلو اہمیت اور افادیت سے خالی نہیں ہے ۔ اس کے ذریعے بہت سے ایسے ہندو شعرا پہلی بار سامنے آتے ہیں جو کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں ہوئے ۔ ان ہندو شعرا میں زیادہ تر مؤلف ہی کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ، یعنی ذات کے کائستھ ہیں ۔ ہندو شعرا کی کل تعداد اس تذکرے میں کتنی ہے ؟ اس کا جواب پورے تذکرے پر نظر ڈالنے سے مل سکتا ہے ۔ ہم نے اس خیال سے

آغاز ، وسط اور آخر کے چند اوراق پر اس نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی تو اندازہ ہوا کہ الف کی ردیف میں سات ، میم کی ردیف میں اکیس ، نون کی ردیف میں دس ، ہائے ہوز کی ردیف میں تین اور ی کی ردیف میں دو شاعر ہندو ہیں - غرض کہ ہر ردیف میں ہندو شعرا موجود ہیں - اس کے بر عکس سراپا سخن میں ان کی تعداد بہت کم ہے - مثلاً الف کی ردیف میں کسی ہندو شاعر کا تذکرہ نہیں ہے - م کی ردیف میں سات اور نون کی ردیف میں تین شاعروں کے نام آئے ہیں - ہ اور ی کی ردیفیں ہندو شعرا کے ناموں سے یکسر خالی ہیں - کم و بیش یہی صورت دوسری ردیفوں کی ہے -

☆ ☆ ☆

طورِ کلیم

''طور کلیم'' کے مؤلف سید نورالحسن خاں متخلص بہ نور و کلیم ہیں - ان کے والد نواب صدیق حسن خاں نواب نے اپنی تالیف ''شمع انجمن'' مؤلفہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ع میں اپنے حالات کے ساتھ ''سید نورالحسن خاں کلیم'' کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا تاریخی نام نظیر حسن اور تخلص نور ہے - خود سید نورالحسن نے بھی اپنے فارسی تذکرہ ''نگارستان سخن'' مؤلفہ ۱۲۹۳ھ میں اپنا ذکر نور تخلص کے تحت کیا ہے اور اپنا سال پیدائش ۱۲۷۸ھ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ریختہ میں کلیم اور فارسی میں نور تخلص کرتے ہیں - ''روزِ روشن'' مؤلفہ ۱۲۹۵ھ میں مظفر حسین صبا نے نورالحسن خاں کا ذکر ''کلیم'' تخلص کے تحت کیا ہے - سید علی حسن خاں نے ''صبح گلشن'' مؤلفہ ۱۲۹۴ھ اور ''بزم سخن'' مؤلفہ ۱۲۹۷ھ میں بھی نورالحسن خاں کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے - ہم نے ''بزم سخن'' کے ضمن میں ان کے والد کے مختصر حالات درج کر دیے ہیں - اس لیے یہاں ان کا دہرانا بے سود ہے - خود مؤلف نے بھی ''طور کلیم'' میں اپنے حالات پر روشنی ڈالی ہے اور خود کو حافظ خان محمد خاں شہیر خلف مولوی غلام محمد خاں کا شاگرد بتایا ہے - یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ شہیر کو ریاست کی طرف سے ''افتخار الشعرا'' کا خطاب ملا ہوا تھا اور وہ غالب کے شاگرد تھے[1] مؤلف نے اپنے والد نواب صدیق حسن خاں کو بھی شاعر کی حیثیت سے اس تذکرے میں جگہ دی ہے اور اُردو کے چھ اشعار بطور نمونہ دیے ہیں -[2]

''طور کلیم'' کا سالِ تصنیف ۱۲۹۷ھ ہے - اس سن میں سید علی حسن خاں

۱- تذکرۂ طور کلیم ، ص ۵۹ ، مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۲۹۸ھ -

۲- تذکرۂ طور کلیم ، ص ۱۱۷ ، مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۲۹۸ھ -

نے اپنا تذکرہ "بزم سخن" تیار کیا ہے، گویا دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ تذکرہ لکھنا شروع کیا اور تھوڑے عرصے میں ایک ساتھ ختم کر لیا۔ "طور کلیم" بھی "بزم سخن" ہی کے ساتھ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ع میں احمد علی خاں صوفی کے زیر اہتمام مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا ہے۔ اس کے نسخے کمیاب ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانہ خاص اور لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں ایک ایک مطبوعہ نسخہ البتہ موجود ہے اور یہی ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے نسخے میں "فروغ دوم" یعنی ہندی شعرا کا تذکرہ نہیں ہے۔ لیاقت نیشنل لائبریری کے نسخے میں دونوں ہیں۔ ہندی شعرا کے ذکر میں یہ خصوصیت برتی گئی ہے کہ مشکل الفاظ کی فرہنگ اور اشعار کی تشریح بھی دے دی گئی ہے۔[۱] ستمبر ۱۹۶۸ع میں عطا کاکوی نے مختصر تعارف کے ساتھ "بزم سخن" اور "طور کلیم" دونوں کا اُردو ترجمہ تلخیص کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔[۲] انجمن کے مطبوعہ نسخے میں کل ۱۲۸ صفحات، لیاقت نیشنل لائبریری کے نسخے میں ۲۵۶ صفحات ہیں۔ ابتدا میں ایک صفحے کا مختصر سا دیباچہ ہے۔ آخر میں داغ دہلوی اور دوسرے شعرا کے جو قطعات تاریخ درج ہیں ان سے بھی اس کا سال تصنیف ۱۲۹۷ھ نکلتا ہے۔ پہلی اشاعت کے سرورق پر نام کے ساتھ ہی جلی حروف میں سالِ طباعت ۱۲۹۸ھ لکھا ہوا ہے۔

"بزم سخن" کی طرح یہ تذکرہ بھی بلحاظ سوانح اور انتخاب کلام بہت سرسری ہے۔ تذکرے کی زبان فارسی ہے اور اس میں دو سو گیارہ شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ مطبوعہ تذکرے کے شروع میں مختصر سا دیباچہ ہے۔ اس میں مؤلف نے لکھا ہے کہ:

"بہانا بر دو فروغ آنرا مشتمل کردیم۔ نخستین فروغ نظر افروز نظارگیان است بخاطر فریبی ہائے اشعار ریختہ آرایان فروغ دوم نظارہ سوز ژرف نظران است بدلکشی ہائے افکار نغمہ سرایان ہندی زبان۔"[۳]

۱- نگار، سالنامہ ۶۴، ص ۳۳۰، مرتبہ راقم الحروف۔

۲- تذکرۂ بزم سخن و طور کلیم، مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ، ستمبر ۱۹۶۸ع۔

۳- دیباچہ طور کلیم، ص ۳، مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۲۹۸ھ مخزونہ انجمن ترقی اُردو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف نے "طور کلیم" کے دو حصے کیے ہیں ، فروغ اول اور فروغ دوم - پہلے میں اُردو شعرا کا اور دوسرے میں ہندی شعرا کا تذکرہ ہے - ہندی شعرا کا تذکرہ ہماری بحث سے خارج ہے -

مؤلف نے "فروغ اول" کے تحت اُردو شاعری کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالی ہے - لکھا ہے کہ دکن میں بعض شعرا ولی سے بھی پہلے گزرے ہیں ، لیکن ولی کی زبان میں ایسی پختگی ہے کہ انھیں ریختہ کا موجد کہا جا سکتا ہے - اس کے بعد ولی کے کلام سے متاثر دہلوی شعرا آبرو ، حاتم اور ناجی وغیرہ کی لسانی خدمات کا مختصر ذکر ہے - بعد ازاں شعرا کے تراجم ردیف وار شروع ہو گئے ہیں - شعرا کے حالات مفصل نہ سہی لیکن واقعات اور وفات کے سلسلے میں سنین کے اندراج اور شعرا کی ولدیت و سکونت کی نشاندہی کا اہتمام بزم سخن کی طرح طور کلیم میں بھی ملتا ہے اور تاریخی نقطۂ نظر سے یہی اس تذکرے کی افادیت ہے - ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے متعدد ایسے شعرا سامنے آ جاتے ہیں جو "بزم سخن" میں شامل نہیں -

تذکرہ آتش کے ذکر سے شروع ہو کر انعام اللہ خاں یقین کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے - دونوں ترجمے اشعار محذوف کر کے لکھے جاتے ہیں :

آتش : خواجہ حیدر علی از گرامی قافیہ سنجان لکھنؤ است - مصحفی استاد او رندانہ زیست و آزادانہ بسر برد [در] ۱۲۶۳ھ از کشا کش آخشیجان وارست - دو دیوان دارد ، شعرے چند از تذکرہ ہا برداشتہ آمد خیلے خوش گفتہ است -[1] (۵ شعر)

یقین : انعام اللہ خاں خلف اظہر الدین خاں سرہندی وطن ، دہلی مولد ، از اولاد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ بود و از شاگردانِ میرزا مظہر علیہ الرحمۃ - در عمر بست و پنج سالگی بہ تہمت زنا از دست پدر خویش کشتہ شد -

---

۱- تذکرۂ طور کلیم ، ص ۶ ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی -

دیوانے دارد ، طبع شگفتہ داشت ۔[1] (تین شعر)

ان تراجم کو اگر "بزم سخن" کے تراجم کے ساتھ رکھ کر دیکھیں تو صاف اندازہ ہوگا کہ دونوں تذکرے ایک دوسرے سے مستفید ہوئے ہیں اور مواد کی فراہمی کے سلسلے میں دونوں تذکرہ نگاروں کا ماخذ ایک ہی رہا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ تذکرۂ طور کلیم ، ص ۱۲۸ ، مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

بزمِ سخن

"بزمِ سخن" کے مؤلف سید علی حسن خاں ہیں ۔ ان کے والد نواب صدیق حسن خاں ، ابن سید اولاد حسن متوطن قنوج تھے ۔ بسلسلۂ ملازمت بھوپال پہنچے ۔ وہاں نائب السلطنت مدارالمہام محمد جمال الدین خاں صاحب کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی ۔ ان سے دو لڑکے سید نورالحسن خاں اور سید علی حسن خاں اور ایک لڑکی پیدا ہوئی ۔ کچھ دنوں مدارس کے مہتمم رہے ، اس کے بعد جب نواب شاہجہان بیگم والیۂ ریاست بھوپال نے ان سے عقد ثانی کر لیا تو پہلے نیابت کا منصب ملا ، پھر جلد ہی "نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خان بہادر" کے خطاب سے یاد کیے جانے لگے ۔ نواب صدیق حسن نے خود بھی "شمع انجمن" کے نام سے فارسی شعرا کا ایک، تذکرہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ع میں مرتب کیا ۔ یہ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ع میں بھوپال سے شائع ہو چکا ہے اور بڑے کتب خانوں میں دستیاب ہے ۔ اس میں نواب صدیق حسن نے اپنے حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور اپنا سال پیدائش ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ بتایا ہے ۔ گویا "شمع انجمن" کی تالیف کے وقت ان کی عمر چوالیس سال تھی ۔ اس تذکرے میں نواب صدیق حسن نے اپنے بیٹے سید نورالحسن خاں نور و کلیم کا بھی ذکر کیا ہے ۔ حالانکہ ان کی عمر اس وقت صرف پندرہ سال تھی ۔ نور الحسن خاں کا تاریخی نام نظیر حسن اور سال پیدائش ۱۲۷۸ھ ہے ۔ اس تذکرے کے علاوہ بھی عربی فارسی کی متعدد کتابیں نواب صدیق حسن سے یادگار ہیں ۔ وہ فقہ ، حدیث اور علوم دینی کے زبردست عالم تھے اور تالیف و تصنیف کا فطری ذوق رکھتے تھے ۔

"بزم سخن" کے مؤلف سید علی حسن خاں سلیم ، نواب صدیق حسن کے چھوٹے بیٹے تھے ۔ علی حسن خاں سلیم نے اپنا حال "بزم سخن" میں لکھا ہے ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۲۹۷ھ یعنی "بزم سخن" کی تالیف سے پہلے فارسی کا ایک تذکرہ موسوم بہ "صبح گلشن" لکھ چکے تھے ۔ صبح گلشن مؤلفہ ۱۲۹۴ھ میں

علی حسن خاں نے اپنا سالِ پیدائش ۱۲۸۳ھ بتایا ہے - اس لحاظ سے ان کی عمر فارسی تذکرے کی تالیف کے وقت صرف ۱۱ سال اور زیرِ نظر تذکرۂ "بزم سخن" مؤلفہ ۱۲۹۷ھ کے تکملہ کے وقت پندرہ سال کے قریب رہی ہوگی - اتنی کم عمری میں فارسی اور اُردو کے تذکروں کا مرتب کر لینا حیرت انگیز ہے - گمان غالب ہے کہ ان تذکروں کی تالیف میں علی حسن خاں کے اساتذہ ، خاص طور پر محمد یوسف علی کا ہاتھ ہے - علاوہ ازیں ان کی تالیف میں قاضی محمد صادق خاں اختر کی ضخیم تالیف "آفتاب عالمتاب" سے خاص مدد لی گئی ہے - محمد صادق خاں اختر کا تذکرہ ۱۲۶۹ھ میں تیس سال کی محنت سے تیار ہوا تھا ، اس میں چار ہزار سے زاید شعرا کا ذکر ہے - سید علی حسن خاں سلیم کے حالات صبح گلشن اور بزم سخن کے علاوہ روز روشن مؤلفہ مظفر حسین صبا اور خمخانۂ جاوید میں بھی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں -

"بزم سخن" ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ع میں مکمل ہوا اور تکمیل کے ایک سال بعد ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ع میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہو گیا - اس کے مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں پھر بھی بعض بڑے کتب خانوں اور صاحبان ذوق کے ذاتی ذخیروں میں مل جاتے ہیں - انجمن ترقی اُردو کراچی اور ترقی اُردو بورڈ کراچی میں اس کے نسخے موجود ہیں - مطبوعہ نسخے کے سرورق پر واضح طور پر "بزم سخن" کے اوپر ۱۲۹۸ھ اور نیچے ۱۸۸۱ع لکھا ہوا ہے - یہ نواب شاہجہان بیگم والیۂ ریاست بھوپال کے عہد میں بہ اہتمام احمد خاں صوفی شائع ہوا ہے - اس میں کل ۱۵۶ صفحے ہیں - آخر میں متعدد شعرا کے قطعاتِ تاریخِ تالیف درج ہیں - سب سے پہلے جمیل احمد سہسوانی کا یہ قطعہ ہے :

ہے سزاوار ثنا طبع سلیم نامور
ریختہ میں تذکرہ کیا خوب برجستہ لکھا
بے تکلف میں نے بھی تاریخ میں اس کی جمیل
جانفزا اشعار و دل آویز گلدستہ لکھا

آخری مصرعے سے ۱۲۹۷ھ برآمد ہوتے ہیں - [بزم سخن ، ص ۱۲۴]

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور آباد لکھنوی سے لے کر ہزبر علی ہزبر تک ۴۳۴ شاعروں کا ذکر ردیف وار آیا ہے - ابتدا میں ۱۴ صفحے فہرست شعرا کے

لیے مخصوص ہیں ۔ اس کے بعد ایک اور سرورق ہے اور صفحوں پر نمبر از سر نو ڈالے گئے ہیں ۔ صفحہ ۱۲۲ میں شعرا کے تراجم انعام اللہ خاں یقین کے ذکر پر ختم کیے گئے ہیں اور جلی حروف میں ''تمام شد'' لکھا ہوا ہے ۔ لیکن اس کے نیچے ہی ''عذر از طرف مہتمم مطبع'' کے زیر عنوان میرزا محمد ہزبر علی ہزبر فرزند واجد علی شاہ اختر کا حال اور انتخاب کلام دیا گیا ہے ۔ اس کے بعد نثر موجز میں جمیل احمد سہسوانی کی تقریظ اور قطعۂ تاریخ تالیف ہے ۔ بعد ازاں متعدد شعرا کے قطعات تاریخ اور تقریظیں ملتی ہیں ، اسی میں مؤلف تذکرہ اور برادر بزرگ مؤلف (نور الحسن) کے سہرے بھی شامل ہو گئے ہیں ۔ غرضیکہ یہ عجیب و غریب سلسلہ ۱۲۲ سے ۱۵۲ صفحے تک چلا گیا ہے ۔ سب سے آخر میں مرزا کمال الدین سنجر قزوینی شاگرد لسان الملک مرزا تقی سپہر کا فارسی قصیدہ ہے جس میں مؤلف تذکرہ سید علی حسن سلیم اور ان کے بھائی نور الحسن کلیم اور ان کے والد امیر الملک نواب صدیق حسن کی مدح کی گئی ہے ۔ تشبیب و گریز کے سلسلے کے چند اشعار یہ ہیں :

گفتمش از ترک صاحبزادگانِ کیستند
گفت صاحبزادگانِ حضرت صدر کبار
گفتمش آن صدر افخم کیست بامن باز گو
گفت آن صدرے کہ باشد بدر خلق روزگار
گفتمش از نام آن صدر مکرم باز خوان
گفت نواب امیر الملک میر نامدار
گفتمش بر گوئے صاحبزادگان را نام چیست
گفت یک ناطق کلیم و یک سلیمِ با وقار
گفتمش یعنی کلیم آن صاحبِ طبعِ سلیم
گفت آن کو طورِ دانش گشتہ از وے نور بار
گفتمش آن کو سلیم است و بہ نطق ہمچو کلیم
گفت آرے از کلامش زندہ جانِ ہوشیار
گفتمش این خواستگاری را چہ کس آمد ملیق
گفت یک با ماہ یک با مشتری گردید یار

گفتمش این عیش را اے ترک تاریخی بگوے
گفت لفظ (خواستگاری) را بتاریخ اندر آر
۱۲۹۸ھ

آخری مصرعے کے لفظ "خواستگاری" سے تذکرے کی تاریخ طبع نکالی گئی ہے اور یہ ۱۲۹۸ھ ہے ۔ اس طرح یہ تذکرہ صفحہ ۱۵۶ پر ختم ہو جاتا ہے ۔

تذکرے میں قدما سے لے کر معاصرین تک صرف ۴۳۴ شاعروں کا ذکر آیا ہے ، گویا تذکرے میں صرف منتخب شعرا کو جگہ دی گئی ہے ۔ تنقیدی عنصر تو کہیں نہیں ہے لیکن اس کی سوانحی اہمیت یوں ہو جاتی ہے کہ اختصار نویسی کے باوجود اس میں ہر شاعر کا پورا نام ، ولدیت ، سکونت ، تلمذ اور تاریخ پیدائش و وفات یا بعض دوسرے واقعات کی تاریخیں دینے کا اہتمام ملتا ہے ۔ سلیم تخلص کے تحت اپنا اور نواب کے تحت اپنے والد سید محمد صدیق حسن کا ذکر البتہ دوسروں کے مقابلے میں قدرے تفصیل سے کیا ہے ۔ منتخبات کلام بھی اس تذکرے کے مختصر ہیں ۔ زیادہ تر ایک دو شعر سے لے کر چھ سات اشعار تک بطور نمونہ دیے گئے ہیں ۔ دو چار جگہ یہ تعداد بڑھ گئی ہے لیکن اشعار کے انتخاب میں کسی حد تک خوش ذوقی کا ثبوت دیا گیا ہے ۔ اس جگہ آباد لکھنوی اور انعام اللہ خاں یقین کے ترجمے بطور مثال درج کیے جاتے ہیں :

آباد : مہدی حسن خاں فرزند غلام جعفر خاں لکھنوی بر ناسخ سخن میگزرانید در ۱۲۲۸ھ پیراہن وجود در برکشید دیوانے گزاشتہ ازوست :

کیا عجب شوقِ اسیری میں اگر منقار سے
بلبلیں دامن پکڑ لیں دوڑ کر صیاد کا

دل لگانے میں تو ہے جور اٹھانے کا مزا
لطف کیا ہے کہ جو معشوق ستمگار نہ ہو
لطف جینے کا یہ ہے جان کسی پر نکلے
نہ جیے وہ جسے مرنے سے سروکار نہ ہو

یقین : انعام اللہ خاں خلف اظہر الدین خاں از احفاد مجدد الف ثانی ، سرہندی موطن ، دہلوی مولد ، بر تہمت زنا از دست والد خویش بقتل رسید و ذائقہ

شربتِ شہادت چشید - گفتار پُردرد می گوید از خیالات اوست :

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دوانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر
کرنے تو کی پہ راس نہ آئی وفا ہمیں

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو، یقین ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا، کیا خدا نہ تھا

جیسا کہ ابتدا میں ظاہر کیا گیا ہے - مؤلف نے یہ تذکرہ صرف چودہ پندرہ سال کی عمر میں مرتّب کیا ہے - اس سے پہلے وہ گیارہ سال کی عمر میں فارسی شعرا کا تذکرہ ''صبح گلشن'' مرتّب کر چکے تھے - ظاہر ہے کہ یہ عمر اس قسم کے علمی و ادبی تذکروں کو فارسی زبان میں لکھنے اور مرتّب کرنے کے لیے موزوں نہ تھی - یقیناً اس کی تالیف میں پیش رو شعرا کے تذکروں اور بعض اساتذہ سے رہنمائی حاصل کی گئی ہے - ''صبح گلشن'' میں تو مؤلف نے خود بھی واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی عمر اس کام کے لیے موزوں نہیں ہے لیکن برادر معظم کی پیروی اور استاد کی توجہ سے تذکرہ ترتیب دیا جا رہا ہے - لیکن بزمِ سخن کے دیباچے میں بھی ان کے یہ الفاظ :

''منشا این نازش و منتہائے این افتخار جز این نیست کہ فرمان حضرت والد ماجد عز مجدہم بران آورد کہ تذکرۂ سخن سنجان ریختہ بضبط نگارش در آید اگرچہ بندہ باین جنس گرانمایہ ارزش نداشت اما بہ فحوائے ''الامر فوق الادب'' ہمت بامتثال امر بر گماشت بافضال الٰہی و بہ اقبال قبلہ گاہی در اندک زمان کار بپایان رسید -''[1]

یعنی ''بزم سخن'' کو بھی سید علی حسن خاں نے باپ کے حکم کی تعمیل میں کسی نہ کسی طرح مرتّب کیا ہے ورنہ بذات خود نہ وہ اپنے میں اس کی

١- بزم سخن ، ص ٣ ، مطبوعہ مفید عام آگرہ ١٢٩٨ھ/١٨٨١ع -

اہلیت پاتے تھے اور نہ اس کام کی طرف راغب تھے ۔ اس لیے یہ گمان ہوتا ہے کہ بزم سخن جس سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور اس میں واقعات و حالات کا اندراج جس محنت و واقفیت سے کیا گیا ہے، ممکن ہے اس میں مؤلف سے زیادہ کسی اور کا ہاتھ ہو، لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ تذکرہ بہرحال علی حسن خاں سلیم کے نام سے چھپا ہے اور تا قیامت اب انھی کا رہے گا ۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جہاں اصل کام کسی اور نے کیا ہے لیکن نام کسی اور کا ہوا ہے ۔

☆ ☆ ☆

آبِ حیات

''آب حیات'' کے مصنّف محمد حسین آزاد ہیں ۔ آزاد ۱۸۳۰ع میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۰ع میں وفات پائی ۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی ، اس کے بعد ۱۸۴۵ع میں دلی کالج میں داخلہ لیا ۔ کالج کے ساتھیوں میں مولوی ذکاء اللہ ، ضیاء الدین اور ڈپٹی نذیر احمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا شیخ محمد ابراہیم ذوق سے یارانہ تھا ، اس لیے آزاد کو تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ذوق کی ہمدردیاں لڑکپن ہی سے حاصل تھیں ۔ شعر و سخن کا مشغلہ بھی انھی کے سایۂ عاطفت میں اختیار کیا اور باقاعدہ شاگرد ہو گئے ۔ ذوق کی وفات کے بعد کچھ دنوں انھوں نے حکیم آغا جان عیش سے بھی اصلاح لی ۔

کالج سے نکلنے کے بعد انھوں نے کچھ دنوں ادھر اُدھر کام کیا لیکن ۱۸۵۷ع کے ہنگامے میں جب ان کے والد شہید ہو گئے تو خاندان کا سارا بوجھ ان پر آن پڑا ، چنانچہ وہ کچھ دنوں بعد لاہور چلے گئے ۔ لاہور کا قیام ان کی علمی و ادبی زندگی کے لیے سازگار ثابت ہوا ۔ دراصل لاہور پہنچ کر ہی آزاد کے تخلیقی اور تصنیفی جوہر بروئے کار آئے ہیں ۔ یہیں وہ پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسری کے عہدے پر فائز ہوئے اور سرکاری رسائل ''اتالیق پنجاب'' اور ''پنجاب میگزین'' کے ادارتی عملے میں شریک رہے ۔ یہیں انھیں کرنل ہالرائیڈ اور میجر فلر کی ہمدردیاں حاصل ہوئیں اور یہیں انھیں انگریزی ادبیات و خیالات سے عملاً شناسا ہونے کا موقع ملا ۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے کا بیشتر کام بھی آزاد نے لاہور ہی میں کیا ہے ۔ اس سلسلے میں نصابی کتب کے علاوہ اور متعدد علمی و ادبی کتابیں ان سے یادگار ہیں لیکن ''آبِ حیات'' ، ''سخن دانِ فارس'' ، ''نیرنگ خیال'' اور ''دربار اکبری'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

آزاد کی زندگی اور ادبی کارناموں کے متعلق سیکڑوں مقالات اور درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس لیے ان کے حالات کے بارے میں اس جگہ مزید تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ محمد یحییٰ تنہا نے آزاد کا حال وضاحت سے لکھا ہے۔[۱] مولانا حامد حسن قادری نے آزاد کی زندگی اور فن دونوں پر جامع تبصرہ کیا ہے۔[۲] مولوی ممتاز علی[۳] اور مولوی عبدالحق[۴]، ڈاکٹر شرافت مرزا دہلی یونیورسٹی سے، ڈاکٹر محمد صادق پنجاب یونیورسٹی سے، ڈاکٹر اسلم فرخی کراچی یونیورسٹی سے اور ڈاکٹر عبدالستار بمبئی یونیورسٹی سے، محمد حسین آزاد کی زندگی اور فن پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ غرضیکہ آزاد کے سلسلے میں خاصا کام ہو چکا ہے اور یہ سارا کام عموماً دستیاب ہے۔ اس لیے جو لوگ آزاد کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کاموں کی تفصیل سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں مندرجہ بالا اصحاب کی تحریروں سے رجوع کرنا چاہیے۔

"آبِ حیات" ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ میں مکمل ہوئی اور بقول حافظ شیرانی اسی سال آخری مہینوں میں سید رجب علی شاہ کے زیرِ اہتمام وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہو گئی۔[۵] ۱۸۸۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، بعد ازاں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور ہر جگہ دستیاب ہیں۔ لیکن پہلا مطبوعہ نسخہ کمیاب ہے، صرف بڑے کتب خانوں یا ذاتی ذخیروں میں ملتا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور (رضا لائبریری) میں بھی ہے۔ مولانا عرشی نے اس کی تفصیلات دے دی ہیں۔[۶] رہا آب حیات کے سال آغاز کا سوال، سو اس کے

۱۔ سیر المصنفین، جلد دوم، ص ۱۰۸ تا ۱۸۰، مطبوعہ مکتبۂ جامعۂ ملّیہ دہلی ۱۹۲۸ء، طبع اول۔

۲۔ داستان تاریخ اُردو، ص ۳۸۳ تا ۳۸۴، مطبوعہ لکشمی نرائن اگروال آگرہ ۱۹۵۷ء۔

۳۔ فصیح الملک، ص ۲۷، اپریل ۱۹۱۰ء۔

۴۔ مرحوم دلی کالج، ص ۱۰۹، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۴۵ء، طبع اول۔

۵۔ تنقید بر آبِ حیات، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین، بابت اگست ۱۹۴۱ء۔

۶۔ دیباچہ دستور الفصاحت، ص ۱۰۹، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ء

بارے میں کسی واضح تاریخ یا مہینے کی نشان دہی مشکل ہے ۔ ہاں آزاد کی بعض تحریروں سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ انھوں نے آب حیات کے لیے مواد جمع کرنا ۱۸۸۰ع سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا ۔

آبِ حیات کی اولیں اشاعت میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں کہ اس پر بہت سخت تبصرے ہوئے ۔ خاص طور پر مومن جیسے ممتاز غزل گو شاعر کو پہلے ایڈیشن میں نظرانداز کر دینے اور ذوق کو سارے شاعروں سے افضل و برتر ظاہر کرنے کے نتیجے میں ان پر ہر طرف سے لے دے ہوئی ، آخرکار انھیں 'آبِ حیات' پر نظر ثانی کرنی پڑی ۔ چنانچہ انھوں نے ۱۸۸۳ع میں آبِ حیات کا دوسرا ایڈیشن بہت سے اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع کیا ۔ مومن خاں مومن ، میر ضاحک ، میر مستحسن خلیق ، میر انیس اور دبیر کے ترجمے پہلے ایڈیشن میں نہیں تھے دوسرے میں شامل کیے گئے ۔ سودا ، جرأت ، انشا ، ناسخ اور ذوق وغیرہ کے حالات کہیں از سر نو لکھے گئے ، کہیں ان کی ترتیب بدل دی گئی اور کہیں ان میں اضافہ کیا گیا ۔ منتخبات کلام کی بھی یہی صورت ہے ۔ غرضیکہ دوسرے ایڈیشن کا حلیہ بلحاظ مواد و معنی بہت کچھ بدل گیا ہے ۔ ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔

"آبِ حیات" اردو کی پہلی تصنیف ہے جسے "تذکرۃ الشعرا" کے ساتھ ساتھ ہم اُردو میں ادبی تاریخ ، ادبی سوانح ، ادبی تنقید اور لسانی تحقیق کا اولیں نمونہ کہہ سکتے ہیں ۔ اس میں ایسی تخلیقی شان اور ایسی ادبی رعنائی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کے باوصف آج بھی بڑے چاؤ سے پڑھی جاتی ہے ۔ آزاد نے اس کتاب کی تالیف کے لیے ہر ممکن ذریعے سے مواد فراہم کیا ہے ۔ دوستوں اور عزیزوں سے مراسلت و ملاقات کے علاوہ قدیم تذکروں سے بھی انھوں نے مدد لی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے بعض ماخذوں کا سراغ انھوں نے دیا ہے ، بعض کو چھپا گئے ہیں یا حوالہ دینے کو بھول گئے ہیں ۔ آبِ حیات میں جن تذکروں کے حوالے واضح طور پر ملتے ہیں ان میں "نکات الشعرا" مؤلفہ میر تقی میر ، "تذکرۂ شورش" ، "گلشنِ بے خار" مؤلفہ مصطفیٰ خاں شیفتہ ، "مخزنِ شعرا" مؤلفہ فائق ، "سراپا سخن" مؤلفہ محسن ، "گلزارِ ابراہیم" مؤلفہ خلیل ، "مجموعۂ نغز" مؤلفہ قدرت اللہ قاسم اور غلام ہمدانی مصحفی کے تینوں تذکروں کے نام آتے

ہیں ۔ سعدی دکھنی اور خان آرزو کے سلسلے میں آزاد نے سودا کے تذکرے کا ذکر بھی اس طور پر کیا ہے گویا وہ ان کی نظر سے گزرا تھا ، حالاں کہ اس کا وجود ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ۔

ان تذکروں کے علاوہ ''خزینۃ العلوم'' مؤلفہ درگا پرشاد نادر، ''گلستان سخن'' مرتبہ قادر بخش صابر ، ''طبقات الشعرائے ہند'' مؤلفہ کریم الدین ، ''خوش معرکۂ زیبا'' مؤلفہ سعادت خاں ناصر اور ڈاکٹر اشپرنگر کے ''یادگار شعرا'' سے بھی آزاد نے فائدہ اٹھایا ہے ۔ لیکن اس استفادے کا سراغ آب حیات میں نہیں دیا گیا ۔ جن تذکروں کے نام آزاد نے آبِ حیات میں دیے ہیں ان کے حوالے بھی ہر جگہ نہیں، کہیں کہیں برائے نام دیے گئے ہیں ۔ ورنہ عام طور پر دوسرے تذکروں کے مواد کو بغیر کسی حوالے کے آزاد نے اس انداز سے پیش کیا ہے گویا یہ انہیں کی تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہے ۔ قاضی عبدالودود اور حافظ محمود شیرانی نے آب حیات کے مآخذ کا اپنی بعض تحریروں میں بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آب حیات میں سب سے زیادہ تین چار قدیم تذکروں سے مدد لی گئی ہے ۔ ان تذکروں میں مجموعۂ نغز طبقات الشعرائے ہند ، خوش معرکۂ زیبا اور یادگار شعرا کے نام آتے ہیں مثلاً :

۱- ولی اور ناصر علی کی معاصرانہ چشمک کا حال ۔
۲- شاہ مبارک آبرو کے حالات و اشعار ۔
۳- شرف الدین مضمون کا حال و کلام ۔
۴- آرزو کا کلام اور ان کی بدیہہ گوئی کی تفصیل ۔
۵- سودا کے شعر کو حدیثِ قدسی کہنا ۔
۶- میر و میرزا کے سلسلے میں ایک کو نہر دوسرے کو دریا بتانا ۔
۷- سودا کا لطیفہ قائم علی امیدوار کے ساتھ ۔
۸- بقاء اللہ خاں بقا کے حالات ۔
۹- میر صاحب کی بد دماغی اور تنک مزاجی کا تذکرہ ۔
۱۰- ولی کے متعلق ''شاعربست از شیطان مشہور تر کا حکم لگانا ۔
۱۱- محمد امان نثار کے حالاتِ زندگی ۔
۱۲- جرأت کے ابتدائی حالات اور مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مشاعرے میں غزل پڑھنا ۔

۱۳- میر حسن کے بعض حالات۔
۱۴- ماشاء اللہ خاں مصدر کے پورے حالات۔
۱۵- انشا اور عظیم بیگ کا معرکہ۔

ان کے علاوہ اور کئی باتیں ''مجموعۂ نغز'' سے ماخوذ ہیں[1] اسی طرح :

۱- آب حیات کے مقدمے کے بعض مطالب۔
۲- فضلی کی ''وہ مجلس'' کی تفصیل۔
۳- ملک محمد جائسی کے سلسلے کی تفصیلات۔
۴- سیوا نامی دکنی مصنّف کا ذکر۔
۵- فرخ سیر کے عہد میں نورا نامی ایک مصنّف کے ترجمۂ شکنتلا کا تذکرہ۔
۶- مرزا جان جاناں کے چارپائی پر بیٹھنے کی روایت اور ایک مرید کے آب خورہ ٹیرھا رکھنے کا قصہ۔
۷- میر ضاحک کی وضع قطع اور لباس۔
۸- خواجہ میر درد کے سلسلے کے بعض واقعات۔
۹- شاہ عالم کا محفل تصوف کی مجالس میں شریک ہونا۔
۱۰- سودا اور میر کے کلام پر دو شخصوں کی تکرار کا ذکر۔
۱۱- دہلی کالج کا از سرِ نو منظور ہونا اور فارسی کی پروفیسری کے لیے غالب، مومن اور امام بخش کی امیدواری کی داستان۔

اور بعض دوسرے واقعات کریم الدین کے طبقات الشعرائے ہند سے لیے گئے ہیں۔[2]

سعادت خاں ناصر کے ''خوش معرکۂ زیبا'' کا حوالہ بھی آب حیات میں نہیں ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق :

۱- سودا اور شجاع الدولہ کے سلسلے کی بعض باتیں،

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمۂ مجموعۂ نغز مرتّبہ حافظ محمود شیرانی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ع۔

۲- ''آبِ حیات اور طبقات الشعرا''، از قاضی عبدالودود مطبوعہ معاصر، ص ۱۵۵ تا ۱۶۳، شمارہ نمبر ۴، مملوکۂ راقم الحروف۔

۲- سودا اور حزیں کی ملاقات کے بعض اجزا ،
۳- ضاحک اور سودا کے سلسلے کی بعض تفصیلات ،
۴- درد اور شاہ عالم کا واقعہ ،
۵- میر سوز کے تخلص کی حکایت ،
۶- ناسخ اور آتش کی معاصرانہ چشمک کی بعض باتیں "خوش معرکۂ زیبا" ہی سے ماخوذ ہیں ۔[۱]

اشپرنگر کا حوالہ بھی آبِ حیات میں نہیں ملتا ۔ لیکن بعض واقعات کی مماثلت ظاہر کرتی ہے کہ آزاد نے اشپرنگر سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ چنانچہ قاضی عبدالودود دونوں کے تقابلی مطالعے سے اس نتیجے پہنچے ہیں کہ آزاد نے حاتم کے دیوان فارسی ، دیوان سوز ، میر تقی میر اور ناسخ کے تراجم کے بعض اجزا اشپرنگر کے بیانات سے لیے ہیں ۔[۲]

لیکن اس اخذ و استفادہ سے آبِ حیات کی اہمیت کم نہیں ہوتی ۔ آزاد نے اپنی انشا پردازی کی مدد سے اس میں ایسا تخلیقی رنگ بھر دیا ہے کہ ہر چیز خواہ آزاد نے کہیں سے لی ہو ان کی اپنی ہو کر رہ گئی ہے ۔ وہ کسی شاعر کی زندگی لکھیں یا اس کی شخصیت کے خط و خال نمایاں کریں یا اس کے کلام پر تنقیدی رائیں دیں یا ماحول کا نقشہ کھینچیں سب میں اپنی طبیعت کی اپج سے ایک انفرادی شان پیدا کر دیتے ہیں ۔ حتٰی کہ لسانیات و تحقیق لفظی کی خشک بحثیں بھی ان کی رنگینیِ طبع کی بدولت ایک دلکش اسلوب میں ڈھل جاتی ہیں اور یہی وہ خوبی ہے جو "آبِ حیات" کو لوح سے لے کر تمت تک ہمیشہ زندہ رہنے والے ادب کے دائرے میں لے آتی ہے ۔

آزاد نے آبِ حیات کو موضوع و مواد کے لحاظ سے دیباچے کے علاوہ پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے ۔ اُردو شاعری اور شعرا کے باب میں ادوار کی تقسیم نئی نہیں ہے ۔ اس کے اولیں نقوش ہمیں قائم کے "مخزن نکات" اور میر حسن کے

۱- "آبِ حیات کے دو ماخذ" ، مطبوعہ معاصر پٹنہ ، شمارہ نمبر ۱ ، ص ۱۳۶ تا ۱۵۰ مملوکہ راقم الحروف ۔

۲- "آبِ حیات کے دو ماخذ" ، ص ۱۳۶ تا ۱۵۰ ، مطبوعہ معاصر ، شمارہ نمبر ۱ ۔

تذکرۂ شعرا میں ملتے ہیں ، بعد کے بھی کئی تذکرہ نگاروں نے درجہ بندی اور تقسیم زمانی سے کام لیا ہے - آزاد کے تنقیدی شعور نے اس تقسیم کو زیادہ معنی خیز اور مفید بنا دیا ہے - آزاد نے دیباچے میں نظم اُردو کی تاریخ بیان کی ہے - اس بیان میں اُردو کے ماخذ ، اس کی قدامت ، سنسکرت اور دوسری زبانوں سے اس کا رشتہ ، اس کی تدریجی ترقی ، عہد بہ عہد تبدیلی ، الفاظ کی ساخت ، دخیل الفاظ کی نوعیت اور زبان و بیان سے متعلق اس طرح کے اور کئی مسائل زیر بحث آئے ہیں - اس بحث میں انھوں نے دیگر ماخذوں کے ساتھ بعض قدیم تذکروں مثلاً کریم الدین کے طبقات الشعراے ہند اور عبدالحئی صفا بدایونی کے شمیم سخن کے مقدمات سے بھی مدد لی ہے -

دیباچے کی دو تین باتیں خصوصاً ، اہلِ تحقیق اور اہلِ ادب کی توجہ کا مرکز بنی ہیں ، ان باتوں ہیں آزاد کے دیباچے کا یہ پہلا فقرہ بھی شامل ہے :

''اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے -''

آزاد کا یہ بیان نیا نہیں ہے بعض تذکرہ نگار ایسی باتیں کہہ چکے تھے - خصوصاً صاحب شمیم سخن کے یہاں بھی ابتدائی جملہ اسی انداز کا ملتا ہے - ان کا بیان ہے کہ :

''واضح ہو کہ اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے -''

لیکن آزاد نے اپنے اس دعوے پر جس انداز سے گفتگو کی ہے اور بھاشا کی تفصیلات میں جا کر فارسی اُردو اور سنسکرت کے متحد الاصل الفاظ پر جس عالمانہ طریقے سے بحث کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے - آج یہ بات ہمارے لیے قابلِ قبول نہ سہی کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ اُردو کے ماخذ اور پیدائش کے بارے میں آزاد نے غور و فکر کی دعوت دی اور اس دعوت کے نتیجے میں اس موضوع پر اُردو میں لسانیات سے متعلق ایک قابلِ قدر ذخیرہ جمع ہو گیا - گویا اُردو میں لسانیات کی بحثوں کے لیے سب سے پہلے آزاد ہی نے راستہ ہموار کیا ہے - اس لیے اُردو کی لسانی تاریخ میں ان کی تحریریں ، خواہ آج وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ثابت کر دی جائیں ، نظر انداز نہیں کی جا سکتیں -

اُردو کے مزاج اور جاذبیت کے بارے میں آزاد کا بیان ہے کہ :

''زبانِ مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے

مِل جُل جاتی ہے ۔ سنسکرت آئی اس سے مل گئی ۔ عربی فارسی آئی بسم اللہ خیر مقدم کہا ۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی ۔" (آبِ حیات ، ص ۲۱)

یہ رائے بہت درست ہے ۔ آزاد نے اس کے ثبوت میں مدلل بحث کی ہے اور عبارتوں کے نمونے نقل کیے ہیں ۔

اُردو کے نام کے متعلق لکھتے ہیں :

"اس زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیوں کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ ، مٹی ، چونا ، سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں ۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز ۔ چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی ، فارسی ، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے ۔"

آزاد نے اُردو کی پیدائش گاہ اور اس کے مرکز اول کو دلی سے منسوب کیا ہے اور اسے شاہجہان کا اقبال بتایا ہے کہ وہ اس کے عہد میں اس نام سے مشہور خاص و عام ہو گئی ۔ آج ان کی یہ رائے قابل قبول نہ سہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ آزاد نے یہ بھی کہا ہے کہ :

"جس وقت مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اس وقت سے ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا ۔"

اور یہ ایک ایسی رائے ہے جسے اُردو کے سببِ پیدائش اور عہدِ پیدائش کے سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

آبِ حیات کے دیباچے کا سب سے دلچسپ اور اہم حصہ در اصل وہ ہے جس میں آزاد نے برج بھاشا پر عربی اور فارسی کے اثرات کا ذکر کیا ہے ۔ یہاں انھوں نے سب سے پہلے زبانوں کے اختلاط کے سلسلے میں ایک اصولی بات کہی ہے ، وہ لکھتے ہیں کہ :

"جب صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے . . . جب یہ دونوں ایک جگہ رہ سہہ کر شیر و شکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی

گھل مل جاتے ہیں . . . جب مہمان اور میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں تو ایک خوش نما اور مفید تبدیلی کے لیے راستہ پیدا ہوتا ہے ۔" (آبِ حیات ۔ صفحات ۲۷ - ۲۸)

اس اصول کے بعد وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو بنیاد بنا کر اُردو کی پیدائش و مقبولیت کے سلسلے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ :

"اُردو زبان اول لین دین ، نشست برخاست کی ضرورتوں کے لیے پیدا ہو گئی ۔ ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے ۔" [آب حیات ص ۲۹]

اس کے بعد آزاد نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ اُردو میں کس صورت سے داخل ہوئے ہیں ۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے متحد المعنی الفاظ اور تراجم محاورات کی سیکڑوں مثالیں دی ہیں اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :

"بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اُردو کو دیے ۔ اُردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا معنی وہی رکھے ، کہیں لفظوں کو سلامت رکھا ، معنی کچھ سے کچھ کر لیے ۔"

اُردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے سلسلے میں اُنھوں نے دلی اور لکھنؤ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور وہاں کے لوگوں کی ادبی و لسانی خدمات کو بھی سراہا ہے لیکن آخر میں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ زبان کسی علاقے کی میراث نہیں ہے بلکہ حسبِ ضرورت اور حسب موقع ہر علاقے میں اس کے فروغ کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

"بہادر شاہ سے پہلے دلی ہر بات کے لیے سند رہی اور انھی صفتوں سے لکھنؤ نے بھی سندِ افتخار حاصل کی ۔ لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو کہ دلپسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے ۔ جہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جمع ہوں گے اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے ۔" (آب حیات ، ص ٦٦)

زبان اور اُردو زبان کے سلسلے میں اس طرح کی اور کئی مفید بحثیں آزاد نے آبِ حیات کے دیباچے میں چھیڑی ہیں اور اپنی بساط کے مطابق رائیں دی ہیں - ان کی بعض رایوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا -

لسانی بحثوں کے بعد آزاد نے دیباچے ہی میں نظم اُردو کی تاریخ لکھی ہے - نظم اُردو سے ان کی مراد اُردو شاعری ہے - اس سلسلے میں انھوں نے صرف اُردو شاعری کے ارتقا پر روشنی نہیں ڈالی ہے ، بعض نظری مسائل پر بھی گفتگو کی ہے - شاعری کیا ہے؟ نظم و نثر میں کیا فرق ہے اور شاعری کس نوع سے اثر دکھاتی ہے؟ ان کے جواب میں وہ لکھتے ہیں :

''نظم (شاعری) ایک عجیب صنعت ، صنائع الٰہی سے ہے - اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں اور نثر میں پڑھتے ہیں - پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں :

(۱) وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں -

(۲) کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے اور مضمون میں ایسی تیزی آ جاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے -

(۳) سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں - تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصہ کسی کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے اور وہ قوت بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے - اسی واسطے سے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صنعت خدا داد ہو - قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے مگر حقیقت میں اس کا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں -''[1]

۱- آبِ حیات ، صفحات ٦٨ ، ٦٩ -

شاعری اور عمل شاعری کی اس تعریف کے بعد آزاد نے اُردو شاعری کا تاریخی جائزہ لیا ہے - یہ جائزہ زبان و بیان کی تبدیلیوں سے متعلق ہے اور امیر خسرو کے ذکر سے شروع ہو کر انیس و دبیر کے عہد تک پھیلا ہوا ہے اور ''آبِ حیات'' کے دیباچے کو اختتام تک لے جاتا ہے -

دیباچے کے بعد آزاد نے آب حیات کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کی خصوصیات اور شعرا کے حالات و کلام پر تبصرہ کیا ہے - ادوار کی نوعیت انھیں کے لفظوں میں یہ ہے :

۱- پہلا دور جس میں ولی اور ان کے قریب العصر با کمال جلسہ جمائے بیٹھے ہیں -

۲- دوسرا دور شاہ حاتم ، خان آرزو ، فغان -

۳- تیسرا دور مظہر جانِ جاناں ، میر سوز ، میر تقی ، مرزا رفیع سودا ، خواجہ میر درد -

۴- چوتھا دور مصحفی ، سید انشا ، جرأت -

۵- پانچواں دور ناسخ ، آتش ، شاہ نصیر ، مومن ، ذوق ، غالب -

سب سے پہلے آزاد نے ہر دور پر ایک عمومی تبصرہ کیا ہے اور اس کی نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے - پہلے دور کے متعلق وہ لکھتے ہیں :

''ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں ، جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں خیالات گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں - ایچ پیچ کے خیال ، دور دور کی تشبیہیں ، نازک استعارے نہیں بولتے ، اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں -''

دوسرے دور کے رنگِ شاعری کے متعلق ان کی رائے ہے کہ :

''یہ با کمال بھی ایک ہی شہد کی مکھی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں - مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں - خیالی رنگوں کے طوطے مینا نہیں بناتے ہاں طوطا و بلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے ہیں - انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری ، ایچ ، پلٹی ، تان ، کسی گویئے سے لے کر نہیں ڈالی - تم

دیکھنا بے تکلف بولی اور سیدھی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے اور سننے والے سنیں گے کلیجے پکڑ کر رہ جائیں گے۔"

تیسرے دور کے شعرا کے متعلق ان کی مجموعی رائے یہ ہے کہ:

"تم دیکھنا وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے آسمان سے تارے اتاریں گے۔ قدر دانوں سے فقط داد نہ لیں گے پرستش لیں گے۔ لیکن وہ پرستش سامری کی طرح عارضی نہ ہوگی۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دامن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صفت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ دے گا۔" (آبِ حیات، ص ۱۲۹)

اسی دور کے بارے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مرزا جانِ جاناں، سودا، میر، خواجہ میر درد، یہی چار شخص تھے جنھوں نے زبان اُردو کو خراد اتارا ہے۔" (آبِ حیات، ص ۱۳۰)

اُردو شاعری کے چوتھے دور کے نمایندہ شاعر جرأت، انشاء، مصحفی اور سعادت یار خاں رنگیں وغیرہ ہیں۔ اس دور کے شعرا کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

"ان کا آنا غضب کا آنا ہے۔ ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے کبھی ہار بنائیں گے کبھی طرے سجائیں گے کبھی انھیں کو پھولوں کی گیند بنا لائیں گے اور وہ گلبازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔"[۱]

آبِ حیات کے آخری اور پانچویں دور (جس میں شاہ نصیر، ناسخ، ذوق، مومن

۱۔ آبِ حیات، ص ۲۲۹۔

اور غالب وغیرہ شامل ہیں) کے بارے میں آزاد کی رائے ہے کہ :

''اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے ، ایک وہ کہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا ۔ یہ ان کے باغوں میں پھریں گے ۔ پرانی شاخیں زرد پتے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ نئے ڈھنگ کے گلدستے بنا بنا کر گلدانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے ۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائیں گے اور برج آتش بازی کی طرح اس سے رتبۂ عالی پائیں گے ۔''[۱]

ہر دور کے نمایندہ شعرا اور ان کے کلام کی روشنی میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ مختلف ادوار پر ایک عام تبصرہ کرتے ہوئے جو رائیں قائم کی ہیں وہ بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہیں ۔ انھوں نے چند لفظوں میں جس خوبی اور جامعیت کے ساتھ ہر دور پر اپنی رائے ظاہر کر دی ہے وہ ان کے معتبر ذوق شعری اور تنقیدی شعور پر دلالت کرتا ہے ۔

ادوار پر مجموعی تبصروں کے بعد آزاد نے ہر دور کے نمایندہ شاعروں کی زندگی اور کلام پر الگ الگ مفصل گفتگو کی ہے ۔ ان کی گفتگو کا انداز پیش رو تذکرہ نگاروں سے بالکل مختلف ہے ۔ اتنا مختلف کہ وہ مروجہ رسم تذکرہ نگاری سے بہت آگے بڑھ کر واضح طور پر ادبی تنقید و تاریخ اور ادبی سوانح نگاری کا ایک معیاری نمونہ بن گئی ہے ۔

آزاد اُردو تنقید کے بانیوں میں ہیں ۔ ان سے پہلے اُردو میں آب حیات کے طرز کی تنقید بھی نظر نہیں آتی ۔ وہ شاعر کے منصب اور اس کے کلام کی نوعیت کے بارے میں نہایت جچے تلے الفاظ میں رائے دیتے ہیں ۔ یہ رائے عموماً مختصر ہوتی ہے لیکن جامعیت سے خالی نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ شعری ادب کے باب میں آج بھی آزاد کی تنقیدی رائیں وقیع خیال کی جاتی ہیں ۔ بات یہ ہے کہ آزاد اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں کی طرح شاعر کے ذکر سے سرسری نہیں گزرے بلکہ انھوں نے ہر شاعر کے بارے میں الگ الگ بھرپور مضامین لکھے ہیں ۔ ان مضامین میں شاعر کی زندگی ، ماحول ، تعلیم و تربیت ، شاگردی و استادی ، شاعرانہ

۱۔ آبِ حیات ، ص ۳۳۲ ۔

قوت ، لسانی قدرت ، میلان طبع ، شخصیت و کردار ، انداز سخن سرائی ، زبان و بیان ، مہارت فن ، اصناف سخن ، امتیازی خصوصیات اور معاصرین شعرا کے رنگ سخن سے اتحاد یا انحراف سب کا بڑی خوبصورتی سے جائزہ لیا گیا ہے ۔ ان کی شخصی کمزوریاں اور فنی خامیاں بھی گنوائی گئی ہیں ۔ غرض کہ آزاد نے ہر شاعر کی زندگی اور شاعری پر عالمانہ محاکمہ کیا ہے ۔ ان کے انداز محاکمہ کو سمجھنے کے لیے مختلف شعرا کے بارے میں ان کی چند رائیں دیکھیے ۔

مرزا رفیع سودا کے بارے میں تقریباً چالیس صفحے لکھے ہیں اور ہر صنف سخن کے سلسلے میں ان کے مرتبے کا تعین اس طور پر کیا ہے :

”اگر شعرا نے کچھ مدح میں کہا ہے تو ایسا ہے کہ اسے قصیدہ نہیں کہہ سکتے ۔ بس اول قصائد کا کہنا اور پھر دھوم دھام سے اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا فخر ہے وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عنان در عنان ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں ۔“

”مثنویاں فصاحت کلام کے اعتبار سے ان کا جوہر طبعی ظاہر کرتی ہیں ، مگر عاشقانہ مثنویاں ان کے مرتبے کے لائق نہیں ۔“

”دیوان ریختہ باعتبار جوہر کلام کے سر تا پا ریختۂ مرصع ہے ۔ بہت سی غزلیں دلچسپ اور دلپسند بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اُردو میں نہیں آئی تھیں ۔ زمینیں سنگلاخ ہیں اور ردیف قافیے بہت مشکل مگر جس پہلو سے انھیں جا دیا ہے ایسے جمے ہیں کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے تو تمھیں معلوم ہو ۔“

”گرمیِ کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخیِ طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی ۔ مگر ہجووں کا مجموعہ جو کلیات میں ہے اس کا ورق ورق ہنسنے والوں کے لیے زعفران زار کشمیر کی کیاریاں ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت ہے کہ طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دلی کسی طرح کے فکر و تردد کو پاس نہ آنے دیتی تھی ۔ گرمی اور مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی . . . کہ ذرا سی ناراضی میں بے اختیار

ہو جاتے تھے ، کچھ اور بس نہ چلتا تھا جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر دیتے تھے ۔''

ہر صنف پر الگ الگ رائے دینے کے بعد سودا کی مجموعی شاعری پر یوں رائے زنی کرتے ہیں :

''کل اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلّم الثبوت تھے ۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر و فن انشا کے لیے پیدا ہوئی تھی . . . نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور رکے نہیں ۔ چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے ۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں ۔ کلام زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی . . . ان کی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی ، نئے نئے خیال اور چٹختے قافیے جس پہلو سے جمتے دیکھتے تھے جما دیتے تھے . . . انھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادے کو دوسرے مادے میں جذب کر دیتا ہے . . . مرزا کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر ، ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے ۔ توسنِ فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رک نہ سکتا تھا ۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے ، تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی ، جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے باندھ لیتے تھے ۔ بے شک ان کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدے کا رنگ دکھاتے ہیں ۔'' (آبِ حیات ، صفحات ۱۵۷ تا ۱۶۴)

خواجہ میر درد کی غزل گوئی کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں :

''خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے ۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے ۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے ، کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی ۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا اُردو میں آج تک کسی سے نہ ہوا ۔''

(آبِ حیات ، ص ۱۸۵)

میر تقی میر کے کلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں :
''غزلوں کے دیوان اگرچہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں . . . ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے - اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز ہے . . . ان کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیرو شکر ہیں مگر چھوٹی بحروں میں فقط آبِ حیات بہاتے ہیں - جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے -''
(آبِ حیات ، صفحات ۲۰۶ تا ۲۱۱)

میر حسن کی سحر البیان پر بحث کرتے ہوئے رائے دی ہے کہ :
''اس کی صفائی بیان اور لطافت محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا اور ادا کی نزاکت اور جواب و سوال کی نوک جھوک حدِ توصیف سے باہر ہے . . . کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ اس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں -'' (آبِ حیات ، ص ۲۵۰)

مصحفی کے رنگ تغزل کے بارے میں لکھتے ہیں :
''جو غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت مشق سے کلام پر قدرت کامل پائی ہے - الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس در و بست کے ساتھ شعر میں کھپایا ہے کہ جو حق استادی کا ہے ادا ہو گیا ہے - ساتھ اس کے اصل محاورے کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتے ، ایسے موقع پر کچھ کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے - جہاں سادگی ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں - اسی کوچے میں اکثر شعر میر صاحب کی بھی جھلک دکھاتے ہیں - مگر جو ان کے جوہر ہیں وہ انھیں کے ساتھ ہیں . . . غرض شعر کی ہر شاخ کو لیا ہے اور جو قواعد و ضوابط اس کے استادوں نے باندھے ہیں ان کا حق حرف بہ حرف بلکہ لفظ بہ لفظ پورا ادا کیا ہے - ہاں اپنے ہم عصروں کی طرح طبیعت میں چلبلاہٹ اور بات میں شوخی نہیں پائی جاتی -'' (آبِ حیات ، صفحات ۳۰۵ - ۳۰۶)

ناسخ کے سلسلے میں رقم طراز ہیں :

''غزلوں میں شوکت الفاظ اور بلندی پرواز اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم -''

آتش کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ :

''میں نے خود دیوان آتش کو دیکھا ، کلام مضامین بلند سے خالی نہیں - ہاں طرزِ بیان صاف ہے ، سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے - ترکیبوں میں استعارے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں مگر قریب الفہم اور ساتھ ہی اس کے اپنے محاورے کی زیادہ پابند ہیں -''

(آبِ حیات ، ص ۳۸۲)

شعرا کے متعلق اس قسم کی جچی تلی رائیں آزاد نے آبِ حیات میں اکثر جگہ دی ہیں - آج ہمارا مذاق سخن ، ادبی نقطۂ نظر اور تنقیدی شعور بہت کچھ بدل گیا ہے اور اس سبب سے ممکن ہے بعض حضرات ان رایوں کو چنداں اہمیت نہ دیں لیکن اگر ہم یہ نہ بھولیں کہ آزاد نے آج سے تقریباً سو سال پہلے یہ باتیں کہی ہیں اور اس زمانے میں کہی ہیں جب کہ ہمارے تذکرہ نگار ہر شاعر کے بارے میں رسمی انداز کی دو سطریں لکھ کر چند شعر نقل کر دینے ہی کو سب کچھ جانتے تھے ، تو آزاد کی آرا کو تنقیدی اہمیت دینی ہی پڑے گی - ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ آزاد آج کے نقطۂ نظر سے کوئی ادبی تاریخ یا تنقیدی کتاب نہیں لکھ رہے تھے بلکہ قدیم طرز پر ایک تذکرۃ الشعرا مرتب کر رہے تھے - ان کی اہمیت اس بات میں ہے کہ انھوں نے تذکرہ نگاری کی قدیم روش سے بہت آگے بڑھ کر اسے ادبی تاریخ تنقید اور سوانح نگاری سے قریب تر کر دیا - ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے آبِ حیات کی تنقیدی کمزوریوں پر بڑے شد و مد سے قلم اُٹھایا ہے لیکن بحث کے آخر میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اُردو میں تنقید نگاری کی بنیاد آبِ حیات کے ذریعے آزاد نے رکھی ہے - چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

''یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے بنیاد رکھی تو تذکرہ نگاری سے آگے قدم بڑھانے کی کوشش تو کی - آبِ حیات کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے - اُردو تنقید نگاری کی تاریخ اسی سے شروع کی جایا کرے گی -

اس کی سوانح عمریاں عام طور پر بھی زندہ رہیں گی ۔"[1]

مختصر یہ کہ "آبِ حیات" اُردو شاعری اور ادب کے طویل سلسلے کی ایک ایسی کڑی ہے جسے نظر انداز کر کے اُردو میں تنقید یا تاریخ کا کوئی خاکہ مرتّب ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ آبِ حیات دراصل تذکرہ نگاری اور ادبی تنقید و تاریخ کے درمیان حدِ فاصل ہے ۔ اس سے ایک طرف تذکرہ نگاری اور اس کی اہمیت کا عملاً خاتمہ ہوتا ہے ، دوسری طرف شاعری اور ادب پر آئندہ قلم اٹھانے والوں کو جدید تقاضوں اور اصولوں کے تحت نقد و تبصرہ کی راہ ہموار نظر آتی ہے ۔

رہی یہ بات کہ آبِ حیات بلحاظ سوانح نگاری کس حد تک شعرا کی زندگی ، شخصیت اور ان کے ماحول کی ترجمان ہے ، سو اس سلسلے میں دو رائیں نہیں ہیں ۔ جو لوگ آزاد کی تنقید کو چنداں اہمیت نہیں دیتے وہ بھی آزاد کی مرقع نگاری کے قائل ہیں اور آبِ حیات کو اپنے عہد کی شاعرانہ فضا کی آئینہ دار خیال کرتے ہیں ۔ کلیم الدین احمد آزاد کی شخصیت نگاری کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"وہ محض متفرق اوصاف و نقائص کی فہرست مرتّب نہیں کرتے بلکہ ہر شاعر کی زندہ تصویر کھینچتے ہیں ۔ میر ، سودا ، درد ، انشا ، آتش ، ناسخ ، مصحفی غرض ہر شخص کی تصویر الگ الگ نظر آتی ہے اور ان تصویروں میں کوئی مشابہت نہیں ہے ، اس لیے غلط فہمی کا امکان نہیں ۔ آزاد صرف ہر شاعر کی الگ الگ شخصیت کی تعمیر نہیں کرتے بلکہ وہ شاعر کے ماحول کی بھی تصویر کشی کرتے ہیں ۔ اس عقبی زمین کی وجہ سے یہ تصویریں زیادہ صاف اور مؤثر ہو جاتی ہیں ۔"[2]

اس سے انکار نہیں کہ آب حیات کی لسانی ، تاریخی اور سوانحی بحثوں میں بہت سی کمزوریاں اور واقعاتی غلطیاں ہیں ۔ ان کی تنقیدی رائیں بھی بعض جگہ بے اعتدالی اور جانب داری کا شکار نظر آتی ہیں ۔ ہمارے بعض ناقدین و محققین نے ان کمزوریوں کی طرف پوری توجہ کی ہے ۔ خصوصاً مولوی عبدالباری آسی[3] ،

۱۔ اُردو میں تنقید ، ص ۳۴ ، مطبوعہ مشتاق بک ڈپو ، کراچی نمبر ۱ ۔

۲۔ اُردو تنقید پر ایک نظر ، مطبوعہ دائرۂ ادب ، بانکی پور پٹنہ ، طبع اول ، مملوکہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۔

۳۔ نگار لکھنؤ ، بابت مئی اور جون ۱۹۲۸ع ۔

حافظ محمود شیرانی[1] اور قاضی عبدالودود[2] نے اس سلسلے میں گراں قدر مضامین لکھے ہیں اور اگر ان مضامین کی روشنی میں آبِ حیات کا تازہ ایڈیشن ضروری حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو یہ بجائے خود ایک اہم ادبی خدمت ہوگی ۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوصف آبِ حیات کی اہمیت بعض وجوہ سے مسلّم ہے ، ان وجوہ پر بھی ہمارے بعض ناقدین بحث کر چکے ہیں ۔ خصوصاً پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب بڑی تفصیل سے آبِ حیات کی اہمیت پر روشنی ڈال چکے ہیں اس لیے اس پہلو پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی[3] ۔ بطور مثال آبِ حیات کے تراجم کو یہاں نقل کرنے کی یوں ضرورت نہیں کہ ان کی نوعیت و کیفیت سے عام و خاص سبھی پوری طرح واقف ہیں ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۱۹۴۱ع اور مقدمہ مجموعہ نغز ، مرتبہ شیرانی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ع ۔

۲۔ ''آزاد بحیثیت محقق'' ، مطبوعہ نوائے ادب ، بمبئی بابت اپریل ۱۹۵۶ع ، جولائی ۱۹۵۶ع اور اکتوبر ۱۹۵۶ع ۔

۳۔ ''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' ، مطبوعہ اسرار کریمی پریس ، الہ آباد ۱۹۵۳ع طبع اول ۔

اردو شعرا کے تذکروں کی
تاریخی ترتیب

تذکروں کی اس فہرست میں ''نکات الشعرا'' سے لے کر ''آب حیات'' تک کے تذکرے بلحاظ سنہ تصنیف، نمبر شمار کے ساتھ ترتیب وار شامل ہیں - ہر چند کہ اس فہرست کے مشمولہ تذکروں پر الگ الگ تبصرے پچھلے صفحات میں کیے جا چکے ہیں اور ان تبصروں میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ کسی خاص تذکرے کا مصنّف کون ہے اور وہ کب، کہاں، کن حالات میں اور کس زبان میں لکھا گیا ہے، پھر بھی دو سبب سے تاریخی ترتیب و توقیت کے ساتھ تذکروں کی فہرست ضروری معلوم ہوئی - اول یہ کہ اس کتاب میں جو تذکرے زیر بحث آئے ہیں بہ یک نظر تقدیم و تاخیر اور بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ قاری کے سامنے آ جائیں، دوم یہ کہ اس سے اگلے صفحوں پر دی ہوئی ''فرہنگ'' سے استفادہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی، کیونکہ فرہنگ میں اسی فہرست میں دیے ہوئے نمبر شمار سے مدد لی گئی ہے -

۱- نکات الشعرا — از میر تقی میر

مرقومہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ع (فارسی) -

۲- گلشن گفتار — از حمید اورنگ آبادی

مرقومہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ع (فارسی) -

۳- تحفۃ الشعرا — از افضل بیگ قاقشال

مرقومہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ع (فارسی) -

۴- تذکرۂ ریختہ گویاں — از فتح علی حسینی

مرقومہ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ع (فارسی) -

۵- مخزن نکات — از قیام الدین قائم
مرقومہ ۱۱۶۸ھ/۵۵-۱۷۵۴ع (فارسی)

۶- ریاض حسنی — از عنایت اللہ فتوت
مرقومہ ۷۳-۱۱۶۸ھ/۶۰-۱۷۵۴ع (فارسی)

۷- چمنستان شعرا — از لچھمی نرائین شفیق
مرقومہ ۷۶-۱۱۷۵ھ/۶۳-۱۷۶۱ع (فارسی)

۸- طبقات الشعرا — از قدرت اللہ شوق
مرقومہ ۸۹-۱۱۸۸ھ/۷۶-۱۷۷۴ع (فارسی)

۹- تذکرۂ شعرائے اردو — از میر حسن
مرقومہ ۱۱۹۱ھ/۷۸-۱۷۷۷ع (فارسی)

۱۰- تذکرۂ شورش — از غلام حسین شورش
مرقومہ ۱۱۹۱ھ/۷۸-۱۷۷۷ع (فارسی)

۱۱- بہار و خزاں — از میر بہاء الدین حسین خان عروج
مرقومہ ۱۱۹۲ھ/۷۹-۱۷۷۸ع (فارسی)

۱۲- گل عجائب — از اسد علی خاں تمنا
مرقومہ ۹۴-۱۱۹۲ھ/۸۰-۱۷۷۸ع (فارسی)

۱۳- مسرت افزا — از ابوالحسن
مرقومہ ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ع (فارسی)

۱۴- گلشن سخن — از مردان علی خاں مبتلا
مرقومہ ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ع (فارسی)

۱۵- گلزار ابراہیم — از علی ابراہیم خلیل
مرقومہ ۱۱۹۸ھ/۸۴-۱۷۸۳ع (فارسی)

۱۶- تذکرۂ ہندی گویاں — از غلام ہمدانی مصحفی
مرقومہ ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ع (فارسی)

۱۷- عیار الشعرا — از خوب چند ذکا
مرقومہ ۱۲۲۶-۱۲۱۲ھ/۱۸۱۲-۱۷۹۸ع (فارسی)

۱۸- تذکرۂ عشقی — از محمد وجیہ الدین عشقی
مرقومہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱-۱۸۰۰ع (فارسی)

۱۹- گلشن ہند — از میرزا علی لطف
مرقومہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰-۱۸۰۱ع (اُردو)

۲۰- عمدۂ منتخبہ — از اعظم الدولہ سرور
مرقومہ ۱۲۱۶-۱۲۲۴ھ/۱۸۰۱-۱۸۱۰ع (فارسی)

۲۱- تذکرۂ حیدری (گلشن ہند) — از حیدر بخش حیدری
مرقومہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲-۰۳ع (اُردو)

۲۲- مجمع الانتخاب — از شاہ محمد کمال
مرقومہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳-۰۴ع (فارسی)

۲۳- ریاض الفصحا — از غلام ہمدانی مصحفی
مرقومہ ۱۲۲۱-۱۲۳۶ھ/۱۸۰۶-۱۸۲۱ع

۲۴- مجموعۂ نغز — از قدرت اللہ قاسم
مرقومہ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۷ع (فارسی)

۲۵- طبقات سخن — از غلام محی الدین مبتلا میرٹھی
مرقومہ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷-۰۸ع (فارسی)

۲۶- تذکرۂ آزردہ — از صدر الدین خان آزردہ
مرقومہ ۱۲۲۶-۳۳ھ/۱۸۱۱-۱۸ع (فارسی)

۲۷- دیوان جہاں — از بینی نرائن جہاں
مرقومہ ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲-۱۳ع (اُردو)

۲۸- تذکرۂ بے جگر — از خیراتی لعل بے جگر
مرقومہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶-۲۷ع (فارسی)

۲۹- تذکرۂ شعرا — از ابن امین طوفان
مرقومہ ۱۲۴۷-۵۱ھ/۱۸۳۱-۳۶ع (فارسی)

۳۰- شوکت نادری — از کلب حسین خاں نادر
مرقومہ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱-۳۲ع (فارسی)

۳۱- دستور الفصاحت — از احد علی خاں یکتا
مرقومہ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳-۳۴ع (فارسی)

۳۲- گلشن بے خار — از مصطفیٰ خاں شیفتہ
مرقومہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴-۳۵ع (فارسی)

۳۳- مدائحُ الشعرا — از عنایت حسین خاں مہجور
مرقومہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷-۳۸ع (فارسی)

۳۴- تاریخ ادب ہندوستانی — از گارسیں دتاسی
مرقومہ ۱۸۳۹-۴۷ع (فرانسیسی)

۳۵- انتخاب دواوین — از امام بخش صہبائی
مرقومہ ۱۲۵۸-۶۰ھ/۱۸۴۲-۴۴ع (اُردو)

۳۶- گلدستۂ نازنیناں — از کریم الدین
مرقومہ ۱۲۶۰-۶۱ھ/۱۸۴۴-۴۵ع (اُردو)

۳۷- خوش معرکۂ زیبا — از سعادت خاں ناصر
مرقومہ ۱۲۶۰-۶۲ھ/۱۸۴۴-۴۶ع (اُردو)

۳۸- بہار بے خزاں — از احمد حسین سحر
مرقومہ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ع (فارسی)

۳۹- گلستان بے خزاں — از قطب الدین باطن
مرقومہ ۱۲۶۱-۶۵ھ/۱۸۴۵-۴۹ع (اُردو)

۴۰- طبقات الشعرائے ہند — از کریم الدین و فلن صاحب
مرقومہ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶-۴۷ع (اُردو)

۴۱- یادگار شعرا — از اشپر نگر
مرقومہ ۱۸۵۰ع (انگریزی)

۴۲- مخزن شعرا — از نور الدین فائق
مرقومہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱-۵۲ع (اُردو)

۴۳- سراپا سخن — از سید محسن علی
مرقومہ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲-۵۳ع (اُردو)

۴۴- گلشن ہمیشہ بہار — از نصراللہ خاں خیشگی
مرقومہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳-۵۴ع (فارسی)

۴۵- نسخۂ دلکشا — از جنم جی متر ارمان
مرقومہ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴-۵۵ع (اُردو)

۴۶- منتخب التذکرہ — از جنم جی متر ارمان
مرقومہ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴-۵۵ع (اُردو)

۴۷- گلستان سخن — از قادر بخش صابر
مرقومہ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴-۵۵ع (اُردو)
۴۸- مخزن نکات (اُردو ترجمہ) — از سید محسن علی
مرقومہ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴-۵۵ع (اُردو)
۴۹- ریاض الفردوس — از محمد حسین خاں شاہجہان پوری
مرقومہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹-۶۰ع (اُردو)
۵۰- قطعہٴ منتخب — از عبدالغفور خاں نساخ
مرقومہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹-۶۰ع (اُردو)
۵۱- سخن شعرا — از عبدالغفور خاں نساخ
مرقومہ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴-۶۵ع (اُردو)
۵۲- بہارستان ناز — از فصیح الدین رنج
مرقومہ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴-۶۵ع (اُردو)
۵۳- تذکرۂ نادری — از کلب حسین خاں نادر
مرقومہ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶-۶۷ع (اُردو)
۵۴- مجموعہٴ واسوخت — از فدا علی عیش
مرقومہ ۱۲۸۲-۸۵/۱۸۶۵-۶۹ع (اُردو)
۵۵- فرح بخش — از یار محمد خاں شوکت
مرقومہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰-۷۱ع (اُردو)
۵۶- خزینۃ العلوم — از درگاہ پرشاد نادر
مرقومہ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱-۷۲ع (اُردو)
۵۷- شمیم سخن ، حصہ اول — از عبدالحئی صفا
مرقومہ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲-۷۳ع (اُردو)
۵۸- شمیم سخن ، حصہ دوم — از عبدالحئی صفا
مرقومہ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲-۷۳ع (اُردو)
۵۹- انتخاب یادگار — از امیر احمد مینائی
مرقومہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳-۷۴ع (اُردو)
۵۹ الف - تذکرۂ شعرائے رام پور — از صاحب و جرجیس
مرقومہ ۱۲۹۰ - ۹۱ھ/۱۸۷۳ - ۷۴ع (فارسی)

٦٠- عروس الاذکار　　از نصیر الدین احمد نقش
مرقومہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ع (فارسی)
٦١- نگارستان بشیر　　از شاہ بہاء الدین بشیر
مرقومہ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ع (اُردو)
٦٢- چمن انداز　　از درگا پرشاد نادر
مرقومہ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ع (اُردو)
٦٣- تذکرۂ بشیر　　از شاہ بہاء الدین بشیر
مرقومہ ۱۲۹۱-۹۷ھ/۱۸۷۴-۸۰ع (اُردو)
٦٤- ارمغان گوکل پرشاد　　از گوکل پرشاد
مرقومہ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ع (اُردو)
٦٥- طور کلیم　　از سید نورالحسن خان
مرقومہ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ع (فارسی)
٦٦- بزم سخن　　از سید علی حسن خاں
مرقومہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ع (فارسی)
٦٧- آبِ حیات　　از محمد حسین آزاد
مرقومہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ع (اُردو)

☆ ☆ ☆

فرہنگِ سخنورانِ نامور

جیسا کہ دیباچے میں ظاہر کیا جا چکا ہے ، اس کتاب کے زیر بحث تذکروں میں ادنٰی ، اعلٰی اور شاعر و متشاعر ، ہزاروں شعرا کا ذکر آیا ہے ، لیکن ''فرہنگِ سخنورانِ نامور'' کے تحت ان سب کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اُن میں سے سوا تین سو کے قریب شعرا ، جن پر کسی وقت تحقیقی و تنقیدی کام کیے جانے کا امکان ہے ، منتخب کر لیے گئے ہیں اور ہر شاعر کے بارے میں یہ نشان دہی کر دی گئی ہے کہ اُس کا ذکر اس کتاب کے زیر بحث تذکروں میں سے کن کن تذکروں میں آیا ہے -

پچھلے صفحات میں ''اُردو شعرا کے تذکروں کی تاریخی ترتیب'' کے زیرعنوان ''نکات الشعرا'' سے لے کر ''آبِ حیات'' تک تذکروں کی ایک فہرست نمبرشمار کے ساتھ دی ہوئی ہے - یہ وہی فہرست ہے جو کتاب کے آغاز میں ''فہرست مضامین'' کے تحت بھی درج ہے - ''فرہنگ سخنورانِ نامور'' میں اسی فہرست سے مدد لی گئی ہے ، یعنی فرہنگ میں شاعر کے تخلص اور نام کے سامنے تذکروں کے نام کے بجائے بطور حوالہ وہ اعداد ظاہر کیے گئے ہیں جو ان تذکروں کے مقابل بطور نمبرشمار درج ہیں ، مثلاً فہرست میں :

(۱) نکات الشعرا ، مؤلفہ میر تقی میر -
(۲) گلشن گفتار ، مؤلفہ حمید اورنگ آبادی -
(۳) تحفۃ الشعرا ، مؤلفہ قاقشال -
(۴) تذکرۂ ریختہ گویاں ، مؤلفہ فتح علی حسینی -
(۵) مخزن نکات ، مؤلفہ قائم -

کے نمبر شمار بالترتیب ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ہیں - اب ان تذکروں میں سے جن جن تذکروں میں کسی شاعر کا ذکر آیا ہے ، فرہنگ میں اس شاعر کے تخلص اور نام کے سامنے ، اُن تذکروں کے نمبر شمار ، فرہنگ کی کلید کی حیثیت رکھتے ہیں - اگر ہر شاعر کے نام کے مقابل ، تذکروں کے نام لکھے جاتے تو جگہ بہت گھرتی ، اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے -

۷۳- بے دل ، مرزا عبدالقادر : ۱ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ ، ۹ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۵ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۵ ، ۴۸ ، ۵۷ -

۷۴- بے قید ، سید فضائل علی : ۹ ، ۱۵ ، ۱۸ ، ۳۴ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۵ ، ۴۸ ، ۶۳ -

۷۵- بہار ، علی بخش : ۳۴ ، ۳۳ ، ۴۷ ، ۴۹ ، ۵۷ ، ۵۹ ، ۶۴ ، ۶۶ -

۷۶- بینی نرائن : ۳۴ ، ۴۰ -

۷۷- پروانہ ، پروانہ علی شاہ : ۶ ، ۷ ، ۸ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۵ -

۷۸- پروانہ ، رائے جسونت سنگھ : ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۵۰ ، ۶۴ -

۷۹- پیام ، شرف الدین علی خاں : ۱ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ ، ۹ ، ۱۰ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۳ ، ۲۴ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۳۹ ، ۴۱ ، ۴۵ ، ۴۸ -

۸۰- تاباں ، عبدالحئی : ۱ ، ۲ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ ، ۹ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۵۷ ، ۶۴ ، ۶۵ ، ۶۶ ، ۶۷ -

۸۱- تانا شاہ ، ابوالحسن : ۹ ، ۱۲ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۲۱ ، ۳۴ ، ۴۱ ، ۴۵ ، ۶۳ -

۸۲- تپش ، مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان : ۸ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۵۳ ، ۵۷ ، ۶۶ -

۸۳- تجلیؔ ، محمد حسین ، عرف میاں حاجی : ۱۶ ، ۱۷ ، ۲۰ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۲۷ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۴۹ ، ۶۵ ، ۶۶ -

۸۴- تراب ، شاہ تراب علی : ۲۳ ، ۳۴ ، ۳۷ ، ۳۹ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۵۰ ، ۵۳ -

☆ ☆ ☆

اشاریہ

مرتبہ

پروفیسر محمد نصیر شادانی

فہرست اشاریہ

۱- اشخاص

الف

خ

د

ذ

ر

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

گ

ل

م

ن

و

اسماے شعرا

ب

پ

ت

ث

ٹ

ج

ذ

ر

ز

س

ش

ص

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

تخلص ہائے شعرا

ب

پ

ت

ث

ج

چ

ح

خ

ز

س

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

غ

ف

ق

ن

☆ ☆ ☆

۲- مقامات

گ

ل

م

محلے

ادارہ ہائے تعلیم

متبرک مقامات

ندیاں

کتب خانے

مطابع

علمی ادارے

ادارہ ہائے نشر و اشاعت

☆ ☆ ☆

۳۔ کتب

ب

ت

م

ن

لغات

مثنویات

اخبارات

مجلّات

الف

ق

ک

گ

م

ن

ہ

تذکرے

الف

ب

ت

د

ر

ل

م

ی

☆ ☆ ☆

صحت نامۂ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۸	۲	یہ	یا یہ
۵۱	۵	علیگڑھ	علیگڑھ اور پنجاب یونیورسٹی
۶۱	۲۲	جتنا کام	چنانچہ گزشتہ چند برسوں میں جتنا کام
۶۵	۲۲/۲۴	۶۷	۶۸
۶۶	۳	اِن میں	اِن میں سے
۶۶	۲۰	ہوتا	آیا
۶۶	۲۱	جاتا	گیا
۸۶	۲۱	کوئی بات	کوئی ایسی بات
۱۰۶	۶	خاص	خاصی
۱۲۱	۹	وہ	کہ وہ
۱۲۴	۱۰	زاہد	زائد
۱۳۰	۹	قائم کے	مخزنِ نکات نے ایک طرف قائم کے
۱۵۴	۱	گرفتار تھے	گرفتار تھے[۱]
۱۵۴	۸	دیدہ ہے	دیدہ ہے[۲]
۱۵۴	۱۲	آسی[۲]	آسی
۱۵۵	۲	اس سے زیادہ	اُن کے متعلق
۱۶۷	۱۹	صدفی	صوفی
۱۸۱	۷	کہ	کو
۱۹۲	۱	صاحب گلزار ابراہیم ،	صاحب گلزار ابراہیم کا ،
۱۹۴	۲۶	نہ ڈاکٹر محی الدین	ڈاکٹر محی الدین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۱۰	۲	ہجری	ہجر
۲۱۲	۶	بیہنیا	بھینا
۲۱۴	۸	شیفتہ	اور شیفتہ
۲۳۰	۱	کر دی	کر دی ہے
۲۳۲	۲۱	تحقیق	بہ تحقیق
۲۴۳	۴	قلمی	ایک قلمی
۲۵۱	۱	نون	قاف
۲۵۷	۱۲	خیراتی	خیراتی لعل
۲۵۷	۲۶	اُن سے	ان میں سے
۲۶۲	۲۷	عشقی	عاشقی
۲۶۴	۲۵	ص ۶۱ - ۶۲	ص ۹۱ - ۹۲
۲۶۵	۱۸/۲۳	عشقی	عاشقی
۲۷۳	۴	جانگزاسے	جانگزائے
۲۷۳	۲۵	عشقی	عاشقی
۲۷۶	۳/۴	ابن طوقان	ابن طوفان[1]
۲۷۶	۱۷	زو فنونان	ذو فنون
۲۸۰	۹	کمتلین	کاملین
۲۸۴	۳	دستور الفصاحت	دستور فصاحت
۳۰۳	۳	میں پیدا ہوئے	پیدا ہوئے
۳۰۳	۱۳	کے	کی
۳۱۷	۳	انختاب	انتخاب
۳۱۹	۲۳	حسن	جس
۳۳۱	۱	کی ہیں[1]	کی ہیں[1+2]
۳۳۴	۲۱	مرقوعہ	مرقومہ
۳۳۵	۲	ہے	ہے کہ

۱- ہر جگہ ''ابن طوقان'' کے بجائے ''ابن طوفان'' ہونا چاہیے -

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳۵	۱۲	شعراء	تذکرۃ الشعرأ
۳۳۶	۲۰	احیا	احبّا
۳۳۹	۲۷	بولیں	بولے
۳۵۵	۲۰	کا	کی
۳۵۹	۱۱	قائدہ	فائدہ
۳۶۰	۷	تذکرے	تذکرہ
۳۶۱	۶	یا ایں	با ایں
۳۷۰	۱۶	اور چمن بے نظیر	تذکرۂ عشقی ، گلشن ہند (لطف) عیار الشعرا ، عمدۂ منتخبہ ، مجموعۂ نغز ، طبقاتِ سخن اور چمن بے نظیر
۴۰۵	۱۱	اس	اُسی
۴۱۰	۲۰	میں	میں بھی
۴۱۱	۲۳	لا	آ
۴۲۳	۲۴	مخزونہ	× ×
۴۲۴	۸	ہے	× ×
۴۴۵	۱۸	صدر الدین	صدر الحق[۱]
۴۵۹	۷	حمد و نعت ، منثور	حمد و نعتِ منثور
۴۸۵	۲۵	کیا	کیا ہے
۴۹۲	۲۴	بہارستانِ نار	بہارستانِ ناز
۴۹۳	۱	یہی	بھی یہی
۴۹۳	۱۴	حال و خط	خال و خط
۴۹۸	۲۶	(انتخاب)	(انتخاب یادگار)
۵۰۲	۱۱	کلام	× ×

۱- ''قطعۂ منتخب'' اور ''سخن شعرا'' کی بحث میں ہر جگہ ''صدر الدین'' غلط
''صدر الحق'' صحیح ہے ۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۰۲	۲۲	قمر ،	قمر کے ۳۹ ،
۵۰۲	۲۶	اپریل ۵	اپریل ۵۷
۵۰۵	۲	شیرانی	شبراتی[1]
۵۰۶	۶	ہے	ہے کہ
۵۱۷	۱۴	داغ	سراغ
۵۲۳	۱۹	خاص	خالص
۵۳۹	۱۱	ہے	ہے کہ
۵۵۳	۱۳	اطلاعات	اطلاعات ملتی
۵۵۸	۸	صورت	صورت میں
۵۵۸	۹	ہے	ہو
۶۰۲	۲۲	سوم	موسوم
۶۰۴	۵	موجز	مرجز
۶۰۴	۲۶	ملیق	لئیق
۶۰۶	۵	کرنے تو	کرنے کو
۶۰۹	۵	عبدالحق	عبدالحق نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی کارآمد ہے
۶۱۲	۶	وہ مجلس	"دہ مجلس
۶۱۲	۱۵	محفل	اہل
۶۱۴	۲۴	آزادی	آزاد ہی
۶۱۹	۸	صفت	صنعت
۶۲۷	۸	بہ یک	وہ بہ یک

☆ ☆ ☆

۱- تذکرۂ شعرائے رام پور کی بحث میں ہر جگہ "شیرانی" غلط ، "شبراتی" صحیح ہے -